فارسی ادب بعہد اورنگزیب

از

ڈاکٹر نور الحسن انصاری ایم ۔ اے، پی، ایچ، ڈی
استاد زبان وادبیات فارسی
دہلی یونیورسٹی دہلی

ناشر

اندو پرشین سوسائٹی، دہلی

مصنف کی دوسری کتابیں

۱۔ مآثر محمود شاہی مؤلفہ شہاب حکیم کرمانی (ترتیب و تلخیص)
۲۔ ترجمۂ انگریزی وقائع نعمت خان عالی (زیر طبع)

اشاعت اول
جنوری ۱۹۶۹ء

ناشر
انڈو پرشین سوسائٹی۔ دہلی

مطبع :- کوہِ نور پریس دہلی
کاتب :- عبد المجید غازیپوری

قیمت
سولہ روپے

انتساب

استاد محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی قبلہ

صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی

کی خدمت میں

خلوص اور عقیدت کے ساتھ

پیش لفظ

ہندوستان کا فارسی ادب کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے وقیع اور قابل قدر ہے۔ ابوالفرج رونی سے غالب و اقبال تک ہندوستان کے فارسی شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنے خون جگر سے جو گل کاری کی ہے اس کے سامنے ایرانی فنکاروں کی گل کاریاں بھی کبھی کبھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے اس اہمیت کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ایسے پر ارزش ادب کی دور بدور تاریخ مرتب کی جائے۔

ہندوستان کی سیاسی اور ادبی تاریخ میں اورنگزیب کا عہد (۱۶۵۸ – ۱۷۰۷) بیحد اہم ہے۔ اورنگزیب صرف سلطنت مغلیہ کا عظیم حکمراں ہی نہیں تھا وہ نثر نگاری اور انشاپردازی کا بھی شہنشاہ تھا۔ دوسری طرف سبک ہندی کا عظیم ترین شاعر بیدل اسی عہد کا فنکار ہے۔ سیاسی خلفشار کے باوجود اس عہد نے فارسی ادب کا دامن جن گہرپاروں سے لبریز کیا وہ وقیع بھی ہیں اور عظیم بھی۔

اس تحقیقی مقالہ پر راقم الحروف کو دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی تھی۔ اب مناسب ترمیم و اصلاح کے بعد کتابی شکل میں حاضر ہے۔ اگر میرے شفیق اساتذہ جناب منظور حسین موسوی پرنسپل دہلی کالج دہلی اور پروفیسر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی کی مسلسل عنایت اور رہنمائی نہ ہوتی تو یہ کتاب پایہ تکمیل کو نہیں پہونچتی۔ مجھے فارسی ادب سے جو بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے وہ انھیں کے قدموں کا فیض ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تکمیل کے لئے اپنے مخلص احباب جناب عبدالودود اظہر اور جناب محمد یوسف اساتذہ شعبہ فارسی، دہلی کالج دہلی کی پرخلوص کوششوں کا احسان مند ہوں۔ جناب شریف حسین قاسمی اور عزیزی ظہیر الحسن نے اس کی طباعت کا انتظام کیا اور مولوی عبدالحمید نے اس کی کتابت فرمائی۔ ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

نورالحسن انصاری

دہلی

۵ر جنوری ۱۹۶۹ء

فہرست

باب ۵

اس عہد کے دیگر شعرا

(ا) مثنوی نگار

(ب) غزل گو

(حصہ نثر)

باب ۶

باب ۷

مکاتیب و انشا

باب ۸
داستان اور قصے

باب ۹
تراجم وموسیقی

باب ۱۰
تاریخ

(الف) عام تاریخ

(ب) ہندوستان کی عام تاریخ

(ج) تاریخ تیموریان

(د) عہد اورنگزیب کی تاریخ

(ہ) معاصرین اورنگزیب

(و) مقامی تاریخ

باب ۱۱
سوانح

(الف) سوانح شعرا

(ب) سوانح مشائخ

باب ۱۲
تصوف و اخلاقیات

باب ۱۳
دیگر علوم

اختصارات

استوری ۔ پرشین لٹریچر۔ اے بیو ببلیوگرافکل سروے، از سی، اے ۔ استوری

اشپرانگر۔ فہرست مخطوطات عربی، فارسی وہندوستانی، کتابخانۂ شاہان اودھ، از اے ۔ اشپرانگر۔

آصفیہ ۔ فہرست کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد

ایتھے ۔ فہرست مخطوطات فارسی، انڈیا آفس لندن، از ہرمن ایتھے ۔

ایڈنبرا ۔ فہرست مخطوطات عربی وفارسی، ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری، از اشرف الحق ۔

ایشیاٹک ۔ فہرست مخطوطات فارسی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، از ایوانوف ۔

جلد اول (ذخیرۂ سوسائٹی)

جلد دوم (ذخیرۂ کرزن)

ایلیٹ ۔ ہسٹری آف انڈیا از ایلیٹ وڈاؤسن ۔

بانکی پور ۔ فہرست مخطوطات فارسی وعربی، اورینٹل لائبریری، بانکی پور، پٹنہ از عبد المقتدر ۔

براؤن کیمبرج ۔ فہرست مخطوطات فارسی، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری از ایڈورڈ براؤن ۔

براؤن فہرست ۔ اے ہینڈ لسٹ آف محمڈن مینسکرپٹس، کیمبرج یونیورسٹی، از ایڈورڈ براؤن ۔

بوڈلین ۔ فہرست مخطوطات فارسی، ترکی، ہندوستانی وپشتو، بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ، از ہرمن ایتھے ۔

بوہار ۔ فہرست مخطوطات فارسی، بوہار لائبریری، کلکتہ از قاسم رضوی ۔

راس وبراؤن ۔ انڈیا آفس کے دو ذخیروں کے عربی فارسی مخطوطات کی فہرست ۔ از ڈینسن راس و ایڈورڈ براؤن ۔

ریو ۔ فہرست مخطوطات فارسی، برٹش میوزیم لندن، از چارلس ریو ۔

مارلے ۔ فہرست مخطوطات تاریخ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن، از مارلے ۔

باب ۱

تاریخی پس منظر

ہندوستان کی تاریخ میں سترہویں صدی کا نصف آخر یعنی اورنگ زیب کا عہد حکومت فارسی ادب اور سیاست دونوں لحاظ سے متنازع اور نازک ہے۔ شاہجہاں کی مہلک بیماری پر جب اس کے بیٹوں میں جنگ کے شعلے بھڑکے تو اورنگ زیب کے علاوہ اور تینوں لڑکے یعنی دارا، شجاع اور مراد اس آگ کی نذر ہو گئے۔ اورنگ زیب تخت طاؤس کا تنہا مالک اور ہندوستان کا واحد حکمراں بن گیا۔ دکن میں تین اور طاقتیں یعنی عادل شاہی، قطب شاہی اور مرہٹہ حکمرانی کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھیں۔ مگر ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ اورنگزیب کے ہاتھ میں تھا، اس نے اول الذکر دونوں حکومتوں کو ختم کر دیا اور مرہٹہ طاقت کو بالکل کچل کے رکھ دیا۔ اسی لئے سترہویں صدی کا نصف آخر اور اٹھارہویں صدی کا ابتدائی عہد اورنگزیب کا عہد کہلاتا ہے۔ اس نے مغل حکومت کو سب سے زیادہ توسیع بخشی۔ تاریخ کی ابتدا سے انگریزوں کی آمد تک کبھی ہندوستان کسی ایک حکمراں کے زیرنگیں اتنا متحد نہیں ہوا تھا، جتنا اورنگزیب کے ماتحت تھا۔ تبت سے راس کماری تک اور کابل سے برما تک ایک بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ایک حکمراں کا فرمان نافذ تھا۔

۱۰۶۸/ ۱۶۵۸ میں تاج محل کا بانی شاہجہاں ایک مہلک بیماری کا شکار ہوا۔ اس وقت شاہجہاں کا بڑا لڑکا دارا مرکز میں بادشاہ کا ہاتھ بٹاتا تھا، اورنگزیب دکن کا گورنر تھا۔ مراد اور شجاع بالترتیب گجرات اور بنگال کے گورنر تھے۔ اچانک یہ خبر پھیل گئی کہ شاہجہاں گزر گیا ہے اور جھروکہ درشن میں ایک فرضی بادشاہ کو بٹھایا جاتا ہے۔ اورنگزیب مراد اور شجاع تینوں نے یہ سوچا کہ اس بہانے دارا حکومت پر قبضہ کر رہا ہے، چنانچہ تینوں بیٹے بیمار باپ کی تیمارداری کے بہانے دہلی کی طرف چل پڑے۔ دارا حریفوں کی چال سے باخبر تھا، اس نے فوراً اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی جس نے شجاع کو شکست دی؛ جسونت سنگھ اور قاسم خاں کی کمانڈ میں اس نے دوسری فوج اورنگزیب اور مراد کے مقابلے کے لئے بھیجی۔ یہ دونوں بھائی راستہ میں مل گئے تھے۔ شاہی فوج کو دھرمات کے مقام پر اورنگزیب کے ہاتھوں شکست ہوئی (۱۵/ اپریل ۱۶۵۸)۔ اب دارا خود میدان میں آیا اور سموگڑھ کے پاس اس کا مقابلہ اورنگزیب سے ہوا۔ اس لڑائی میں بھی دارا کو شکست ہوئی (۲۹/ مئی)، اورنگزیب فتح کے نقارے بجاتا ہوا آگرہ پہونچا اور شاہجہاں کو قید کر کے دہلی کی طرف بڑھا۔ دارا ایک شکست خوردہ فوجی کی طرح چھپ چھپ کر بھاگتا رہا۔ مگر اورنگزیب کی فوجیں برابر اس کا تعاقب کرتی رہیں، یہاں تک کہ اسے گرفتار کر کے دہلی لایا گیا اور ۳۰/ اگست ۱۶۵۸ کو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اورنگ زیب کی فتح اور سلیمان شکوہ کی گرفتاری کے بعد شجاع پھر مرکز کی طرف بڑھا۔ مگر اورنگزیب کی فوج نے اسے کڑا کے پاس شکست دی۔ شجاع پورب کی طرف بھاگا۔ میر جملہ برابر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اراکان کے جنگلوں میں بھاگ گیا اور معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوا۔ شجاع کی شکست سے پہلے مراد کی گرفتاری عمل میں آچکی تھی۔ اب مقابل میں کوئی حریف نہیں تھا۔ چنانچہ اورنگزیب نے ۲۴/ رمضان ۱۰۶۹/ ۵/ جون ۱۶۵۹ کو پوری شان و شوکت سے دوسرا جلوس کیا۔ اور یہ طے پایا کہ یکم رمضان ۱۰۶۸ (۲۳/ مئی ۱۶۵۸) سے

حکومت کا آغاز شمار کیا جائے۔

اورنگزیب کے ابتدائی عہد میں اس کی سلطنت میں خاصی توسیع ہوئی۔ پورب میں میر جملہ نے کوچ بہار اور آسام فتح کئے۔ چند سالوں کے بعد شائستہ خان نے چٹا گاؤں اور جزیرۂ سوندیپ پر قبضہ کیا (۲۶ جنوری ۱۶۶۶)۔ چار سال قبل بہار کا گورنر داؤد خاں پالامئو پر فتح پا چکا تھا۔ ۱۶۶۵ میں تبت مغل حکومت کی برتری تسلیم کر چکا تھا۔

اس دوران میں ادھر ادھر چھوٹی بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ قابل ذکر باغیوں میں بیکانیر کا رس کرن اور چمپت رائے بندیلہ ہیں۔ اول الذکر کو اگست ۱۶۶۰ میں خاموش کر دیا گیا مگر موخر الذکر کافی دنوں تک حکومت کو پریشان کرتا رہا۔ آخر کار اکتوبر ۱۶۶۱ میں اس نے خودکشی کر لی۔ شمال مغرب میں ۱۶۶۷ میں یوسف زئی قبیلہ نے بغاوت کی پانچ سال بعد آفریدی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آفریدیوں کی رہنمائی مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک اور اس کا ساتھی اکمل خاں کر رہے تھے۔ اس بغاوت نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ اورنگزیب خود جون ۱۶۷۴ء میں حسن ابدال پہونچا اور تقریباً دو سال وہاں مقیم رہا۔ جب حالات سازگار ہوئے تو وہ دہلی لوٹ آیا۔

دسمبر ۱۶۷۸ میں مہاراجہ جسونت سنگھ کی وفات کے بعد ریاست جودھپور کا مرکز سے الحاق کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درگا داس راٹھور کی قیادت میں راجپوتوں نے بغاوت کر دی اور عہد اورنگزیب کے اختتام تک ان کی باغیانہ کاروائیاں جاری رہیں۔ اورنگزیب اس بغاوت کو فرد کرنے کے لئے بذات خود اجمیر گیا۔ مگر شہزادہ اکبر کی اچانک بغاوت نے صورت حال اور ابتر کر دی۔ اکبر کو گرفتار کرنے کی ساری کوششیں بیکار ہو گئیں۔ درگا داس راٹھور کی حمایت میں وہ چھپتا چھپاتا مرہٹہ حکمراں شمبھوجی کے دربار میں پہونچ گیا۔ چنانچہ نومبر ۱۶۸۱ میں اورنگزیب نے بھی دکن کا رخ کیا اور اس نے اپنی زندگی اور حکومت کے باقی پچیس سال دکن میں گذارے۔ یہاں وہ مستقل عادل شاہیوں، قطب شاہیوں اور

مرہٹوں سے جنگ میں مصروف رہا اور اس طرح شمالی ہندوستان جنگ کے شعلوں سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔

مرہٹوں کی طاقت کا عروج شیواجی سے ہوتا ہے۔ شیواجی پہلے اپنے باپ کی جاگیر کانگراں تھا لیکن اکتوبر ۱۶۵۵ تک وہ چالیس قلعوں پر قبضہ کر چکا تھا مغل فوج سے آئے دن اس کی جھڑپ ہوتی رہتی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا۔ آخر کار اورنگزیب کے کمانڈر مرزا راجہ جے سنگھ اور شیواجی کے درمیان معاہدہ صلح ہوا۔ شیواجی دہلی آیا۔ یہاں اسے گرفتار کرلیا گیا مگر وہ ڈرامائی انداز میں فرار ہوگیا اور اس نے اپنی وفات (۵ اپریل ۱۶۸۰) تک اپنی باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ شیواجی کے بعد اس کے لڑکے شمبھوجی نے خاندیس میں اپنی لوٹ مار جاری رکھی یہاں تک کہ مغل جنرل مقرب خان کے ہاتھوں وہ اپنے وزرا سمیت گرفتار ہوا اور اسے مارچ ۱۶۸۹ میں ختم کردیا گیا۔

شمبھوجی کے قتل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی راجہ رام رائے گڈھ میں تخت نشین ہوا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد مغل فوج نے اس کی راجدھانی کا محاصرہ کرلیا۔ راجہ رام جنجی بھاگ گیا۔ اس کے فرار ہونے سے مرہٹہ حکومت اپنی مرکزیت کھو بیٹھی۔ اس طرح ۱۶۸۹ کے اختتام تک اورنگزیب شمالی ہند اور دکن کا عظیم حکمراں ہوگیا۔

بیجاپور اور حیدرآباد پر ایک عرصہ سے مغلوں کی نظر تھی۔ اورنگزیب اپنی گورنری کے عہد میں اس کا محاصرہ کرچکا تھا۔ لیکن تخت نشینی کے لئے جب اسے شمالی ہند جانا پڑا تو یہ محاصرہ اٹھالیا گیا اور یہ مہم یونہی ادھوری رہ گئی۔ ۱۶۷۲ میں عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد تخت پر ایک لڑکے سکندر کو بٹھایا گیا اور بیجاپور پر بالترتیب عبدالمحمد خاں، خواص خان بہلول خاں اور سیدی مسعود بادشاہ کے قائم مقام بن کر حکمرانی کرتے رہے۔ یکم اپریل ۱۶۸۵ کو بیجاپور کا باقاعدہ محاصرہ شروع کیا گیا۔ اورنگزیب خود کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ ۱۲ ستمبر ۱۶۸۵ کو شہر پر قبضہ ہوگیا۔ اور ۱۹ ستمبر کو اورنگزیب فاتح کی حیثیت سے قلعہ میں داخل ہوا۔

سکندر کو گرفتار کیا گیا۔ اور اسے ایک قیدی کی حیثیت سے شہنشاہ کے خیمے کے برابر رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ستارہ کی مہم کے دوران ۳ / اپریل ۱۷۰۰ کو اس نے وفات پائی۔

بیجاپور پر تسلط کے بعد مغل حیدرآباد کی طرف مڑے جہاں قطب شاہیوں کی حکومت تھی۔ اپریل ۱۶۷۳ میں عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں دو ہندو دانشوروں کا حکومت میں پورا عمل دخل تھا۔ مدنا وزیر اعظم کی حیثیت سے اور اس کا بھائی اکنا سپہ سالار اعلیٰ کی حیثیت سے پوری حکومت پر قابض تھے۔

جولائی ۱۶۸۵ میں اورنگزیب نے اپنے بڑے لڑکے شاہ عالم کو حیدرآباد شہر کا محاصرہ کرنے کے لئے بھیجا۔ شاہ عالم نے اکتوبر میں شہر فتح کر لیا۔ ابوالحسن اپنے تمام وزیروں سمیت قلعہ گول کنڈہ میں محصور ہو گیا جو شہر سے کچھ ہی دور پہاڑی پر واقع ہے۔ بیجاپور کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ساری مغل فوج گول کنڈہ پر لگا دی گئی۔ اورنگزیب خود اس مہم میں موجود تھا۔ تقریباً آٹھ مہینے کے محاصرہ کے بعد (جس کے دوران شاہ عالم کو قید ہوئی اور بیشتر امرا کو معطل کیا گیا) قلعہ والوں نے دروازہ کھول دیا۔ ابوالحسن گرفتار ہوا۔ اسے دولت آباد کی سرکاری جیل میں رکھا گیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری چودہ سال گذار کے وفات پائی۔

بیجاپور اور گول کنڈہ پر فتح کے بعد اورنگزیب کا واحد مقصد مرہٹوں کے باقی قلعوں کو فتح کرنا تھا چنانچہ وہ بذات خود اس عظیم مہم پر روانہ ہوا اور اس نے مرہٹوں کے تمام اہم قلعے بسنت گڈھ، ستارہ، پارلے گڈھ، وردھن گڈھ، کھیلنہ، تورنہ، راجنجرہ وغیرہ ایک ایک کر کے فتح کئے اور تقریباً اکیاون سال حکمرانی کر کے ۲۱ / فروری ۱۷۰۷ کو وفات پائی۔ اسے دولت آباد کے پاس خلد آباد میں مدفون کیا گیا جہاں ابوالحسن تاناشاہ پہلے ہی دفن تھا۔

اورنگزیب کے عہد میں ایران، عرب، حبشہ، ترکی اور مرکزی ایشیا سے ہندوستان

کے عمدہ سفارتی تعلقات تھے۔ ان ممالک کے سفیر برابر ہندوستان آتے تھے تاکہ اس وقت کی سب سے عظیم مسلم حکومت سے اچھے تعلقات قائم کر سکیں۔ دانشوروں، شاعروں ادیبوں اور عالموں کے ذریعہ بھی ان ممالک کی تہذیب ہندوستان پہونچ رہی تھی۔ شاہ عباس ثانی والی ایران اگرچہ پہلے دارا اور مراد کے ساتھ سازش کر چکا تھا لیکن اورنگزیب کی تخت نشینی کے تین سال بعد اس نے اپنا سفیر بوداق بیگ بھیجا۔ مگر اس کے جواب میں ہندوستان سے جو سفیر گیا، وہ شاہ ایران کا تہدید آمیز خط لے کر لوٹا۔ مرکزی ایشیا سے سفیروں کی آمد زیادہ تھی۔ بلخ کا پہلا سفیر ۱۶۶۱ میں اور بخارا سے ۱۶۶۷ میں ہندوستان پہونچا اور عہد اورنگزیب کے اواخر تک ان ممالک سے سفرا آتے رہے۔ اس کے علاوہ کاشغر، مکہ اور ترکی سے بھی ہندوستان کے بہترین سفارتی تعلقات بحال رہے۔[۵]

---

[۱] اورنگزیب کی مفصل تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو:۔

۱۔ تاریخ اورنگزیب از جدوناتھ سرکار (پانچ جلد)، کلکتہ ۱۹۲۵-۱۹۵۲ء

۲۔ مآثر عالمگیری از محمد ساقی مستعد خاں۔ مرتبہ آغا احمد علی۔ کلکتہ ۱۸۷۱ء

۳۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد ۴۔ مرتبہ سر رچرڈ برن۔ کیمبرج ۱۹۳۷ وغیرہ

باب ۲

سماجی اور ثقافتی حالات

اورنگزیب کا عہد پچیس پچیس سال کے دو نصفوں میں منقسم ہے۔ اس نے اپنی حکومت کا پہلا نصف شمالی ہند میں گذارا۔ اس دور میں دہلی کو دارالخلافہ اور مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ حکومت کے باقی پچیس سال جنوبی ہند میں گذرے۔ اس پورے عرصہ میں اورنگزیب لگاتار ایک مہم سے دوسری مہم پر روانہ ہوتا رہا اور اس کی اس زندگی کا بیشتر حصہ کیمپ، خیموں اور کبھی کبھی مٹی کے مکانوں میں گذرا۔ اس دور میں اورنگ آباد کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور وہ تقریباً ہندوستان کا جنوبی دارالخلافہ بن گیا۔ اس طرح دہلی اور اورنگ آباد آرٹ اور ثقافت کے دو بڑے اہم مرکز ہو گئے۔ ادیب اور فنکار انھیں مرکزوں پر جمع ہوتے اور اپنے فن کی بدولت کسی رئیس کی سرپرستی یا کم از کم دانشوروں کی صحبت حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ صوبائی راجدھانیوں کو بھی ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جن میں لاہور، سری نگر، الہ آباد، پٹنہ، ٹھٹہ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اڑیسہ کی راجدھانی کٹک شمالی ہند سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود علما کا مرکز

تھی۔ اس عہد کے سب سے بڑے شاعر مرزا عبدالقادر بیدل نے یہیں اپنے چچا سے تفسیر اور دیگر علوم کی تحصیل کی تھی۔ دکن میں حیدرآباد اور بیجاپور پہلے سے آرٹ اور ادب کے مرکز تھے۔ راجستھان میں جے پور، بیکانیر، بوندی اور جودھپور میں فنکاروں کا اجتماع تھا ان شہروں میں زندگی اگرچہ پُرسکون تھی، مگر کسب معاش کی کوئی خاص مستقل صورت نہیں تھی۔ چونکہ بادشاہ امرا، اور منصب داروں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتا رہتا تھا، اس لیے مختلف مقام اور نسل کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور ان کی تہذیب سمجھنے کا بہترین موقع ہاتھ آتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس اختلاط نے اس عہد کے سماج میں ایک خاص ہم آہنگی اور توازن پیدا کیا۔

یورپی سیاحوں کے سفرناموں سے اس عہد کے سماجی اور ثقافتی حالات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض کے بیانات مثلاً منوچی افسانہ طرازی کا طومار معلوم ہوتے ہیں اور بعض سے یہاں کی باتیں سمجھنے میں فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ پھر بھی انھوں نے مغل دربار کا جو نقشہ کھینچا ہے یا ہندوستان کے مختلف شہروں کی جو زندگی پیش کی ہے، وہ دلچسپ بھی ہے اور پُراز معلومات بھی۔

عہد اورنگزیب کے ابتدائی ایام میں ہندوستانی معاشرہ میں کسی خاص تبدیلی کا ظہور نہیں ہوا سوائے اس کے کہ تخت طاؤس پر ایک نیا حکمراں متمکن تھا، چند نئے امرا نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی اور کچھ پرانے امرا اچانک غائب ہو گئے۔ درحقیقت شاہجہاں نے مغل فن اور ثقافت کا جو عظیم ورثہ چھوڑا تھا، اس میں اتنی آسانی سے اور اتنی کم مدت میں کوئی خاص تبدیلی آ بھی نہیں سکتی تھی۔ اورنگزیب شروع میں اسی شان و شوکت سے دربار کرتا تھا دربار کے جملہ رسوم و آداب پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کی تاج پوشی اور یوم پیدائش کا جشن اسی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا جس کی روایت شاہجہاں سے چلی آ رہی تھی۔ اس موقعہ پر بادشاہ کو سونا، چاندی اور قیمتی جواہرات میں تولا جاتا تھا اور یہ سب رقم غریبوں میں

تقسیم کر دی جاتی تھی۔ امرا، شہزادے اور منصب دار ملاقات کے وقت بادشاہ کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر نذر پیش کرتے تھے۔ جب بادشاہ دربار خاص میں جلوس کرتا تو بدستور موسیقی کی دھنیں بجتی تھیں[1]۔

اورنگزیب نے اپنے جلوس کے دس سال بعد کفایت شعاری، سادگی اور کہیں کہیں زہد و ورع پر زور دینا شروع کیا۔ سب سے پہلے دربار سے موسیقی کا جنازہ نکلا، پھر سرکاری تاریخ نویسی بند ہوئی اور رفتہ رفتہ ہر قسم کے جشن منانے پر پابندی لگا دی گئی۔ کہتے ہیں جب موسیقار دربار سے نکالے گئے تو انھوں نے ایک جمعہ کو عجیب مظاہرہ کیا۔ اورنگزیب جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد جا رہا تھا، اس نے دیکھا کچھ لوگ ایک جنازہ لئے جا رہے ہیں۔ ان کے ماتم اور بین سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، اورنگزیب نے پوچھا "کس کا جنازہ ہے؟" لوگوں نے کہا موسیقی کا، جو بادشاہ کے حکم سے قتل کی گئی ہے اورنگزیب نے کہا اسے اس طرح دفنانا کہ دوبارہ زندہ نہ ہو سکے[2]۔

لیکن اس واقعہ کے بعد بھی امرا کی محفلوں سے موسیقی کا جنازہ نہیں نکلا، بلکہ ان میں سے بیشتر اسی والہانہ انداز سے موسیقی سے دلچسپی لیتے رہے۔ شہزادہ محمد اعظم کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ امرا میں مرزا روشن ضمیر اور سیف خاں نے موسیقی پر گراں قدر کتابیں تصنیف کیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ میر عبد الجلیل بلگرامی جو اس دور کے بڑے ثقہ عالم تھے، موسیقی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ دربار گولکنڈہ میں موسیقاروں کو بہت اعزاز حاصل تھا اور وہاں کے آخری حکمراں کو موسیقی میں خاص شغف رکھنے کی وجہ سے تانا شاہ کہا جاتا تھا[3]۔

---

[1] لین پول: اورنگزیب، آکسفورڈ، ۱۸۹۳، ص ۸۸۔

[2] ایضاً ص ۹۸-۹۹؛ تاریخ اورنگزیب مرتبہ جدوناتھ سرکار ۳/۸۵

[3] سرکار ۳/۸۵۔

اس عہد کے معاشرہ میں چار بنیادی طبقے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد، امرا، اور منصب دار، فوجی اور عوام جن میں دستکار اور تاجر بھی شامل تھے۔ ہر طبقہ کا معیار زندگی خاصا مختلف تھا۔ فرانسیسی سیاح برنیر کا بیان[۱] ہے کہ شاہی خاندان کے افراد اور امرا بڑے بڑے کشادہ محلوں میں رہتے تھے، معمولی حکام اور تاجر اینٹ یا مٹی کے مکانوں میں زندگی گذارتے تھے لیکن عام فوجی عموماً چھپر یا بانس کی جھونپڑیوں میں گذارا کرتے تھے۔ لوگوں میں اوہام پرستی عام تھی۔ جیوتش اور نجوم پر بڑا اعتقاد تھا۔ بڑے بڑے امرا، اور منصب دار جیوتشیوں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ چھوٹے موٹے جیوتشی سڑک کے کنارے پھٹی پرانی دری بچھائے بیٹھے رہتے تھے، اور سنسنی خیز پیشین گوئیوں سے لوگوں کی جیب ہلکی کرتے تھے۔

اورنگزیب نے آرٹ اور ادب کی سرکاری سرپرستی ختم کر دی تھی۔ چونکہ اس کا میلان مذہب اور تصوف کی طرف زیادہ تھا، اس لئے وہ عالموں اور دانشمندوں کی سرپرستی پر زیادہ توجہ صرف کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا سہرا اس کے سر ہے۔ مگر امیروں اور شہزادوں کے دربار میں شعرا کی رسائی بھی تھی اور عزت بھی۔ یہاں انھیں پوری پوری سرپرستی حاصل تھی۔ شہزادہ اعظم نے اس دور کے تمام مشہور شعرا، بیدل راسخ سرہندی، شہرت اور سالم کشمیری وغیرہ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا جس کا بنیادی مقصد ان حضرات کی سرپرستی تھی۔ شہزادی زیب النساء کی سرپرستی میں ایک بیت العلوم (اکادمی) قائم کیا گیا تھا جہاں علما تالیف و تصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ نعمت خاں عالی، ملا صفی الدین قزوینی اور مرزا خلیل شہزادی سے متعلق تھے۔ ان کی تصانیف کا نام زیب سے شروع ہوتا تھا مثلاً زیب التفاسیر، زیب المنشآت وغیرہ۔ اورنگزیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان کے دربار

---

[۱] برنیر: سیاحت نامہ (انگریزی)۔ ترجمہ کانسٹیبل۔ ص ۲۴۶۔

ہیں ملا سعید اشرف اور محمد حسن ایجاد رہتے تھے۔ امرا میں دانشمند خاں ماہر کے سرپرست تھے سیف خاں اور ذوالفقار خاں ناصر علی پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ نواب حفظ اللہ خاں گورنر ٹھٹھہ نے سندھ کے شعرا کی سرپرستی کی۔ مکرم خاں کے دربار میں غنیمت کنجاہی، راسخ سرہندی اور محمد سعید اعجاز رہتے تھے۔ شکر اللہ خاں خاکسار بیدل اور شیر خاں لودی مصنف مرآۃ الخیال کے مربی تھے۔ محمد حسن مخاطب بہ ہمت خاں کے حضور میں محمد عاشق ہمت رہتے تھے بعض امرا خود بڑے شاعر اور ادیب تھے۔ ان میں سب سے پہلا نام عاقل خاں رازی کا ہے جو دلی کے گورنر تھے۔ موسوی خاں فطرت، رفیع خاں باذل، مرزا ارادت خاں واضح، ہمت خاں میرن، بختاور خاں، سیف خاں، اس عہد کے مشہور رئیس اور منصب دار تھے۔ کچھ شعرا سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ مثلاً نعمت خاں عالی شاہی مطبخ کے داروغہ تھے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی بھکر کے وقائع نگار تھے، خالص اصفہانی پٹنہ کے دیوان تھے۔ ایزد بخش رسا بیوتات سے متعلق تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ شعرا اور مصنفین کو بلا واسطہ سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی مگر وہ سرپرستی سے محروم نہیں تھے۔ ایک بات یہ بھی اہم ہے کہ اورنگزیب قصیدہ گوئی کا مخالف تھا شعر گوئی کا نہیں۔ اسے فارسی شاعری کا بہترین ذوق تھا۔ اس کے خطوط میں فارسی اشعار کی بہترین پیوندکاری ہے جن میں بعض اشعار خود اس کے ہم عصر شعرا کے ہیں۔

نقاشی اور مصوری کے لحاظ سے بھی اورنگزیب کا عہد خاص خصوصیات کا حامل ہے اس دور کی تصویروں کا عام موضوع جنگی یا مذہبی مناظر ہے[۱]۔ اگرچہ اس دور میں بھی فن کی وہی قدیم تکنیک باقی رہی مگر ولندیزی اثر کے تحت خصوصاً دکن میں تاریک مناظر کا چلن زیادہ ہوا جس میں گہرے رنگوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گہرے کالے اور

---

[۱] ہرمن گوئیٹز: ہندوستانی آرٹ کے پانچ ہزار سال (انگریزی)، بمبئی، ص ۲۲۵

خاکستری رنگوں پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔[۱] اس دور کی نقاشی میں ایک اور جدت عمل میں آئی۔ اکبر سے شاہجہاں تک مغل نقاشی میں عورتوں کی تصویر سرسری اور اتفاقیہ ہوتی تھی لیکن اس دور میں عشق و محبت کے مناظر پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔[۲] فنکار کا مقصد اپنے آقاؤں کو خوش کرنا تھا، جس میں اکثر کا ذوق خاصا پست تھا۔

اورنگزیب کے دربار کی اور خود اس کی ذاتی جو تصویریں ملتی ہیں ان سے بڑی حد تک اس عہد کی مصوری پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم اور وقیع تصویر اس کے دربار کی ہے جس میں سفیر ایران اسے کچھ تحفے پیش کر رہا ہے۔ یہ تصویر انوپ چتر کی بنائی ہے اور چوتھے سال جلوس (۶۲-۱۶۶۱ء) کے دربار عام کا منظر پیش کرتی ہے۔ غالباً یہ وہی انوپ چتر ہے جس نے بیدل کی تصویر بنائی تھی اور جس کے بارے میں بیدل نے ایک حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے۔ اورنگزیب کے دربار کی دو اور تصویریں قابل ذکر ہیں۔ ایک وہ جو ۱۹۱۱ء کے جشن تاجپوشی کے موقع پر دہلی میں پیش کی گئی تھی جو ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ کے دربار خاص سے متعلق ہے، اور دوسری جو جرمن دنگ لنگر (Dinglinger) نے ۱۷۰۰ء میں بنا کر جرمنی کے حکمراں آگسٹ (۱۷۳۳-۱۶۷۰) کو پیش کی تھی۔ موخرالذکر واقعتاً مصوری کا لاجواب شاہکار ہے۔[۳]

سترہویں صدی کے آخری حصہ میں اورنگزیب کی ذاتی تصویریں بہت ملتی ہیں یا ایسی تصویریں ہیں جن میں خود بادشاہ کو دکھایا گیا ہے اور یقیناً یہ تصویریں اس کی مرضی سے بنائی گئی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ان امراء یا شہزادوں کی شبیہات بھی خاص توجہ کی مستحق ہیں

۱۔ ڈبلیو۔ جی۔ آرچر: انڈین پینٹنگ، لندن، ص ۱۳

۲۔ ایضاً

۳۔ فکر و فن۔ ہیمبرگ ۱۹۶۶ء عدد ۸ –

جن سے اس عہد کی فنکاری کے خصائص نکھرتے ہیں۔ وزیر اعظم نواب اسد خاں کی شبیہہ جو انڈیا آفس میں موجود ہے، غالباً اس سلسلہ کی سب سے اہم تصویر ہے[۱]۔

اورنگزیب نے جب دہلی چھوڑ کر دکن کو مرکز بنایا تو فنکار بھی اپنے سرپرست امرا کے ساتھ دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں بعض راجستھان کی ریاستوں سے منسلک ہوگئے، جن میں جے پور، بیکانیر، جودھ پور، بوندی اور میواڑ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سترہویں صدی کی آخری چوتھائی کے بعد راجستھان میں جو نقاشی وجود میں آئی، وہ تقریباً مغل نقاشی کی آواز بازگشت ہے۔ راجہ انوپ سنگھ (م۔ ۱۶۹۸ء) اور اودے پور کے رانا راج سنگھ (۸۱-۱۶۵۲) آرٹ کی سرپرستی میں پیش پیش تھے۔ ان کی توجہ اور تربیت سے بہترین تصویریں وجود میں آئیں ان تصویروں کا عام موضوع رادھا اور کرشن کی محبت ہے لیکن اس کی تہہ میں مصوروں اور ان کے آقاؤں کے جنسی تجربات کی واضح جھلک ملتی ہے[۲]۔

بیجا پور کی نقاشی کا اپنا منفرد انداز تھا جس میں مغربی اثرات اور وجیا نگر کی دیواری تصویروں سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا تھا۔ لیکن سترہویں صدی کے اختتام تک بیجا پور نقاشی بہت کچھ اپنی خوبصورتی کھو چکی تھی[۳]۔

نقاشی کی طرح فن تعمیر نے بھی راجستھان میں خاصی ترقی کی۔ اس عہد کے سب سے بڑے اور بہترین روضے راجستھان میں تعمیر ہوئے۔ راجہ کرن سنگھ (م۔ ۱۶۷۵) اور بیکانیر کے راجہ انوپ سنگھ (م۔ ۱۶۹۸) کے روضے اس عہد کی فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں جن میں مغل اور راجپوت فن تعمیر کا عمدہ امتزاج ملتا ہے[۴]۔

---

[۱] ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی: فنون لطیفہ بعہد اورنگزیب، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۵۹ و مابعد

[۲] ہرمن گوئٹیز۔ آرٹ اینڈ آرکیٹکچر، بیکانیر اسٹیٹ، آکسفورڈ ۱۹۵۰، ص ۱۰۶، انڈین پینٹنگ، ص ۱۰

[۳] انڈین پینٹنگ، ص ۱۳

[۴] آرٹ اینڈ آرکیٹکچر، بیکانیر اسٹیٹ، ص ۶۵

شاہجہاں کے عہد میں مغل تعمیر اپنے عروج کو پہونچ چکی تھی۔ تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد (دہلی) پر کسی مزید اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ درحقیقت فن تعمیر اپنے کمال پر پہونچ چکا تھا، اس کا زریں دور ختم ہو رہا تھا اور عہد شاہجہاں کے اختتام سے پہلے ہی اس میں زوال کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ شاہجہاں کے اواخر عہد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں ان میں اس ناگزیر زوال کے آثار صاف دکھائی دیتے ہیں۔ لال قلعہ آگرہ کا مچھی بھون اس کی واضح مثال ہے اورنگزیب پر یہ الزام ہے کہ اس نے فن تعمیر کی سرپرستی نہیں کی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی انسانی طاقت تمام شاہی ذرائع کے باوجود زوال کے اس فطری اصول کو بدل سکتی تھی؟[۱]

عہد اورنگزیب کی تعمیر کو ایک زوال پذیر دور کی تخلیق کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی اپنی دلکشی اور اہمیت ہے۔ ابھی فن کی تخلیق کرنے والے ہاتھ سرگرم عمل تھے، گو فنکار کی روح بڑی حد تک پژمردہ ہو چکی تھی۔ پھر بھی بعض عمارتیں اپنی مثالی خوبیوں کی وجہ سے ناقابل فراموش ہیں۔ لال قلعہ کی موتی مسجد خالص سفید سنگ مرمر سے تعمیر کی گئی ہے اور اپنی نزاکت پاکیزگی اور خوبصورتی میں عہد اورنگزیب کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ اور لال قلعہ کی عمارتوں سے بڑی حد تک ممتاز ہے۔ ۱۶۷۹ میں اورنگزیب کی ملکہ دلرس بانو کا مقبرہ اورنگ آباد کے قریب شاہی معمار عطاء اللہ کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔ دلرس بانو کا مقبرہ دکن کا تاج کہلاتا ہے اگرچہ سائز میں یہ تاج سے آدھا ہے مگر اس کے علاوہ یہ تاج کی ہو بہو نقل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں تاج کی عظمت نہیں ہے پھر بھی اس کا حسن نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔[۲]

لاہور میں اورنگزیب کے رضاعی بھائی فدائی خاں کوکہ نے بادشاہی مسجد تعمیر کرائی جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ بادشاہی مسجد اپنی تعمیری خوبصورتی اور سائز دونوں

---

[۱] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، مرتبہ رچرڈ برن، کیمبرج ۱۹۳۷ء، ۴/۵۶۷

[۲] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ ۴/۵۶۷ -

حیثیت سے دیکھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ مگر یہ افسوس کی بات ہے کہ ۱۸۴۰ کے زلزلہ میں مسجد کے چاروں مینارے ٹوٹ گئے۔[1] بنارس کی شاہی مسجد اپنے اونچے میناروں کے لئے ممتاز ہے جس سے شہر اور گنگا کا بہت حسین منظر نظر آتا ہے۔ اورنگزیب کی لڑکی زینت النساء نے دہلی میں زینت المساجد تعمیر کی۔ زینت المساجد پر سرخ پتھر سے تعمیر ہونے والی مساجد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔[2] ان عمارتوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب فن تعمیر کا سورج مغرب کی طرف ڈھل چکا تھا۔[3]

اورنگزیب کا دور فنی اور ثقافتی تخلیقات کے لحاظ سے بہت نمایاں نہیں ہے۔ نقاشی اور تعمیر دونوں کا زریں دور ختم ہو رہا تھا اور ایک ایسے دور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں زوال کے واضح آثار نمایاں تھے، اس کا ذمہ دار اورنگزیب تھا، یا یہ حالات کی فطری روتھی، اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ البتہ یہ مسلم ہے کہ ہندوستان اب بھی ادب، تعمیر، اور فنون لطیفہ میں تمام مسلم ممالک سے پیش پیش تھا،

۱۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ۴/۵۶۸

۲۔ سر سید احمد خاں: آثار الصنادید، نولکشور ۱۹۰۰، باب ۳۔

۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ لندن ۱۹۳۶، ۳/۶۳۸۔

شاعری

باب ۳

عہد اورنگزیب کی فارسی شاعری کا عمومی جائزہ

یہ ایک عام تصور ہے کہ فارسی شاعری کا زوال عہد اورنگزیب سے شروع ہوتا ہے۔ اس زوال کا ذمہ دار بڑی حد تک اورنگزیب کو سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس نے ملک الشعراء کا عہدہ ختم کر دیا اور شعرا کی سرکاری سرپرستی بند کر دی، اس لئے خیال ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی میں ایک طرح کی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اورنگزیب قصیدہ گوئی کا مخالف تھا۔ اور شاعری سے اسے کوئی والہانہ لگاؤ نہیں تھا۔ موسیقی نقاشی اور دیگر فنون لطیفہ سے بھی اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

اورنگزیب کی اس بے تعلقی کے باوجود ہندوستان میں فارسی شاعری کی شمع روشن رہی اور بہترین ادبی تخلیقات وجود میں آئیں۔ اس لئے اس دور کی شاعری کا عمومی جائزہ لینے سے پہلے دو اہم باتوں پر غور کرنا ہے اول یہ کہ کیا اس دور کی شاعری زوال پذیر ہے اور دوسرے یہ کہ سیاسی انتشار اور سرکاری سرپرستی کی کمی شاعری پر کہاں تک اثر انداز ہوتی ہے؟

ہندوستان اور ایران میں شاہی دربار نے فارسی شاعری کے ارتقا میں جو اہم کردار ادا کیا ہے، وہ فارسی ادب کا ایک مستقل موضوع ہے۔ رودکی سے غالب اور قاآنی تک تمام عظیم شاعر کسی نہ کسی دربار سے وابستہ رہے ہیں۔ لیکن فقط شاہی سرپرستی سے عظیم شاعری وجود میں نہیں آتی اور نہ ملک الشعرا اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر ہوتا ہے فارسی کے عظیم شعرا، فردوسی، خیام، رومی، سعدی، خسرو، حافظ، اور بیدل کی شاعری درباری سرپرستی کی رہین احسان نہیں۔ شاہی دربار شاعری کے لئے مناسب اور ہموار فضا ضرور پیدا کرتا ہے، لیکن عظیم شاعر نہیں پیدا کرتا۔ اس لئے عہد اورنگزیب کے سلسلہ میں یہ دلیل بیکار ہو جاتی ہے کہ اس دور کی شاعری کے زوال کا سبب شاہی سرپرستی کا فقدان اور سیاسی خلفشار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پرسکون حالات میں فنکار کو تخلیق کے زیادہ مواقع میسر ہوتے ہیں، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ فارسی کا عظیم ادب انتہائی سیاسی خلفشار یعنی چنگیزی اور تیموری دور میں وجود میں آیا ہے۔ اورنگزیب اگر ملک الشعرا کا عہدہ نہ ختم کرتا تو کیا فرق پڑتا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ضروری نہیں کہ ملک الشعرا اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر ہو۔ عنصری اور معزی کی ملک الشعرائی ان کے ہم عصروں کے لئے باعث رشک تھی، لیکن آج فارسی شاعری میں ان کا کیا مقام ہے۔ اس کے برخلاف فردوسی، خیام سعدی، رومی، حافظ اور بیدل ملک الشعرائی سے محروم رہے مگر ان کی شاعری پر تمام ملک الشعرا قربان کئے جا سکتے ہیں

دوسرا اہم سوال یہ ہے کیا عہد اورنگزیب کی شاعری زوال پذیر ہے۔ اس سے قبل کہ اس بات کا تجزیہ کیا جائے، یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ زوال پذیر دور اور زوال پذیر ادب میں کوئی منطقی ہم آہنگی ضروری نہیں ہے۔ بہترین فارسی اور اردو شاعری زوال پذیر دور کی پیداوار ہے۔ درحقیقت اکبر کے عہد میں فارسی شاعری کی جو عظیم روایت قائم ہوئی تھی، وہ جہانگیر کے عہد ہی سے بدل گئی۔ عہد جہانگیری اور عہد شاہجہانی کی شاعری، عہد اورنگزیب کی شاعری

سے کوئی خاص مختلف نہیں ہے۔ ادب کی روایتیں ہر دور میں یکساں نہیں ہوتیں، روایات کی تبدیلی بدلتے ہوئے زمانہ کا تقاضا ہے، ہاں کچھ ایسی اقدار ہوتی ہیں جو ہر دور اور ہر عصر میں جاری وساری رہتی ہیں۔ یہی اقدار ادب کو ابدیت اور آفاقیت سے ہم آہنگ کرتی ہیں، عہد اورنگزیب کی شاعری کا جائزہ لینے کے لیے اسی دور کے معیار اپنانے ہوں گے۔ اگر پہلے سے طے شدہ معیار کی روشنی میں انھیں پرکھا جائے گا تو ہو سکتا ہے مایوس کن نتائج برآمد ہوں۔ کسی دور کے ادب کو پرکھنے کے لیے ہمدردانہ نقطۂ نظر کی ضرورت ہے اور جذبات سے قطع نظر پوری احتیاط سے اس بات کا جائزہ لینا چاہیئے کہ اس دور کے شعرا کی تخلیق کہاں تک کامیاب ہے۔

عہد اورنگزیب سے فارسی شاعری میں کچھ امتیازی خصوصیات کا آغاز ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے یہ امتیازی خصوصیات ہمارے موجودہ مذاق کو نہ بھائیں۔ ان خصوصیات کا سہرا بالعموم ہندوستان کے فارسی شعرا کے سر ہے۔ یہ روایتیں اتنی مقبول ہوئیں کہ ایرانی شعرا نے بھی انھیں گلے سے لگایا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد کی ایرانی شاعری ہندوستان کی فارسی شاعری کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

اس دور کی خصوصیات میں سب سے پہلا درجہ تصنع کے عنصر کا ہے۔ اگرچہ قصیدہ گوئی تقریباً متروک تھی اور غزل گوئی سب سے زیادہ مقبول، مگر شاعر کا زور زبان اور خیال دونوں کے تصنع پر تھا۔ اظہار و ابلاغ کے لیے جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ عموماً پیچیدہ، تمثیلی، استدلالی، اور بڑی حد تک ہیجان اور گنجلک ہے۔ غزل میں خالص رومانیت اور سپردگی کا فقدان اور ایک طرح کی فلسفیانہ قنوطیت کی بہتات ہے۔ تمثیل اور ایہام کا جا و بیجا استعمال اس دور کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس رجحان سے خیالات و افکار کا دائرہ ضرور وسیع ہوا مگر الفاظ کی حد بندیاں بڑھ گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل جس میں اطناب و تفصیل کی گنجائش کم ہوتی ہے، ابہام اور پیچیدگی کا شکار ہو گئی۔ یہ والہانہ سرخوشی میں گنگنانے اور گانے والی غزلیں نہیں

ہیں، بلکہ قاری سے غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ بیدل، ناصر علی اور غنی کی غزلوں میں ترنم کم ہے اور تفکر زیادہ۔ اس خالص فکری ماحول میں شعرا کو تصوف کا بہت سہارا ملا اور اس کی مخصوص اصطلاحوں سے انھوں نے اپنی شاعری کی تزئین کاری کی۔

اس دور میں تصوف میں جو مخصوص رجحانات چھائے ہوئے تھے، ان کے تفصیلی تجزیہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصراً یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اس عہد کی سیاسی افراتفری اور اورنگزیب کی مذہبیت نے ایک طرح کے منفی تصوف کو فروغ دیا جس میں فقر اور مادی دنیا سے بیزاری پر سب سے زیادہ زور تھا۔ اورنگزیب کی تخت نشینی کے وقت ہندوستان میں تصوف کے دو متضاد دبستان کام کر رہے تھے۔ ایک دبستان داراشکوہ کی سرپرستی اور ملا شاہ بدخشی اور سرمد کی رہنمائی میں فروغ پا رہا تھا۔ اس نقطہ نظر کی رو سے تصوف کا مقصد تھا روح انسانی کی تکمیل و تنزیہ۔ یہاں مذہبی اختلافات کی گنجائش نہیں تھی۔ ہندو سنت اور مسلم صوفیوں کا یکساں احترام تھا، گیتا اور قرآن دونوں ہی کو آسمانی صحیفہ مانا جاتا تھا۔ یہاں کسی خاص مذہب کی پابندی یا کسی خاص معاشرہ کی رسوم پر عمل بھی ضروری نہیں تھا۔ سرمد بالکل ننگے رہتے تھے، پھر بھی ان کے عقیدت مندوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔

تصوف کے دوسرے دبستان کا سرچشمہ مجددی سلسلہ تھا، جس کے بانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔ اس کی رو سے شریعت اور طریقت میں مکمل ہم آہنگی تھی اور غیر اسلامی طریقت روح اسلام کے منافی سمجھی جاتی تھی۔ اورنگزیب اسی سلسلہ سے متعلق تھا۔ اس کے مرشد شیخ معصوم سرہندی شیخ احمد کے لڑکے اور خلیفہ تھے۔ شیخ معصوم کے لڑکے شیخ سیف الدین (م۔ ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶) اورنگزیب کے دربار میں رہتے تھے تاکہ شہنشاہ وقت کی روحانی رہنمائی فرماتے رہیں[1]۔ عام لوگ اسی اسلامی تصوف کے پیرو تھے۔ بیدل

---

[1] مرآۃ العالم (مخطوطہ علی گڑھ) ورق ۶۲۶، شیخ محمد اکرام: رود کوثر، لاہور، ۱۹۵۸ (تیسرا ایڈیشن) ص ۴۸۷۔

ان دونوں متضاد دبستانوں کی آویزش کا شکار رہے ۔ چار عنصر میں انھوں نے دو صوفیوں شاہ ملوک اور شاہ کمال سے اپنی عقیدت کا ذکر کیا ہے ۔ اول الذکر سرمد کی طرح عریاں زندگی گذارتے تھے اور مؤخر الذکر شرعی اصولوں پر سختی سے کاربند تھے ۔ ناصر علی سرہندی ابتدا میں ایک رند سرمست کی زندگی گذارتے تھے ، مگر جب ان کے خلاف قتل کا فتویٰ صادر ہوا تو وہ بھی مجددیہ سلسلہ میں بیعت ہو گئے ۔ بیغم بیراگی دبستان دارا کے صحیح نمایندہ تھے ۔

مذہبی احیا اور اسلامی تصوف کے باوجود اس دور کے فارسی ادب میں خالص ہندو اور ہندوستانی عناصر کی فراوانی ہے ۔ اس دور کے کئی شعرا اور دانشور ہندی اور سنسکرت ادبیات میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے ۔ مرزا روشن ضمیر ، مرزا فقیر اللہ ، سیف خاں ، ہمت خاں (میر عیسیٰ) اور میر عبد الجلیل بلگرامی ہندی کے عالم تھے اور موخر الذکر دونوں حضرات ہندی میں شعر کہتے تھے ۔ ہندی کے دو مشہور شاعر چنتامنی اور بھوشن شاہی دربار سے متعلق تھے[1] اور ان کی صحبت سے بھی فارسی شعرا نے استفادہ کیا ہوگا ۔ ہندوستانی قصوں پر جو مثنویاں لکھی گئیں ، ان میں رازی کی مہر و ماہ اور شمع و پروانہ ہے ۔ پہلی مثنوی منوہر اور مدھومالتی کے قصہ پر مشتمل ہے اور دوسری فارسی پدماوت ہے ۔ لائق کی دستور ہمت میں کامروپ اور کام لتا کا قصہ نظم کیا گیا ہے ۔ پنجاب کے ایک شاعر چنابی نے ہیر رانجھا کی داستان عشقیہ پنجاب کے عنوان سے منظوم کی ۔ بیانی کی مثنوی چندر بدن اور مہیار کی عشقیہ داستان سے متعلق ہے ۔ بینش کشمیری اور فطرت موسوی نے بنارس کے عاشقوں کا قصہ نظم کیا اور بیغم بیراگی کی مثنوی ہندوستانی فقیروں کے قصوں پر مبنی ہے ۔

اردو لسانیات کے اعتبار سے یہ دور بہت اہم ہے ۔ اگرچہ اردو ابھی ریختہ کی منزل میں تھی ، لیکن وہ ایک واضح ارتقا یافتہ شکل اختیار کر چکی تھی ۔ اس دور کے کئی ایک فارسی

---

[1] معارف ، مئی ۱۹۳۷ء ۔

شعرا نے خالص ریختہ میں اشعار کہے ہیں۔ جن میں جعفر زٹلی مقدم ہیں۔ دو شعر بیدل کی طرف منسوب ہیں۔ عطا ٹھٹھوی کے دیوان میں چھ غزلیں ملتی ہیں۔ ناصر علی نے تین غزلیں لکھی ہیں۔ مزید تلاش و جستجو سے اور کلام دستیاب ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ نصف ریختہ "نصف فارسی کا بھی چلن ہو چلا تھا۔ اس سلسلہ میں جعفر زٹلی کا نام سرفہرست ہے۔ کچھ مثالیں نعمت خاں عالی، دانا بن اشرف اور فطرت موسوی کے یہاں ملتی ہیں۔ میر عبدالجلیل بلگرامی کی پدماوت نصف ریختہ نصف فارسی زبان میں تھی۔

فارسی کے بہترین طنزیہ اور ہجویہ ادب کی تخلیق کا سہرا بھی اسی دور کے سر ہے۔ نعمت خاں عالی اور میر جعفر زٹلی کا شمار فارسی کے بہترین طنز نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے یہاں پھکڑپن کی کمی نہیں، پھر بھی انھوں نے زوال پذیر معاشرہ کی جو جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے، اس کا جواب نہیں۔ مغل دربار کی آمرانہ ہیبت کو دیکھتے ہوئے ان شعرا کی بے جھجک بیباک گوئی پر حیرت ہوتی ہے۔ نعمت خاں عالی نے وقائع میں اورنگزیب پر جو چھینٹے اڑائے ہیں، وہ واقعی حیرت ناک ہیں، لیکن جب جعفر زٹلی نے فرخ سیر کا مذاق اڑانا چاہا تو اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ درحقیقت ہجو نگاری یا ہزل نویسی اس عہد میں ایک عام وبا تھی۔ کلمات الشعرا کے مصنف سرخوش کا خیال ہے کہ بے ہجو کا شاعر بن زہر کے سانپ کی طرح بیکار ہے۔[۵] خود بیدل نے تین ہزار ہجویہ شعر کہے ہیں حالانکہ انھیں اپنی متانت اور تصوف پر بڑا ناز تھا۔

اس عہد میں مثنوی نے ایک خاص رخ اختیار کیا۔ حکایاتی یا بیانیہ شاعری کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال فلسفیانہ شاعری کے لئے بھی کیا گیا۔ بیدل اور ناصر علی کی مثنویاں اس سلسلہ میں خاص توجہ چاہتی ہیں۔ ان میں کوئی خاص مرکزی موضوع نہیں ہے بلکہ فلسفۂ اخلاق اور تصوف

---

۵ محمد افضل سرخوش: کلمات الشعرا۔ مرتبہ صادق علی دلاوری، لاہور، ۱۹۴۲، ص ۲۸

کے بکھرے ہوئے موتی ایک جگہ پرو دیئے گئے ہیں۔ بیانیہ مثنویوں میں غنیمت کی نیرنگ عشق اور عاقل خاں رازی کی مثنویاں قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں اگرچہ قصیدہ کی روایت باقی رہی مگر اس کی روح ختم ہو چکی تھی، اورنگزیب خود مدح گوئی کو ناپسند کرتا تھا، اس دور میں جو بھی چند مدحیہ قصیدے لکھے گئے ہیں ان میں کوئی خاص قابل ذکر نہیں۔ مدح کے ساتھ نعت و منقبت کے قصیدے بھی کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ قصیدہ کی طرح رباعی کا دائرہ بھی محدود ہوتا جا رہا تھا حالانکہ رباعی کی صنف اس دور کے فکری مزاج کے لیے بہت موزوں ہو سکتی تھی۔ اس عہد کے رباعی نگاروں میں محض بیدل اور واضح کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی فارسی شاعری کی عمارت چار عظیم ستونوں پر قائم ہے۔ یہ ہیں خسرو، بیدل غالب اور اقبال۔ اس دور کے لیے یہ بات بہرحال قابل فخر ہے کہ ان چار عظیم ترین شاعروں میں سے بیدل اسی دور سے متعلق ہیں۔

سترہویں صدی کا نصف آخر ایران کے لیے صفوی شان و شوکت کے اختتام کا عہد ہے۔ شاہجہاں کی فیاضیوں کے سامنے ایران کے شہنشاہ شاہ عباس ثانی کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ آخری صفوی حکمراں شاہ حسین کی تخت نشینی کے بعد ایران کی سرزمین ادبی اور ثقافتی تخلیقات کے لیے بنجر ہو چکی تھی۔ وہاں سے شعرا اور دانشور برابر ہندوستان کو ہجرت کر رہے تھے۔ صائب ایران کے آخری بڑے شاعر تھے جن کی وفات عہد اورنگزیب کے آغاز میں ۱۰۸۱/۱۶۷۱ میں ہوئی۔ ہندوستان کی کشش انھیں بھی یہاں کھینچ لائی۔ یہاں چند سال گذارنے کے بعد وہ ایران پہونچے تو صفوی دربار سے انھیں ملک الشعرا کا خطاب عنایت ہوا۔[۱] ایران کی پژمردہ شاعری میں صائب نے روح پھونکنے کی کوشش کی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ

۱؎ صائب کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ کلیات صائب، مرتبہ امیری فیروز کوہی، تہران ۱۳۳۶ (شمسی)

اٹھارہویں صدی میں ہمیں جاندار شاعری کے کچھ بکھرے ہوئے نمونے مل جاتے ہیں۔ اس وقت کے ایران میں صائب کو مسلمہ طور پر سب سے بڑا شاعر مانا جاتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے شعرا ان کی استادی کے قائل نہیں تھے۔ اور اپنی شاعری کے مقابلے میں صائب کی شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان شعرا میں ناصر علی اور واضح پیش پیش تھے۔ ناصر علی کہتے ہیں:۔

علی شعرم بہ ایران می برد شہرت، از آن ترسم — کہ صائب خون بگرید آب در دفتر شود پیدا[1]

طاہر وحید (م۔ ۱۱۲۰/۹۔۔ ۱۷۰۸) اور شوکت بخاری (م۔ ۱۱۰۷/۹۶۔ ۱۶۹۵) ایران کے دو اور بڑے شاعر تھے۔ اول الذکر اپنی شاعری سے زیادہ اپنی انشا کے لئے مشہور ہیں اور موخر الذکر عمدہ شاعر ہونے کے باوجود ایران سے زیادہ ترکی میں مقبول ہیں[2]۔

اکبر کے عہد سے ہندوستان نے مسلم ممالک میں جو مرکزیت حاصل کی تھی، وہ اورنگزیب کے عہد میں بھی قائم تھی، فارسی شاعری کے میدان میں بھی ہندوستان ہم عصر ایران سے کافی آگے تھا۔ بیدل، ناصر علی، غنی، رازی، واضح، نعمت خاں عالی اور فطرت موسوی کے پایہ کے شعرا اس دور کے ایران میں نہیں نظر آتے۔

---

[1] ناصر علی: دیوان۔ نولکشور، کانپور ۱۹۱۲، ص ۷

[2] براؤن: لٹریری ہسٹری آف پرشیا، ج ۴ کیمبرج، ۱۹۵۳، ص ۲۶۲۔

باب ۴

شعرائے معروف

غنی کشمیری

ملا محمد طاہر غنی کشمیر کے اشئی[1] قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تذکروں میں ان کے جو حالات ملتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ محسن فانی (م۔ ۱۰۸۰/۷۰-۱۶۶۹) کے شاگرد تھے[2]۔ زندگی بھر کشمیر میں رہے[3]۔ صائب، کلیم اور قدسی کی محفلوں میں شریک ہوئے[4]۔ ۱۰۶۰/۵۰-۱۶۴۹

---

[1] تاریخ حسن مؤلفہ پیر غلام حسن کھویہامی، سرینگر (۱/۶۰) نے یہ لفظ عشائی (اشائی) لکھا ہے۔ یہ قبیلہ خراسان کے ایک گاؤں عشاور سے ہجرت کر کے آیا۔ سر والٹر لارنس کا خیال ہے کہ اشئی مغلوں کی ایک شاخ تھی (غنی کشمیری از ڈاکٹر محمد ظفر خاں، ہلال، کراچی، جنوری ۱۹۶۳ء) اشئی کے لئے مزید ملاحظہ ہو۔ لچھمی نرائن شفیق، گل رعنا (بانکی پور اورینٹل لائبریری پٹنہ) نمبر ۲۳۴، ورق ۱۹۱ اور نشتر عشق (بانکی پور نمبر ۲۴۱)، ص ۱۲۹۹۔

[2] شیر خاں لودی: مرآۃ الخیال، عمدۃ الاخبار پریس، ۱۸۴۸، ص ۱۵۳۔

[3] غلام علی آزاد بلگرامی: سرو آزاد، حیدرآباد، ۱۹۱۳، ص ۱۰۳، ید بیضا (مخطوطہ علی گڑھ) ص ۲۰۶۔

[4] احمد علی: مخزن الغرائب (مخطوطہ علی گڑھ) ورق ۲۹۵۔ ابو طالب اصفہانی، خلاصۃ الافکار، (بانکی پور نمبر ۱۲/۷۱) ورق ۱۲۴۔

سے شعر کہنا شروع کیا ان کے تخلص سے بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے اور عنفوان شباب میں ۱۰۷۹ھ/ ۶۹-۱۶۶۸ء میں انتقال کر گئے۔[1]

ان بیانات میں تضاد بھی ہے اور غلطی بھی۔ مثلاً غنی کا زندگی بھر کشمیر میں رہنا ان کے اشعار سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ مندرجہ ذیل رباعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غنی ہندوستان میں کچھ دن قیام پذیر رہے اور یہاں کے قیام سے تنگ آکر انھوں نے دعا کی:۔

کردہ است ہوای ہند دلگیر مرا　　ای بخت رسان بہ باغ کشمیر مرا

گشتم ز حرارت غریبی بیتاب　　از صبح وطن بدہ طباشیر مرا[2]

دیوان میں کچھ اور اشعار بھی ہیں جن سے غنی کے قیام ہند پر روشنی پڑتی ہے۔

در نمکزار سواد ہند شادابی کم است　　گر در آنجا سبزہ ای باشد ز تخم آدم است

گردد اگر برشتہ ز گرمی عجب مدار　　ہر کس کہ سایہ پرور ہندوستان بود[3]

اس دور غریب الوطنی میں رہ رہ کر غنی کو وطن کی یاد تڑپاتی تھی اور بے اختیار ہو کر وہ کہتے ہیں:۔

بسکہ شد زنجیر پایم رشتۂ حب الوطن　　در سفر دائم چو سوزن چشم دارم در قفا[4]

مگر پھر یہ خیال آتا کہ پردیس میں اگر برا حال ہے تو وطن میں کیا اچھا تھا:۔

ہر کہ پابند وطن شد می کشد آزارہا　　پای گل اندر چمن دائم بود است از خارہا[5]

---

[1] کلمات الشعراء، ص ۸۴، مرآۃ الخیال، ص ۱۷۲۔

[2] دیوان غنی، لکھنؤ، جنوری ۱۹۳۱ء، ص ۱۲۱۔

[3] ایضاً۔ ص ۳۵، ۷۵۔

[4] ایضاً۔ ص ۹

[5] ایضاً ص ۱۶

دیوان غنی کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دیارِ غیر کی مشکلات نے غنی کو مجبور کیا کہ وہ واپس کشمیر آجائیں اور یہاں گوشہ گیری کی زندگی گذاریں۔ لیکن وطن میں بھی وہ قدردانی کہاں تھی جس کے لئے غنی ترستے تھے۔ وہ وطن میں آکر بھی مسافر ہی رہے۔

کسی آوارہ تا کی در دیارِ خویشتن باشد ‖ چو ریگ شیشۂ ساعت مسافر در وطن باشد[1]

غنی کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ صائب سے ملاقات ہے۔ غنی اور صائب کی ملاقات اس وقت ہوئی جب موخر الذکر اپنے مربی ظفر خاں احسن (م۔ ۱۰۷۳/۶۳-۱۶۶۲ء) کے ساتھ کشمیر آئے[2]۔ لیکن صائب کے کشمیر آنے کی جو وجہ بیان کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صائب نے جب غنی کا یہ شعر سنا:

موی میانت شدہ اگر الہ پن ‖ کردہ جدا کاسۂ سرہا ز تن

تو وہ ایران سے چل کر ہندوستان آئے تاکہ غنی سے ملاقات کر سکیں[3]۔ حالانکہ غنی اور صائب کی ملاقات محض اتفاقی تھی۔ صائب عہد جہانگیر کے اختتام میں ایران سے کابل پہونچے جہاں مغل گورنر ظفر خاں احسن نے ان کی سرپرستی فرمائی۔ عہد شاہجہانی کی ابتدا میں ظفر خاں کو آگرہ بلا لیا گیا اور انھیں دکن میں مامور کیا گیا۔ صائب اپنے مربی کے ساتھ ساتھ رہے۔ دو سال بعد ظفر خاں احسن پھر آگرہ بلا لئے گئے اور اس کے اگلے سال یعنی ۱۰۴۲/۳۳-۱۶۳۲ء میں انھیں کشمیر کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اب صائب بھی کشمیر گئے اور غنی سے ملے[4]۔ سوال یہ ہے کہ اگر ظفر خاں احسن کشمیر نہ جاتے تو کیا صائب خود کشمیر پہونچتے، غالباً نہیں۔

---

[1] دیوان۔ ص ۶۹۔

[2] آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ، کانپور ۱۸۷۱، ص ۲۸۷۔

[3] حسین دوست سنبھلی: تذکرۂ حسینی، نولکشور، ۱۸۷۵، ص ۲۲۸

[4] سرو آزاد، ص ۹۹، خزانۂ عامرہ، ص ۳۸۷۔

کشمیر میں اس وقت اس عہد کے مشہور شعرا کا بہترین اجتماع تھا، جن میں کلیم کاشانی، محمد جان قدسی مشہدی، محسن فانی، عماد الدین الہی اور غنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صائب غنی کی شاعری سے بیحد متاثر ہوئے اور غنی کے اس شعر پر وہ اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہو گئے،

حسن سبزی بہ خط سبز مرا کرد اسیر دام ہمرنگ زمین بود، گرفتار شدم[1]

اسی تأثر کے تحت انھوں نے غنی کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ غنی نے اپنا دیوان صائب کی خدمت میں پیش کیا جس میں سے انھوں نے دوسو اشعار منتخب کئے اور اپنے ساتھ ایران لے گئے[2]

غنی کے لئے ان رفقا کی صحبت بڑی غنیمت تھی، مگر ان میں سے بیشتر غنی کی حیات میں داغ مفارقت دے گئے۔ کلیم کی وفات پر غنی نے چند اشعار کا ایک دردناک مرثیہ لکھا ہے جس میں دوستوں کی جدائی کا ماتم وہ اس طرح کرتے ہیں:۔

حیف کز دیوار این گلشن پرید طالبا آن بلبل باغ نعیم
عمرہا در یاد او زیر زمین خاک بر سر کرد قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاق یک دگر گشتہ اند این ہر سہ در یکجا مقیم
گفت تاریخ وفات او غنی "طور معنی بود روشن از کلیم"
۱۰۶۱ھ

اسی طرح ۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳ء میں اسلام خاں گورنر کشمیر کی وفات پر بھی انھوں نے ایک تاریخی قطعہ کہا[3]

غنی کے دوستوں کی فہرست اگرچہ طویل نہیں تھی، مگر اس میں مشہور شعرا، فضلا اور امرا تھے،

---

[1] دیوان غنی (ضمیمہ)

[2] سراج الدین علی خاں آرزو: مجمع النفائس، (دہانکی پور نمبر ۲۳۷) ورق ۳۴۵۔

[3] دیوان غنی ص ۱۳۵۔

جن میں کلیم، قدسی، صائب، محسن فانی، اسلام خاں وغیرہ کا وجود بہت غنیمت تھا، مگر پھر بھی غنی کو مخلص دوستوں کی کمی کھٹکتی تھی۔ وہ کہتے ہیں :-

کردم ہر چند جستجو در عالم   یاران موافق بہ جہان دیدم کم
افسوس کہ ہمچو مہرہ ہای شطرنج   یکرنگ نیند ہم نشینان باہم[1]

ان کے ایک شاگرد خواجہ ابوالفتح خاں جنون کا ذکر ملتا ہے جو گورکھپور کے دیوان تھے[2]۔ خلوص اور وفاداری کو غنی کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ اپنے دوستوں کی حمایت میں کبھی کبھی وہ عام آداب سے آگے بڑھ جاتے تھے اور اپنے دوستوں کے مخالف کی ہجو تک کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ عہد شاہجہانی کا مشہور طنز نگار ملا طغرا (م۔ ۱۰۷۸/ ۶۸-۱۶۶۷) اپنے ہم عصروں کی ہجو کہنے میں مشہور تھا اس نے غنی کے دوستوں کی ہجو بھی کہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غنی نے اس رباعی میں طغرا کی خبر لی :-

طغری کہ بود روح کثیفش چو جسد   باصاف ضمیران شدہ دشمن ز حسد
گویند کہ بہ نار شعرش ارباب سخن   نامش نبرند تا بہ شعرش چہ رسد[3]

۔ سرخوش[4] کا یہ بیان صحیح نہیں کہ غنی نے ۱۰۶۰/ ۵۰-۱۶۴۹ سے شعر گوئی شروع کی جو لفظ غنی کی تاریخ ہے اور انھوں نے عنفوان شباب میں وفات پائی۔ اوپر یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ غنی نے ۱۰۴۲/ ۳۳-۱۶۳۲ میں صائب کو اپنا دیوان پیش کیا تھا اور اس وقت ان کی شاعرانہ حیثیت اتنی مسلم ہو چکی تھی کہ صائب ان کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے۔ علاوہ ازیں غنی کے دو شعر

---

[1] دیوان غنی، ص ۱۲۸۔

[2] آزاد بلگرامی : ید بیضا (علی گڈھ) ص ۶۷۔

[3] دیوان غنی، ص ۱۲۹۔

[4] کلمات الشعرا، ص ۸۴۔

میں طاہر تخلص ملتا ہے اور ممکن ہے کہ اس سے قبل وہ غزلوں میں یہ تخلص استعمال کرتے ہوں :۔

چنان گردید دامن گیر گرد غربتم طاہر — کہ ریگ شیشۂ ساعت بود خاک مزار من [1]

گفت تاریخ وفاتش طاہر — "بردِ الٰہی ز جہان گوی سخن" [2]
۱۰۶۳ھ

دیوان غنی میں بہت سے ایسے شواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے خاصی لمبی عمر پائی تھی اور بڑھاپا اس کے لئے وبال جان ہو گیا تھا۔ اگرچہ ایسے اشعار میں شاعرانہ مبالغہ بھی ہے، پھر بھی ان سے غنی کے بڑھاپے کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے :۔

"غنی جسمانی طور پر اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ انھیں چلنے میں چھڑی کی ضرورت پڑتی تھی[3]۔ نظر اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ وہ چشمہ لگاتے تھے[4]۔ اونچا سنائی دیتا تھا[5]۔ بال سفید ہو گئے تھے اور دانت گر گئے تھے[6]۔ جاڑے کے موسم میں گٹھیا سے انھیں اور بھی زحمت ہوتی تھی اور ٹھنڈے پانی سے وہ گھبراتے تھے"۔

دیوان غنی کے مرتب مسلم کے بیان سے بھی (جو اپنے آپ کو غنی کا شاگرد بتاتا ہے) اس بات کی تصدیق ہوتی ہے :۔

"از پیکر ہیولانیش پوستی و استخوانی مانده بود"۔ [7]

---

[1] دیوان غنی، ص ۱۱۱۔

[2] ایضاً ص ۱۳۵۔ یہ وہی عماد الدین الٰہی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔

[3] از ضعف پیری است مرا تکیہ عصا — گر دم ہنوز ہرزہ چو طفلان نی سوار (دیوان ص ۸۲)

[4] نیست عینک کہ نہادیم ز پیری بر چشم — نگہ از شوق جمال تو زند سر بر سنگ (دیوان ص ۹۲)

[5] رہین منت گوش گران خویشتنم — کہ تا بلند نگردد سخن، نمی شنوم (دیوان غنی مرتبہ محمد داراب، سرینگر ۱۹۶۴ء ص ۲۰۰)

[6] موگشت سفید و ریخت دندان — در صبح شود ستارہ پنہان (دیوان ص ۱۱۲)

[7] دیوان غنی، دیباچہ ص ۵۔

یہ مصائب کچھ ایسی شدت اختیار کر گئے کہ تنگ آکر غنی موت کی آرزو کرنے لگے :-

دارم دردی کہ ہست جانکاہ مرا ای کاش کہ بودی عمر کوتاہ مرا[۱]

اس طرح خاصی لمبی عمر پاکر غنی نے ۱۰۷۹/ ۶۹-۱۶۶۸ میں وفات پائی۔ انھیں کشمیر کے مقبرۃ الشعرا میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات پر محمد علی ماہر نے یہ تاریخی قطعہ کہا :-

چو دادش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی غنی سر حلقۂ اصحاب او در نکتہ دانی شد

تہی چون کرد بزم شیخ را گردید تاریخش کہ آہ آگاہی سوی دار البقا از دار فانی شد[۲]

طاہر نصر آبادی[۳] نے غنی کی وفات کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ اورنگزیب نے سیف خاں گورنر کشمیر کو یہ لکھا کہ غنی کو دربار میں بھیج دے۔ سیف خاں نے غنی کو بلا کر اورنگزیب کا حکم سنایا۔ غنی نے کہا آپ شہنشاہ کو لکھ دیجئے کہ غنی پاگل ہے، سیف خاں نے کہا "میں ایک عاقل کو دیوانہ کیسے کہہ سکتا ہوں"؟۔ اس پر غنی نے اپنے کپڑے پھاڑ لئے اور دیوانگی کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے، تین روز کے بعد ان کے انتقال کی خبر ملی۔

غنی کے نام کے ساتھ لفظ "ملا" سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر گوئی کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان کے استاد محسن فانی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور پیچیدہ مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے[۴]۔ غنی کو خود یہ احساس تھا کہ شاعری نے ان کے علم و فضل کو پس منظر میں ڈال دیا ہے :-

ز شعر من شدہ پوشیدہ فضل و دانش من چو میوہ ای کہ بماند بزیر برگ نہان[۵]

۱۔ دیوان غنی، ص ۱۳۱

۲۔ مرآۃ الخیال، ص ۱۷۲، ریو، ۲/ ۶۹۲۔ مرآۃ العالم (ورق ۸۰۰) میں ۱۰۷۷ھ درج ہے۔

۳۔ محمد طاہر نصر آبادی: تذکرہ نصر آبادی، تہران، ۱۳۱۷ (شمسی)، ص ۴۴۵۔

۴۔ مرآۃ الخیال، ص ۱۷۳۔

۵۔ دیوان غنی ص ۱۱۰۔

غنی کے اشعار اور ان کے حالات زندگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی قناعت اور روحانیت کا مثالی نمونہ تھی۔ وہ حقیقتاً اسم بامسمیٰ تھے۔ ڈاکٹر اقبال غنی کے بڑے مداح تھے انھوں نے یہ واقعہ لکھا ہے (جس کا تاریخی ثبوت راقم الحروف کو نہیں مل سکا) کہ غنی جب تک گھر میں رہتے تھے، دروازہ بند رکھتے تھے، اور جب گھر سے باہر جاتے تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتے تھے کسی نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا:۔

غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش ۔۔۔ متاع گرانی است در خانہ اش
چو آن محفل افروز در خانہ نیست ۔۔۔ تہی تر ازین ہیچ کاشانہ نیست[1]

غنی نے خود جگہ جگہ بے نیازی پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے کسی کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا اور نہ کسی امیر یا رئیس کی ندیمی سے اپنی زندگی خوشحال بنانے کی کوشش کی۔ وہ شمع کی طرح اپنی ہی محفل میں جلتے اور پگھلتے رہے، محفل غیر کی زینت نہیں بنے۔

سعی روزی بر نمی دارد مرا از جای خویش ۔۔۔ آبرو چون شمع می ریزم ولی در پای خویش[2]

دیوان دیوان غنی کے کئی ایک ایڈیشن مرتب کیے گئے۔ سب سے پہلی ترتیب خود غنی نے کی تھی اور صائب کو پیش کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ماہر اکبرآبادی نے ایک نثری مقدمہ کے ساتھ ان کا دیوان مرتب کیا[3]۔ اب عام طور پر دیوان غنی کا جو نسخہ ملتا ہے، وہ مسلم کا

---

[1] علامہ اقبال: پیام مشرق، لاہور، ۱۹۴۶ (پانچواں ایڈیشن)، ص ۱۶۰۔

[2] دیوان۔ ص ۸۸۔ دیوان میں یہ رباعی ہے جو اورنگزیب کی مدح میں بتائی جاتی ہے:۔

در عہد تو بسکہ بخت شد یار بہ خلق ۔۔۔ ہرگز نہ دہد سپہر آزار بہ خلق
در باغ جہان نہال جودی کہ ز فیض ۔۔۔ ہر روز دو بارہ بدہی بار بہ خلق

(دیوان مرتبہ داراب، حاشیہ ص ۲۳۶)

[3] کلمات الشعراء ص ۸۴، ریو (۶۹۲/۲) نے اس نسخہ کا ذکر کیا ہے اور انھیں کے تتبع میں ادانوف (فہرست ایشیاٹک الانمبر ۷۷۴) نے بھی۔ مگر ان مخطوطات میں جو مقدمہ ہے وہ بلفظہ مسلم کے مقدمہ سے ملتا ہے۔

مرتب کیا ہوا ہے۔ مسلم اپنے آپ کو غنی کا شاگرد بتاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ غنی کی حیات میں ان کے دیوان کی کوئی ترتیب نہیں ہوئی۔ نیز اس مجموعہ میں غنی کے تمام اشعار شامل ہیں اور یہ کہ غنی نظم و نثر کے یکساں ماہر تھے[۱]۔ غنی کی نثر کا صرف ایک نمونہ ملتا ہے۔ ایک بار غنی پر سرقہ کا الزام لگایا تھا، جس کی غنی نے تردید کی تھی، یہ نثر اسی سے متعلق ہے[۲]۔

مسلم کے مرتب کردہ دیوان میں غزلیں، قصیدے اور رباعیاں ہیں۔ آخر میں تواریخ اور ہجویات ہیں جن میں ایک مثنوی حجام کی شان میں ہے۔ غنی کے تاریخی قطعے اور بڑھاپے سے متعلق قصائد اسی حصہ میں ہیں۔ بعض نسخوں میں جاڑے سے متعلق ایک اور مثنوی ہے[۳]۔ بمبئی یونیورسٹی کی فہرست میں ایک مثنوی متعلق بہ جنگ اورنگزیب و دارا، غنی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن یہ مثنوی کسی یوسف کی ہے[۴]۔ غنی نے کل کتنے شعر کہے، اس کا اندازہ مشکل ہے۔ موجودہ دیوان میں تقریباً انیس سو اشعار ملتے ہیں۔ حسینی کا بیان ہے کہ غنی نے ایک لاکھ شعر کہے تھے جن میں سے دو ہزار کا انتخاب کیا تھا[۵]۔

---

[۱] دیوان غنی، دیباچہ ص ۴۔ مسلم نے اپنے ایک اور ہمکار ملک شہید کا ذکر کیا ہے۔ مگر کسی تذکرہ میں اس شخص کا حال نہیں ملتا۔ بعض نسخوں میں اس کا نام نہیں ہے۔

[۲] ریو، ۲/۶۹۲۔

[۳] دیوان غنی، مرتبہ داراب، ص ۲۴۶۔

[۴] عبدالقادر سرفراز: فہرست مخطوطات بمبئی یونیورسٹی لائبریری (انگریزی)، بمبئی، ۱۹۳۵، ص ۲۰۸، دیوان غنی مرتبہ داراب، دیباچہ، ص ۲۰۔

[۵] تذکرۂ حسینی، ص ۲۲۸، والہ داغستانی: ریاض الشعرا (مخطوطہ علی گڑھ) ورق ۲۸۳، مخزن الغرائب (مخطوطہ علی گڑھ) ورق ۲۹۵۔

٭ ٭ ٭

غنی کا شمار ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں ہوتا ہے۔ کشمیر کے شاعروں میں محسن فانی کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ ان کی شاعرانہ حیثیت ان کی حیات میں مسلم ہو چکی تھی۔ صائب ان کے ایک شعر پر اپنا سارا دیوان دینے کو تیار تھے، ہندوستان سے اگر کوئی ایران پہونچتا تو صائب دریافت کرتے کیا وہ شعر غنی کا کوئی تحفہ لایا ہے[1]۔ صائب کے ہم عصر طاہر وحید غنی کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے[2]۔ فطرت موسوی ان کا شمار ہندوستان کے تین بہترین شاعروں میں کرتے تھے[3]۔ بیدل کو بھی ان کا طرز بہت مرغوب تھا[4]۔ لیکن غنی کی خدمت میں سب سے قابل قدر نذرانۂ عقیدت علامہ اقبال نے پیش کیا۔ پیر رومی کے ساتھ عالم بالا کی سیر کرتے ہوئے اقبال غنی سے ملتے ہیں اور ان الفاظ میں ان کا تعارف کرتے ہیں:۔

شاعر رنگین نوا، طاہر غنی	فقر او باطن غنی، ظاہر غنی
مرشد آن کشور مینو نظیر	میر و درویش و سلاطین را وزیر
آفرید آن مرد ایران صغیر	با ہنرہای عجیب و دلپذیر

غنی علامہ کو یہ پیغام دیتے ہیں:۔

زندگی جولان میان کوہ و دشت	ای خنک موجی کہ از ساحل گذشت
تازہ آشوبی فگن اندر بہشت	یک نوا مستانہ زن اندر بہشت[5]

شاعری کے بارے میں غنی کے نظریات واضح طور پر ان کی غزلوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً

---

[1] دیوان (ضمیمہ)۔

[2] مجمع النفائس (مخطوطہ بانکی پور نمبر ۷۰۲۳) ورق ۳۴۵۔

[3] کلمات الشعرا، ص ۹۹۔

[4] دیوان (ضمیمہ)

[5] علامہ اقبال: جاوید نامہ، لاہور، ۱۹۴۷ (دوسرا ایڈیشن) ص ۱۹۳۔

وہ سرقہ اور تکرار کے سخت خلاف ہیں۔ وہ بامعنی تنقید اور اعتراض کو پسند کرتے ہیں، مگر خواہ مخواہ کی کج بحثی سے انھیں چڑ ہے۔ سچی تنقید سے شاعری میں وہی چمک دمک آتی ہے جو ہیرے کو تراشنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہر بڑے شاعر کے یہاں اچھے اور برے دونوں طرح کے شعر ملتے ہیں۔ "ید بیضا" میں بھی پانچوں انگلیاں برابر نہیں تھیں۔ ہر شاعر کا فرض ہے کہ اساتذہ فن کے سامنے زانوی تلمذ تہہ کرے۔[۱]

غنی کی شاعری رد و قبول اور تکمیل و تحسین کی منزلیں بتدریج طے کرتے ہوئے، اس مقام پر پہونچی کہ شاعر کو ہر طرف سے تحسین و آفریں ملنے لگی۔ ہند اور بیرون ہند میں لوگ ان کے اشعار کے منتظر رہتے تھے اور انھیں جی جان سے عزیز رکھتے تھے۔ مگر غنی جب شہرت کے بلند بام پر پہونچے تو ان کی زندگی کا سورج ڈھل چکا تھا۔ انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا کہ لوگ ان کی شاعری کے دیوانہ ہیں مگر ان کی ذات کی کسی کو فکر نہیں:۔

یاران برند شعر مارا　　　افسوس کہ نام ما نبردند[۲]

ان کی شاعری کی بدولت دوسرے لوگ عزت اور شہرت حاصل کرتے اور غنی خود گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے، اپنے بڑھاپے اور تنہائی کا ماتم کرتے۔ ندیمی اور مدح نگاری غنی کے مزاج کے خلاف تھی ورنہ ممکن ہے وہ بھی کچھ دنیاوی آرام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے انھیں یہ تسلی تھی

غنی چرا صلۂ شعر از کسی گیرد؟　　　ہمین بس است کہ شعرش گرفتہ عالم را[۳]

---

[۱] بحث کج در طبع شاعر ی خلافی دخل راست　　　طاقت خار است ماہی را و تاب شست نیست　　(دیوان ص ۳۷)

چون نگیسی کہ بہ کندن شود از رگ خالی　　　کم مباد از عیب مرا سرزنش یاران پاک　　(ایضاً ص ۹۱)

شعر اگر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست　　　در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست　　(ایضاً ص ۳۷)

بہر خدمت پیش ارباب سخن آمادہ باش　　　نقش خود را چون قلم بنشان و خود استادہ باش　　(ایضاً ص ۸۷)

[۲] ایضاً، ص ۷۹　　　[۳] ایضاً ص ۲۲

ان کے خیال میں شاعری کا مرتبہ بہت بلند تھا، شاعر تو قطرہ کو موتی بناتا ہے پھر وہ چاندی کے پھولوں کے لئے ان موتیوں کو کیوں لٹاتا ہے

آب بود معنی روشن غنی — خوب اگر بستہ شود، گوہر است[1]

غنی بنیادی طور پر غزل گو تھے. ان کی غزلوں میں اس دور کے مزاج کے مطابق اخلاق تصوف، فقر اور ماورائی مضامین کی فراوانی ہے. خالص رومانی اور خمریہ خیالات غنی کے خلاف تھے مگر جہاں کہیں انھوں نے ان خیالات کا سہارا لیا ہے، ان کی شاعری میں ایک نئی آب آگئی ہے:۔

آن چشم مست بادہ کشی را چو عام کرد — نرگس زری کہ داشت، ہمہ صرف جام کرد

باد صبا بہ گلشن حسن تو رہ نیافت — آن غنچہ دہن بہ نسیم سخن شگفت[2]

ان دو شعروں میں کشمیر کا لہلہاتا حسن ملاحظہ فرمائیے:۔

پیرہن گل، تن گل، عارض گل، لب دلدار گل — باغبان صنع بستہ دستۂ این چار گل

پیکر ساقی سراپا گوئی از گل ساختند — دست گل، پا گل، بدن گل، چہرہ گل، رخسار گل[3]

غنی کی محدود رومانی شاعری میں اگر ایک طرف ان کے جذباتی خلا کی گونج ہے تو دوسری طرف بے اختیاری اور اضطراب کے عجیب نمونے ملتے ہیں. میرے خیال میں ان کے "کھل کھیلنے" کا شوق ان کی بے پناہ تنہائی کی آواز بازگشت ہے:۔

شوم عریان تن و در جامہ از شادی نمی گنجم — اگر یک شب دہد آن ماہ پیکر تن در آغوشم

بی محابا می نہد لب بر لب می نوشش او — گر بہ دست ما بیفتد، خون ساغر می خورم

تا کی آن نازک بدن را تنگ در بر می کشد؟ — روز محشر دست ما و دامن پیراہنش[4]

---

[1] ایضاً ص ۳۴.

[2] ایضاً ص ۴۷، ۵۷

[3] ایضاً ص ۹۲

[4] ایضاً ص ۹۵، ۹۷، ۸۹ .

تلمیح غزل کا بنیادی عنصر ہے لیکن غزل کا حسن تلمیح کے خوبصورت استعمال میں ہے۔ فارسی غزل میں غالباً یوسف کے قصہ کو سب سے زیادہ تہہ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں غنی کا یہ شعر قابل توجہ ہے :۔

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن ‌‌ ‌ ‌ که نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را[۱]

اسی طرح ان کے بعض اشعار میں ایہام و تمثیل کا تعجب خیز استعمال ہے :۔

دیدہ چون آن دو لب شیرین دید ‌ ‌ ‌ معنی قند مکرر فہمید[۲]

کشمیر کے شعرا میں غنی کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے دیوان کے جتنے قلمی اور مطبوعہ نسخے ملتے ہیں، اس سے ان کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ ان کی شاعری کسی دور میں بھی اپنے عظیم لمحات کی بدولت تابندہ و پائندہ رہے گی :۔

خوشا عہدی کہ مردم آدم بی سایہ را دیدند ‌ ‌ ‌ غریب است این زمان گر سایۂ آدم شود پیدا[۳]

غنی تا چند پرسی دستگاہ اہل دنیا را ‌ ‌ ‌ کہ باشد وسعت آن از حصار جام جم پیدا[۴]

---

[۱] ایضاً ص ۷۔

[۲] ایضاً ص ۴۴۔

[۳] ایضاً ص ۱۶۔

[۴] ایضاً ص ۱۴۔

ماہر اکبر آبادی

مرزا محمد علی ماہر اکبر آبادی عہد شاہجہاں کے شاعر تھے، لیکن چونکہ انھوں نے اس دور کے اکیس سال دیکھے اور اورنگزیب کی مدح میں گل اورنگ تصنیف کی، اس لئے ان کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے. ماہر نسلاً ہندو تھے. ان کے والد مرزا محمد زماں کی سرکار میں ملازم تھے، مرزا نے ماہر کو گود لے لیا تھا اور انھیں کے ایما پر ماہر نے اسلام قبول کیا. مرزا محمد زماں کی وفات (۱۰۵۱/۴۲-۱۶۴۱) پر ماہر نے جو تاریخی قطعہ کہا ہے، اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے :

خواجہ محمد زمان خواجۂ نیکو صفات	آن کہ لقب چل بکش بود بر خاص و عام
کرد معزز مرا چون بہ پسر خواندگی	آن سبب عزتم گشت میان انام
داشت دو صلبی پسر لیک محبت نداشت	ذقف منش کردہ بود، مہر و محبت تمام
سال وفاتش طلب کرد خرد از سروش	گفت "محمد زمان خلد گزیدہ مقام"[۱]

۱۰۵۱ ھ

مرآۃ الخیال[۲] محمد زمان کے بجائے جعفر معمائی کو ماہر کا سرپرست بتاتا ہے. روز روشن[۳] کے مؤلف کا خیال ہے کہ ماہر جعفر معمائی کے ساتھ ایران گئے، اور وہاں ملا شفیعا (دانشمند خاں) کی صحبت سے استفادہ کیا اور علی مردان خان کے ساتھ ہندوستان لوٹے.

اپنے مربی کے انتقال کے بعد ماہر دارا شکوہ کی خدمت میں ملازم ہو گئے اور دارا کی شکست تک اسی سے متعلق رہے. انھیں مرید خاں کا خطاب عطا ہوا.[۴] اسی دوران میں ماہر نے جہاں آرا کی

---

[۱] خزانۂ عامرہ ص ۴۱۴

[۲] مرآۃ الخیال ص ۲۱۹؛ شاہنواز خاں خوافی نے بہارستان سخن (مخطوطہ) ورق ۲۱۷ میں دونوں کو ماہر کا سرپرست بتایا ہے.

[۳] محمد مظفر حسین صبا : روز روشن، بھوپال، ۱۲۹۷ ھ، ص ۶۰۰

[۴] سرو آزاد، ص ۱۱۴، روز روشن، ص ۶۰۰

نشان میں ایک مثنوی لکھی اور عنایت خاں آشنا (م۔ ۱۰۸۱/ ۷۱-۱۶۷۰) کی والدہ کے ذریعہ پیش کی۔ جہاں آرا کو مندرجہ ذیل شعر بہت پسند آیا، اور اس نے ماہر کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔

به ذات او صفات کردگار است　　که خود پنہان و فیضش آشکار است[1]

اورنگزیب کی تخت نشینی کے بعد ماہر دانشمند خاں سے وابستہ ہو گئے۔ انھیں کے ایما پر انھوں نے اورنگزیب کی مدح میں گل اورنگ تصنیف کی اور شہنشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا[2]۔ چنانچہ ماہر نے گوشہ گیری اختیار کر لی۔ ان کے احباب اکثر انھیں ملازمت کے لیے اکساتے تھے لیکن ماہر یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ایک بار درویش بننے کے بعد دنیا میں پھنسنا مناسب نہیں ہے[3]۔ اسی گوشہ گیری اور قناعت کی حالت میں ماہر نے ۱۰۸۹/ ۱۶۷۸ میں وفات پائی۔ سرخوش نے یہ تاریخ کہی :-

"آہ آہ! ماہر ما فوت شد"[4]
۱۰۸۹ھ

سترہویں صدی کے وسطی دور میں ماہر ہندوستان کے بڑے شعرا کی صف میں گنے جاتے تھے ان کے شاگردوں میں سرخوش جیسے شاعر اور نقاد شامل ہیں[5]۔ ماہر خود شاعری میں ملا خیالی اور آغا محمد صادق کے شاگرد تھے[6]۔

---

[1] ایضاً ص ۱۱۲۔ تعجب ہے کہ نعمت خاں عالی نے شہزادی زیب النسا کی تعریف میں جو مختصر قطعہ لکھا ہے، اس میں بھی یہی شعر ہے۔ مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ ماہر نے زیب النسا کی تعریف میں نو سو اشعار کی ایک مثنوی کہی تھی (معارف ج ۴۹، نمبر ۵، ص ۳۵۶)

[2] مرآۃ الخیال ص ۲۲۰۔

[3] کلمات الشعرا ص ۱۰۲ (حاشیہ)

[4] ایضاً ص ۱۰۵۔

[5] ایضاً ص ۱۰۴۔

[6] ایضاً ص ۲۹، محمد قدرت اللہ گوپاموی : نتائج الافکار، بمبئی، ۱۳۳۶ (شمسی)، ص ۵۹۱۔

افسوس کہ ماہر کی تصانیف ناپید ہیں۔ انھوں نے ایک ضخیم دیوان مرتب کیا تھا، اور چند مثنویاں لکھی تھیں۔ جن میں سے ایک خاقانی کی تحفۃ العراقین کے جواب میں جامع نشأتین کے عنوان سے تھی۔[۱] اس کے علاوہ ماہر نے غنی کشمیری کا دیوان بھی مرتب کیا تھا اور اس پر ایک نثری مقدمہ لکھا تھا۔[۲]

سرخوش کے بیان کے مطابق ماہر کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ سعد اللہ خاں، ہمت خاں اور دانشمند خان وغیرہ کی مدح میں قصیدے تھے۔[۳]

ماہر کے دیوان کی غیر موجودگی میں ان کی شاعری پر تنقید ممکن نہیں۔ البتہ مختلف تذکروں میں ان کے جو اشعار ملتے ہیں، ان سے ان کی شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ماہر کی شاعری میں ایک خاص روانی اور آمد ہے۔ ایہام تمثیل اور دیگر صنائع کا کم سے کم استعمال ہے۔ خیالات کی وضاحت اور زبان کی پاکیزگی سے ان کے شعروں میں ایک خاص گھلاوٹ ہے۔ سرخوش کا بیان ہے کہ ماہر بڑے غور و فکر کے بعد شعر کہتے تھے اور بعض بعض مرتبہ دوسرا مصرع لگانے میں انھیں چھ چھ مہینے لگ جاتے تھے۔[۴] چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

من از بیتابی پروانۂ فانوس می سوزم — کہ در پیراہن یار است و گرم جستجو باشد[۵]

دریا ز حد خویش برون پا نمی نہد — نادان کند قیاس کہ در بند ساحل است

چہ باک گر گزرد جان ز آشنایی تن؟ — میان ما و تو بیگانگی، خدا نکند![۶]

---

[۱] کلمات الشعرا ص ۱۰۳-۱۰۲، ید بیضا (علی گڈھ) ص ۲۷۵۔

[۲] ایضاً ص ۸۴۔

[۳] ایضاً ص ۱۰۲ [۴] ایضاً

[۵] نواب صدیق حسن خاں: شمع انجمن، بھوپال، ص ۴۲۳

[۶] خزانہ عامرہ، ص ۴۱۷، ۱۹۰۰ء

گل اورنگ

گل اورنگ، ماہر کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ درحقیقت یہ مخلوط نظم و نثر میں اورنگزیب کی مدح ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ماہر داراشکوہ سے متعلق تھے اس لئے اورنگزیب کی تخت نشینی کے بعد اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اور چونکہ ماہر کو یہ معلوم تھا کہ اورنگزیب کا رجحان نظم کے بجائے نثر کی طرف زیادہ ہے اس لیے انھوں نے نظم و نثر کا ایک حسین آمیزہ پیش کیا۔ "گل اورنگ" مرصع نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اور اس دور کے انداز کے مطابق اس میں جگہ جگہ اشعار کی پیوند کاری ہے۔ شروع میں خدا کی حمد ہے:-

"فرخندگی کلام رنگین از حمد مالک الملکی است کہ اجرای احکامش بہ زینت معدلت جہان پناہان اولی الامر پرداختہ و خجستگی سخن دلنشین از ثنای کریمی است کہ سلطنت بخشش جلوس بادشاہان عالمگیر را زیب اورنگ دولت خداداد ساختہ۔ صانعی کہ شمع فیض ریختہ قدرت اوست و طرح شبستان عالم انگیختہ حکمت او....

زہی قادر، زہی خلاق عالم	کزو موجود شد آدم بہ یک دم
فضای عالم صنعش جہان است	کہ یک گلشن زمین تا آسمان است
برون آوردہ از فیض معانی	ز کاریز قلم بحر معانی
می توحید در جام خموشی است	انا الحق گفتن اینجا خود فروشی است[1]

حمد کے بعد نعت ہے، نعت میں یہ شعر ملاحظہ ہو

از رسل آخر آمد آن کامل	عطر بعد از گلاب شد حاصل[2]

ماہر نے سارا زور قلم اورنگزیب کی مدح میں صرف کیا ہے، انھوں نے اورنگزیب کے عدل، تقویٰ، علمیت، خطاطی، تیر اندازی، شکار، مہارت جنگ اور جنگی ہاتھی کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] گل اورنگ (مشمولہ مجمع الافکار) بانکی پور نمبر ۸۶۰، ورق ۱۵۱۔

[2] ایضاً ورق ۱۵۳۔

اس کی مذہبیت کے سلسلہ میں یہ جملہ ملاحظہ ہو:-

"اگر عرفی در عہدش می بود، تخلص خود شرعی می نمود"[1]

ان اشعار پر مدح ختم ہوتی ہے:-

ترا از راہ دین دولت خدا داد | خدا داد است این دولت خداداد

سزد گر عالمت تسخیر باشد | کہ عالمگیر عالمگیر باشد

جہان از ذکر خیرت باد ذاکر | یکی از مدح گویان بود ماہر[2]

خاتمہ میں اس مضمون کا عنوان ہے:-

بحمد اللہ کہ این سرمایۂ فکر | ز نظم و نثر ماہر یافت اتمام

چو زیبش مدح شاہ اورنگزیب است | "گل اورنگ" شد این نسخہ کا نام[3]

---

[1] ایضاً ورق ۱۵۴۔

[2] ایضاً ورق ۱۵۸۔

[3] ایضاً

بینش کشمیری

بینش کشمیری اس عہد میں کشمیر کے دوسرے اہم شاعر ہیں۔ ان کے آبا و اجداد ایران سے آکر کشمیر میں آباد ہو گئے تھے۔ بینش یہیں پیدا ہوئے[1] بعض تذکروں نے بینش کشمیری اور جعفر بیگ بینش کو خلط ملط کر دیا ہے[2]۔ مؤخر الذکر سلطان حسین صفوی (۱۶۹۴-۱۷۲۲ء) کا معاصر تھا۔ اس نے کئی ایک مثنویاں لکھی ہیں جن میں مکافات نامہ اور دل و دلبر کا ذکر ملتا ہے[3]۔

بینش کشمیری کا نام اسمٰعیل تھا[4]۔ انھوں نے شاہجہاں کا دور بھی دیکھا تھا[5]۔ وہ لاہور اور پنجاب میں رہے اور دہلی کا سفر کیا[6]۔ البتہ اپنی مثنویوں میں ایران کے بعض شہروں کا انھوں نے جو ذکر کیا ہے وہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ کیونکہ یہ بہر حال محقق ہے کہ . . کسی تذکرہ سے ان کا ایران جانا نہیں ثابت ہوتا۔ بینش صف شکن خان (م۔ ۱۰۸۵ / ۷۵-۱۶۷۴) سے متعلق تھے اور ان کی مدح میں انھوں نے بعض قصیدے لکھے ہیں۔ کشمیر کے دیوان مرزا محمد قاسم کرمانی اور میر جمشید کاشانی کی بھی انھوں نے مدح کی ہے[7]۔ ان کی تاریخ

---

[1] بانکی پور ۳/ص ۱۴۵

[2] نتائج الافکار ص ۱۰۹، سید حسن علی خاں: صبح گلشن، بھوپال، ۱۲۹۵ ھ، ص ۷۵۔

[3] ریاض الشعرا (علی گڈھ) ورق ۶۶، ابراہیم خاں خلیل: صحف ابراہیم (بانکی پور نمبر ۲۲۸) ورق ۱۳۴

[4] صحف ابراہیم، ورق ۱۳۴۔

[5] نشتر عشق (بانکی پور نمبر ۲۴۱) ص ۲۸۵

[6] لطف علی خاں آذر: آتشکدہ، بمبئی، ۱۲۹۹ ھ، ص ۳۶۵، مخزن الغرائب (علی گڈھ) ورق ۵۸

[7] ریو ۲/۶۹۵۔

وفات کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے گیارہویں صدی ہجری کے اختتام میں کشمیر میں وفات پائی[1]۔ سرخوش کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمات الشعرا کی تالیف کے وقت (۱۰۹۳/۸۲-۱۶۸۱) بینش وفات پا چکے تھے[2]۔

بینش البصار بینش نے چھ مثنویاں بینش البصار، گنج رواں، گلدستہ، شور خیال اور رشتۂ گوہر یادگار چھوڑیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ایک دیوان مرتب کیا جس میں غزلیات کے علاوہ چند قصائد بھی ہیں۔ ان میں سے پہلی مثنوی بینش البصار نظامی کی مخزن اسرار کے انداز اور بحر میں ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم — گلبن برجستۂ باغ قدیم[3]

کم و بیش بینش کی ہر مثنوی میں اورنگ زیب کی پرجوش مدح، شاعری کی تعریف و توصیف اور ہندوستان یا ایران کے کسی شہر اور کشمیر کا بیان ہے۔ بینش البصار میں شاعر شہنشاہ وقت اورنگزیب کی خدمت میں اس طرح عقیدت پیش کرتا ہے:

شد قلم طرح کش بوستان — از گل مدح شہ ہندوستان

آن کہ لقب از لب اہل یقین — یافت ظل اللہ و محیی دین

نیست بجز ذکر خدا حاصلش — دانۂ تسبیح بود در گلش

گنج احادیث دل پاک اوست — صدق خبر گوہر ادراک اوست[4]

بینش البصار میں دہلی، وہاں کے صوفیا، لوگ اور دریائے جمنا کا بڑا دلکش بیان ملتا ہے۔

---

[1] نتائج الافکار ص ۱۰۹، فہرست بوڈلین نمبر ۱۲۰۹؛ ید بیضا (علی گڈھ) ص ۵۴۔

[2] کلمات الشعرا، ص ۱۰۔

[3] ریو ۲/۶۹۵۔ مجموعہ مثنویات بینش میں (سالار جنگ نمبر ۱۰۹۴) جس سے یہاں اقتباسات دیئے گئے ہیں، یہ آغاز ہے:

نالہ فروشی ز دل پر ز جوش — از سر شب تا بہ سحر داشت جوش

[4] مجموعہ مثنویات بینش ورق ۱۲۔

شہر بہ خوبی بہ ہمہ شہرہا است — شہر بہ رنگینیٔ دہلی کجا است؟
او ست ز ارباب صفا بی بدل — ہمچو صدف مشت گہرہا در بغل
لالہ رخانش ہمہ خوش خط و خال — ہوش ربا چون شفق برشگال[1]

لیکن دہلی کے لالہ رُخ ہی نہیں وہاں کے اولیا بھی دل کھینچتے ہیں اور ان اولیاء اللہ کے سرتاج شیخ نظام الدین ہیں جنھوں نے امیر خسرو کو خسروی عطا کی تھی :-

دہلی اگر ہست صفا دستگاہ — ہست نظر کردۂ لطف الٰہ
شیخ نظام است کہ او را است نام — سلسلۂ ہر دو جہان را نظام
خسرو از و شد سخن دل قوی — یافت از و مرتبۂ خسروی[2]

اسی دہلی میں جمنا ندی بھی ہے جس کی آغوش میں ہزاروں عقیدت مند صبح پناہ لیتے ہیں اور جس کی نیلی مسکراہٹ آکاش گنگا کا دل موہ لیتی ہے۔

جمنای دریا دل سیلاب زور — از می قہر آمدہ مست غرور
موجۂ او را چو تماشا کند — کاہکشان چین ز جبین وا کند[3]

کشمیر کے دوسرے شعرا کی طرح بینش کو بھی کشمیر سے والہانہ تعلق ہے۔ ان کی کوئی مثنوی کشمیر کے ذکر سے خالی نہیں۔ بینش ابصار میں فرماتے ہیں :-

شوق مرا بلبل تقریر کرد — مدح سرای گل کشمیر کرد
رنگ گلشن ریختہ طرح فرنگ — سبزہ بہ مژگان فرنگی بہ جنگ[4]

---

[1] ایضاً ورق ۳۱

[2] ایضاً ورق ۳۲

[3] ایضاً

[4] ایضاً

بینش ابصار کا کوئی خاص مرکزی موضوع نہیں ہے۔ یہ ایک عام اخلاقی نظم ہے جس میں صبر سخاوت، فقر اور قناعت وغیرہ کی تلقین کی گئی ہے اور کینہ، حسد، دشمنی وغیرہ سے بچنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

گنج روان بینش کی دوسری مثنوی گنج رواں ہے[1]۔ اس مثنوی میں اورنگزیب کی مدح بعد شاعر نے اپنے مربی مرزا محمد قاسم کرمانی اور میر جمشید کاشانی کی تعریف میں اشعار کہے ہیں[2]۔ اور ایران کے تین شہر کرمان، تبریز اور کاشان کا بیان کیا ہے۔ گنج روان کا موضوع حسن فطرت ہے۔ مثنوی چار حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ میں ایک موسم کا بیان ہے۔ اس طرح شاعر نے بہار خزاں، سردی اور گرمی کی منظر کشی کرتے ہوئے ساقی نامہ پر مثنوی کا اختتام کیا ہے۔

گلدستہ تیسری مثنوی گلدستہ تخلیق کائنات کے موضوع پر ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے بڑی فنکاری سے مختلف مظاہر قدرت چاند، سورج، زمین وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مادی اور روحانی افادیت کو ابھارا ہے۔ مظاہر قدرت کے بیان کے ساتھ ساتھ حسن، عشق دماغ، دل اور روح کا ذکر بھی اسی دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ گلدستہ میں پنجاب اور لاہور کی تعریف ہے۔ خیال ہے کہ بینش دہلی آتے ہوئے لاہور میں قیام پذیر رہے ہوں گے۔ لاہور کی قدامت اور جدت نے ہمارے شاعر کو بہت متاثر کیا ہے، وہ کہتا ہے:-

لاہور جہان جاودان است — پر کہن است و نوجوان است
آراستہ آن قدر کہ شاید — پیراستہ آن چنان کہ باید
مشہور بہ خوبی است لاہور — ہر چشم بدی چو عیب ازو دور[3]

---

[1] ایضاً ورق ۱۰۹

بود نام این نسخہ گنج روان — کہ چون آسمان است صاحب نشان

[2] ایضاً ورق ۹۱-۹۸

[3] ایضاً ورق ۶۶

لاہور کی دلکشی اور دل نوازی سارے پنجاب میں پائی جاتی ہے. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے بعد بینش کو پنجاب کی سرزمین سب سے زیادہ پسند تھی. وہ پنجاب کو ہندوستان کی جان اور دنیا کا تاجدار کہتے ہیں.

بازدی سپہر را دہد تاب	از پنجۂ حسن خویش پنجاب
پنجاب بود رئیس عالم	دیہی است جہان داو مقدم
پنجاب سراست و تن بود ہند	جان پنجاب و بدن بود ہند[1]

آخر میں ان الفاظ میں شاعر نے اپنی مثنوی کی تعریف کی ہے :-

بر دفتر چشم آفرینش ..	کردی تو رقم سواد بینش
ہر نامہ کہ ناتمام باشد	از نام تواش نظام باشد
گلدستۂ گی است از بہارت	ختم است بہ نام نامدارت[2]

شور خیال بینش کی چوتھی مثنوی شور خیال بنارس کی ایک عشقیہ داستان پر مشتمل ہے. اس مثنوی میں بینش نے شہر بنارس کی بڑی حسین تصویر پیش کی ہے. بنارس تقدس اور پاکیزگی کا مرکز بھی ہے اور حسن و عشق کا مخزن بھی. صبح بنارس کی رومانیت ہمیشہ سے اردو اور فارسی شعرا کے لئے محبوب موضوع رہی ہے. یہاں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

بنارس را عجب آب و ہوایی است	برای عشق بازی طرفہ جایی است
برہمن زادگان فتنہ آئین	چو گل دارند در بر جامہ پرچین
بتانش از سنگ نیکو سرشتند	کہ موج سبزۂ باغ بہشت اند
شد آن روزی کہ ہندوستان گلستان	ز سبزان شد بنارس سنبلستان[3]

---

[1] مجموعۂ مثنویات بینش ورق ۶۴.

[2] ایضاً ورق ۷۳

[3] ایضاً ورق ۹۲ . ۱۴۱ .

داستان کا ماحصل یہ ہے کہ ایک مسلمان نوجوان ایک ہندو دوشیزہ پر عاشق ہوگیا۔ لڑکی حسن و جمال میں یکتا اور نزاکت اور شوخی کی تصویر تھی ،

پری رو دختری پروردهٔ ناز | به عاشق همچو فیض صبح دمساز
سیه چشمی چو خال روی مردم | سخن گویی چو چشم خوش تبسم
لطیف و شوخ و بی پروا چو سیماب | نمکزار ملاحت همچو مهتاب[1]

لڑکی روزانہ اشنان کرنے گنگا پر آتی اور اشنان کر کے اپنی پیشانی پر صندل کا تلک لگاتی :-

ز گلبرگ جبین صندل آلود | گل رعنای باغ عاشقان بود
جبین آن بت نیکو شمائل | چو ماه نو به زردی بود مائل[2]

رفتہ رفتہ عشق کی چنگاری لڑکی کے دل میں بھی بھڑکی اور وہ اشنان کے بہانے اپنے عاشق سے ملنے لگی۔ دونوں گنگا میں اشنان کرتے اور دیر تک پیار و محبت کی باتیں کرتے۔ مگر ان کی مسرت کا زمانہ بہت ہی مختصر تھا، ایک دن اشنان کرتے ہوئے، اچانک عاشق و معشوق ایک بھنور کی لپیٹ میں آگئے اور دریا میں غرق ہو گئے۔ جب ان کی لاش نکالی گئی اور لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ لڑکی ہندو ہے تو انھوں نے ہندو رسم و رواج کے مطابق اسے جلانا چاہا، لیکن لڑکے کے بعض حامیوں نے یہ کہا کہ چونکہ اس کی موت عاشق کی آغوش میں ہوئی ہے، اس لئے مسلم دستور کے مطابق اسے دفن کرنا چاہیے :-

چو از دریای عشق فتنه پرداز | برون آمد سر این گوهر راز
برهمن زادگان خوب رخسار | ازین حیرت چو بت رفتند از کار
مسلمانان ازین اندیشه مدهوش | به رنگ کعبه زین ماتم سیه پوش

---

[1] ایضاً ورق ۱۴۲۔

[2] ایضاً ورق ۱۴۲۔

زہر سو مصلحت بینان رسیدند	فسون مصلحت بر ہم دمیدند
درآخر رای سنج کفر و اسلام	بدینسان مصلحت را داد انجام
کہ چو آن کافر مائل بہ ایمان	بہ راہ یار خود بگذشت از جان
بہ طبعش رسم دلدار است مرغوب	کہ طالب را بود آئین مطلوب [۱]

ابھی لوگ یہ بیکار کج بحثی کر رہے تھے، کہ زمین شق ہوئی اور عاشق و معشوق اس میں سما گئے:۔

زمین از اشتیاق آن دو مدہوش	چو چشم منتظر بگشاد آغوش
درو کردند جا از بی پناہی	چو در دیدہ سفیدی با سیاہی [۲]

داستان کے اختتام کے بعد مثنوی میں کشمیر کے موسم، وہاں کے پہاڑ اور صفاپور جھیل کا بیان ہے۔

شور خیال بینش کی تمام مثنویوں میں اپنی رومانی لطافت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سچا واقعہ تھا اور اس دور میں اس کی خاصی شہرت ہوئی تھی کیونکہ اس دور کے ایک اور اہم شاعر فطرت موسوی نے بھی یہی واقعہ نظم کیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

رشتۂ گوہر بینش کی پانچویں مثنوی رشتۂ گوہر ہے۔ اس مثنوی کا کوئی خاص مرکزی موضوع نہیں ہے بلکہ مختلف چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے ذریعہ شاعر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثنوی میں مازندران کی راجدھانی ساری کی ایک عشقیہ داستان بھی ہے اور مازندران کی تعریف میں اشعار ہیں [۳]۔ ایک اور چھوٹی حکایت یہ ہے کہ ایک سانپ کو ایک گدھ شکار

---

[۱] ایضاً ورق ۱۴۶۔

[۲] ایضاً ورق ۱۴۶۔

[۳] ایضاً ورق ۱۹۱۔

کر کے لے جارہا تھا، دفعتہً سانپ اس سے چھوٹ کر زمین پر آرہا۔ نیم مردہ سانپ نے وہاں بیٹھی ہوئی ایک عورت کو کاٹ کھایا اور وہ بیچاری مرگئی۔ بینش کہتے ہیں۔ قضا کے تیر سے بچنا آسان نہیں :-

اژدہای است ہر خدنگ قضا | نتوان برد جان زچنگ قضا [1]

رشتۂ گوہر کے خاتمہ میں شاعر کہتا ہے کہ یہ اس کے خمسہ کی آخری کڑی ہے :-

رشتۂ گوہر کلام نظام | کہ بہ نام تو خمسہ کرد تمام
یارب این خمسہ بی قرین باشد | تا سخن ہست این چنین باشد [2]

جواہر خانہ خمسہ کی تکمیل کے بعد بینش نے ایک مثنوی جواہر خانہ کے نام سے لکھی :-

نام این نامہ جواہر خانہ است | حمد و نعتش گوہر یکدانہ است [3]

اس مثنوی میں بھی اورنگزیب اور مرزا محمد تقی بیگ کی مدح ہے اور بغداد اور تبریز کی توصیف میں اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا انداز اور موضوع پہلی مثنویوں سے کوئی خاص مختلف نہیں۔

بینش کی مثنویوں کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارا شاعر بنیادی طور پر مذہبی تھا۔ اس کی ہر مثنوی کا معتد بہ حصہ، حمد اور نعت کے علاوہ قرآن شریف کی تکریم و توصیف اور شب معراج کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس کے علاوہ ہر مثنوی میں بینش نے شاعری سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ تقریباً ہر مثنوی میں اورنگزیب اور کشمیر کی پرجوش مدح ہے۔ اور بنیادی اخلاقی اقدار کا بیان ہے۔

دیوان ان مثنویات کے علاوہ بینش نے ایک دیوان بھی مرتب کیا جس میں بیشتر غزلیں اور چند

---

[1] ایضاً ورق ۱۹۹

[2] ایضاً ورق ۲۰۴

[3] ایضاً ورق ۲۰۵

قصیدے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بینش کا اصل کمال مثنوی میں ہے، غزل میں نہیں، پھر بھی ان کی غزلوں میں ایک خاص بات ہے جو ہماری توجہ منعطف کرتی ہے۔ سرخوش[1] کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ مجھے دیوان بینش میں صرف یہ دو شعر اچھے ملے :-

هر پارهٔ دلم چمنی از نگاه او است — آئینه چون شکسته شد، آئینه خانه شد

در راه وصال تو زبس چشم براهم — چون جاده بوده خاک نشین هر نگاهم

غالباً اسی تتبع میں سفینۂ بیخبر میں بھی یہ جملہ ہے "یابس بسیار وارد"[2]

بینش کی غزلوں میں ایک خاص سادگی اور شیرینی ہے، صنائع و بدائع کا کم سے کم استعمال ہے اور بے ساختگی اور آمد کی عجیب کیفیت ہے۔ ایک غزل ملاحظہ فرمائیے :-

رهروی کو که برد جانب میخانه مرا — دستگیری کند از گردش پیمانه مرا

نسخهٔ شورشی از ابر بهاری دارم — زینت ناله بود گریهٔ مستانه مرا

دست را هیچ کسی بر دل من نگذارد — سنگ بر شیشه زند عاقل و دیوانه مرا

از تعلق چو نسیم سحری آزادم — بوی گل ساخته شوق رخ جانانه مرا

هست تا شمع رخت انجمن آرای نظر — پردهٔ دیده بود از پر پروانه مرا

خفته در سایهٔ من عرصهٔ صحرای وجود — هست در دامن کهسار فنا خانه مرا

عشقم آورده درین عالم خاکی بینش — داده جا خواهش سیلاب به ویرانه مرا[3]

بینش کی غزلوں سے کشمیر کا حسن چھلکا پڑتا ہے۔ معلوم نہیں بیخبر اور سرخوش نے کن غزلوں کو دیکھ کر یہ حکم لگایا تھا۔ حالانکہ ان کے یہاں عشق، حسن اور خمریات کا جتنا حسین رچاؤ ہے اس کی نظیر

---

[1] کلمات الشعراء، ص ۱۰۔

[2] میر عظمت اللہ بیخبر: سفینۂ بیخبر (علی گڈھ) ص ۵۴۔

[3] دیوان بینش (رامپور نمبر ۵۴۷) ورق ۶۔

ہم عصر کشمیری شعرا میں صرف جویا کے یہاں ملتی ہے۔

بزم چمن بہ بلبل و پروانہ خوشناست | خود را بہ جلوہ گاہ دگر بردہ ایم ما
یک روز و شب زیاد تو غافل نبودہ ایم | آفتاب و ماہ بسر بردہ ایم ما[1]

بہ برگ گل نزاکت ہست اما چون لب ساقی | تبسم را حیات دغندہ را کوثر نمی سازد[2]

یک صبحدم زچہرہ برافگن نقاب را | بنشان بہ روز شبنم گل آفتاب را[3]

در بزم می پرستان یاد لب تو کردم | چون غنچہ خود بخود شد لبریز می، سبوہا[4]

ان اشعار سے بینش کی غزل کا حسن بڑی حد تک ثابت ہوتا ہے۔ بینش کے مقطعے حیرت انگیز اور بیحد لطیف ہیں۔ اور گویا ان کا فن مقطعے میں عروج کو پہونچتا ہے۔ چند مثال ملاحظہ فرمایئے:-

در آسمان شیشہ کہ جز دور جام نیست | ہر قطرہ می بہ دیدۂ بینش برابر است

شہری است پر از شور ز رسوائی بینش | دیوانہ ازین مژدہ بہ ویرانہ نگنجد

داشت مجنون دامن صحرا و ما دامان دوست | در دیار عشق رسم اہل بینش دیگر است[5]

---

[1] ایضاً ورق ۴

[2] ایضاً ورق ۳۰

[3] ایضاً ورق ۹

[4] ایضاً

[5] ایضاً ورق ۱۲، ۲۳، ۱۵۔

غنیمت

مولینا محمد اکرم غنیمت شیخ نازر محمد کے لڑکے اور کنجاہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔[۱]
ان کے والد مفتی تھے۔[۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ غنیمت شاہجہان آباد کے باشندہ تھے۔[۳] بعض اور مستشرقین کا بیان ہے کہ غنیمت گنجہ کے رہنے والے تھے۔[۴] انھیں درحقیقت نظامی کے وطن گنجہ اور غنیمت کے وطن کنجاہ میں اشتباہ ہوا ہے۔ غنیمت کے حالات زندگی زیادہ معلوم نہیں۔ ان کے ہم عصر تذکرہ نویسوں میں شیر خاں لودی نے سرے سے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگار سرخوش نے صرف اتنا لکھا ہے "از خاکیان ہند غنیمت بودہ"۔[۵] البتہ اٹھارہویں صدی کے تذکرہ نگار مثلاً آزاد بلگرامی، خان آرزو، شفیق اور خوشگو وغیرہ کا بیان ہے کہ غنیمت کنجاہ کے رہنے والے تھے۔[۶] غنیمت کے کنجاہی ہونے کا ایک قابل اعتبار ثبوت ان کے بھتیجے محمد ماہ صداقت کی کتاب ثواقب المناقب سے بھی ملتا ہے، جس میں انھوں نے اپنے دادا یعنی غنیمت کے والد

---

[۱] ید بیضا (علی گڈھ) ص ۲۰۶؛ مجمع النفائس (بانکی پور نمبر ۲۳۷) ورق ۳۴۴؛ گل رعنا (بانکی پور نمبر ۲۳۴) ورق ۱۹۲؛ تذکرۂ حسینی ص ۲۳۰؛ اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۴۲)؛ ریاض الشعرا (علی گڈھ) ورق ۲۸۳ اور مخزن الغرائب (ورق ۲۹۶) نے غنیمت کا وطن لاہور لکھا ہے۔ سفینۂ بیخبر (علی گڈھ) ص ۲۳۹ انھیں از نواح پنجاب کہتا ہے، اور صحائف شرائف (محمد عسکری حسینی بلگرامی) بانکی پور نمبر ۲۶۸ انھیں "از منطرب زادگان نواح گجرات" لکھتا ہے۔

[۲] ید بیضا (علی گڈھ) ص ۲۰۶۔ حسین قلی خاں: نشتر عشق (بانکی پور نمبر ۲۴۱) ص ۱۲۹۸۔

[۳] اورینٹل کالج میگزین (اگست ۱۹۴۳)

[۴] ریو ۲/ ۷۰۰، ایتھے نمبر ۱۶۴۹۔ ریو نے ان کا وطن قصور (مغربی پاکستان) بھی بتایا ہے۔

[۵] کلمات الشعرا ص ۸۲۔ [۶] ملاحظہ ہو حوالہ بالا۔ بندرابن داس خوشگو: سفینۂ خوشگو، پٹنہ، ص ۲۲۔

شیخ نذر محمد کو کنجاہی لکھا ہے[۱]۔ اٹھارہویں صدی کے شاعر زیرک کلانوری نے بھی غنیمت کو کنجاہ سے منسوب کیا ہے۔

منیری شد زنار لاہور آہ　　غنیمت نیست ہر ملای کنجاہ[۲]

خود غنیمت کا یہ بیان ہے کہ میرا وطن پنجاب ہے:-

نخواہم لالہ زار گلشن ایران کہ سر بر زد　　گل داؤدی صبح وطن از خاک پنجابم[۳]

مثنوی غنیمت میں بھی پنجاب کا والہانہ ذکر ہے:-

ندیدم کشوری غارت گر تاب　　بہ خوبی ہای حسن آباد پنجاب

چہ پنجاب؟ افتخار ہفت کشور　　قسم خوردہ بہ خاکش آب کوثر[۴]

اپنے والد کی طرح غنیمت بھی قادریہ سلسلہ سے منسلک اور شیخ محمد صالح خلیفہ شیخ محمد نوشہ گنج بخش سے بیعت تھے[۵]۔ مثنوی میں اپنے مرشد کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:-

در کشور کشای فیض سرمد　　امام عاشقان صالح محمد

سرو سر حلقہ صاحبدلان است　　جنید وقت و شبلی زمان است[۶]

قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی (م۔ ۵۶۱/۶۶ - ۱۱۶۵) سے غنیمت

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء۔

[۲] ڈاکٹر سید محمد باقر: پنجابی قصے فارسی زبان میں؛ لاہور۔ ۷-۱۹۵۶، ج ا/ص ۲۳۴۔

[۳] دیوان غنیمت مرتبہ غلام ربانی عزیز، لاہور، ۱۹۵۸، ص ۲۲۳۔

[۴] غنیمت: نیرنگ عشق (مثنوی غنیمت)، فخر المطابع ۱۲۶۸ھ ص ۱۲

[۵] سفینۂ خوشگو، ص ۲۲؛ اورینٹل کالج میگزین (نومبر ۱۹۴۳ء) شیخ صالح کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیا از غلام سرور، کانپور۔ ۱۳۲۰ھ، ج ا/ص ۱۸۹۔

[۶] نیرنگ عشق، ص ۸۔

کی بے پناہ عقیدت کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے :۔

غنیمت ای غلام غوث اعظم　　فدای نام پاک قطب عالم
چون من خود را سگ کوی تو خواندم　　به آهوی حرم نسبت رساندم
خوش آن روزی که آرم رو به بغداد　　ز سر پا کرده، از بند غم آزاد
به گرد مرقدت گردیده باشم　　مراد دیده و دل دیده باشم[1]

غنیمت کی زیارت بغداد کی آرزو پوری نہیں ہوسکی۔ وہ کابل اور کشمیر جانے کی آرزو بھی کرتے رہتے تھے۔ کابل میں ان کے دوست فائز تھے۔

شوق فائز می کند تکلیف سیر کابلم　　شد غنیمت دیدۂ ما عرصۂ سرخاب ازو[2]

غنیمت کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گذرا[3]۔ سفر دہلی کی جو داستان ان سے منسوب کی جاتی ہے وہ افسانہ معلوم ہوتی ہے[4]۔ ثواقب المناقب سے معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت لاہور میں مرض موت میں مبتلا ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی انھیں کنجاہ لے گئے جہاں انھوں نے وفات پائی[5]۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ریو اور براؤن کا خیال ہے کہ انھوں نے ۱۱۰۷/۹۶-۱۶۹۵ء میں وفات پائی[6]۔ ان کے لوح مزار پر (جس کی تعمیر ۱۹۲۴ء میں ہوئی) ۱۱۱۰/۹۹-۱۶۹۸ کندہ ہے[7]۔ ایتھے اور اوانوف بھی اسی تاریخ سے اتفاق کرتے ہیں[8]۔ شمع انجمن کے مؤلف کا یہ خیال

---

[1] نیرنگ عشق، ص ۸۰۷۔

[2] دیوان غنیمت، ص ۲۵۵

[3] عبدالغنی خاں: تذکرۃ الشعرا، علی گڑھ، ۱۹۱۶ء، ص ۹۶۔

[4] دیوان غنیمت (دیباچہ)

[5] اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۴۲ء)

[6] ریو ۲/۷۰۰؛ براؤن کیمبرج، نمبر ۱۳۴۶۔

[7] اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۴۲ء)

[8] ایتھے نمبر ۱۶۲۹، ایشیاٹک ۱/ نمبر ۸۱۹

ہے کہ غنیمت نے گیارہویں صدی کے اختتام پر وفات پائی۔[1] سرخوش نے اپنے تذکرہ کلمات الشعرا بہ ۱۱۰۸ھ یا اس کے بعد نظرثانی کی اور اس نے ان کا ذکر مرحومین میں کیا ہے۔ غالباً غنیمت نے ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ (سال تصنیف مثنوی غنیمت) اور ۱۱۰۸/۹۷-۱۶۹۶ کے دوران وفات پائی۔

غنیمت کی تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کی حیات ہی میں لوگ انھیں پیر مانتے تھے۔ اور اب بھی ان کے علاقہ کے لوگ ان کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ان کی طرف بہت سی کرامتیں منسوب کرتے ہیں۔ ان کی قبر پر سالانہ عرس ہوتا ہے جس میں اردگرد کے لوگ آکر اپنے مرشد کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

غنیمت کے مربیوں میں دو اشخاص کا ذکر ملتا ہے۔ ایک نواب مکرم خاں ہے جو عہد اورنگزیب میں ملتان اور لاہور کا گورنر تھا۔ اور عہد فرخ سیر میں فوت ہوا۔[2] دوسرا شخص سیالکوٹ کا فوجدار مرزا ارتق بیگ ہے۔[3]

غنیمت کی تصانیف میں ایک دیوان اور مثنوی نیرنگ عشق ہے۔ ریاض الافکار میں ان کا ایک فحش خط ہے جو انھوں نے دردانہ بائی کے نام لکھا ہے۔[4]

دیوان | موجودہ دیوان غنیمت میں ۳۲۲ غزلیں، ۹۹ متفرق اشعار، ۵ قصیدے اور چند

۱۔ شمع انجمن، ص ۳۵۶۔

۲۔ شاہنواز خاں: مآثر الامرا (۳ جلد) کلکتہ، ۱۹۰۳-۱۸۸۸، ۳/ ۶۹۵؛ شیخ محمد اکرام: رود کوثر، فیروز سنز ۱۹۵۸ (تیسرا ایڈیشن)، ص ۲۸۷۔

۳۔ سفینۂ خوشگو، ص ۲۲۔

۴۔ وزیر علی عبرتی: ریاض الافکار (مخطوطہ) ورق ۸۴۔ یہی خط صحائف شرائف (بانکی پور نمبر ۲۶۸۷) ورق ۱۳۹ پر بھی درج ہے۔

رباعیاں ہیں۔ مرتب دیوان نے بارہ رباعیاں نقل کی ہیں حالانکہ ان میں سے پانچ قطعے ہیں کیونکہ ان کے اوزان رباعی سے مختلف ہیں۔ مثلاً

(ا) تا رقم شد حرف شوق آن بدل مطلوب ما

(ب) جلوہ فرمای سرو قامت را

(ج) زخوبان نیست چشم دلنوازی عشقبازان را

(د) زہی بہ غمزۂ شوخ تو جنگ وعربدہ ہا

(ھ) کہ این برق پر تو رفتہ است از جلوہ گاہ این جا[1]

غنیمت کی غزلیں اتنی بلند پایہ نہیں جتنی ان کی مثنوی ہے[2]۔ مثنوی میں غنیمت نے اپنا منفرد رنگ ایجاد کیا لیکن غزل میں وہ بنیادی طور پر موجد نہیں بلکہ پیرو ہیں۔ سب سے زیادہ انھیں ناصر علی سرہندی کا طرز پسند تھا۔ اپنے اشعار میں بار بار وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ صائب تبریزی، قاسم دیوانہ، نظیری، کلیم، فغانی، جلال اسیر اور صیدی تہرانی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ تعجب ہے غنیمت نے اپنے استاد راسخ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ ان شعرا کے ہجوم میں غنیمت ایسے کھو گئے تھے کہ ان کے لیے خود یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ان کا اپنا طرز کیا ہے۔

دل نمی داند غنیمت آشنای طرز کیست ہر نفس صد معنی بیگانہ در خاطر گذشت[3]

بہرحال غنیمت کی غزلیں سپاٹ نہیں ہیں۔ خاص طور پر ان کے رومانی اشعار میں ایک خاص دلکشی ہے جس کی تکمیل ان کی مثنوی میں نظر آتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمایئے:

بتی دارم سراپا ہمچو شاخ ارغوان رنگین زنام او بہ رنگ غنچہ ہا کام و زبان رنگین

---

[1] دیوان غنیمت ص ۱۵۔۲۱۲

[2] صحائف شرائف (ورق ۱۳۹) نے غنیمت کی غزل کو مثنوی سے بہتر بتایا ہے۔

[3] دیوان غنیمت ص ۶۲۔

ازبس کہ نازک است قد دلربای او   گل شیشۂ شکستہ بود زیر پای او[۱]

نیرنگ عشق غنیمت کا شاہکار ان کی مثنوی نیرنگ عشق ہے جس کا دوسرا نام شاہد وعزیز[۲] بھی ہے۔ مثنوی میں شاہد اور عزیز کی محبت کی داستان نظم کی گئی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس داستان کی کوئی تاریخی صداقت ہے یا نہیں۔ گنجاہ کے اطراف میں یہ روایت ہے کہ یہ خود غنیمت کی اپنی داستان عشق ہے۔ اور داستان کا معشوق شاہد ماجرا گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اس روایت کے معتقدین ثبوت میں غنیمت کا یہ شعر پیش کرتے ہیں، اگرچہ ان کی دلیل میں کوئی جان نہیں نظر آتی:-

اسیرم کرد کافر ماجرایی   رہایی یا نبی اللہ رہایی[۳]

خوشگو اور اس کے تتبع میں نشتر عشق[۴] کے مؤلف کا یہ خیال ہے کہ داستان کا ہیرو دراصل مرزا عبدالعزیز ہے جو غنیمت کے مربی مرزا ارتق بیگ فوجدار سیالکوٹ کا لڑکا تھا۔ اور اسی کے ایما پر غنیمت نے یہ داستان نظم کی۔[۴] تذکرۂ حسینی کا یہ بیان صحیح نہیں کہ عزیز نواب مکرم خاں کا لڑکا تھا[۵] کیونکہ خود مکرم خاں کی کوئی اولاد نہیں تھی اور انھوں نے عبید اللہ نامی ایک لڑکے کو گود لے لیا تھا[۶]۔ خود مثنوی سے عزیز کی شخصیت پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک رئیس زادہ تھا۔

مہین فرزند والا شان امیری   سکندر شوکت افلاطون وزیری

۱؎ ایضاً ص ۲۵۰، ۲۵۳۔

۲؎ راس وبراؤن نمبر CLXXIV

۳؎ نیرنگ عشق ص ۵؛ اورنٹیل کالج میگزین (مئی ۱۹۴۲ء)

۴؎ سفینۂ خوشگو ص ۲۲، نشتر عشق (بانکی پور نمبر ۲۴۱) ص ۱۲۹۸۔

۵؎ تذکرۂ حسینی، ص ۲۳۰۔

۶؎ مآثر الامرا ۳/۶۹۸۔

در آن فرمانروا ایبهای موجود ولی عہدش اگر بود آن پسر بود[1]

نیز اس کے ایما پر غنیمت نے یہ داستان نظم کی۔

حدیث عشق بود از گفتنم دور ولی بودم بہ حکم امر معذور

سخن گفتم بہ امید تمیزی گہر سفتم بہ تکلیف عزیزی[2]

بہر حال غنیمت اس واقعہ کے شاہد ضرور تھے اور انھوں نے اس قصہ میں ایک معمولی سا کردار بھی ادا کیا ہے وہ شاہد کے مدرسہ میں "سیپارہ دل" بیچنے جاتے ہیں۔ شاہد اور شاعر کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے، وہ خاصا دلچسپ ہے:۔

پسندش کرد و گفتا "من خریدار" بگفتم "ار شود طالع مددگار"

بگفتا قیمتش؟ گفتم "نگاہی" بگفتا "کمترک"، گفتم "کہ گاہی"[3]

مثنوی نیرنگ عشق ۱۰۹۶/ ۸۵-۱۶۸۴ میں مکمل ہوئی اور پندرہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔

نمایاں گشت تاریخ نو آئین ز "گلزار بہار فکر رنگین"

چو ابیاتش پس از گفتن شمردم بہ اعداد "غنیمت" راہ بردم[4]

نیرنگ عشق کی داستان کوئی خاص دلچسپ نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہندوستان میں امرد پرستی پر یہ پہلی فارسی مثنوی ہے۔ شاہد بھگت بازوں کی ٹولی کا خوبصورت لڑکا ہے۔ یہ ٹولی عزیز کے شہر میں آکر تماشا دکھاتی ہے۔ عزیز شاہد پر فدا ہو جاتا ہے اور اسے بہلا پھسلا کر اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ عزیز کے باپ کو جب اس واقعہ کا علم ہوتا ہے تو وہ شاہد کو نکال دیتا ہے

---

[1] نیرنگ عشق ص ۱۵۔

[2] ایضاً ص ۷۵-۷۶۔

[3] ایضاً ص ۴۷۔

[4] ایضاً ص ۴۵۔

بیچارہ عزیز کبھی گھر سے نکل جاتا ہے باپ کی منت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آخرکار باپ دونوں کو گھر بلا لیتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد شاہد اپنی ماں سے ملنے گاؤں جاتا ہے اور وہاں ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر وہیں رہ جاتا ہے۔ اس کی جدائی عزیز کو عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور اس طرح ہم جنسی کی یہ داستان تصوف کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔

چو شد از بادۂ غم بیخود و مست	گرفتش لطف معشوق ازل دست
تماشا حسن غیبش دل نشین شد	تمنا محو شاہد آفرین شد
خلیل کعبۂ ملک یقین گشت	مقر لا احب الآفلین گشت[1]

درحقیقت نیرنگ عشق خالص عشقیہ داستان ہے۔ حمد کے ذیل میں شاعر نے عشق سے متعلق جو اشعار کہے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

دلی وہ سر بسر عشق و ہمہ سوز	سرشک دیدۂ داغ دل افروز
دلی چون غنچہ الفت خانہ ریش	بہ رنگ لالہ داغ آتش خویش
دلی چون قطرہ لبسریز چکیدن	دلی چون شعلہ سرجوش تپیدن[2]

حمد و نعت کے بعد شاعر نے شہنشاہ وقت اورنگزیب، اپنے روحانی مرشد حضرت شیخ محمد صالح اور حضرت عبدالقادر جیلانی کی مدح میں بڑے جذباتی اشعار کہے ہیں۔ اس کے بعد اصل داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

غنیمت رومانیت کے استاد تھے، انھوں نے حسن کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بڑی بھرپور اور جاذب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا احساس جمال بڑا پاکیزہ اور

---

[1] ایضاً ص ۷۳-۷۴

[2] ایضاً ص ۳

صحت مند ہے۔ ان کی شاعری کا اصل جادو ایسے ہی اشعار میں ہے :۔

زانگیز بدن پر گشتہ یکسر	زہر عضوش عیان رخسار دیگر
بتی از شوخی آہو سرشتہ	نمک پروردۂ حسن برشتہ
ادای او ہزاران جلوہ بردوش	نگاہ او رم آہو در آغوش
زاعضایش کزو شد صبح بیتاب	بجای سایہ می افتاد مہتاب[۱]

شاہد جس لڑکی پر فریفتہ ہوا، اس کا بیان ملاحظہ فرمائیے :۔

نہان در گیسوی او لیلۃ القدر	عیان از جبہۂ او مطلع الفجر
غزال چشم تکلیف رم ہوشش	نگاہ مست صد میخانہ در جوشش
بہار عارضش را وقت دیدار	لطافت چون عرق ریزان زرخسار[۲]

نیرنگ عشق کا حسن انداز بیان میں ہے۔ غنیمت نے اس مثنوی میں ایجاد و اختراع کے جو جوہر پیش کئے ہیں، اس کی امثال ہندوستان کے فارسی ادب میں کم ملتی ہے۔ ایک خاص بات مکالموں کی نوک جھونک اور چستی ہے۔ اس ڈرامائی انداز سے پوری نظم میں عام روزمرہ کی فضا پیدا ہوگئی۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ہمارے درمیان بیٹھا ہوا بے تکلفی سے باتیں کر رہا ہے۔ عزیز کا قاصد جب شاہد کے پاس پہونچتا ہے تو دونوں میں یہ مکالمہ ہوتا ہے:

شکر لب بعد از آن مکتوب خوانی	خبر پرسید از قاصد زبانی
کہ واگو حال آن مشتاق چون است؟	بگفتا مست صہبای جنون است
بگفتا با کہ دارد صحبت گرم؟	بگفتش با دل وارستہ از شرم
بگفتا دل نشین یارش کدام است؟	بگفتش آن کہ در ہجر نام است

۱؎ ایضاً، ص ۴۲

۲؎ ایضاً، ص ۵۷

بگفتا باکتابی ہست ہمدم؟ بگفتش خود شدہ مجموعۂ غم[۵]

ان اشعار میں جو بے تکلفی اور بے جھجک انداز ہے وہ خاص غنیمت کا حصہ ہے، کہانی کے ہندوستانی پس منظر نے اسے ہم سے اور قریب کر دیا ہے۔ سارا واقعہ پنجاب میں ہوتا ہے۔ بھگت بازوں کی ٹولی، پنگھٹ کا منظر وغیرہ خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ اکا دکا ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں۔

مثنوی نیرنگ عشق کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اس عہد کی کسی اور تصنیف کو نہ ہو سکی۔ وہ تقریباً اسی وقت سے درس میں شامل ہو گئی۔ اردو میں اس کے کئی ترجمے پائے جاتے ہیں۔ ایک ترجمہ پشتو میں بھی ہوا[۲]۔

فطرت موسوی

مرزا معزالدین محمد فطرت موسوی قم کے ایک معزز سید تھے[۳] اور وہیں ۱۰۵۰/۴۱-۱۶۴۰ میں ان کی ولادت ہوئی[۴]۔ ان کے والد مرزا فخرا قمی اور ان کے نانا میر محمد زماں کا شمار فاضل علما میں ہوتا تھا[۵]۔ ان کی ابتدائی تعلیم قم اور مشہد میں ہوئی[۶]۔ بعد میں والد سے ان کے اختلافات ہو گئے اور وہ اصفہان

۱؎ ایضاً ص ۵۲-۵۱۔

۲؎ ڈاکٹر امیر حسن عابدی: روابط ادبی افغانستان و ہند (مشمولہ مجلہ ادب، کابل، جون جولائی ۱۹۶۶ء)

۳؎ سفینۂ بیخبر (علی گڑھ)، ص ۲۵۹۔

۴؎ کلمات الشعرا ص ۱۰۰، فطرت نے 'افضل اہل زمانہ' سے اپنی تاریخ ولادت نکالی تھی۔ اتفاق سے سرخوش کی تاریخ ولادت بھی یہی تھی۔ انھوں نے فطرت سے یہ تاریخ اپنے لئے مانگ لی۔ مآثر الامرا ۶۳۵/۳ نے 'افضل اولاد زمانہ' لکھا ہے جس سے ۱۰۵۶ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

۵؎ سرو آزاد ص ۱۲۶۔

۶؎ ریاض الشعرا (مخطوطہ) ص ۶۲۸۔

چلے گئے جہاں انھوں نے آقا حسین خوانساری سے تعلیم حاصل کی[1]۔ فطرت ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ میں ہندوستان آئے۔ اورنگزیب کے دربار میں ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی[2]۔ دو سال بعد وہ شہنشاہ کی معیت میں حسن ابدال گئے۔ وہاں بیدل کے استاد شیخ عبدالعزیز عزت سے ان کا ایک دلچسپ مکالمہ ہوا جسے ماثر الامرا کے الفاظ میں سنئے۔

"گویند در حسن ابدال روزی (فطرت را) با شیخ عبدالعزیز عزت مباحثۂ علمی درمیان افتاد و بہ طول انجامید۔ شیخ گفت کہ این را شما از کہ سند دارید؟ گفت 'از شیخ بہاءالدین محمد'۔ گفت 'من بر شیخ بست و دو جا حرف کردہ ام'۔ گفت 'مخدوم! آن حروف ہجی خواہد بود'۔[3]"

اس واقعہ سے فطرت کی غیر معمولی علمی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دہلی آکر درس و تدریس کا شغل شروع کیا تھا۔ معقولات میں وہ بے بدل تھے[4]۔ تصوف میں بھی انھیں بہت دسترس تھی مگر سرخوش نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے:۔

"می فرمودند کہ قدرتی دارم کہ ہیچ کس در علم معقولات و تحقیق تصوف از من پیشی نتواند گرفت ولیکن وقتی کہ حرف فنا درمیان می آید، من در می مانم زیرا کہ نہ انکار می توانم، نہ اقرار۔ در احوال جمیع مشایخ خواندہ ام کہ در ذات حق فانی می شوند و ظاہرا درمیان خود و ایشان ہیچ فرقی نمی یابم۔ ہمچو من می خورند و می آشامند۔ ایشان چہ قسم فانی گشتہ اند و من نیستم۔ فقیر می خندید و می گفت سبحان اللہ ؎

چشم باز و گوش باز و این ذکا | خیرہ ام در چشم بندی خدا[5]"

---

[1] سرو آزاد، ماثر الامرا (حوالہ بالا)

[2] ماثر الامرا ۶۳۳/۳

[3] ایضاً

[4] کلمات الشعرا ص ۹۹ - ۹۸

[5] ایضاً ص ۹۹ (حاشیہ)

فطرت مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے[1] یہاں تک کہ انھیں بہار کے گورنر بزرگ امید کے ماتحت وہاں کا دیوان مقرر کیا گیا، مگر دیوان اور گورنر میں زیادہ نہ نبھ سکی۔ بزرگ امید کو اپنے عہدہ کا گھمنڈ تھا اور فطرت اپنی سیادت اور فضیلت پر نازاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں واپس دربار میں بلالیا گیا۔[2] خود اورنگزیب فطرت کی اس بے نیازی اور خودداری سے زیادہ خوش نہیں تھا اس نے بہرہ مند خاں سے ایک بار کہا کہ فطرت نے کبھی اپنی کسی ضرورت کے لیے مجھے کوئی عرضی نہیں دی ہے۔ جب یہ بات فطرت تک پہونچی تو انھوں نے شہنشاہ کی خدمت میں عرض کیا:

در طلب با بیزبانان امت پروانہ ایم — سوختن از عرض مطلب پیش من آسانتر است

شد از غرور غلامی زبان عرض خموش — مرا بہ راہ خطا این صوابہا انداخت

اورنگزیب کو یہ پیغام پہونچا تو اس نے کہا:-

"ہرگاہ سلطان عصر با نوکران خود التجای مطلب او کند و او جواب باین خوبی دہد از اخلاق بعید است کہ التفات بہ حال او نشود"۔[3]

۱۰۹۹/۸۸-۱۶۸۷ء میں فطرت کو موسوی خاں کا خطاب عطا کیا گیا اور انھیں دفتر داری تن کا عہدہ ملا۔[4] اگلے سال انھیں دکن کا دیوان بنا کر بھیجا گیا اور انھیں ہزاری منصب عطا ہوا۔[5] اپنی دیوانی کے دوران فطرت نے کافی سختی سے اخراجات میں کٹوتی کی مہم شروع کی۔[6] مگر بہت جلد ان کا انتقال

---

[1] کشن چند اخلاص: ہمیشہ بہار (مخطوطہ دہلی یونیورسٹی لائبریری) ورق ۸۹۔

[2] سرو آزاد، ص ۲۷-۱۲۶۔

[3] حمید الدین خاں: احکام عالمگیری مرتبہ سرجدو ناتھ سرکار، کلکتہ ۱۹۱۲ء، ص ۴۵

[4] مآثر عالمگیری ص ۳۱۲۔

[5] ایضاً ص ۳۳۰، کلمات الشعراء ص ۱۰۰ (حاشیہ)

[6] مآثر الامرا ۳/۶۳۴۔

ہو گیا۔ ان کی موت اورنگزیب کے ۴۳ ویں سن جلوس (۱۱۰۱-۱۱۰۰) میں ہوئی[1]۔ سرخوش کی تاریخوں سے دونوں ہی سال برآمد ہوتے ہیں۔

کشید آہ[۶] دبگفتا عقل تاریخ   معزالدین محمد موسوی رفت
۱۱۰۶ - ۶ = ۱۱۰۰

دوسری تاریخ ہے:

کجا شد موسوی خان[2]
۱۱۰۱

یہ خبر سن کر ناصر علی پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے اور سرخوش پر کیا کچھ نہیں بیتی۔ مؤخرالذکر نے ایک قطعہ میں اپنے اس درد کا اظہار کیا ہے:۔

دریغا شعر رخت از دہر بربست   سخن با موسوی خان از جہان رفت
زفوت راجہ ای دل نغمہ ہم مرد   نشان عیش از ہندوستان رفت
زمن باقی است سرخوش جوش عرفان   پس از من خواہد این ہم از جہان رفت[3]

موسوی خاں کی شادی اورنگزیب کی سالی یعنی شاہنواز خاں صفوی کی لڑکی سے ہوئی تھی[4]۔ فطرت کا شمار اس دور کے بڑے شعرا اور علما میں ہوتا ہے۔ ایران میں انھوں نے صائب اور دیگر ادیبوں کی صحبتیں دیکھی تھیں[5]۔ ہندوستان میں انھیں فارسی شعر و ادب کا مستند نقاد تسلیم کیا جاتا تھا اور کسی شاعر یا شعر کے بارے میں ان کی رائے کو کافی وقیع سمجھا جاتا تھا[6]۔ اگرچہ فطرت کا

---

[1] ایضاً ۶۰/۲ ؛ مآثر عالمگیری ص ۲۳۷۔

[2] کلمات الشعرا، ص ۱۰۲

[3] ایضاً

[4] مآثر عالمگیری ص ۳۳۸۔

[5] مجمع النفائس (بانکی پور ۲۳۷) ورق ۳۷۰

[6] کلمات الشعرا، ص ۱۰۰-۹۸۔

خود یہ کہتا تھا کہ اصلاً میں چمن علم کا بلبل ہوں، شاعری کا نہیں:[۱]

من مرغ خوش ترانۂ باغ فضیلتم — طبع مرا بہ زمزمۂ شاعری چہ کار؟

مگر لوگ انھیں شاعری کا مسلم استاد مانتے تھے اور ان کے ایران زا ہونے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست میں سرخوش (مؤلف کلمات الشعرا) انصاف[۲]، مضمون[۳]، مائل[۴] اور تحقیق[۵] کے نام ملتے ہیں۔

ہمارے شاعر کا تخلص شروع میں فطرت تھا۔ بعد میں اپنے حسب نسب کی مناسبت سے اس نے موسوی تخلص کر لیا[۶] لیکن کہیں کہیں معز بھی ملتا ہے۔ فطرت کی تصانیف میں ایک دیوان ایک چھوٹی سی مثنوی اور چند خطوط ہیں۔ انھوں نے گلشن فطرت کے نام سے ایک بیاض بھی مرتب کی تھی، جس کا اب پتہ نہیں چلتا[۷]۔ سرخوش نے کلمات الشعرا میں اس کا بار بار ذکر کیا ہے۔

---

[۱] ایضاً ص ۹۸

[۲] محمد ابراہیم انصاف پنجاب کا رہنے والا تھا۔ بارہویں صدی کے آغاز میں اس کا انتقال ہوا (کلمات الشعرا ص ۸؛ صبح گلشن، ص ۴۵)

[۳] محمد ہاشم مضمون پٹنہ کا باشندہ تھا۔ اس کا تخلص مشربی بھی تھا۔ ایک شعر میں وہ اپنے استاد پر اس طرح فخر کرتا ہے:

مشربی منت تعلیم فلاطون نکشم — موسوی خان جو بود صاحب واستاد مرا

(روز روشن ص ۶۳۲؛ سید نور الحسن: نگارستان سخن، بھوپال، ۱۲۹۳ھ، ص ۹۸)

[۴] مرزا قطب الدین مائل اور اس کا بھائی مرزا نظام الدین طالع دونوں شاعر تھے۔ اول الذکر نے ایک دیوان ایک مثنوی اور ایک ساقی نامہ لکھا۔ آخری عمر میں وہ شاہی نوکری سے مستعفی ہو گیا تھا اور ۷ رمضان ۱۱۲۸/ستمبر ۱۷۱۶ کو اس کا انتقال ہوا (سفینۂ خوشگو ص ۱۱)

[۵] میر محمد علیم تحقیق پٹنہ کے ایک شریف خاندان کا فرد تھا۔ اس کا انتقال طویل عمر میں ۱۱۶۲/۱۷۴۹ میں ہوا (سفینۂ خوشگو، ۲۵۷)

[۶] کلمات الشعرا، ص ۱۰۰

[۷] ایضاً ص ۱۲۶؛ یہ عنوان مرآۃ العالم کے مؤلف نے تجویز کیا تھا (مرآۃ العالم ورق ۲۸۲)۔ اس بیاض کا دیباچہ ایک انتخاب نظم و نثر آئینہ جہان نما (بانکی پور ضمیمہ ۱/ص ۲۰س) میں شامل ہے۔ مخزن الغرائب (ورق ۱۸۲) نے اس کا نام بیاض گلزار فطرت لکھا ہے اور ایڈ نبرا کیٹلاگ نمبر ۳۰۹ میں اسے گلشن شعرا کہا گیا ہے۔

دیوان سرخوش کا بیان ہے کہ اس نے دیوان فطرت مرتب کیا[1] مگر دیوان کے آغاز میں جو نثری مقدمہ ہے وہ خود فطرت کا لکھا ہے۔ ممکن ہے سرخوش اور فطرت نے الگ الگ دو ایڈیشن ترتیب دیئے ہوں۔ کیونکہ دیوان فطرت کے بعض نسخوں میں صرف غزلیں ہیں[2] اور بعض میں کوئی غزل نہیں، صرف قصائد وغیرہ ہیں[3]۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سرخوش نے ان دونوں کو یکجا کر کے اپنا نسخہ ترتیب دیا ہو۔

فطرت ایک اچھے شاعر، مستند نقاد، مسلم عالم اور باعزت رئیس تھے۔ ان تمام عناصر نے ان کی شاعری کی تکمیل و تزئین کی ہے۔ خصوصاً ان کی تنقیدی صلاحیت نے ان کی شاعری کو ایک خاص توازن عطا کیا اور ان کی ایرانیت نے ان کی زبان کو بہت حد تک فطری خوبیوں سے معمور کیا۔ خود شعر کے بارے میں فطرت کا نظریہ یہ تھا، کہ شعر جب تک بہت اچھا نہ ہو اسے پسند نہیں کرنا چاہیئے۔

موسوی شعر اگر خوب نباشد مپسند — تا نیابند دگر راہ سخن بدگو ہا[4]

فطرت اپنے ہم عصر شعرا میں صرف تین یعنی غنی، ناصر علی اور سرخوش کو سب سے عمدہ سمجھتے تھے[5] حالانکہ ان کا انداز ان میں سے کسی سے لگا نہیں کھاتا۔ یہ تینوں شاعر ایہام و ابہام کے نمائندہ ہیں، جبکہ فطرت کا انداز سادہ اور بے تکلف ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں اتنی اہمیت اور شہرت کے باوجود خود ایران میں فطرت کی شاعری کی زیادہ وقعت نہیں تھی۔ آتشکدہ کے مؤلف

---

[1] کلمات الشعرا ص ۸۴۔

[2] فہرست ایڈنبرا نمبر ۳۰۹

[3] بانکی پور ۳/ص ۱۶۵۔

[4] دیوان فطرت نیشنل میوزیم نئی دہلی نمبر (3.51) ورق ۴۔

[5] کلمات الشعرا ص ۹۹۔

آذر کا بیان ہے کہ ایران میں ان کی شہرت فقط ان کے قصیدہ شمس المناقب سے ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

شب ہا ز شور نالۂ زارم، عجب مدار — در گوش پنبہ گر نہد از صبح روزگار[1]

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ فطرت کی غزلیں اپنے رچاؤ اور خوبصورتی کے لئے ممتاز ہیں اور آذر کا بیان جانبداری سے خالی نہیں۔ یہاں ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

بر گل ہزار ناز بجا می کنیم ما — خود را حنای آن کف پا می کنیم ما

او مست ناز می رود و از کمال ضعف — عمری گذشتہ تا مژہ وا می کنیم ما

نام خدا چہ حسن کلام است ای معز! — تحسین ہمی کنیم و دعا می کنیم ما[2]

سرخوش[3] نے لکھا ہے کہ فطرت نے صائب کے سامنے اس کے شعر میں نقص نکالا اور صائب کو مجبوراً ماننا پڑا۔ ایک شعر میں صراحتاً انھوں نے صائب کی شاعری پر نکتہ چینی کی ہے۔

جہان ز پختگی ما شدہ است داغ کباب — نہ صائبیم کہ اندیشہ ہای خام کنیم[4]

لیکن اس کے مقابلہ میں طاہر وحید کی شاعری کو سراہا ہے :-

موسوی شعر تو ہیچ است بر نظم وحید — چہ کند با شتر مست غزال ختنی[5]

فطرت کی شاعری میں وہ گہرائی اور فلسفیت نہیں ہے جو غنی، ناصر علی اور بیدل وغیرہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے یہاں تخئیل اور زبان دونوں میں سادگی ہے لیکن ان کی زبان اتنی جاذب شستہ اور رواں ہے کہ ان کی شاعری دامن دل کھینچتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے :-

---

[1] آتشکدہ، ص ۹۷

[2] دیوان فطرت ورق ۸ ۔

[3] کلمات الشعرا، ص ۹۸

[4] دیوان فطرت مرتبہ ڈاکٹر متین احمد (مشمولہ مرزا معز فطرت موسوی، حیات و تصانیف، مقالۂ تحقیقی، بہار یونیورسٹی) غیر مطبوعہ، ص ۹۴۔

[5] ایضاً ص ۱۰۵۔

در شبستان ازل شمع یکی بیش نبود　　بزم را از پر پروانہ چراغان کردند

تو ای قاصد بہر عنوان کہ دانی شرح حالم کن　　جواب نامہ دشوار است و پیغام زبانی ہم

کی اکنون در حساب عاشقانم؟ یاد ایامی　　کہ گر نامم نمی بردند، می گفتی فلانی ہم[1]

اس دور میں ریختہ میں شعرگوئی شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں فطرت کے بھی دو ایک شعر ملتے ہیں :-

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے　　در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے[2]

غزلیات کے علاوہ فطرت کے پانچ قصیدوں کا پتہ چلتا ہے جن میں شمس المناقب کا ذکر اوپر ہوا۔ یہ قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ہے اور ۱۶۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس دور کے دوسرے شاعر ارادت خاں واضح نے بھی اسی زمین میں ایک طویل قصیدہ کہا ہے۔ اور شمس المناقب کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ موسوی کو قصیدہ میں 'نیم جو عیار' بھی نہیں تھا۔[3] دوسرا قصیدہ امام موسیٰ رضا کی منقبت میں ہے اور تیسرا فطرت کے چچا مرزا بدرالدین محمد کی مدح میں ہے۔ دیوان میں چند قطعے بھی ہیں جن میں یہ قابل توجہ ہے :-

بہ ہمراہ یار مہ غبغبی　　بہ گلزار افتاد را ہم شبی

شنیدم کہ پروانہ با عندلیب　　بہ گفت ای ز سوز درون بی نصیب

چہ تہمت تہی، می زنی لاف عشق　　نداری خبر ہیچ ز اوصاف عشق

نہ از شعلہ ای پیکر افروختی　　نہ در آتشی بال و پر سوختی

بر آورد بلبل فغان از جگر　　کہ ای از فن عاشقی بی خبر

---

[1] ایضاً ص ۶۹، ۹۴۔

[2] میر تقی میر: نکات الشعرا، ص ۴

[3] کلیات واضح (انڈیا آفس نمبر ۱۶۷۴) ورق ۵۔

چمن آتش افروز داغ من است   مرا شعلہ در جان، ترا در تن است[1]

مثنوی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا فطرت نے بنارس کے عشق کی داستان نظم کی ہے لیکن فطرت کے قصہ میں جزوی اختلافات ہیں۔ فطرت کے بیان کے مطابق وہ لڑکی وہاں کے راجہ کی بیٹی تھی۔ لڑکی کو جب اس جوان کے عشق کا حال معلوم ہوا تو اس نے بطور امتحان عاشق کو دریا میں ڈوبنے کے لیے کہا۔ نوجوان فوراً دریا میں ڈوب گیا۔ لڑکی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ وہ چند دن بہت اداس رہی اور ایک دن :-

روزی آن فتنہ دہر آفت دین   چہرہ آراست چو دریای ثمین

زلف را شانہ زد و گیسو بافت   وانگہ از خانہ بہ دریا بشتافت

سر فرو برد بہ گرداب فنا   تہ نشین گشت چو دُر در دریا[2]

ایک ہفتہ کے بعد عاشق و معشوق کی لاش برآمد ہوئی :-

بعد یک ہفتہ بہ دام آمدہ شان   مہر با ماہ بہم کردہ قران

یار با یار ہم آغوش شدہ   از می وصل قدح نوش شدہ[3]

اس مثنوی میں کل ایک سو چار شعر ہیں اور اگرچہ یہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے بینش کی مثنوی سے برتر نہیں، پھر بھی فطرت کی استادی نے جگہ جگہ اس کا حسن ابھارا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں لڑکی کے نہانے کا منظر پیش کیا گیا ہے :-

گشتہ عریان ز لباس گلگون   ہمچو خور کز شفق آید بیرون

راہ نظارگیان بست ز تاب   فتنہ برخاست چو بنشست در آب

---

[1] قصائد فطرت موسوی (بانکی پور نمبر ۱۹۵۸) ورق ۳۲۱۔

[2] دیوان فطرت مرتبہ ڈاکٹر متین احمد ص ۱۵۵

[3] مثنوی فطرت، (بیاض نمبر ۷۳۔ سالار جنگ میوزیم)

گرد ور آب تنش جلوه ز نور　　چون می صاف ز مینای بلور[1]

سالارجنگ میوزیم میں ملا فطرت کی ایک مثنوی ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

الٰہی رخت دل زانگونہ پرداز　　کہ بر پیراہن یوسف کند ناز[2]

اس مثنوی میں ایک دھوبی اور ایک شہزادی کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ مثنوی کے آخر میں جو تاریخ ہے "حدیث مدحت مطلوب طالب[3]" اس سے ۱۱۰۳/۹۲-۱۶۹۱ برآمد ہوتا ہے۔

ظاہر ہے یہ مثنوی فطرت موسوی کے قلم سے نہیں کیونکہ ان کی وفات ۱۱۰۱/۹۰-۱۶۸۹ میں ہو چکی تھی۔ یہ مثنوی غالباً لاہور کے وقائع نگار ملا محمد اکبر کی ہے جن کا تخلص پہلے فطرت تھا مگر انھوں نے فطرت موسوی کی خواہش پر اسے فطرتی سے بدل دیا تھا۔[4] داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دھوبی جس شہزادی کے کپڑے دھویا کرتا تھا اس پر فریفتہ ہو گیا۔ شہزادی کے دل میں بھی عشق کی چنگاری سلگ رہی تھی۔ آخر کار ایک دن دونوں ایک باغ میں ملے۔ اور ایک دوسرے کی آغوش میں جان دے دی۔ بوڑھی دھوبن نے بیٹے اور شہزادی کی لاش ایک ہی قبر میں دفن کرادی۔ مگر بادشاہ کو جب علم ہوا تو اس نے شہزادی کی لاش نکلوانے کے لئے قبر کھدوائی اور یہ دیکھا کہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں پیوست ہیں۔

منثورات

منثورات (یا منشآت) فطرت میں دیوان فطرت کا نثری مقدمہ اور آٹھ خط ہیں۔ مقدمہ انتہائی مرصع اور پر تکلف ہے۔ ایک خط اورنگزیب

---

[1] دیوان فطرت مرتبہ ڈاکٹر متین احمد ص ۱۵۱۔

[2] سالارجنگ نمبر ۸۸۱۔

[3] مثنوی ملا فطرت (سالارجنگ نمبر ۸۸۱) ورق ۳۱۔

[4] حدائق الشعرا ورق ۱۰۸۰ (بحوالہ ایشیاٹک کرزن نمبر ۷۰۲)

کے نام ہے۔ ایک عبداللطیف کو لکھا گیا ہے[1]۔ باقی میں مکتوب الیہم کا ذکر نہیں ہے۔ ریاض الافکار میں شہزادہ کام بخش کی شادی سے متعلق فطرت کا ایک رقعہ ہے[2]۔ آئینۂ جہاں نما اور منشورات تمنا وغیرہ میں بھی فطرت کے خطوط اور رقعات ملتے ہیں[3]۔ منشورات فطرت کو انشا کا عمدہ نمونہ مانا جاتا تھا، اور اس کا تتبع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ رنچھوڑ داس نے دقائق الانشا اسی کے نمونہ پر مرتب کی[4]۔

راسخ سرہندی

غنیمت کے استاد سید میر محمد زمان راسخ سرہند کے باشندے اور سید کلال کی اولاد سے تھے[5]۔ ان کے والد کا نام میر عماد تھا[6]۔ راسخ نے ابتدائی تعلیم اور فن شاعری کی تحصیل اپنے چچا[7] میر مفاخر حسین ثاقب سے کی جو خود ایک اچھے شاعر تھے[8]۔ اپنے ہم عصر اور شعرا کی طرح راسخ نے

---

[1] منشورات فطرت (بانکی پور نمبر ۷۹۵) ورق ۳۰۲، ۳۰۵۔ یہ عبداللطیف خاں تنہا جلال اسیر کے بھانجے اور عہد اورنگزیب میں بیوتات کشمیر تھے۔ فطرت کی بیاض پر انھوں نے دیباچہ لکھا تھا۔ جو صحائف شرائف میں درج ہے۔ ایک اور بیاض (بانکی پور نمبر ۱۰۸۰) میں عبداللطیف کے کئی رقعات ہیں۔ (صحائف شرائف ورق ۱۲۴؛ کلمات الشعرا ص ۲۰)

[2] ریاض الافکار (مخطوطہ) ورق ۵۰۔

[3] بانکی پور ضمیمہ ۱/ نمبر ۲۳۵۱۰۱۹۷۴۰۸۰۔

[4] فہرست ایڈنبرا نمبر ۱۱۵۔

[5] خزانہ عامرہ ص ۲۴۴۔ بیخبر (سفینۂ بیخبر ص ۱۱۶) نے "ظاہراً از سادات معتبر لاہور" لکھا ہے۔

[6] سفینۂ خوشگو ص ۷۔ ید بیضا (علی گڈھ ص ۶۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عماد راسخ کے دادا تھے۔ صحف ابراہیم (بانکی پور نمبر ۲۲۸) ورق ۳۴۶ نے بھی "از اولاد میر عماد" لکھا ہے۔

[7] مجمع النفائس (ورق ۹۸) میں انھیں راسخ کا خالو کہا گیا ہے۔

[8] خزانہ عامرہ، ص ۲۴۳۔ ثاقب شاہی ملازمت میں تھے۔ مگر بعد میں نوکری ترک کر دی۔ ان کا انتقال سرہند میں ہوا (عبدالوہاب افتخار: تذکرۂ بےنظیر مرتبہ سید منظور علی، الہ آباد، ۱۹۴۰ء، ص ۵۸)

بھی فوجی پیشہ اپنایا اور شہزادہ اعظم کی ملازمت اختیار کی۔ انھیں ہفت صدی منصب ملا[1]۔ اور بہت جلد وہ شہزادے کے معتمد مشاور بن گئے[2]۔ گجرات میں قیام کے دوران وہ شہزادہ اعظم کی سرکار کے اور شعرا بیدل، اسلم کشمیری، حکیم شہرت (م۔ ۱۱۴۹/ ۳۷-۱۷۳۶) وغیرہ کی صحبتوں میں شریک رہے[3]۔ بحیثیت ایک دانشور اور سپاہی کے ان کی عزت تھی[4]۔ راسخ اپنی شاعری کے بارے میں کوئی تنقید و تنقیح نہیں پسند کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے یہ شعر پڑھا:

دلبری یافتم و گوشۂ خلوت رفتم　　ریختم شمع بہ اندازۂ کاشانۂ خویش

شعرا نے یہ اعتراض کیا کہ 'شمع ریختن' کوئی محاورہ نہیں ہے۔ راسخ اتنا بددل ہوئے کہ انھوں نے شاہی ملازمت ترک کر دی[5]۔

لیکن ترک ملازمت کے سلسلہ میں خوشگو نے جو وجہ پیش کی ہے وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ خوشگو[6] کا بیان ہے کہ شہزادہ اعظم کے پاس ایک خوبصورت لڑکا تھا جس پر راسخ کی نظر تھی۔ ایک رات راسخ اس لڑکے کی خوابگاہ میں گھس گئے اور غالباً اس کے ساتھ کچھ زیادتی کرنی چاہی۔ جب شہزادے کو اس معاملہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے راسخ کو برطرف کر دیا۔ اس کے بعد راسخ نواب کرم خاں سے متعلق ہو گئے۔ کرم خاں نے ان کے لیے صرفۂ پالکی کے علاوہ تین سو روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا[7]۔ راسخ وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے اور سرہند آ کر گوشہ گیری اختیار کر لی یہیں ۱۱۰۷/ ۹۶-۱۶۹۵ میں انھوں نے وفات پائی۔

---

1. ید بیضا (علی گڈھ) ص ۱۰۴
2. مرآۃ الخیال ص ۳۳۸۔
3. سفینۂ خوشگو ص ۸
4. مرآۃ العالم (علی گڈھ) ورق ۶۷۲۔
5. خزانۂ عامرہ ص ۴۴۳
6. سفینۂ خوشگو ص ۸؛ صحف ابراہیم (بانکی پور نمبر ۲۲۸) ورق ۳۴۶۔
7. خزانۂ عامرہ ص ۴۴۴

راسخ بمرد" تاریخ وفات ہے[۱]۔

راسخ کا شمار اپنے دور کے ممتاز شعرا میں ہوتا تھا۔ سرخوش نے ان کے ذوق سلیم کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ سرخوش نے جب یہ شعر کہا:۔

بہ اندک تلخی اندوہ عشرت ہا نمی ارزد   بہ تشویش خلال این نعمت دنیا نمی ارزد

تو سبھی نے تعریف کی لیکن راسخ نے پہلے مصرع میں لفظ تلخی کو کاوش سے بدل دیا اور واقعۃً شعر بہت بلند ہو گیا[۲]۔

راسخ کے شاگردوں میں اس دور کے ممتاز شعرا شامل تھے۔ غنیمت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ان کے علاوہ ارادت خاں واضح[۳]، سرخوش[۴]، محمد علی رائج[۵]، میر غازی شہید[۶] اور میرزا عبداللہ فنا[۷] کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے خاندان میں شاعری کی بڑی صحت مند روایت تھی۔ راسخ کے بعد ان کے

۱۔ کلمات الشعرا، ۴۲۔

۲۔ ایضاً، حسینی (ص ۱۳۶) نے غلطی سے اس شعر کو خود راسخ کا سمجھا ہے۔

۳۔ سفینۂ خوشگو ص ۸۴۔

۴۔ کلمات الشعرا ص ۴۲

۵۔ محمد علی رائج ترشیز کے سید خاندان کا فرد تھا اور سیالکوٹ کا باشندہ تھا۔ اس کا انتقال طویل عمر میں لاہور میں ۱۷۳۷/۱۱۵۰ میں ہوا۔ اس نے ایک ضخیم دیوان مرتب کیا تھا (سفینۂ خوشگو ص ۲۱۶؛ خزانۂ عامرہ ص ۲۴۴)

۶۔ میر غازی شہید راسخ کا بھانجا تھا، اس کا انتقال ۱۱۳۰/۱۸-۱۷۱۷ میں یا اس کے بعد ہوا۔ غازی نے ہفت پیکر نام سے سات مثنویاں لکھیں۔ خوشگو نے اس کی ایک مثنوی شور جنوں کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں۔ اس کی دوسری مثنوی اشک و آہ آصفیہ لائبریری میں ہے اور غلطی سے امیر خسرو کی طرف منسوب ہے۔ (تبصرہ کارروائی ترتیب کلیات امیر خسرو از محمد اسحق۔ ص ۱۹)

۷۔ صبح گلشن ص ۳۲۰۔

لڑکے میر معصوم وجدان اور ان کے پوتے میر شمس الدین سند[1] نے یہ شمع روشن رکھی۔ وجدان (م ۱۱۶۰/۱۷۴۷ء) بقول آزاد بلگرامی اپنے والد سے بہتر شاعر تھے۔ ان کے دیوان میں صرف غزل کے بیس ہزار اشعار تھے۔ آزاد نے وجدان کے چند شعر نقل کئے ہیں جو یہاں پیش کئے جاتے ہیں:-

جان حاضر است بستان، دل می کنی طلب نیست
یک شیشہ بود، بشکست، پہلوی من حلب نیست

نہ در بند فقیری شو، نہ میل دولت گی کن
سفر در پیش داری، یا عنی بنشین ورہ طی کن

دلی بیار و بہ میخانہ عاشقانہ در آ
بگو کہ شیشہ فرو شم، باین بہانہ در آ[2]

راسخ کی تصانیف میں صرف ایک مثنوی باقی ہے۔ ان کے دیوان کا پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے واضح کے کلیات کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ سرخوش نے اپنے تذکرہ میں بطور سند ان کی باتیں نقل کی ہیں[3]۔

مثنوی راسخ کی مثنوی جس کا عنوان داد و فریاد ہے[4]۔ ان کی واحد تصنیف باقی رہ گئی ہے، یہ عنوان غالباً اس شعر سے معلوم ہوتا ہے:-

تراشم خامہ ای از نبض فرہاد
نو یسم نسخہ ای از داد و فریاد[5]

لیکن بانکی پور کے مخطوطہ میں اس کا عنوان "مثنوی ناز و نیاز و داد و فریاد"[6] لکھا ہے۔ اور غالباً اس سے عنوان استنباط کیا ہے۔

"انجام نمودن حکایتہای ناز و نیاز و رجوع شاعر بہ مثنوی داد و فریاد"[7]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۲۷۲۔

[2] خزانۂ عامرہ ص ۴۴۳ - ۴۴۴۔

[3] کلمات الشعرا ص ۱۲۷۔

[4] مجمع النفائس، ورق ۱۵۹؛ سفینۂ خوشگو ص ۹؛ مخزن الغرائب (ورق ۱۴۶) میں مثنوی کا نام داد و بیداد لکھا ہے۔

[5] بانکی پور مخطوطہ (نمبر ۶۲۱) ورق ۱۳۔

[6] مرتب فہرست نے اس کا ذکر راز و نیاز کے عنوان سے کیا ہے (بانکی پور ۳/۱۶۸)۔

[7] مثنوی راسخ (راز و نیاز) ورق ۲۴۔

مثنوی راسخ اس کی دوسری مثنویوں کی طرح اخلاقی اور مثالی حکایتوں پر مشتمل ہے۔ آغاز قصہ کے عنوان سے شاعر نے ایک شہزادہ میر قوام الدین علی کے ترک دنیا کی حکایت بیان کی ہے۔ ہندوستان میں ایک بھرا پرا شہر تھا:-

کہ شہری بود شمع خانۂ ہند	شراب شیشہ و پیمانۂ ہند
جہان دلبری، معمورۂ ناز	طلسم معرفت، گنجینۂ راز[1]

اس شہر کا حاکم ایک انصاف پرور سید تھا:-

شہی دین پروری، عدل آفرینی	چو جام جم بہ چشم دور بینی
سیادت گوہر طرف کلاہش	سخاوت آستین دستگاہش[2]

اس بادشاہ کے ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام میر قوام الدین علی تھا:-

نہ بحر دل دریکتا بہ کف داشت	چراغ خانہ فرزندی خلف داشت
سیادت صبح بخت ارجمندش	قوام الدین علی نام بلندش[3]

اچانک اس شہر پر دشمن کا حملہ ہوا:-

بہ ناگہ بانگ زد کوس خرابی	شکست آمد بہ مینای شرابی
جہان تاریک گشت از دل سیاہان	سیہ شد روز بر دشت و بیابان[4]

شہزادہ ابھی کم عمر تھا لیکن اصرار کر کے اس نے میدان جنگ میں جانے کی اجازت لے لی۔ وہاں اسے فتح ہوئی مگر واپسی میں اسے دشمن کے ایک سپاہی نے زخمی کر دیا۔ بادشاہ نے اس غصہ میں

---

[1] ایضاً ورق ۲۳

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً ورق ۲۹۔۲۸۔

زبردست حملہ کیا مگر وہ میدان جنگ میں مارا گیا۔ جب اس کی لاش شہزادے کے پاس لائی گئی تو وہ دیکھ کر تڑپ اٹھا اور آخر ترک دنیا کر کے فقیر ہو گیا:۔

جہان را دید فانی تا نظر کرد	بصیرت عینک نور نظر کرد
امید از گل بہار بلبل آہنگ	چکید از اشک شبنم نشہ رنگ[1]

عالم فقر میں بھٹکتے بھٹکتے شہزادہ جونپور پہونچا۔ وہاں اسے ایک پرانا رفیق مل گیا۔ اس کی زبانی اس نے اپنے ہم وطن ساتھیوں کو یہ پیغام بھیجا:۔

کہ ای سنگین دلان! عالم خراب است	چہ طوفان شد کہ دل تا دیدہ آب است
ز عہد بیغمیہا یاد بادا	ز دور جام صہبا یاد بادا[2]

شہزادے نے وطن کے ایک درخت کو بھی پیغام بھیجا تھا جو ایک تالاب کے کنارے تھا۔ اور جہاں شہزادہ کی محفلیں جمتی تھیں۔ جب درخت نے وہ پیغام سنا تو:۔

خمید از غم سر ہر شاخ ناگاہ	ز بار دل دو تا شد قامت آہ[3]

حکایت کے خاتمہ میں یہ اشعار ہیں:۔

بیارا سخ کہ انجام کلام است	نماز خامہ را وقت سلام است
دگر شور جنونی می کنم یاد	من و خونین نوائی داد و فریاد[4]

اس کے بعد وہ عنوان ہے جس کا ذکر اوپر ہوا یعنی "انجام نمودن حکایتہای ناز و نیاز و رجوع شاعر بہ مثنوی داد و فریاد"

---

[1] ایضاً ورق ۳۴۔

[2] ایضاً ورق ۳۷۔

[3] ایضاً ورق ۴۱۔

[4] ایضاً ورق ۴۲۔

اس کے بعد شاعر نے امام غزالی (م۔ ۵۵۰/ ۱۲-۱۱۱۱) کی وساطت سے بادشاہ ترکستان کی لڑکی کی حکایت لکھی ہے کہ بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو میری لڑکی سے شادی کرے گا میں اس کے حق میں تخت سے دستبردار ہو جاؤں گا اور اگر لڑکی نے اسے پسند نہیں کیا تو اس کا سر قلم کر دوں گا۔ شدہ شدہ یہ بات حسن بصری تک پہونچی کہ روز چند بے گناہ مارے جا رہے ہیں وہ بھی لڑکی سے ملنے چلے اور وہاں پہونچ کر انتہائی پُر سوز آواز میں تلاوت شروع کر دی۔ لڑکی اس لحن سے اتنا متاثر ہوئی کہ باہر آگئی اور حسن بصریؒ کی نصیحت پر مسلمان ہوگئی اور کعبہ کی زیارت کے لئے چلی مگر کعبہ خود اس کے استقبال کے لئے آگیا۔

آخر میں چند اور متفرق مختصر حکایتیں ہیں۔

راسخ کی مثنوی کا اصل کمال ان حکایتوں میں نہیں بلکہ ان کے انداز بیان میں ہے۔ خان آرزو کی رائے میں یہ مثنوی "بسیار دقیق است"[1]۔ شفیق کا خیال ہے کہ "زبان ناصر علی ورزیدہ لیکن مغزی کہ کلام ناصر علی دارد کو؟"[2] اس میں شک نہیں کہ راسخ کا انداز دقیق ہے اور ان کا انداز بیان ناصر علی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ناصر علی کی مثنوی اس سے بدرجہا بلند ہے۔ مگر راسخ کی مثنوی میں اپنی دلکشی اور خوبی ہے۔ ان کے انداز بیان کی پختگی، ترکیب کی جدت، جذبات کی شدت اور غیر معمولی روانی ان کی مثنوی کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ مثنوی کا ابتدائی حصہ خصوصاً بہت اہم ہے جہاں شاعر نے حمد و مناجات میں بہت دلدوز شعر کہے ہیں، مثلاً:۔

بہ نام آنکہ دل دیوانۂ اوست	رم مجنون رہ کاشانۂ اوست
لبش خندیدو صبحی جلوہ گر گشت	حریم شش جہت تنگ شکر گشت
فروغش ہستی عشق آفریدہ	نسیمش روح در آتش دمیدہ

---

[1] مجمع النفائس ورق ۱۵۹۔

[2] گل رعنا ورق ۱۱۰۔

زسرہا سجدۂ طاعت خریدہ زہر پیمانہ پیمانی کشیدہ [1]

مناجات کے یہ اشعار راسخ کی والہانہ سپردگی اور محبت کے گواہ ہیں :۔

بیا ای راسخ حسرت سرانجام پریشان محشر شوریدہ ایام

بہار عمر در مستی بسر شد گلی چیدی کہ بستان بی ثمر شد

بہ کام خویش رفتی ، مدعا ماند نگہ برگشت و پیلی بر قفا ماند

مرو از رہ کہ این دریا سراب است مجو دنیا کہ بنیادش خراب است [2]

ان اشعار کا حسن نئی ترکیبوں ، بندشوں اور استعاروں کے روپ میں اور نکھر جاتا ہے۔ یہاں راسخ ناصر علی کے بہت قریب آجاتے ہیں اور غالباً اسی بات پر شفیق کو غصہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ راسخ کے ان اشعار میں زبان کا رچاؤ بھی ہے اور مغربیت بھی :۔

بہ حیرت خانۂ جولان جمال است دل آئینہ فانوس خیال است

بہ زخم کوہکن شیرین نہان است ہمی در خلوت چاک کتان است

تمنا چیست ؟ کچکول گدائی طلسم سازہ برگ بینوائی

مشام افروختم تا گل رسیدم تمنا کاشتم ، دیدار چیدم [3]

چند تسمیہ اشعار ہیں جو عرفی کی یاد دلاتے ہیں :۔

بہ پاس ملت ساغر پرستان بہ حق بی نیازی ہای مستان

بہ صہبائی کہ در گل می زند موج بہ گلزاری کہ در دل می زند موج

بہ زخم مصریان سخت بریدہ بہ سودای مہ اعجاز دیدہ [4]

---

[1] مثنوی راسخ ورق ۲

[2] ایضاً ورق ۴

[3] ایضاً ورق ۱۱،۱۳

[4] ایضاً ورق ۱۵۔

ان اشعار میں اور دوسروں میں راسخ نے جو عجیب و غریب استعارے استعمال کیے ہیں وہ اپنی جدت اور شگفتگی کی بنا پر ہمیشہ فارسی ادب کی زینت رہیں گے۔ مثلاً رم مجنون، وسمۂ ناز، از سجدہ خریدن، محشر شوریدہ ایام، لیلی بر قفا ماندن، حیرت خانۂ جولان، خلوت چاک کتان، خامہ از نبض تراشیدن، مشام افروختن، تمنا کاشتن، دیدار چیدن، مصریان کف بریدہ، سمندر رخانہ بنیاد کردن، مژگان نقاب، وغیرہ۔ یہ ان بے شمار ترکیبوں میں سے چند ہیں۔ ان کی روشنی میں راسخ کی شاعری، فنکاری اور استادی کا درجہ بہر حال مسلم ہے۔

ناصر علی سرہندی

ناصر علی سرہندی بلا شبہہ بیدل کے بعد اس دور کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ وہ سرہند کے ایک معزز سید تھے۔[۱] ان کے والد کا نام رجب علی بیگ حالی تھا۔[۲] غالباً وہ خود شاعر تھے، جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہوتا ہے۔ ناصر علی کی ابتدائی تعلیم سرہند میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ مرزا فقیر اللہ سیف خاں گورنر کشمیر مؤلف راگ درپن کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء میں سیف خاں الہ آباد کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ناصر علی بھی ہمراہ تھے۔[۳] سیف خان سے ناصر علی کو والہانہ وابستگی تھی۔ ان کے انتقال پر ہمارے شاعر کو جو روحانی صدمہ پہنچا اس کا اندازہ مرثیہ سیف خاں سے ہوتا ہے۔[۴]

۱؎ سفینۂ خوشگو ص ۱۰۔ مرآۃ الخیال (ص ۲۱۸) اور سرو آزاد (ص ۱۲۹) انھیں شیخ کہتے ہیں۔ سرخوش (کلمات ۸۴) نے انھیں میاں لکھا ہے۔ خوشگو نے نصر آبادی کے اس بیان کی تغلیط کی ہے۔ کہ ناصر علی چیلہ یعنی غلام تھے۔ مرآۃ العالم نے ناصر علی کا وطن لاہور بتایا ہے (ورق ۶۷۹) اور نصر آبادی نے (ص ۴۴۷) نے انھیں کشمیری کہا ہے۔

۲؎ سفینۂ خوشگو ص ۱۰۔ نشتر عشق ص ۱۱۷۹ مطبوعہ سفینہ میں حالی کے بجائے عالی چھپا ہے مگر فہرست بانکی پور (۸/۶۸) میں اس کا جو اقتباس درج ہے اس میں حالی ہے۔

۳؎ سرو آزاد ص ۱۱۹۔

۴؎ صبح گلشن ص ۲۱۵۔

سیف از سرم گذشت، دلم را دونیم کرد

اس دور کے امرا اس بات پر رشک کرتے تھے کہ سیف خاں کی سرکار میں ناصر علی جیسا عظیم شاعر ہے۔ وہ ناصر علی کو اپنے احسانات کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے تھے، مگر ناصر علی کی خودداری اس بات کے لئے کہاں آمادہ تھی۔ ایک بار وہ سیف خاں کے ہمراہ خاں جہاں بہادر کوکلتاش (م۔ ۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷) کی خدمت میں گئے۔ خان جہاں نے کچھ شعر سنانے کی فرمائش کی۔ ناصر علی نے یہ شعر پڑھا:۔

اہل دنیا را بہ غفلت زندہ دل پنداشتم　　خفتہ دائم مردگان را زندہ می بیند بہ خواب

خان جہاں بہت محظوظ ہوئے اور ناصر علی کو انعام دینا چاہا مگر انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی:۔

ما بہ خدمت این بزرگ می باشیم　　ہر گاہ گرسنہ شویم از مطبخش شوربا می رسد[1]

بیدل کے سرپرست شکر اللہ خاں سے بھی ناصر علی کے قریبی تعلقات تھے۔ ایک شعر میں وہ اس طرح ان کی یاد کرتے ہیں:۔

علی بریاد شکر اللہ خان دوش این غزل گفتم　　زشوقش گل فشانی می سرایم، جان فشانی ہم[2]

شکر اللہ خاں اور ناصر علی میں مراسلت کا سلسلہ بھی تھا۔ شکر اللہ خاں کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر علی کے لئے ان کے دل میں بڑا احترام تھا:۔

"عالمگیر پناہا! از غایت توجہ بہ عالم معنی آن لشکر شکن فوج شطحیات را خبر نیست کہ بہ دولت خداداد سخن عالمگیر شدہ اند و بہ لشکر معنی جہانگیر"[3]

---

[1] کلمات الشعرا ص ۷۸ (حاشیہ)

[2] دیوان ناصر علی، نولکشور کانپور، ۱۹۱۲ء ص ۷۹۔

[3] مرآۃ الخیال ص ۲۵۹۔

۱۰۹۵/۸۴-۱۶۸۳ء میں سیف خاں کے انتقال کے بعد ناصر علی واپس سرہند چلے گئے اور بارہویں صدی ہجری کا آغاز ہوتے ہی وہ دکن کے لئے روانہ ہو گئے[1] جہاں اورنگزیب اپنی مہم میں مصروف تھا۔ کہتے ہیں اورنگزیب اور ناصر علی کی ملاقات ہوئی مگر مغل شہنشاہ کو ہمارے شاعر کا بے پروا انداز پسند نہ آیا[2] پھر بھی ناصر علی کے دل میں اورنگزیب کا جو احترام تھا، اس میں فرق نہیں پڑا۔ اپنی مثنوی میں ناصر علی نے اورنگزیب کی مدح میں بڑے پرجوش اشعار کہے ہیں۔

بیجاپور میں ذوالفقار خاں[3] نے ناصر علی کی سرپرستی فرمائی۔ ناصر علی نے جب اس کی شان میں یہ قصیدہ لکھ کر پڑھا:-

ای شان حیدری ز جبین تو آشکار نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

تو ذوالفقار خاں اتنا محظوظ ہوا کہ اس نے صرف مطلع پر تیس ہزار روپیہ انعام دیا اور کہا کہ ناصر علی اور شعر نہ سنائیں کیونکہ وہ مزید انعام نہیں دے سکتا[4] ذوالفقار خان کے ہمراہ ۱۱۰۳/۹۲-۱۶۹۱ء میں ناصر علی کرناٹک گئے۔ جنجی میں ذوالفقار خان کے دوست غضنفر علی خاں نے ان کی خاطر کی۔ ناصر علی نے اس شعر میں غضنفر علی خاں کی مدح کی ہے:-

ہمچو پیل بی جگر بگریزد از میدان ما بشنود گر پیل آواز غضنفر خان ما[5]

---

[1] سروِ آزاد ص ۱۳۰۔

[2] سفینۂ خوشگو ص ۲۔

[3] ذوالفقار خاں وزیر اعظم اسد خاں کا لڑکا تھا اس کا نام اسمٰعیل تھا۔ جب فرخ سیر کے حکم سے قتل کیا گیا تو اس کے باپ نے یہ شعر کہا:

ہاتف چشم غریباں بادو چشم خونفشاں گفت ابراہیم اسمٰعیل را قربان کرد (ماثر الامرا ۲/۹۳، روز روشن ص ۱۳)

[4] خزانۂ عامرہ، ۳۲۹ نے خان آرزو کے بیان کی تغلیط کرتے ہوئے اس رقم کو صحیح بتایا ہے۔ خان آرزو نے پانچ ہزار بتایا ہے۔ مرآۃ العالم (ورق ۶۷۹) نے ایک لاکھ کی رقم لکھی ہے۔

[5] سروِ آزاد ص ۳۱-۱۳۰؛ دیوان ناصر علی ص ۵۔

ناصر علی کم از کم ۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ تک دکن میں رہے[1]۔ اس کے بعد وہ دہلی لوٹ آئے، یہیں ۲۰ رمضان ۱۱۰۸/۲ اپریل ۱۶۹۷ کو انھوں نے وفات پائی۔ ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی[2]۔ مقبرۂ حضرت نظام الدین اولیاء میں انھیں دفن کیا گیا۔ بیدل نے "رنگ ناز شکست" سے تاریخ نکالی[3]۔

پس ماندگان میں تین لڑکے تھے۔ علی عظیم، علی علیم اور علی کریم۔ اول الذکر بڑا اچھا شاعر تھا۔ بارہویں صدی کے وسط میں اس کا انتقال ہوا۔ خوشگو نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے جو واقعی بہت عمدہ ہے[4]:

ازبیابان عدم تا سر بازار وجود　　　به تلاش کفنی آمده عریانی چند

ناصر علی نے ایران جانے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ وہ اس مقصد کے لئے ملتان تک گئے مگر بعض وجوہات کی بنا پر انھوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ایک شعر میں کہتے ہیں[5]:

علی امسال موقوف است سیر گلشن ایران　　　چو داغ لالہ دامنگیر دل شد خاک پنجابم

آخری عمر میں ناصر علی سنکی، چڑچڑے اور ہر دم بیزار ہو گئے تھے۔ شیخ معصوم سرہندی کے زیر اثر وہ پہلے ہی تصوف سے باقاعدہ وابستہ ہو چکے تھے۔ اب انھوں نے قطب ہونے کا دعوی کیا[6]۔

---

1. آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، آگرہ، ۱۹۱۰ء ص ۲۶۰۔
2. خزانۂ عامرہ ص ۳۳۰۔ سرخوش نے (کلمات ص ۷۵) ۶ رمضان لکھا ہے اور اگرچہ اس نے الفاظ میں یک ہزار و یکصد و ہشت لکھا ہے مگر اس کی دونوں تاریخوں "آہ علی بعالم معنی رفت" اور "آہ آہ از رحلت ناصر علی" سے ۱۱۰۹ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔
3. سفینۂ خوشگو ص ۴۔
4. ایضاً ص ۴۳-۲۲۔ علی علیم سید قطب بارہ کا ملازم تھا اور عہد محمد شاہی کے اوائل میں فوت ہوا۔ تیسرا لڑکا درویش مزاج تھا اور بیس سال کی عمر میں گذر گیا۔
5. بہارستان سخن ورق ۲۲۵؛ دیوان ص ۸۲۔
6. کلمات الشعراء ص ۷۵۔

لیکن ہمیں ان کے مریدوں کا کوئی حلقہ نظر نہیں آتا۔ ان کی ابتدائی زندگی ایک رند لاابالی کی طرح تھی ایک بار وہ بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے، اتفاقاً شیخ معصوم سرہندی (م ۱۰۷۹/۶۹-۱۶۶۸ء) جو بعد میں ان کے پیر ہوئے، ادھر سے گذرے۔ شیخ صاحب نے غصہ میں پوچھا کیا پی رہے ہو؟ ناصر نے برجستہ جواب دیا "میں کہ ملائکہ می خورند" اس گستاخانہ جواب کی بہت تشہیر ہوئی اور علمائے وقت نے ناصر علی کے قتل کا ایک محضر نامہ تیار کیا۔ راسخ سرہندی بڑی مشکل سے ان کی جان بچا کر دہلی لائے[1] لیکن شیخ معصوم کے حلقہ میں آجانے کے بعد ناصر علی صوفیوں کی صحبت پسند کرنے لگے ان کی مثنوی میں شیخ معصوم کے علاوہ چند اور صوفیوں سے عقیدت کا ذکر ملتا ہے جن میں جنجی کے شاہ حمیدالدین اور شاہ عادل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ معصوم کے بارے میں کہتے ہیں:۔

چراغ ہفت کشور خواجہ معصوم — منور از فروغش ہند تا روم

دو عالم کرد خود را زیر پایش — کہ شاید زیر پا افتد نگاہش

ولی آن شمع بزم بادشاہی — نپرداز دبہ این مشت سیاہی[2]

ایک اور شخص نبی شاہ تھے جن کی روحانیت سے ناصر علی بہت متاثر تھے۔ نبی شاہ بچپن سے ناصر علی کے رفیق تھے۔ ہمارے شاعر کا کہنا تھا کہ نبی شاہ کی شخصیت میں انھیں رسول اکرم کی جھلک نظر آتی ہے۔

علی از دیدنش بوی نبی اللہ می آید — ہمہ عطر یمن برداشتم از فیض ناموسش[3]

تصوف اور رندی نے ناصر علی کی زندگی میں انسانیت، ہمت، سخاوت، آزادی فکر اور مادی زندگی سے بیزاری جیسی بنیادی قدریں پیدا کیں۔ ان کی شاعری کے بنیادی موضوع بھی انھیں اقدار سے

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۳۲۸۔

[2] مثنوی ناصر علی نیشنل میوزیم نمبر ۳۰۶۹) ورق ۲۹۔

[3] قانع ٹھٹھوی: مقالات الشعرا مرتبہ حسام الدین راشدی، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۸۰۵-۸۰۴۔

متعلق ہیں. مدح گوئی اور تملق پرستی ان کے مزاج بلکہ فطرت کے خلاف تھی. ذوالفقار خاں کا دیا ہوا انعام انھوں نے کھڑے کھڑے لٹا دیا[1]. خان جہاں بہادر کا احسان انھوں نے بڑی صفائی سے ٹھکرا دیا. ان کے ایک آدھ مدحیہ قصیدے ان کے پرخلوص تعلق کی وجہ سے لکھے گئے نہ کہ تملق کے لئے. وہ خود کہتے ہیں :-

از سخن ہرگز علی در مدح کس نگریختیم — اختیار ما بہ دست ہمت مردانہ بود[2]

سرخوش نے ناصر علی اور ہمت خاں کی ملاقات کا یہ دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے :-

"در اوائل شہرت ہمت خان خواہش دیدن او کرد. بہ رفاقت مرزا محمد علی ماہر رفت بعد از شعر خوانیہا خان بہ تقریبی گفت کہ در مردم مغلیہ با خوب رسم است کہ یاران در خانۂ یکدگر مہمان می شوند. امروز من بہ خانہ یاری رفتہ خوردم، فردا او بہ خانۂ من آمدہ خواہد خورد مردم ہندوستانی رکیک طبع اند، در غایت خست، در خانہ ہای خود پنہان شدہ می خورند گفت 'مغلان نان را بہ قرض می دہند و ہندوستانیان ازین شیوہ عار دارند.' ہمت خان برہم خورد"[3]

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس عہد کے شعرا میں ناصر علی کا مرتبہ بیدل کے علاوہ اور سب سے بلند ہے. سرخوش کا خیال ہے :-

"در زمان بی فیض واقع شدہ والا چنین نازک خیال می باید ملک الشعرای عصر باشد!"[4]

فطرت موسوی ان کا شمار ہندوستان کے تین بہترین شاعروں میں کرتے تھے[5]. سرخوش انھیں

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۳۲۹ .

[2] دیوان ص ۵۰

[3] کلمات الشعرا ص ۷۲، (حاشیہ)

[4] کلمات الشعرا ص ۷۲ .

[5] ایضاً ص ۱۰۰ .

آبروی ہند کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ شعر گوئی شروع کی لیکن لیلای شاعری کے مجنون ہونے کا فخر ناصر علی کو نصیب ہوا :-[1]

طالع شہرت رسوائی مجنون بیش است — ورنہ طشت من وا دو مرد و زیک بام افتاد

کلمات الشعرا میں کئی جگہ سرخوش نے ناصر علی کی سند کا حوالہ دیا ہے[2]۔ خوشگو کا خیال ہے کہ ناصر علی نے کم از کم پانچ سو بہترین شعر کہے ہیں جب کہ اس دور کے کسی اور اچھے شاعر کے منتخب شعر سو دو سو سے زیادہ نہیں ہوں گے[3]۔

ناصر علی کو خود اپنی ادبی عظمت کا شدید احساس تھا۔ ان کی انا کسی ادیب یا شاعر کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ ایران کے ملک الشعرا صائب کا جگہ جگہ انھوں نے مذاق اڑایا ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :-

این غزل ناصر علی اعجاز ہندوستان ما است — صائب این جامی نہد بر خاک تا محشر جبین[4]

ایک بار بیدل نے اپنا یہ شعر انھیں سنایا :-

مزن بر ہیچ سنگی ہیچ دستی — کہ مینا در بغل خفتہ است مستی

تو ناصر علی نے کہا دوسرا مصرعہ اچھا ہے۔ بیدل نے طنزاً کہا آپ پہلا مصرعہ لگا دیجئے۔ ناصر علی بولے کہ یہ ان کے معیار سے فروتر ہے[5]۔

ایک بار رفیع خاں باذل نے اپنا یہ شعر پڑھا۔

---

[1] ایضاً ص ۷۴۔

[2] ایضاً ص ۶۰، ۸۶۔

[3] سفینۂ خوشگو ص ۴۔

[4] دیوان ص ۹۳۔

[5] تذکرۂ حسینی ۲۲۳۔

دل داشتیم دادیم، جان بود عرض کردیم   چیزی که یار خواہد، صبر است و مانداریم۔

ناصر علی بولے میاں صاحب! کوئی اپنا شعر سنائیے۔[1] سرخوش کا بیان ہے کہ ناصر علی نے انھیں اکسایا کہ بیدل کے جواب میں اشعار کہیں[2] یہ انداز ظاہر ہے ان کے ہم عصروں کے لیے بیحد تکلیف دہ تھا چنانچہ ان پر سرقہ کا الزام لگایا گیا اور فی البدیہہ شعر گوئی کی فرمائش کر کے ان کا امتحان لیا گیا۔[3]

لیکن عرفی کے برخلاف ناصر علی متقدمین شعرا میں رومی، حافظ اور نظیری کے بہت مداح تھے حافظ ان کے محبوب شاعر تھے اور انھیں کی زمین میں ناصر علی نے اپنا جوہر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

علی امشب می شیراز درجام و سبو دارد   'الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

علی در بحر حافظ دست و پائی می زنم امشب   کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا'[4]

رومی ان کے مرشد طریقت تھے۔ ان کی مثنوی پر مثنوی رومی کی گہری چھاپ ہے۔ ایک جگہ خود کہتے ہیں:-

بہ طرز مولوی آہنگ بردار   حدیث دیگران کن پردۂ تار[5]

اساتذہ کے تتبع اور تاثر کے باوجود شاعری میں ناصر علی کا ایک منفرد طرز تھا جس کی اس دور میں بڑی وقعت تھی۔ یہ طرز پیچیدہ، متوازن، تجریدی اور فلسفیانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آسانی سے اس کا خاکہ نہیں اڑایا جا سکتا تھا۔ اس تتبع کے چکر میں بعض اپنا انداز بھی کھو بیٹھے۔ شیخ محمود حیران کے

۱؎ سفینۂ خوشگو ص ۵۶

۲؎ کلمات الشعرا ص ۱۵

۳؎ ایضاً ص ۷۵۔

۴؎ دیوان ص ۳۔

۵؎ مثنوی ناصر علی ورق ۹۔

سلسلہ میں سرخوش کہتے ہیں :-

" می خواست کہ بہ تقلید ناصر علی راہ رود، راہ اصلی خود ہم گم کردہ "[1]

اس کے برخلاف شاہ آفرین لاہوری اور آزاد بلگرامی طرز ناصر علی کے جانشین مانے جاتے ہیں[2]۔ خود ان کے شاگرد محمد عاشق ہمت، عبدالواحد وحشت، محمد احسن ایجاد، ارشد علی رسائی[3] اور سرمد سرہندی[4] میں سے کوئی عظمت کے اس بام پر نہیں پہونچ سکا۔

ناصر علی کی تصانیف میں دیوان، چند مثنویاں اور نثر کے کچھ متفرق ٹکڑے ہیں۔ مرحوم شیرانی صاحب نے ان کی تین اردو غزلوں کا انکشاف کیا ہے[5]۔

مرآۃ الخیال میں نواب شکر اللہ خاں کے نام ان کے دو خط ہیں[6]۔ ایک خط اس کے علاوہ ریاض الافکار میں درج ہے[7]۔ مجمع الانشاء میں بھی کچھ نمونے ہیں[8]۔ نواب شکر اللہ خاں کے نام جو خط ہے، وہ انانیت سے بھرپور اور خودستائی کا بہترین نمونہ ہے۔ غالباً اسی کے جواب میں نواب نے وہ خط لکھا تھا، جس کا اوپر حوالہ دیا گیا۔ ناصر علی لکھتے ہیں :-

" مرا از وکالت خود برآوردند و بہ حضرت کبریای خود تسلیم نمودند۔ سخن نام دولت

---

[1] کلمات الشعراء ص ۳۲۔

[2] سفینۂ خوشگو ص ۲۶۹۔

[3] رسائی کا انتقال دہلی میں ۱۱۴۴ھ/۳۲-۱۷۳۱ء میں ہوا۔ (سفینۂ خوشگو ص ۱۸۹)

[4] روز روشن ص ۲۸۸۔ باقی تینوں شاگردوں کا بیان آگے آئے گا۔

[5] حافظ محمود شیرانی : پنجاب میں اردو، لکھنؤ دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۶۵۔

[6] مرآۃ الخیال ص ۲۵۸۔

[7] ریاض الافکار ورق ۲۴۶، یہ خط سید لطیف کے نام ہے۔

[8] مجمع الانشا مرتبہ محمد امین (دیکھئے نمبر ۲۱۲۲)۔

داوند. مضمون ازز وال . اگر بہ پشت گرمی او شکم چون کمان بر پشت بندم، زور تن و
قوت دل بجاست و معنی لقب لشکری کہ اگر بہ عالمگیری سر برآورم، رواست . . . .
حرفی کہ بہ خاطر نگذشتہ ، فکر دنیا است و نقشی کہ در سینہ جا گرفتہ، یاد عقبی[1]"

صحائف شرائف میں ناصر علی کے چار رقعے ہیں . پہلا رقعہ ذوالفقار خاں کے نام ہے . ناصر علی
کے لڑکے علی عظیم کو جاگیر اور چار بیسی منصب ملا تھا . اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"خدمتی برای او معین باید کرد کہ از دست او برآید"

تیسرے رقعہ میں علی عظیم کے لیے مدد معاش کی درخواست ہے :-

"لہذا در خدمت گرامی مصدعم کہ قطعہ زمین . . . در قصبہ پانی پت بہم رسانند"[2]

ناصر علی کا دیوان سرخوش نے مرتب کیا[3] . اس میں غزلیں، قصیدے اور رباعیاں ہیں . مثنویات کی
تدوین اب تک نہیں ہوئی . ان کے مجموعی اشعار کی تعداد دس بارہ ہزار بتائی جاتی ہے[4] .

غزل ناصر علی کی غزلوں میں یوں تو اس دور کی تمام مصنوعی آرائشیں، ایہام، تمثیل، تلمیح وغیرہ ملتی ہیں
اور ان کے اشعار کا خاصہ حصہ بیجان اور بے روح ہے . پھر بھی ان کے یہاں خیالات اور زبان کی
عجیب دلکشی ملتی ہے . ان کی بہترین شاعری اسی مختصر حصہ میں ہے جہاں جذبہ کی شدت اور احساس
کی لطافت اپنے بے مثل امتزاج سے ایک عجیب عالم پیدا کرتی ہے . انا ان کا محبوب موضوع ہے .
جب وہ انا کی بات کرتے ہیں تو ان کا سارا وجود نغمہ و آہنگ میں ڈھل جاتا ہے اور شدت جذبات
و احساسات دو آتشہ کی طرح تیز ہو جاتی ہے . مثلاً :-

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۵۸ .

[2] صحائف شرائف ورق ۱۹۱

[3] کلمات الشعرا ص ۸۴

[4] خلاصۃ الافکار (بانکی پور) ورق ۱۱۹ - نمبر ۲۱۹ -

نیست معلوم کہ آن شوخ بہ کاشانہ کیست؛ | بہ در دل بنشنیم و یک آواز دہیم
ما گرفتاران ہستی را بہ چشم کم مبین | بوی یوسف می دہد ہر ذرہ در زندان ما
سینہ ام بر خویش می لرزد چو موج از جوش دل | سنگسار گریۂ بی اختیارم کردہ اند[1]

ناصر علی نے غزل کی اس عمارت کو جو جلال اسیر اور ان کے ہمکاروں کے ہاتھوں خستہ ہوری تھی پھر سے اٹھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے جو مسالا استعمال کیا وہ بہت پائدار نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے جس خلوص اور لگاؤ سے غزل کے احیا کی کوشش کی، اس کا نتیجہ ضرور نکلا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ فلسفہ کی پیچیدگی اور تخیل کی گہرائی کے باوجود خلوص اور جذبات کی گرمی سے غزل کا حسن باقی رکھا جا سکتا ہے۔ بیدل اور غنی دونوں کے یہاں ایک ہموار دھیما پن ہے۔ مگر ناصر علی کے یہاں خیال اور زبان دونوں میں پر خلوص جوش ہے اور یہی ان کے فن کا کمال ہے۔ والہ داغستانی کا یہ خیال بے بنیاد ہے کہ ان کے کلام میں شتر گربہ ہے[2]۔ ذیل میں ناصر علی کی ایک غزل درج کی جاتی ہے:

کہ بر شیخ و برہمن دارد احسانی کہ من دارم | چراغ کعبہ و دیر است ایمانی کہ من دارم
دلی دارم جواہر خانہ اشک است تحویلش | کہ دارد زیر گردون میر سامانی کہ من دارم
بہ دست آوردہ ام دل را زاسمائم چہ می پرسی؛ | ہمہ تصویر معشوقی است قرآنی کہ من دارم
جہان تنگ است بیرون رفتن آسان است مردان را | دم از آہو جدا شد در بیابانی کہ من دارم
علی من می شناسم این کہن دزدان حکمت را | فلاطون آہ اگر می دید یونانی کہ من دارم[3]

مثنوی | مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی ناصر علی کا رتبہ کچھ کم نہیں۔ بلکہ ان کی مثنوی ہندوستانی

---

[1] دیوان ص ۸۱، ۹۱، ۴۷۔

[2] ریاض الشعرا (علی گڑھ) ورق ۲۷۵۔

[3] دیوان ص ۷۴۔

کی بہترین فارسی مثنویوں میں بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔ بظاہر اس مثنوی کا کوئی خاص عنوان نہیں ہے اور عموماً مثنوی ناصر علی کہلاتی ہے[1]۔ اس کی صحیح تاریخ تصنیف کا بھی علم نہیں۔ ریو[2] کا بیان ہے کہ یہ مثنوی ناصر علی نے اپنی عمر کے ۵۲ ویں سال یعنی ۸۹/۱۱۰۰-۱۶۸۸ء میں لکھی۔ دار المصنفین اعظم گڈھ کے ایک مخطوطہ کی تاریخ محرم ۳۰ جلوس اورنگزیب (۱۰۹۸/نومبر ۱۶۸۶) ہے[3]۔ بہرحال یہ مثنوی ۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اسی سال ناصر علی نے یہ مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی کو دکھائی تھی اور انھوں نے اس کے دو شعروں میں کچھ تبدیلی تجویز کی تھی[4]۔ اس شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ناصر علی کے بڑھاپے کی تخلیق ہے

به پیری می کند عشقم همان شور   چو صبحم بخیه ای بر روی ناسور[5]

کہا جاتا ہے کہ مثنوی ناصر علی کے دو دفتر ہیں۔ پہلا دفتر یعنی موجودہ مثنوی بحر ہزج میں، اور دوسرا بحر رمل یعنی مثنوی معنوی کی بحر میں ہے[6]۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ناصر علی نے اس دور کے اور شعرا کی طرح ممکن ہے کئی مثنویاں لکھنے کا پروگرام بنایا ہو۔ کیونکہ ایک مخطوطہ میں تیسرا دفتر بھی ہے۔ اس کی بحر بھی مختلف ہے۔ اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے[7]:

به نام خداوند ناز آفرین   جگرهای عاشق گداز آفرین

---

[1] ریو ۲/۶۹۹ کے ایک مخطوطہ میں اس کا عنوان 'مثنوی لطف کش ساغر ازلی' ہے۔

[2] ایضاً

[3] معارف نومبر ۱۹۶۸ء۔

[4] سرو آزاد ص ۳۶۰

[5] مثنوی ناصر علی ورق ۸

[6] مثنوی ناصر علی دفتر دوم (نیشنل میوزیم نمبر ۳۰۳۹)

[7] ایضاً

خلاصۃ الکلام میں ان کی ایک اور مثنوی دلکش کا انتخاب شامل ہے[ا] ۔ اس کے علاوہ ان کی ایک مثنوی کشمیر پر ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

خدایا روز بیم کن سوز دردی | کہ دریا بم خزان و رنگ زردی[۲]

ان تمام مثنویوں میں صرف پہلی مثنوی شاعری کے اعتبار سے قابل قدر اور بلند پایہ ہے۔ اس کے ابتدائی شعر کے بارے میں سرخوش نے ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب ناصر علی نے یہ شعر کہا :-

الہی ذرۂ دردی بہ جان ریز | شرر در پنبہ زار استخوان ریز

تو ان کے ایک دوست نے اس کی یہ اصلاح فرمائی :-

الہی ذرۂ دردی بہ تن ریز | شرر در پنبہ زار موی من ریز[۳]

مثنوی ناصر علی میں تغزل اور ترنم کے ساتھ ساتھ ایک ایسا مستقل آہنگ ہے جو اس کی روانی اور تسلسل کو کہیں سے گم نہیں ہونے دیتا ۔ اور خصوصاً جب شاعر انا کا ساز چھیڑتا ہے تو یہ آہنگ اور بھی بلند اور جاندار ہو جاتا ہے ۔ مثلاً

سخن را آفریدم ، جان دمیدم | بہ اقرار خدایی برگزیدم
الستی سر زد از من او بلی گفت | منش یا عبد، او یا ربنا گفت
بہ جایی پایۂ معنی رساندم | کہ من ہم از خیالش باز ماندم
جراحت زار عشق است این رقم نیست | صدای تیغ می آید، قلم نیست
سماع از وجد بسمل می تراشم | دل از کیفیت دل می تراشم[۴]

[ا] بانکی پور ۸/۱۴۳ ۔

[۲] ریو ۲/۷۰۰

[۳] کلمات الشعراء ص ۷۷ ؛

[۴] مثنوی ناصر علی ورق ۳۹ ۔

لوگوں نے اس مثنوی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے باقاعدہ درس میں شامل کر لیا گیا[1]۔ اس کی شہرت ہندوستان کے باہر ایران اور بغداد تک پہونچی اور خاص طور پر بغداد میں اسے ہندوستانی فارسی شاعری کا بہترین نمونہ تصور کیا جاتا تھا[2]۔ اس طرز پر اور مثنویاں بھی لکھی گئیں جن میں خواجہ محمد عاقل کی مرآۃ الجمال خاص طور پر قابل ذکر ہے[3]۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

بہ نام آن کہ دارم در کنارش	دلی خون گشتہ ام از انتظارش
از و ہر ذرہ ای پیمانہ دید	از و ہر شبنمی فانوس خورشید
تہی در سینۂ ہر ذرہ جا لیش	نمی دانم کجا باشد سرایش؟
ہمان آتش کہ زد بر سینۂ طور	تراوش کردہ باز از جوی منصور
زلیخا را اگر تابی است در دل	بود در پای یوسف ہم سلاسل[4]

عشق خداوندی کے ساتھ ساتھ عشق محمدی کی یہ شدت دیکھئے :۔

بہ مہرش از دو عالم پیش رفتم	محمد گفتم و از خویش رفتم[5]

ناصر علی کی دوسری مثنوی (یا دوسرے دفتر) میں نہ یہ جوش بیان ہے اور نہ شدت جذبات اس میں شاعر نے امام ابو حنیفہ، شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ معین الدین چشتی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، شیخ حمید الدین اور دوسرے صوفیہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

بو حنیفہ دین جعفر داشتہ	سکہ اش از فقہ اکبر داشتہ

---

[1] حاکم لاہوری : مردم دیدہ، مرتبہ ڈاکٹر سید عبد اللہ، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۲۲۔

[2] خزانہ عامرہ، ص ۳۳۰۔

[3] سفینۂ خوشگو ص ۸۲، ۸ / ۱۔ عاقل کا تخلص ہندی میں بدھ ونت تھا۔ ان کا ۱۱۴۳ / ۳۱-۱۷۳۰ء میں انتقال ہوا۔

[4] مثنوی ناصر علی ورق ۴۔

[5] ایضاً ورق ۲۶۔

پیر جیلان خود قلندر بودہ است | ساقی صہبای کوثر بودہ است
ای معین الدین! امام انس و جان | ای تو خورشید زمین و آسمان
آن نصیر الدین چراغان کردہ است | قطب دہلی گل ثنا آوردہ است[1]

جنجی کے شاہ حمید الدین کی منقبت میں پرجوش اشعار آزاد نے یہیں سے نقل کئے ہیں:۔

اینک اینک ساقی شیرین رسید | نوبت جام حمید الدین رسید
حلقہ درگاہ بیچون جام او | از زمین تا آسمان در دام او
جام او خورشید ربانی بود | انجمن افروز سبحانی بود[2]

عاقل خاں رازی

عاقل خاں رازی جن کی محبت کے بے بنیاد افسانے شہزادی زیب النساء سے منسوب کئے جاتے ہیں، اس دور کے شعراء میں دنیاوی جاہ و حشمت کے لحاظ سے سب سے بلند پایہ اور قابل رشک تھے۔ ان کا نام میر عسکری[3]، والد کا نام سید محمد تقی اور دادا کا نام سید محمد قاسم تھا۔[4] ان کا آبائی وطن خواف، (خراسان) تھا[5]۔ مگر ان کی پیدائش اور تربیت ہندوستان میں ہوئی۔[6]

---

[1] مثنوی ناصر علی دفتر دوم (نیشنل میوزیم نمبر ۳۰۳۹) ورق ۲۰۲۱، ۲۶۰۲۳
[2] سرو آزاد ص ۱۳۰
[3] یہ نام تقریباً سبھی تذکروں میں ہے مگر خود انھوں نے ثمرات الحیاۃ (سالار جنگ نمبر ۳۸) ورق ۱ میں میر علی عسکری لکھا ہے۔
[4] بوڈلین نمبر ۱۱۴۸
[5] سفینۂ خوشگو ص ۱۳۔ رازی کہتے ہیں: مرا در دفتر دیوان ایام | تخلص رازی است و عسکری نام
بہ ہندوستان اگرہستم تخم باف | ولیکن تار و پودم ہست در خواف (بہرداد ورق ۱۱)
[6] بانکی پور ۳/۱۶۹

انھوں نے اپنا تخلص اپنے مرشد حضرت برہان الدین راز الٰہی کے لقب کی مناسبت سے اختیار کیا تھا.

تخلص بہتر از رازی چہ خواہی   چو باشد مرشدت راز الٰہی[1]

عاقل خاں رازی اورنگزیب کی تخت نشینی سے پہلے اس سے وابستہ تھے. وہ دکن کی گورنری کے زمانے میں اورنگزیب کے بخشی دوم تھے[2]۔ جب تخت نشینی کی جنگ کے سلسلہ میں اورنگزیب نے شمالی ہند کا رخ کیا تو عاقل خاں رازی کو اورنگ آباد کی دفاع سپرد کی تھی. تخت نشینی کے بعد اورنگزیب نے انھیں دربار میں بلا لیا اور عاقل خاں کا خطاب عطا کیا[3]. انھیں دوآب کا فوجدار بنا کر بھیجا گیا[4]. لیکن تیسرے سن جلوس ۱۰۷۰-۷۱/ ۱۶۶۰-۶۱ میں[5] انھیں خرابی صحت کی بنا پر سبکدوش کر دیا گیا. انھیں نو ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا اور لاہور میں رہنے کی اجازت دی گئی[6]۔ چھٹے سن جلوس ۱۰۷۳-۷۴/ ۱۶۶۳-۶۴ میں جب اورنگزیب کشمیر سے واپس آتے ہوئے لاہور ٹھہرا تو عاقل خاں رازی کو داروغہ غسل خانہ کے عہدہ پر بحال کیا اور دو ہزاری منصب عطا کیا[7]۔ تین سال کے بعد ان کے عہدہ میں پانصدی کا

---

[1] رازی: مثنوی مہر و ماہ (علی گڑھ) ورق ۹۲. شیخ برہان الدین راز الٰہی شیخ حسنی کے خلیفہ اور شطاریہ سلسلہ کے ایک بلند مرتبہ صوفی تھے. اورنگزیب عہد شہزادگی سے ان کا معتقد تھا. ان کا وصال ۱۰۸۳/ ۱۶۷۲-۷۳ میں ہوا. (ثمرات الحیاۃ ورق ۲؛ نشتر عشق ص ۶۸۴)

[2] مآثر الامرا ۲/ ۸۲۱ -

[3] محمد کاظم: عالمگیر نامہ، کلکتہ، ۱۸۶۸، ص ۴۲ - ۴۳ -

[4] ایضاً ص ۴۱۶، ۴۷۸ -

[5] یہ سبکدوشی ۱۰۷۱/ ۱۶۶۰-۶۱ میں ہوئی جیسا کہ خوافی خاں (منتخب اللباب، کلکتہ ۱۸۶۹-۷۴، ج ۲/ ۱۲۷) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے. مآثر الامرا (۲/ ۸۲۱) نے یہ سبکدوشی چوتھے سن جلوس (۱۰۷۱-۷۲) میں لکھی ہے.

[6] عالمگیر نامہ ص ۶۴۳. بقول خوافی خاں (۲/ ۱۲۷) یہ رقم پچاس ہزار تھی اور بقول مآثر الامرا (حوالہ بالا) دس ہزار روپیہ. لیکن مآثر عالمگیری (ص ۳۷) نے صرف یہ لکھا ہے "بہ سالانہ ہزار روپیہ موظف گشت"؟

[7] عالمگیر نامہ ص ۸۴۳، ۸۵۱ -

اضافہ ہوا۔[1] لیکن بارہویں سن جلوس ۸۰-۱۰۷۹/۱۶۶۹ میں انھیں پھر معزول کر کے بارہ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔[2] تقریباً دس سال تک رازی کو کوئی سرکاری عہدہ نہیں ملا۔ آخر کار ربیع الثانی ۱۰۹۰/مئی ۱۶۷۹ میں انھیں بخشی تن کا عہدہ ملا[3] اور اس کے اگلے سال انھیں دہلی کی گورنری اور چار ہزاری منصب دیا گیا۔ سرخوش کے ایک ہجویہ قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸-۱۰۹۷/۸۷-۱۶۸۵ میں انھیں اضافہ ہزاری ملا تھا۔[4] رازی اسی عہدہ پر اپنی وفات تک قائم رہے۔ ان کی وفات ربیع الثانی ۱۱۰۸/اکتوبر ۱۶۹۶ میں ہوئی اس وقت ان کی عمر بیاسی سال کی تھی۔[5]

جیسا کہ عرض کیا گیا عاقل خاں رازی اورنگزیب کے عہد شاہزادگی سے اس کے معتمد رفیقوں میں تھے، اور بعض نجی معاملات میں بھی وہ اورنگزیب کے ہمراز تھے۔ ایک بار اورنگزیب بہت اداس تھا غالباً یہ زین آبادی کی وفات کا واقعہ تھا۔ اس نے یہ شعر پڑھا:۔

نالہ ہای خانگی دل را تسلی بخش نیست — در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ زد

رازی نے جواب دیا:۔

عشق چہ آسان نمود، آہ چہ دشوار بود! — ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آسان گرفت!

---

[1] عالمگیرنامہ ص ۹۸۱

[2] مآثر الامرا ۸۲۲/۲۔ مآثر عالمگیری (ص ۱۵۳) کا بیان ہے کہ یہ رقم ۱۰۸۷ (۷۷-۱۶۷۶ء) میں منظور ہوئی۔

[3] مآثر عالمگیری ص ۱۷۶۔ اس تقرری پر رازی نے اورنگزیب کی خدمت میں جو شکریہ لکھا تھا وہ ریاض الافکار (ورق ۲۹) میں درج ہے۔

[4] مآثر عالمگیری ص ۱۹۵؛ ید بیضا (علی گڑھ) ص ۱۰۳؛ کلمات الشعرا ص ۲۴، ۲۵۔

[5] سفینۂ خوشگو ص ۱۳۔ ید بیضا (حوالہ بالا) اور مآثر الامرا (۸۲۳/۲) میں سال وفات ۱۱۰۷ھ درج ہے۔ مگر خوشگو کی تائید بیدل کی ایک غزل سے ہوتی ہے جس کے ہر مصرعہ سے ۱۱۰۸ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں:۔

"وای پیوند سخن سنجان نماند — تکیہ گاہ صاحب عرفان نماند"

(سفینہ ص ۱۳)۔

اورنگزیب شعر سن کر پھڑک اٹھا، پوچھا کس کا شعر ہے؟ رازی نے استعارتاً کہا "اس کا جس نے آپ کے حضور اپنے آپ کو کبھی شاعر نہیں بتایا"۔[1]

ان دیرینہ تعلقات کی بنا پر اورنگزیب رازی کی بعض کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ ایک بار مہابت خاں گورنر لاہور (م۔ ۱۰۹۹/۸۸-۱۶۸۷) نے لال قلعہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، وہ اپنے ساتھ شاہی اجازت نامہ لایا تھا، مگر عاقل خاں رازی نے صاف انکار کر دیا اور اسے قلعہ نہیں دکھایا۔[2] ایک بار وزیر اعظم اسد خاں کے بھتیجے مرزا مفاخر نے عاقل خاں کے ساتھ کوئی گستاخی کی۔ اسد خاں نے فوراً انھیں ایک خط لکھ کر معافی مانگی اور انھیں عہد شاہجہاں سے اپنے تعلقات کا واسطہ دلایا۔[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رازی کے جاہ و جلال کے سامنے دوسروں کا چراغ کم جلتا تھا۔

ان بھاری مصروفیات کے باوجود رازی نے نظم اور نثر میں جو ممتاز تصانیف چھوڑی ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعر و ادب سے انھیں والہانہ وابستگی تھی۔ تصوف کے رموز پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا شمار مثنوی معنوی کے بہترین مفسروں میں ہوتا تھا۔ انھیں کے ایما پر ان کے داماد شکر اللہ خاں نے مثنوی رومی کی شرح لکھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ خود بیدل اپنے ذوق تصوف کے لیے رازی کے ممنون تھے۔[4] جب وہ بیدل کے کسی شعر کی تعریف کرتے تھے تو وہ سر وقد کھڑے ہو کر تعظیم کرتے تھے۔[5]

---

[1] مآثر الامرا ۱/۷۹۱۔ مرآۃ الخیال (ص ۲۵۴) نے نام نہیں دیا ہے۔ زین آبادی کا واقعہ احکام عالمگیری حمید الدین (ص ۶) میں بھی درج ہے مگر اس میں حقیقت سے زیادہ افسانہ معلوم ہوتا ہے (ملاحظہ ہو: سید نجیب اشرف ندوی: مقدمہ رقعات عالمگیر، اعظم گڑھ ص ۱۵۵)

[2] مآثر الامرا ۳/۶۲۷۔

[3] احکام عالمگیری (انگریزی ترجمہ سر جدو ناتھ سرکار، کلکتہ ۱۹۴۹ء) ص ۹۹۔

[4] سفینۂ خوشگو ص ۱۳۔

[5] نشتر عشق ص ۶۸۴۔

نظم و نثر میں رازی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

نظم :-

۱- مثنوی مہر و ماہ یا منوہر و مدھومالت

۲- مثنوی شمع و پروانہ یا پدماوت

۳- مرقع

۴- دیوان

نثر :-

۱- وقائع عالمگیری (عہد اورنگزیب کے پہلے پانچ سال کی تاریخ)

۲- ثمرات الحیات (حضرت برہان الدین راز الٰہی کے ملفوظات کا مجموعہ)

۳- کشکول

۴- رسالہ امواج خوبی

۵- نغمات العشق -

ان میں امواج خوبی کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ رسالہ تصوف پر مشتمل تھا، مرقع اسی کی منظوم شکل ہے[1]۔ سرخوش نے رازی کی ایک اور تصنیف گل و بلبل کا ذکر کیا ہے[2]۔ صحائف شرائف میں رازی کے چھ خط درج ہیں۔ ان میں ایک خط ان کے پیر کے نام ہے۔ جس میں لکھتے ہیں :

"ہمین برادر این کہین مرید با مول حصول وصول بآن درگاہ ہدایت دستگاہ است"[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رازی کے خاندان کے دوسرے افراد غالباً شیخ سے بیعت تھے۔ ایک

---

[1] کلمات الشعرا ص ۴۰

[2] ایضاً

[3] صحائف شرائف ورق ۷۳ ۔

خطا استعفا پر مشتمل ہے۔ یہ غالباً دوسری سبکدوشی (۶۹/۱۰۷۹ - ۱۶۶۸) سے متعلق ہے۔ کیونکہ رازی لکھتے ہیں کہ اب میری عمر پچاس سے متجاوز ہو چکی ہے:۔

"این پیر کثیر التقصیر کہ سال عمرش از پنجاہ متجاوز گشتہ، الحمد للہ کہ در دعاگویی نشینان این درگاہ گذشتہ۔ اکنون کہ قوت اکتساب کہ با عہد شباب بستہ بود، رفتہ و حرص جمعیت اسباب کہ در دل خراب نشستہ بود، برخاستہ۔ نہ در دل قوتی و نہ در قوت دلی، مزاج منحرف از استقامت، علاج منحصر در عزلت و ندامت۔ چون این معنی ۔ ۔ ۔ ۔ در خاطر جا کردہ، اجازت اجابت این خطرہ لازم است"[1]

رازی کا دیوان مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ساقی نامہ، خمار نامہ، ترجیع بند شیخ برہان الدین کی مدح میں قصیدہ اور عزیزوں کی وفات پر قطعے ہیں[2]۔ بیخبر کا بیان ہے:۔

"دیوانش را سیر کردم، ابیاتش ہمہ بر طور متقدمین یافتم"[3]

اور والہ داغستانی کے خیال میں:۔

"شعرش چندان نمک ندارد"[4]

رازی بنیادی طور پر عشقیہ مثنوی کے شاعر تھے۔ اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے ان مثنویوں کو "بے مزہ"[5] اور "از فصاحت افتادہ"[6] کہہ کر ٹال دیا ہے مگر ان کی دلکشی اور رعنائی میں شک نہیں ہے۔ الخصوص

---

[1] ایضاً ورق ۷۲۔

[2] بوڈلین نمبر ۱۱۴۸۔

[3] سفینۂ بیخبر ص ۱۱۸۔

[4] ریاض الشعرا (علی گڈھ) ورق ۱۵۹

[5] کلمات الشعرا ص ۴۰

[6] مخزن الغرائب (علی گڈھ) ورق ۱۴۸۔

نے ہندوستانی قصوں کا موضوع اپنایا اور اپنے ذوق تصوف اور ذوق سلیم سے اس میں حسن اور جاذبیت پیدا کی۔

مہر و ماہ رازی کی پہلی مثنوی مہر و ماہ منوہر اور مدھومالتی کی داستان عشق پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۶۵/ ۵۵-۱۶۵۴ یعنی اورنگزیب کی تخت نشینی سے تقریباً تین سال پہلے ہے۔

زہجرت یک ہزار و شصت و پنج است | کزین غم نامہ طبعم نکتہ سنج است
چو من زین داستان از غم زدم دم | بخوان تاریخ آن 'دیباچۂ غم'[1]

غالباً اسی وجہ سے بعض مخطوطات میں اس مثنوی کا نام غم نامہ بھی ہے۔[2] چونکہ مثنوی میں منوہر اور مدھومالتی کے نام بالترتیب مہر اور ماہ سے تبدیل کر دیئے گئے ہیں، اس لئے اسے مثنوی مہر و ماہ کہا گیا ہے۔

کنم عشق منوہر را کتابی | دہم از نام مہر آن را خطابی
نوای حسن مدھمالت سرایم | ولی از پردۂ ماہش نمایم[3]

رازی کی تصانیف میں مہر و ماہ کی اہمیت علاوہ ایک جذباتی داستان عشق کے اس لئے بھی ہے کہ اس سے شاعر کے حالات زندگی، اس کے عقائد اور ہندوستان سے اس کی گہری وابستگی پر روشنی پڑتی ہے۔ رازی شطاریہ سلسلہ کے مرشد شیخ برہان الدین راز الٰہی سے بیعت تھے۔ انھوں نے ثمرات الحیات میں شیخ کے ملفوظات جمع کئے ہیں۔ یہاں وہ اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

خطابش در جہان راز الٰہی است | بہ چشمش جلوہ گر اشیا کماہی است
چو در ملک دکن قطب زمان است | دکن ولکش تر از ہندوستان است

---

[1] مہر و ماہ۔ (علی گڑھ) ورق ۹۲۔

[2] بانکی پور ۱۶۹/۳؛ ایتھے نمبر ۱۶۳۴ میں اس کا عنوان 'قصہ عشق' ہے۔

[3] مہر و ماہ ورق ۷

ز نور اوست برہانپور معمور — ہمیشہ باد این معمورہ پر نور
مرا تا علم و عقلم رہنمون بود — مسلمانی ندانستم کہ چون بود؟
چو رو بر خاک درگاہش نہادم — نقاب از عارض ایمان گشادم[1]

یہ رازی کی ہندوستان سے محبت تھی کہ انھوں نے ہندوستانی قصوں کو فارسی میں نظم کیا حالانکہ وہ نسلاً خراسانی تھے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ ہندوستان کی دلکشی ایرانیوں کا دل اس طرح موہ لیتی ہے کہ وہ واپس اپنے وطن نہیں جانا چاہتے :-

سواد چشم و رنگ روی ہندو — بود دلبند چون گیسوی ہندو
ازآن ہر کس بہ ہند آمد سفر ساز — بہ ملک خویشتن کمتر رود باز[2]

وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ہندوستان کے فارسی اساتذہ کی عظمت ایران والوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کا اپنا ایک منفرد انداز ہے جس کی بہر حال قدر کرنی چاہیے :-

بسا آئینۂ روشن ضمیران — ز ہند انداختہ پرتو بہ ایران
سواد ہند را گر نکتہ دانی — سیاہی دان ز افواج معانی[3]

رازی سے کم و بیش ایک سو تیرہ سال پہلے ۹۵۲/۱۵۴۵ء میں شیخ منجھن نے ہندی میں مدھو مالتی کا قصہ نظم کیا تھا[4]۔ رازی نے شیخ منجھن کا صراحتہً نام نہیں لیا ہے مگر وہ اپنی مثنوی کا ماخذ "لوح ہندوی" کو بتاتے ہیں :-

ز لوح ہندوی کاین نسخۂ راز — بہ نقش فارسی شد جلوہ پرداز

---

[1] مہر و ماہ ورق ۳۰۴۔

[2] ایضاً ورق ۶

[3] ایضاً ورق ۹۲

[4] مدھو مالتی منجھن مرتبہ ڈاکٹر شیو بال مصرا، بنارس ۱۹۴۷، (دیباچہ)

مرادم ذکر عشق است ای وفاکیش بود در عہدہ راوی کم و بیش[1]

اسی طرح وہ شیخ نور محمد کی مثنوی منوہر و مدھومالتی کا ذکر بھی نہیں کرتے جو ۱۰۵۹/۱۶۴۹ء میں مکمل ہو چکی تھی۔[2]

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ منوہر کنیسر کے راجہ سورج بھان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یہ پیشین گوئی کی گئی کہ وہ عمر کے چودھویں سال میں کسی خطرہ کا شکار ہوگا۔ راجہ اسے بچا بچا کر پالتا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو ایک رات کھلی چھت پر سو رہا تھا۔ ادھر سے پریوں کا ایک قافلہ گذرا۔ وہ منوہر کو اٹھا لے گیا اور اسے رائے بکرم کی لڑکی مدھومالتی کی خوابگاہ میں پہونچا دیا۔ منوہر کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے پہلو میں ایک حسین لڑکی دیکھی۔ اس نے نام پوچھا تو لڑکی بولی۔

بود مدھمالتی نامم درین عصر بہ رغم چرخ خود کامم درین عصر[3]

منوہر نے عالم وجد میں رات گذاری۔ صبح ہونے سے پہلے پریوں نے اسے واپس اس کے محل پہونچا دیا۔ نوجوان شہزادہ عشق کے اس تجربے کے بعد محل میں کہاں ٹکتا۔ وہ گھر چھوڑ کر جنگل نکل گیا۔ وہاں اتفاق سے اس کی ملاقات مدھومالتی کی رشتہ دار بہن پیما (پریما) سے ہوئی جسے ایک دیو نے گرفتار کر رکھا تھا منوہر نے پیما کو دیو کے چنگل سے چھڑایا اور اس کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ پیما نے بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق کے وصال کا انتظام کیا۔ منوہر نے جب مدھومالتی کو آتے ہوئے دیکھا تو:

زجا برخاست لیک از پا در افتاد ازان شوری کہ او را در سر افتاد
چو جانش شد بہ استقبال جانان چسان برخیزد از جا جسم بیجان؟[4]

---

[1] مہر و ماہ ورق ۹۱۔

[2] ریو ۲/ ۷۰۰، ۸۰۳؛ بوہار نمبر ۳۹۵۔ ریو کے مخطوطہ میں شاعر کا نام نہیں ہے۔ یہ نام موخر الذکر مخطوطہ کے ترقیمہ میں درج ہے۔

[3] مہر و ماہ ورق ۱۶

[4] ایضاً ورق ۵۲۔

مدھومالتی فوراً آگے بڑھی۔ اور منوہر کو سہارا دیا۔ اور ساری رات اس کے ساتھ گذاری:۔

بہ دست جان سرش بگرفت جانان	بہ پہلو جای گردش چون بہ تن جان
کشیدش مہر چون مستان در آغوش	چو جان و دل بہم گشتند مدہوش[۱]

جب مدھومالتی کی ماں کو اس عشق کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے جادو کے زور سے مدھومالتی کو چڑیا بنا دیا اور ایک پنجرے میں قید کر دیا۔ اتفاق سے موقع پا کر چڑیا فرار ہوگئی اور اڑتے اڑتے دہلی کے رئیس تاراچند کی حویلی میں پہونچی۔ تاراچند اسے لیکر اس کی ماں کے پاس آیا اور ماں نے بیٹی کی اصلی شکل بحال کر دی۔ اس کے بعد منوہر کی شادی مدھومالتی سے اور تاراچند کی شادی پیاسے ہوگئی:۔

روان مہ را بر خورشید خواندند	گہی اشلوک و گاہی بید خواندند
نخستین گوشۂ دامان ایشان	بہم بستند تا نبود پریشان
پس آنگہ آتشی کردند نایر	بہ گردش آن دو کس گشتند دایر[۲]

مثنوی مہر و ماہ میں ۱۸۵۰ اشعار ہیں۔ پوری مثنوی عشق کے نغمہ سے بھرپور اور رازی کی فنکاری سے معمور ہے۔ رازی اصلاً عشق کے شاعر تھے۔ ان کا اصل کمال عشقیہ شاعری میں ہے۔ مثنوی مہر و ماہ کو غالباً اسی وجہ سے قصہ عشق بھی کہا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

الا ای سامع افسانۂ عشق!	بنوش این جرعہ از خمخانۂ عشق
درین میخانہ خوبان می فروشند	زیک پیمانہ خم نوشان بجوشند
یکی از جرعہ ای مست اوفتادہ	یکی پیمانہ در دست اوفتادہ
یکی پیمانہ و مینا شکستہ	زجا رفتہ بہ پای خم نشستہ
تو ہم رازی درین میخانہ گم شو	جشیدی جرعہ ای، رو ہمچو خم شو[۳]

---

[۱] ایضاً،

[۲] ایضاً، ورق ۸۱-۸۰۔

[۳] ایضاً ورق ۸-۷۔

فارسی میں قصہ مدھومالتی کی ایک نثری روایت بھی ملتی ہے۔ مگر اس کے مصنف یا تاریخ کا علم نہیں[۱]۔ آصفیہ لائبریری میں الجھا رام لالہ کی ایک مثنوی منوہر و مدھومالت ہے[۲]۔

شمع و پروانہ رازی کی دوسری مثنوی شمع و پروانہ چار سال بعد ۱۰۶۹/۵۹-۱۶۵۸ء میں مکمل ہوئی۔

سال ہجرت ہزار و شصت و نہم — ہست اکنون ز دور این طارم[۳]

شمع و پروانہ میں پدماوت کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کا ماخذ ملک محمد جائسی کی مشہور نظم پدماوت ہے مگر رازی نے جائسی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ صرف قصہ پرداز ہندی کہا ہے:

محرم راز شمع و پروانہ[۴] — قصہ پرداز ہندی افسانہ

پدماوت کی داستان مشہور ہے۔ فارسی اور ہندی داستان میں جزوی اختلافات کا ہونا لازمی ہے۔ اس مثنوی میں بھی رازی کی رومانی شاعری اپنے پورے جمال و کمال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن مہر و ماہ کے مقابلہ میں شمع و پروانہ جوش بیان اور شدت جذبات کے لحاظ سے کچھ ہلکی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار پدمنی کے حسن سے متعلق ہیں:

از جالش شدہ علم افراز	مہر و مہ، روز و شب، نشیب و فراز
ہندوی ہست صد خدنگ بہ دست	چشم او صید گیر آہوی مست
لب او چشمہ ای ز آب حیات	دہن تنگ او چو تنگ نبات
ورق زر بود ولی خوشبوی[۵]	بدن آن نگار مشکین بوی

---

[۱] ایتھے نمبر ۸۰۳ (دج)، نیز آصفیہ ۲/ ۱۴۹۰ نمبر ۱۶۴

[۲] فہرست کتب خانۂ آصفیہ (فن جدید) نمبر ۵۰۴۴۔

[۳] شمع و پروانہ (پدماوت)، سالار جنگ نمبر ۶۱۷، ورق ۶۴

[۴] ایضاً ورق ۴

[۵] ایضاً (حبیب گنج علی گڑھ) ورق ۱۳-۱۲۔

رازی نے پدماوت کی داستان عشق سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ لوح عالم پر صرف عشق کو ہی ثبات ہے، باقی ساری چیزیں فانی ہے :۔

رازیا درجہان بہ روی زمین ۔۔۔ نہ رتن ماند نی علاء الدین

نی پدم ماند نی جمال پدم ۔۔۔ برد باخود رتن خیال پدم

لیک از عشق داستانی ماند ۔۔۔ زان وفا پیشگان نشانی ماند

نام او ثبت شد بہ لوح ابد ۔۔۔ ذکر او می رسد بہ گوش خرد

ہشت صد سال شد ز عشق رتن ۔۔۔ لیک این داستان نگشتہ کہن[1]

فارسی میں سب سے پہلے عبدالشکور بزمی (م ۔ ۱۰۷۳/۶۳-۱۶۶۲) نے داستان پدماوت نظم کی۔ بزمی کی مثنوی عہد جہانگیر میں ۱۰۲۸/۱۹-۱۶۱۸ میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد ۱۰۷۱/۶۱-۱۶۶۰ء میں حسام الدین نے حسن و عشق کے نام سے اور حسین غزنوی نے یہی داستان نظم کی۔[2] میر عبدالجلیل بلگرامی نے اسے مخلوط ہندی اور فارسی میں منتقل کیا۔[3] نثر میں پدماوت کی دو روایتیں ملتی ہیں۔ ایک لچھمی رام ابراہیم آبادی کی فرح بخش ہے[4]۔ دوسری روایت کے نام اور مصنف کا پتہ نہیں۔[5]

مرقع

رازی کی تیسری مثنوی مرقع مثنوی رومی کی بحر اور طرز میں ہے۔ مرقع کے سال تصنیف کا علم نہیں۔ اس سے پہلے رازی نے تصوف کے نکات پر نثر میں ایک رسالہ امواج خوبی لکھا

---

[1] شمع و پروانہ (سالار جنگ نمبر ۶۱۷) ورق ۶۴۔ آخری شعر تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ علاء الدین نے ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ چتوڑ پر حملہ کیا تھا۔

[2] ایتھے نمبر ۱۵۸۲۔

[3] ریو ۳/۱۰۳۶

[4] ایضاً ۲/۷۶۸

[5] ایتھے نمبر ۱۶۳۶۔

تھا۔ مرقع میں تقریباً اسی کے مضامین منظوم کر دیئے گئے ہیں۔ مثنوی میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں اور قصے ہیں۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :۔

ایہا الساقی افثنی فی الغمام اسقنی من جرعۃ الکاس الکرام[۱]

علی گڈھ یونی ورسٹی لائبریری میں رازی کی ایک اور مختصر مثنوی بعنوان قصۂ لدھا فقیر موجود ہے[۲]۔ لیکن یہ مرقع کا جزو ہے[۳]۔ یہ ایک درویش کا قصہ ہے۔ جس کا نام لدھا تھا۔ لدھا اپنی خانقاہ میں دنیا سے الگ تھلگ رہتا تھا۔

بود در ہندوستان دل خستہ ای ۔ خستہ ای از بند دنیا رستہ ای

ہر غریبی کامدی از راہ دور یافتی در تکیہ گاہ او حضور

بود لدھا نام آن آزاد مرد عشق با آن ناتوان پیکر چہ کرد؟[۴]

ایک دن خانقاہ میں ایک دلھن کی ڈولی آکر رکی اور تھوڑا دم لیکر چل دی۔ اتفاقاً لدھا نے دلھن کا جلوہ دیکھ لیا اور وہ اتنا محو ہوا کہ جب ڈولی چلی تو لدھا ایک پیڑ پر چڑھ کر دیر تک اسے نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیسے ہی ڈولی اوجھل ہوئی، لدھا زمین پر گر پڑا اور دم توڑ دیا۔

جان پاکش ناقۂ معشوق راند جسم خاکش خاکسار افتادہ ماند

ادھر لڑکی کا حال اچانک بدلا اور اس نے فرمائش کی کہ ڈولی واپس خانقاہ لے جائی جائے۔ جب واپس پہونچ کر اسے معلوم ہوا کہ درویش کو دفنایا جا چکا ہے تو وہ اس کی قبر پر بے اختیار گر پڑی۔ اتفاقاً قبر شق ہو گئی اور لڑکی درویش کی آغوش میں سما گئی :۔

۱۔ مرقع (بانکی پور نمبر ۶۹۵)، ورق ۱

۲۔ علی گڈھ سلیمان نمبر ۴۳-۷۴۳ - (۱۸-۱۹)

۳۔ مرقع ورق ۷

۴۔ مرقع ورق ۸ -

آن سمن بر رفت خندان در لحد   شد فراہم خاک از حکم احد

لاجرم دست تصرف داشتند   ہر دو را بر حال شان بگذاشتند[1]

مرقع تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ غالباً اسی کی بنا پر خان آرزو نے یہ کہا تھا کہ رازی کا انداز مولانا روم سے ملتا جلتا ہے۔ مرقع میں مثنوی کی طرح چھوٹی موٹی اخلاقی اور صوفیانہ حکایتیں ہیں جن کے ضمن میں شاعر نے تصوف کے رموز کی تشریح کی ہے۔ پھر بھی مرقع کا انداز سطحی سا ہے اور رازی کے مرتبۂ شاعری سے فروتر ہے۔ مرقع رازی کا تقلیدی کارنامہ ہے، تخلیقی نہیں۔ ایک جگہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے بارے میں یہ حکایت لکھی ہے کہ ان کی محفل میں قوال یہ شعر گا رہا تھا۔

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زمان از غیب جانی دیگر است

شیخ کا یہ حال ہوا کہ :۔

شیخ از مصراع اول در گذشت   باز از مصراع ثانی زندہ گشت

نغمہ را مطرب مکرر می نمود   شیخ را ہر بار موت و بعث بود

باز آخر مصراع اول بخواند   مصرع ثانی نخواند و باز ماند[2]

رازی خود شاہی دربار سے متعلق تھے مگر ان کا نظریہ یہ تھا :۔

خویش را از قرب سلطان دور دار   لیکنش وقت دعا معذور دار

دور باش از صحبتش ای خواجہ تاش   ور در افتادی ز خود غافل مباش[3]

نطق کی حقیقت پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

مثل رازی فہم کن این راز را   تا بدانی راز ہر آواز را[4]

---

[1] ایضاً۔

[2] ایضاً ورق ۴۰۔

[3] ایضاً ورق ۲۶۔

[4] ایضاً ورق ۶۲۔

جویا کشمیری

کشمیر کے دو شاعر غنی اور بینش کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن یعنی غزل اور مثنوی میں استاد تھے۔ ان کے ہم عصر اور ہم وطن داراب بیگ جویا اگرچہ اس پایہ کے شاعر نہیں تھے، مگر وہ بہرحال ایک مسلم استاد تھے اور ان کا ضخیم کلیات ان کی فنکاری اور پختہ شاعری کا بین ثبوت ہے۔ جویا کے آباؤ اجداد تبریز[۱] سے منتقل ہو کر کشمیر میں آباد ہو گئے تھے۔ یہیں جویا کی ولادت ہوئی[۲]۔ ان کے والد کا نام ملا سامری تھا[۳]۔ جویا نے ابتدا سے اچھے شعرا مثلاً ابوطالب کلیم، ملا رضا تجلی، سعید اشرف، سالک یزدی اور سالک قزوینی کی محفلیں دیکھیں اور ان سے استفادہ کیا[۴]۔ شاعری میں انھوں نے کلیم کی شاگردی اختیار کی[۵]۔ اگرچہ وہ صائب اور فطرت موسوی کے زیادہ شیدائی تھے[۶]۔ صائب کے دیوان واجب الحفظ پر جویا نے ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں وہ صائب کو اپنا استاد بتاتے ہیں[۷]۔ ہو سکتا ہے کہ جویا نے کشمیر میں صائب

---

[۱] یدِ بیضا، علی گڈھ، ص ۶۶؛ محمد علی تربیت: دانشمندان آذربائجان، تہران ۱۳۱۴ ھ، ص ۱۰۱۔

[۲] صبح گلشن ص ۱۱۰۔

[۳] بانکی پور ۳/۱۷۸۔ ریاض الشعرا (بحوالہ ایشیاٹک ۲/۵۶، نمبر ۲۰۷۶) میں ایک سامری کا ذکر ہے جو حیدری تبریزی کا لڑکا تھا۔ اور گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں تھا۔

[۴] ایضاً۔ سالک یزدی حکیم رکنا مسیح کاشی کا شاگرد تھا۔ وہ ہندوستان آکر عبداللہ قطب شاہ کا متوسل ہوا۔ اس کے بعد شاہجہان کے دربار سے متعلق ہو گیا۔ سالک قزوینی دوبارہ ہندوستان آیا مگر واپس ایران چلا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ (سرو آزاد ص ۱۰۹-۱۱۰؛ آتشکدہ ص ۲۲۹، ۲۷۵)

[۵] تذکرہ حسینی ص ۸۷۔

[۶] بانکی پور ۳/۱۷۸۔

[۷] کلیات جویا مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۹۱۰۔

کی محفل بھی دیکھی ہو۔ جیسا کہ والہ داغستانی کا خیال ہے۔[1] اگر یہ خیال صحیح ہے تو جویا نے کافی طویل عمر پائی کیونکہ ان کا انتقال ۱۱۱۸/۰۷-۱۷۰۶ میں ہوا۔[2] سخن پروران کی تاریخ وفات ہے[3]

کشمیر کے حکام میں جویا کی خاصی عزت تھی۔ ابراہیم خاں،[4] حفظ اللہ خاں اور فاضل خاں[5] جو یکے بعد دیگرے کشمیر کے گورنر ہوئے، جویا کا احترام کرتے تھے۔ جویا نے اپنے قصیدوں اور قطعوں میں ان سرپرستوں کی ستائش کی ہے۔ ابراہیم خاں نے ایک آئینہ خانہ بنوایا تھا۔ جویا نے اس کی تقریب پر ایک نظم کہی جس کا ایک شعر یہ ہے:-

نواب درو نشستہ چون مردم چشم　　　غلام بہ دورش زدہ صف چون مژگان[6]

ابراہیم خاں کے لڑکے فدائی خاں کی تعریف میں ایک رباعی ہے۔ فدائی خاں نے ۱۰۹۴/۸۳-۱۶۸۲ میں تبت فتح کیا تھا جس پر اس کے والد کو پنج ہزاری اور خود فدائی خاں کو یک ہزاری منصب ملا تھا۔[7] اس سلسلہ میں جویا کا یہ شعر ملاحظہ ہو:-

نواب ما بہ فتح تبت کامیاب شد　　　جویا ہزار شکر کہ دنیا بہ کام ما است[8]

---

[1] ریاض الشعرا (بحوالہ بانکی پور ۳/۱۷۸)

[2] گل رعنا (بانکی پور) ورق ۷۹۔

[3] صبح گلشن ص ۱۱۰-۱۱۱۔

[4] ابراہیم خاں ۱۰۷۰/۶۰-۱۶۵۹ اور ۱۱۱۷/۰۶-۱۷۰۵ کے درمیان تین بار کشمیر کا گورنر ہوا۔ (مآثر الامرا ۱/۲۹۵)

[5] برہان الدین فاضل خاں علاء الملک تونی کا بھتیجا تھا۔ اسے ۱۱۰۸/۹۷-۱۶۹۶ میں کشمیر کا گورنر بنایا گیا (مآثر الامرا ۳/۳۴)

[6] کلیات جویا ص ۲۴۲۔

[7] مآثر عالمگیری ص ۲۳۶۔

[8] کلیات جویا ص ۲۱۳۔

۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ء میں حفظ اللہ خاں کے منصب میں اضافہ ہوا تو جویا نے 'پیر اقبال و دولت بر دمید' سے اس کی تاریخ نکالی۔ ایک اور قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حفظ اللہ خاں کسی بات پر جویا سے ناراض ہو گئے تھے تو انھوں نے یہ اشعار کہے :۔

شکستہ خاطرم از بس ز کم عنایتیت — نہ ماندہ است دل فکر و نی زبان سخن

بدی ز بندہ و نیکی ز صاحبان باشد — بوذ گناہ ز جویا و از تو بخشیدن[۲]

فاضل خاں گورنر کشمیر سے جویا کے خصوصی روابط تھے۔ انھیں کے ایما پر جویا نے اپنی بہترین مثنوی حسن معنی اور ڈل جھیل پر روشنی سے متعلق دوسری مثنوی لکھی۔ کلیات میں فاضل خاں کے نام جویا کے دو خط بھی ہیں۔ ایک میں انھوں نے قہوہ کی درخواست کی ہے اور دوسرے میں حب نزلہ کی۔ فاضل خاں جب کشمیر آئے تو جویا نے اس شعر سے ان کا استقبال کیا :۔

مگر نواب کشور گیر آمد — کہ جانی در تن کشمیر آمد[۳]

جویا کے دوستوں اور سرپرستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ جن سے متعلق ان کے کلیات میں اشعار اور اشارے ملتے ہیں۔ مرزا ابوالخیر کی تعریف میں انھوں نے ایک انتہائی مرصع انشائیہ لکھا۔ اور ان کے یہاں بچے کی ولادت پر یہ تاریخ کہی جس سے ۱۱۰۸/۹۷-۱۶۹۶ برآمد ہوتا ہے :۔

سراپا زبان غنچہ سان شد نخست — پس آنگہ گل باغ امید گفت[۴]

(۱۱۰۸)

میر ہدایت اللہ[۵] نے ۱۱۰۷/۹۶-۱۶۹۵ء میں ایک مرقع مرتب کیا تھا۔ جویا نے اس پر بھی ایک

---

[۱] ایضاً ص ۲۳۹۔

[۲] ایضاً ص ۲۳۷۔

[۳] ایضاً ص ۲۲۴۔

[۴] ایضاً ص ۲۴۲۔

[۵] میر ہدایت اللہ عنایت اللہ خان مرتب مکاتیب اورنگزیب کا لڑکا تھا۔ (مآثر الامرا ۲/۴-۵۰۲)

دیباچہ لکھا۔ علاوہ ازیں سید عبداللہ، ملا محمد عظیم تہرانی اور شیخ نجفی کے نام ان کے خطوط کلیات میں درج ہیں[1]۔ کشمیر کے ایک صوفی درویش شاہ رضا کی شان میں یہ اشعار ملتے ہیں:۔

بادشاہی است شہ رضا امروز   کہ نہ در فکر تخت و دیہیم است

در کنار دل آن مکان شریف   بی تکلف بہشت و تسنیم است

بوی فقر آید از در و بامش   این مقام رضا و تسلیم است[2]

شاہی دربار سے بظاہر جویا کا کوئی بلا واسطہ تعلق نہیں تھا۔ نہ اورنگزیب سے ان کی ملاقات کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ لیکن اورنگزیب کی شان میں مندرجہ ذیل رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہی کرم کے امیدوار ضرور تھے:۔

شاہنشاہا کف تو بحرین عطا است   تقوای تو زیب سلطنت نام خدا است

زینت بخش صلاح باشد کرمت   در دست تو سبحہ چون گہر در دریا است[3]

اسی طرح ایک قطعہ شاہ عالم بہادر شاہ کی تعریف میں بھی ہے۔ کلیات جویا کے مرتب ڈاکٹر محمد باقر نے اس قطعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جویا عہد بہادر شاہ تک زندہ تھے۔ درحقیقت اس قطعہ سے ۱۱۰۷/۹۶-۱۶۹۵ کا سن نکلتا ہے۔ شاہ عالم ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۰۷/۱۳ جولائی ۱۶۹۶ کو گورنر ملتان کی حیثیت سے آگرہ سے روانہ ہوا[4]۔ "در و موکب شاہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ جویا نے شہزادہ کے لشکر کی آمد کی تاریخ کہی ہے:۔

ز شمشیر بہادر شاہ غازی   بود شیر فلک در چارہ سازی

---

[1] کلیات ص ۹۴-۸۹۳۔

[2] ایضاً ص ۲۴۸۔

[3] ایضاً ص ۲۶۸۔

[4] مآثر عالمگیری ص ۳۷۳، ۳۸۲۔

چو تاریخ ورود موکب شاہ | منیرم جست از عقل دل آگاہ
خرد مستانہ در تقریر آمد | بگفتا "شاہ کشور گیر آمد"[1]

تعجب ہے کہ کلیات میں جویا کے استاد کلیم اور دیگر اساتذہ کی وفات پر کوئی تاریخ نظر نہیں آتی۔ سب سے پہلی تاریخ کسی مرزا شاہ حسین کی وفات پر ہے۔ جنھیں جویا مرشد معنی اور استاد سخن کہتے ہیں۔ سن تاریخ ۱۰۸۹/۷۹-۱۶۷۸ اس مصرعہ سے نکلتا ہے۔

"طبع او بود آب و رنگ سخن"[2]

اور سب سے آخری تاریخ میر عبداللطیف خاں کے انتقال پر ہے جن کی وفات محرم ۱۱۱۷/اپریل ۱۷۰۵ میں واقع ہوئی[3]۔ اس کے علاوہ امیرالامرا شائستہ خاں (م ۱۱۰۵/۹۴-۱۶۹۳) اور ملک فخر (م ۱۱۱۰/۹۹-۱۶۹۸) کی وفات پر بھی تاریخی قطعات ہیں[4]۔

جویا کی غزلوں میں اپنے ہم عصر اور متقدم شعرا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان میں بعض سے جویا کے ذاتی تعلقات تھے اور بعض سے ادبی۔ ان کا ذکر یا تو محض احتراماً ہے یا اس لیے کہ جویا نے ان کی غزل پر غزل کہی اور مقطع میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان شعرا میں ہیں علوی، نکرت[5]، فطرت موسوی، تمکین،

---

[1] کلیات ص ۲۲۷۔

[2] ایضاً ص ۲۴۸

[3] ایضاً ص ۲۴۵

[4] ایضاً ص ۲۴۰، ۲۴۷

[5] میر غیاث الدین نکرت صائب کا شاگرد تھا اور عہد اورنگزیب میں پانصدی منصبدار تھا۔ (کلمات الشعرا ص ۸۷ ؛ ہمیشہ بہار ورق ۷۸)

سالک، گویا، بینش کشمیری، واعظ[۱]، حاجی فریدون سابق، طاہر وحید، جلال اسیر اور طالب آملی کے نام ملتے ہیں۔ ان میں نہ تو جویا کے استاد کلیم کا ذکر ہے اور نہ کشمیر کے بہترین غزلگو غنی کا۔

جویا ایک پڑھے لکھے خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کے نام سے پہلے ملا کا لقب ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک فاضل شخص تھے۔ ان کے دونوں بھائی مرزا کامران بیگ گویا اور مرزا فتح علی بیگ تسکین[۲] اور ان کے پوتے عبدالعلی تحسین اچھے شاعر تھے۔ ان کے سالے ملک سلطان بھی شعر کہتے تھے اور تمکین تخلص کرتے تھے[۳]۔ جویا کے تلامذہ میں ملا ابوالحق ساطع[۴]، عبدالغنی قبول[۵]، فضل علی بیگ[۶]، میر سید احمد فائق اور سیادت[۷] کے نام ملتے ہیں۔ اور بہتوں کا علم نہیں[۸]۔

۱؎ محمد رفیع الدین واعظ اصفہان کا رہنے والا تھا اور ۱۱۰۵/۹۴-۱۶۹۳ میں فوت ہوا۔ وہ ابواب الجنان اور ایک دیوان کا مصنف ہے۔ (ریو ۲/۶۹۸، ۸۲۶)

۲؎ صبح گلشن ص ۱۱۰؛ ہمیشہ بہار ورق ۲۳۔

۳؎ سفینۂ خوشگو ص ۲۶۶؛ ہمیشہ بہار ورق ۲۳۔

۴؎ ساطع صمصام الدولہ کا متوسل تھا اور کشمیر میں ۱۱۵۶/۴۴-۱۷۴۳ میں انتقال کیا۔ اس نے دیوان (سالار جنگ نمبر ۳۵) ایک مثنوی اور حجت ساطع کے نام سے برہان قاطع کا انتخاب کیا تھا (خزانۂ عامرہ ص ۲۴۵۔ بھگوان داس ہندی: سفینۂ ہندی، پٹنہ، ۱۹۵۸، ص ۱۰۶)

۵؎ قبول کشمیری ملا شاہ بدخشی کا عزیز تھا۔ اس کے تینوں لڑکے مرزا ارجمند آزاد، مرزا گرامی اور مرزا محترم شاعر تھے اور بھی بہت سے شاگرد تھے۔ قبول کی وفات ۱۱۳۹/۲۷-۱۷۲۶ میں ہوئی۔ (سرو آزاد ص ۱۹۸، بانکی پور ۳/۱۸۳)

۶؎ کلیات جویا ص ۶۹۴۔

۷؎ میر سید احمد فائق اور اس کے تین اور بھائی میر جلال الدین سیادت، میر نجابت اور میر مدہوش لاہور کے معزز سادات سے تھے اور سرکاری عہدوں پر فائز تھے (ہمیشہ بہار ورق ۵۴، ۶۲، ۹۶؛ کلمات الشعراء ص ۸۸ وغیرہ)

۸؎ نشتر عشق (بانکی پور) ص ۱۷۴۔

جویا کے اشعار اور خطوط سے ان کی بعض دلچسپ عادتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے دو خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قہوہ اور حقہ کے عادی تھے۔ حقہ کی شان میں ان کی یہ رباعی دلچسپی سے خالی نہیں:۔

بس فیض کہ از چلیم اندوختہ ام　　بروی نظر خواہش از آن دوختہ ام

دودش کہ ز سینہ ہر نفس بر گردد　　دارد پیغامی از دل سوختہ ام[1]

جویا غالباً افیم کے بھی عادی تھے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :۔

ز فیض کیف افیون موشگافم در سخن جویا　　خدیو ملک معنی ام چو باشد تخت ثریا کم[2]

لیکن وہ شراب نوشی کے سخت خلاف تھے۔ وہ شراب کو "گوہ حرام" کہتے ہیں :۔

حیف است اگر ز دخت رز جوئی کام　　کین فاحشہ باشد از ذوات اعلام

تا کی سر خود بہ پای خود خواہی سود ؟　　تا چند کشی منت این گوہ حرام[3]

جویا نے غالباً اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذارا۔ کشمیر ان کی تمناؤں کا محور اور امیدوں کا مرکز تھا۔ ان کی غزلوں، قطعوں اور رباعیوں میں بار بار کشمیر کا ذکر والہانہ انداز میں ملتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے دل میں یہ خواہش انگڑائی لیتی کہ آبائی وطن ایران کی زیارت کریں مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے :۔

کی غریب کشور ہندیم ما جویا ؟ کہ ہست　　مجلس نواب ابراہیم خان ایران ہند[4]

بہر حال جویا کشمیر سے نکلے اور لاہور پہونچے۔ لاہور میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں ہوا اور انھوں نے ایک شعر میں لاہور والوں کی ہجو کی[5] مگر لاہور سے جویا کا اور تعلق تھا۔ ایک تو وہاں کے

۱؎ کلیات ص ۲۵۱۔

۲؎ ایضاً ص ۷۸۲۔

۳؎ ایضاً ص ۲۵۶۔

۴؎ ایضاً ص ۵۶۵۔

۵؎ دیباچہ کلیات جویا ص ۱۰۔

دلبروں کی بے جھجک آمیزش جویا کو گرویدہ کئے ہوئے تھی :۔

لاہور کہ دلبرش بسی عیار است | از شوخی طبع باکہ ومہ یار است
گر کینہ نیش دست زد خلق بود | عیبش نکنی، طلای دست افشار است[1]

دوسرے لاہور میں جویا کی معشوقہ رہتی تھی، جس کے وصال کی خواہش رہ رہ کر ان کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی :۔

درراہ شوق جانان عزم سفر مبارک | بر فوج غم دلم را فتح وظفر مبارک
بستم میان ہمت جویا بہ سیر لاہور | امید وصل یاری نازک کمر مبارک[2]

ایک اور غزل میں جویا اپنی جیتی (محبوبہ) سے کہتے ہیں کہ چند روز تیری حسین مسکراہٹ سے لطف اندوز ہونے کے بعد اب میں واپس کشمیر جا رہا ہوں :۔

دل می بردم غنچۂ خندان تو جیتی | جان می دہدم خندۂ پنہان تو جیتی
فردا است کہ خواہد سوی کشمیر روان شد | جویا دو سہ روزی شدہ مہمان تو جیتی[3]

لاہور کے علاوہ جویا ہندوستان کے اور شہروں میں گئے یا نہیں، یہ معلوم نہیں، بہرحال ہندوستان کے لئے ان کے دل میں اول اول بڑی قدر تھی، اور انھوں نے اسی جذبہ کے ماتحت یہ رباعی کہی تھی :۔

در ہند کہ دیدہ را غبارش مددی است | ہر قبضۂ خاک خلد را دست ردی است
ہر سو طاؤس مست بر نخل بلند | ہمچو سبد گل بہ سر سرو قدی است[4]

لیکن بعد میں انھیں یہ تلخ تجربہ ہوا کہ ہندوستان کی آب وہوا میں کشت امید آسانی سے سرسبز

---

[1] کلیات ص ۲۶۵۔

[2] ایضاً ص ۷۲۵۔

[3] ایضاً ص ۸۷۹۔

[4] ایضاً ص ۲۵۴۔

نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی آبیاری بسا اوقات عزت نفس سے کرنی پڑتی ہے :-

درسواد ہند دست از لذت دنیا بشوی | جز جگر خواری نباشد نعمتی بر خوان ہند
کشت امیدش درین کشور نیابد خرمی | تا نریزد آبرو از مرد چون باران ہند[۱]

کلیات جویا بڑے پُرگو شاعر تھے۔ ان کا ضخیم کلیات تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے، قطعات، مثنویات، رباعیات اور نثر کے نمونے ہیں۔

جویا کے تمام قصیدے جو تعداد میں بتیس[۳۲] ہیں حمد و نعت اور ائمہ معصومین کی منقبت میں ہیں۔ منقبت میں دو ترجیع بند بھی ہیں۔ اس دور میں قصیدہ گوئی کی روایت بالکل بے روح ہو چکی تھی اور جویا کے قصیدوں میں بھی رسمی خلوص و عقیدت کے سوا حسن فن کی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ حالانکہ بعض قصیدوں میں انھوں نے سنگلاخ قافیوں سے شوکت الفاظ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے :-

عریانی خورشید نقاب رخ او بس | کی ہودج او آمده محتاج سدیلی؟
آبی نزند بر دلم آب رخ و یاقوت | کز وی نتواند شود، اطفای غلیلی[۲]

مختصر مثنویوں میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک ڈل جھیل کی روشنی پر ہے اور دوسری حسن کشمیر پر۔ یہ دونوں نظمیں فاضل خاں گورنر کشمیر کے ایما پر لکھی گئیں۔ دوسری مثنوی میں ۱۹۴ اشعار ہیں۔ اس کا عنوان 'حسن معنی' ہے :-

بیا ساقی کہ از فیض الٰہی | شدم فارغ ز فکر 'حسن معنی'
ز جویا چون بہ خوبی یافت اتمام | ازان شد 'حسن معنی' نامہ را نام[۳]

---

[۱] ایضاً ص ۵۶۴۔

[۲] ایضاً ص ۱۲۱-۱۲۰

[۳] ایضاً ص ۱۲۷۔

حسن معنی میں کشمیر کا تفصیلی بیان ہے۔ کشمیر کے باغات میں سے شالیمار باغ، باغ نسیم، باغ بہار آرا باغ سیف آباد، باغ الٰہی اور نور باغ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ کوہ پیر پنچال اور ڈل جھیل کی حسین منظر کشی ہے، پھر کشمیر کے لوگوں کے حسن کا بیان ہے اور آخر میں خود کشمیر جنت نظیر سے شاعر کے والہانہ عشق کی داستان ہے:

مگو ای ساقی از دشواری آه | بہ کشمیر آمدیم الحمد للہ
درین گلشن کہ باد آباد جاوید | لطافت را مجسم می توان دید
لب ہر برگ گل را در گلستان | گرفتہ شبنم از شوخی بہ دندان[1]

کلیات میں قطعات اور رباعیات کی مجموعی تعداد ۱۲۷ ہے جس میں رباعیاں ۱۰۳ ہیں۔ حالانکہ مرتب نے بخاری سے متعلق دو قطعوں کو بھی رباعی میں شامل کر لیا ہے[2]۔ قطعات زیادہ تر موضوعاتی ہیں اور تاریخ وفات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ جویا کی بہترین شاعری ان کی غزلوں میں ہے۔ جویا اگرچہ کلیم کے شاگرد تھے مگر غزل گوئی میں وہ صائب کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ صائب سے ان کی عقیدت اور ان کے دیوان پر دیباچہ نگاری کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر جویا کا اپنا ایک انفرادی انداز ہے جو صائب اور جویا کے دوسرے پسندیدہ شاعر فطرت موسوی دونوں سے الگ ہے۔ جویا کے یہاں ایک جاندار تغزل ہے جس کا بنیادی عنصر حسن کا انتہائی نازک اور جمالیاتی احساس ہے۔ جویا کا تصور حسن ٹھوس بھرپور اور خالص جسمانی اور جذباتی ہے۔ کشمیری حسینوں کے برف جیسے شفاف و شاداب جسم میں شاعر کی نظر کے لیے جو فتنہ سامانی ہے، اس کا منظر دیکھئے:

پای تا سر مژہ است اندامت | بہ نگہ می توان چشید ترا[3]

محبوب کا جسم پھول سے زیادہ نازک اور اس کی خوشبو سے زیادہ لطیف ہے۔ اس کا چلبلا گات

---

[1] ایضاً ص ۱۴ - ۲۱۲

[2] ایضاً ص ۲۷۱

[3] ایضاً ص ۳۵۴ -

پھولوں کی ڈالی کی طرح تروتازہ اور اس کا نازک ملبوس نکہت گل کی طرح بہار بدست ہے :-

ہمچو شاخ نازک گل از نسیم نوبہار — جوش مستی می کند در ہر طرف مائل ترا

ترسم کہ خراشد تن نازک بدنم را — از نکہت گل جامہ دہ سیم تنم را

آن کسوت نازک کہ بر اندام تو بار است — چون نکہت گل دست در آغوش بہار است[۱]

جویا عاشق مزاج تھے۔ لاہور کی جٹی سے ان کی داستان معاشقہ کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ جویا کے یہاں وصال محبوب کی جو بھرپور اور مؤثر کیفیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جویا کا معشوق کوئی فرضی یا روایتی نہیں بلکہ ایک حسین و نفیس جسم کا انسان ہے جس کی ہم آغوشی شاعر کو کیا کچھ نہ لطف دیتی ہوگی :-

شب کہ عریان بہ بر آن شوخ قدح نوشم بود — یک بغل نور چو فانوس در آغوشم بود[۲]

ز سرو یار کہ در بر کشیدہ ام امشب — بغل بغل گل آغوشش چیدہ ام امشب

سخن چو شیرۂ جان سالہا چکد ز لبم — باین کہ لعل بت را مکیدہ ام امشب[۳]

لیکن فقط رومانی اور جسمانی شاعری ہی جویا کا سرمایۂ حیات نہیں۔ ان کے یہاں اس طرح کے فکری عناصر بھی ملتے ہیں :-

گشتہ آبستن ہزار سحر — شب تار مرا تماشا کن

وارد حیات عالمی و جان پدید نیست — دنیا ز آدمی پر و انسان پدید نیست[۴]

جویا کا یہ عقیدہ تھا کہ شاعری حیات جاوداں کا سامان بہم پہونچاتی ہے اور خود ان کی شاعری طوطی خوش نوا کے نغمے کی طرح ساری دنیائے شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے ہجو شاعر اور شاعری دونوں

۱؎ ایضاً ص ۳۴۴، ۳۳۹، ۱۶۹ -

۲؎ ایضاً ص ۳۴۵ -

۳؎ ایضاً ص ۳۶۱

۴؎ ایضاً ص ۳۶۹، ۸۲۴ -

کے مرتبہ سے فروتر ہے۔ جویا کا دعویٰ ہے کہ ان کی زبان کسی کی ہجو سے آلودہ نہیں ہوئی :۔

شکر للہ کہ ہجو کس گفتن — فطرت عالی مرا نہ فن است
نشدہ در ہجای کس جاری — تا زبانم مجاور دہن است
شعر گفتن بہ کیش من در ہجو — ہتک ناموس حضرت سخن است[1]

پھر بھی ان کے کلیات میں دو ہجویں ملتی ہیں۔ ایک کسی شیخ میرک کی اور دوسری ایک بخیل کی اول الذکر درج ذیل ہے :۔

شیخ میرک کہ از رہ دانش — مسند عز و شان مقامش شد
بسکہ کوچک دلی کند با خلق — کاف تصغیر جزو نامش شد[2]

جویا اس دور کے عام انداز کی طرح بڑی پر تکلف اور مرصع نثر لکھتے تھے۔ دیباچہ نگاری سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ کلیات میں چار کتابوں پر دیباچے موجود ہیں جن میں دو مرقع پر ہیں، ایک کسی سفینہ پر اور چوتھا صائب کے دیوان واجب الحفظ پر۔ اس کے علاوہ خود جویا کے دیوان کا دیباچہ، قلمدان کی تعریف، نوروز کا بیان اور دوستوں کے نام چند خطوط ہیں۔ ریاض الافکار میں ان کا ایک اور خط ہے جو کسی محمد صادق کے نام ہے۔ جویا نے اسے دیوان تجلی مستعار دیا تھا اسی کا تقاضا ہے[3]

---

[1] ایضاً ص ۲۴۳۔

[2] ایضاً ص ۲۴۹۔

[3] ریاض الافکار ورق ۲۰۔

اشرف مازندرانی

شہزادی زیب النساء کے استاد ملا محمد سعید اشرف مازندرانی کا شمار اس دور کے ثقہ علما اور معتبر شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کی ولادت اصفہان میں ہوئی[1] والد کا نام ملا محمد صالح[2] اور نانا کا ملا محمد تقی مجلسی تھا[3]۔ ایران میں وہ صائب اور طاہر وحید کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے[4]۔ صائب شاعری میں ان کے استاد بھی تھے[5]۔ اشرف عہد اورنگزیب میں کے آغاز میں ہندوستان آئے[6]۔ اور شہزادی زیب النساء کے اتالیق مقرر ہوئے[7]۔ شہزادی ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ اور ان کی ضروریات کا خیال کرتی تھی۔ ایک بار زیب النساء کی بیاض کسی خواص سے حوض میں گر پڑی اور خراب ہو گئی۔ اشرف نے اس کی طرف سے ایک قطعہ میں معافی مانگی اور خواص کو معاف کر دیا گیا[8]۔ ایک بار زیب النساء نے استاد کو ایک کنیز پیش کی۔ اشرف نے ایک ہجو یہ قطعہ لکھ کر شہزادی کا شکریہ ادا کیا[9]۔

---

[1] آتشکدہ، ص ۱۷۰۔

[2] اشپرانگر ص ۳۴۰ میں صانع ہے۔

[3] سرو آزاد ص ۱۱۶

[4] کلمات الشعرا ص ۷۔

[5] سفینۂ خوشگو ص ۱۸۔

[6] سرو آزاد ص ۱۱۶۔ خوشگو (سفینہ ص ۱۸) کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ اشرف عہد اورنگزیب کے اواخر میں ہندوستان آئے۔ یہ غالباً ان کی دوبارہ آمد کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو تذکرۂ نصرآبادی ص ۱۸۱)

[7] سفینۂ خوشگو ص ۱۸۔

[8] شبلی نعمانی: مقالات شبلی، اعظم گڈھ ج ۵/ص ۱۱۲؛ دیوان اشرف (علی گڈھ) ورق ۳۷۔

[9] سرو آزاد ص ۱۱۷؛ دیوان اشرف ورق ۳۸۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔

ہندوستان میں چند سال قیام کے بعد اشرف نے واپس وطن جانے کے لئے زیب النسار کی خدمت میں یہ قطعہ گذرانا:۔

یکبار از وطن نتوان برگرفت دل — درغربتم اگرچہ فزون است اعتبار

پیش تو قرب و بُعد تفاوت نمی کند — گو خدمت حضور نباشد مرا شعار

نسبت چو باطنی است، چہ دہلی، چہ اصفہان؟ — دل پیش تست، تن چہ بہ کابل چہ قندھار[1]

درخواست منظور ہوئی اور ۱۰۸۳/۷۳-۱۶۷۲ میں اشرف ایران کے لئے روانہ ہوئے[2]

طاہر نصر آبادی کا بیان ہے کہ اشرف کے قیام اصفہان کے زمانے میں دونوں کی ملاقات اکثر مسجد لبنان میں ہوتی تھی[3] مگر اشرف کا دل وطن میں نہیں لگا اور وہ واپس ہندوستان آگئے۔ اب انھیں شہزادہ عظیم الشان گورنر بہار کے دربار میں جگہ ملی۔ عظیم الشان ملا اشرف کا بہت خیال کرتا تھا انھیں دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی[4]

اورنگزیب کی وفات کے بعد جو سیاسی خلفشار رونما ہوا، غالباً اس سے پریشان ہو کر اشرف حج کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ پٹنہ سے مونگیر (بہار) آئے۔ یہاں ان کی طبیعت خراب ہوئی اور یہیں ۱۱۲۰/۰۹-۱۷۰۸ میں ان کا انتقال ہوا۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ اشرف کی قبر خاصی مشہور ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اسی سال کی تھی[5]

---

[1] دیوان اشرف ورق ۲۸۔

[2] سرو آزاد ص ۱۱۶۔

[3] تذکرہ نصری آبادی ص ۱۸۱

[4] سرو آزاد ص ۱۱۷۔

[5] ایضاً: سفینۂ خوشگو ص ۲۰۔ نتائج الافکار ص ۵۵ نے ۱۱۱۶/۰۵-۱۷۰۴ میں اشرف کی وفات لکھی ہے۔ فہرست بانکی پور (۳/۱۷۶) میں ہے کہ اشرف نے عظیم الشان کی وفات کے کچھ ہی بعد انتقال کیا۔ شہزادہ عظیم الشان کا انتقال ۱۱۲۳/۱۲-۱۷۱۱ میں ہوا۔

اشرف ایک عالم و فاضل خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد اچھے عالم تھے۔ انھوں نے اصول کافی کی شرح لکھی تھی[۱]۔ ان کے نانا ملا محمد تقی مجلسی اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ ان کی اولاد میں بڑے بڑے مجتہد پیدا ہوئے۔ مثلاً ملا باقر مجلسی، ملا محمد علی وغیرہ[۲]۔ اشرف کے دونوں بھائی ملا علی نقی سابق اور ملا حسین شاعر اور عالم تھے[۳]۔ ان کے لڑکے دانا کا حال آگے آئے گا۔ خود اشرف عجیب صلاحیتوں کے عالم تھے۔ ان کی علمی برتری کا ہر جگہ اقرار و اعتراف تھا۔ وہ عمدہ خطاط اور مصور تھے۔ اور ان سب باتوں کے ساتھ مزاح و ظرافت سے ان کی شخصیت کی رعنائی اور بڑھ گئی تھی[۴]۔ ان خوبیوں کی بنا پر ان کے استاد صائب خود ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے ایما پر اپنے شعروں میں رد و بدل کر لیتے تھے[۵]۔ شاہ گلشن بھی اشرف سے بہت متاثر تھے اور انھیں کے انداز میں شعر کہتے تھے[۶]۔

اشرف کی تصانیف میں ان کا کلیات شعر ہے۔ فہرست آصفیہ میں فارسی شاعری کا ایک انتخاب ان سے منسوب ہے۔ مگر یہ انتخاب کسی مرزا محمد اشرف کا ہے جو سعید اشرف سے مختلف اور بعد کے دور کے ہیں کیونکہ اس میں شیخ حزیں کی غزل شامل ہے[۷]۔ موتمن الدولہ اسحٰق خاں

۱؎ بانکی پور ۳/۱۷۶۔

۲؎ ریو ۱/۳۸۵۔

۳؎ ملا علی نقی سابق اورنگزیب کے عہد میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت اختیار کی۔ انھوں نے اورنگزیب کی لڑائیوں پر ایک مثنوی لکھی تھی۔ ملا محمد حسین بھی ہندوستان آئے وہ ابراہیم خاں کے متوسل تھے۔ انھوں نے مغل اور افغان کی جنگ پر ایک مثنوی قضا و قدر لکھی تھی (سفینۂ خوشگو ص ۱۷؛ تذکرہ نصرآبادی ص ۱۸۲)

۴؎ سفینۂ خوشگو (حوالہ بالا)؛ نتائج الافکار ص ۵۵۔

۵؎ کلمات الشعرا ص ۷۔

۶؎ سفینۂ خوشگو ص ۲۰۔

۷؎ آصفیہ ۴/۲۸۲ نمبر ۱۰۵۰ (دیوان)، اگرچہ اس کے ترقیمہ میں 'بلدۂ کابل من شہور ۱۱۰۶ھ' درج ہے، ممکن ہے کسی نے بعد میں اور اضافہ کیا ہو۔

ان کے شاگرد تھے۔[۱] چنپت رائے کی مفید الانشا پر انھوں نے اصلاح کی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

کلیات

کلیات اشرف تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ اس میں معما فردیات، تاریخی قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔

سب سے پہلا تاریخی قطعہ ۱۰۵۸/۱۶۴۸ میں ایک پل کی تعمیر سے متعلق ہے۔ یہ پل صفوی حکمراں شاہ عباس ثانی (۶۶-۱۶۴۲) نے بنوایا تھا۔[۲] بعض قطعات زیب النساء کی شان میں ہیں۔ جن میں شہزادی کی ذہانت، پرہیزگاری اور علم و ادب کی سرپرستی کی تعریف کی گئی ہے۔ چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

پرتو دودمان تیموری	زینت روزگار زیب نساء
عصمتش ثانی خدیجہ بود	ہست صغریٰ قرینۂ کبریٰ
قبلہ گاہا! بہ درگہ تو کہ ہست	مجمع شاعران بزم آرا
تحفۂ شعر کردہ ام ارسال	ہدیۂ نظم کردہ ام اہدا
کہ بہ چشم قبول درنگری	کہ بہ سمع رضا کنی اصغا[۳]

کلیات میں دو طویل مثنویاں ہیں۔ ایک کا عنوان ساقی نامہ ہے اور ۴۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسری قضا و قدر ہے۔ اس میں ۷۰۰ شعر ہیں اور فی البدیہہ تصنیف ہے۔[۴] مختصر مثنویوں میں چند اورنگزیب کی مدح میں ہیں۔ ایک کشمیر پہ ہے[۵] اور ایک ہولی پر۔[۶] ان کی مجموعی تعداد نو ہے۔

۱۔ نشتر عشق ورق ۱۴۱۔ اسحق خاں نے عہد محمد شاہی میں ترقی کی (گل رعنا ورق ۳۵)

۲۔ دیوان اشرف (علی گڑھ) ورق ۲۶

۳۔ ایضاً ورق ۲۱۔

۴۔ کلمات الشعراء،

۵۔ ایشیاٹک ۱/نمبر ۹۷، ورق ۶۸۔

۶۔ دیوان اشرف ورق ۶۹۔

ان میں ساقی نامہ اپنی شگفتگی، سپردگی اور جذباتیت کی بنا پر قابل توجہ ہے۔ اشرف نے بہار کا اتنا سحر آفریں منظر کھینچا ہے کہ ان کے زور قلم پر حیرت ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

دلا! مژدہ بادا کہ نوروز شد	چو می بوی گل عشرت اندوز شد
ز لطف طراوت چمن با صفا است	ہوائش بود آب و آبش ہوا است
بود آسمان از زمین فیض یاب	برد شبنم از رشتۂ آفتاب
کند ژالہ گوہر بہ دامان موج	کند لالہ گل در گریبان موج
چنان گشتہ از عکس گل فیض یاب	کہ می آید از آب بوی گلاب
چو حوری حباب می لالہ گون	سر از قصر یاقوت کردہ برون
زر و مال دنیای ناپایدار	بہ یک جا و یک کس نگیرد قرار
غلام ار نخواہی، کنیزی بخر	برای نہادن چہ سنگ و چہ زر[1]

کلیات میں چند قصائد بھی ہیں۔ ان میں سے بعض ائمہ کی منقبت میں ہیں۔ ایک قصیدہ صاحب کی مدح میں ہے۔ دیگر ممدوحین میں امتیاز الدولہ خلیفہ سلطان، آقا حسین، مرزا قاضی خلیل ابراہیم اور شاہ سلطان حسین کے نام نظر آتے ہیں۔

اشرف درحقیقت غزل کے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی اور رباعی بھی شاعرانہ حسن میں کم نہیں مگر ان کی غزلوں میں جو بے ساختہ پن اور ظرافت کا لطیف عنصر ہے، اس کے نمونے اس دور میں عام نہیں۔ ان کے یہاں زبان و بیان میں بے تکلفی اور روانی کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص انفرادیت ہے۔ مثلاً

تا سحر سیری مہتاب جمالش بودم	جامۂ صبر کتان بود، نمی دانستم
قرب یک ماہ بہ میخانہ اقامت کردم	اتفاقاً رمضان بود، نمی دانستم

---

[1] ایضاً (ایشیاٹک نمبر ۷۹۷)، ورق ۴۸۔

دوش گفتم شرح احوال پریشان پیش او　　　گفت من ہم دیدہ ام یکبار خوابی این چنین[1]

آصفیہ لائبریری میں دانا بن اشرف کا ایک کلیات ہے۔ یہ دانا ملا سعید اشرف کے لڑکے ہیں۔ ان کا نام بقول سرو آزاد محمد علی تھا۔ آزاد بلگرامی نے دانا کے چند اشعار نقل کئے ہیں جو انھوں نے خود ان کے لکھے ہوئے دیکھے تھے[2]۔ فہرست میں ان کا سن وفات ۱۱۰۱/۹۰-۱۶۸۹ دیا ہوا ہے[3]۔ صحف ابراہیم کے مؤلف کا بیان ہے کہ دانا نے مرشد آباد میں رحلت کی۔ انھوں نے مختلف شعرا کے ہم قافیہ اور ہم ردیف اشعار کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا[4]۔ کلیات کے مرتب جعفر کا بیان ہے کہ دانا اس کے استاد تھے۔ ان کے انتقال کے وقت وہ ابھی لڑکا سا تھا۔ جبھی سے اس کی یہ خواہش تھی کہ استاد کا کلام مرتب کرے۔ آخر کار یہ کام ۱۱۵۱/۳۹-۱۷۳۸ میں مکمل ہوا۔

بحمد اللہ کہ از تائید معبود　　　شدہ مجموعۂ دانا مؤلف

چو جستم سال تاریخش، خرد گفت　　　کہ کلیات دانا ابن اشرف[5]

۱۱۵۱

کلیات میں تقریباً چار ہزار شعر ہیں اور بیشتر غزلیں ہیں۔ مناجات النجات کے عنوان سے ایک اخلاقی مثنوی ہے۔ رباعی، فرد اور تاریخی قطعے بھی ہیں۔ محتشم کاشی کے مشہور مرثیہ پر مخمس کی شکل میں ایک تضمین ہے لیکن کلیات کی اصل جان ایک شہر آشوب ہے۔ نظم میں بظاہر جنوبی ہند کی ایک حسینہ کا بیان ہے لیکن تمثیل اور استعارہ کے پیرایہ میں دراصل شاعر نے اورنگزیب کے دربار کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نظم کے ذریعہ ہمیں دربار اورنگزیب کے مختلف امرا اور منصب داروں کی صحیح

---

[1] ایضاً (علی گڑھ) ورق ۱۳۶۔

[2] سرو آزاد ص ۱۱۷۔

[3] آصفیہ ۱/۷۴۲، نمبر ۵۹۰۔

[4] صحف ابراہیم، ورق ۳۱۴

[5] کلیات دانا (آصفیہ نمبر ۵۹۰)

پوزیشن کا علم ہوتا ہے، اور شاہی خاندان کے افراد کی طرف بھی لطیف اشارے ملتے ہیں :-

آفتاب حسن عالمگیر او ملک ہند زلف در تسخیر او
در عرق از بس ز شرم مردم است عارض او گوہر آرا بیگم است
زینت افزا چہرہ ای چون ماہ او غمزۂ خونین بہادر شاہ او
بوسہ اش در عالم خواب و خیال کام بخش آرزو ہای محال

امرا کے نام کا استعمال دیکھئے :-

غازی الدین غمزۂ غماز او ہست از فیروز جنگی ناز او
تیغ نصرت جنگ وا برو ذو الفقار عشوہ در جان بخشی دل ہای زار
خاندوران گردش چشمان او ملتفت خان دیدن پنہان او
صف شکن خان آن صف مژگان او گوی سرہا در خم چوگان او
سینۂ اش آئینۂ صدر الصدور کہ از و چشم بد اغیار دور

اب شاعروں کی باری ہے :-

فارسی او کہ فہمش مشکل است دلکش و موزون چو شعر بیدل است
وان بہ ہندی گفتنش مت چھوو چھر ، ہمچو بیت مخلص از معنی است پر
ریختہ گوییش در بازی گری درہم و شیرین چو شعر انوری[۱]

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری نظم میں ایک خاص طنز ہے اور ہندی الفاظ کی حسین پیوندکاری نے اس طنز کو اور تیز کر دیا ہے۔

---

[۱] کلیات دانا۔

نعمت خاں عالی

ہندوستان کے فارسی ادیبوں اور شاعروں میں نعمت خاں عالی سب سے بڑے طنز نگار اور ہجو نویس ہیں۔ ان کا نام مرزا نورالدین محمد ہے۔ وہ شیراز کے ایک حکیم خاندان کے فرد تھے[۱]۔ عالی کی ولادت ہندوستان میں ہوئی[۲]۔ یہاں سے وہ اپنے والد حکیم فتح الدین کے ہمراہ شیراز گئے۔ ان کی تعلیم آبائی وطن میں ہوئی۔ ان کے اساتذہ میں برنیر کے مربی ملا شفیعا دانشمند خاں بھی ہیں[۳]۔

عالی کا بیان ہے کہ انھیں عہد شاہجہاں میں شاہی ملازمت ملی[۴]۔ گویا وہ عہد شاہجہان میں واپس ہندوستان آچکے تھے۔ اس لئے خوشگو کا یہ بیان صحیح نہیں ہوتا کہ عالی حج کرنے کے بعد عہد اورنگزیب کے وسط میں ہندوستان آئے[۵]۔ جہاں تک حج کی بات ہے ممکن ہے وہ اپنے والد کے ہمراہ حج کرنے گئے ہوں کیونکہ بعض جگہ ان کے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ ملتا ہے۔ مثلاً بیدل انھیں حاجی ہجوی کہتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہاجی بعد میں حاجی بن گیا ہو۔ جیسا کہ مجمع النفائس سے معلوم ہوتا ہے[۶]۔

۱۔ سرو آزاد ص ۱۳۶؛ خوشگو (سفینۂ ۵۹) کا بیان ہے کہ عالی کا تعلق مشہد سے تھا۔

۲۔ ایضاً؛ نشتر عشق ص ۱۱۹۳۔

۳۔ سرو آزاد ص ۱۳۶۔

۴۔ کلیات نعمت خاں عالی (مخطوطہ) ورق ۶۳۔

۵۔ سفینۂ خوشگو ص ۵۹۔

۶۔ مجمع النفائس ورق ۳۲۵؛ مآثر الامرا (۳/ ۶۲۷، ۶۵۱، ۶۶۰) اور مآثر عالمگیری (ص ۲۶۷) انھیں ہاجی (ہجو نگار) کہتے ہیں۔

عہداورنگزیب میں عالی اولاً کس عہدہ پر فائز تھے، اس کی تفصیل معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ شہزادی زیب النساء کی سرکار سے متعلق ہوں جیساکہ ان کے بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے بہرحال عالی کی شہرت گیارہویں صدی ہجری کے اواخر سے شروع ہوتی ہے۔ جب وہ شاہی فوج کے ہمراہ غالباً بحیثیت ایک وقائع نگار کے دکن گئے۔ ۱۰۹۷/۱۶۸۵ میں جب شاہ عالم نے حیدرآباد شہر فتح کیا تو نعمت خاں عالی نے یہ تاریخ کہی:-

از نصرت بادشاہ غازی — گردید دل جہانیان شاد

آمد بہ قلم حساب تاریخ — شد فتح بجنگ حیدرآباد[۱]

۱۰۹۷

وہ محاصرہ گولکنڈہ میں بھی موجود تھے، جس پر ان کا شاہکار وقائع ہے۔

کچھ دنوں کے بعد عالی دہلی واپس آگئے۔ یہاں انھوں نے ۱۱۰۱/ ۹۰-۱۶۸۹ میں ایک گھر بنوایا اور اس کی یہ تاریخ کہی:-

زملک دکن آمدم سوی دہلی — چو از ظلمت آید کسی جانب ضو

بنا کردم اینجا و تاریخ گفتم — الٰہی مبارک کنی خانہ نو[۲]

۱۱۰۱

دو سال بعد یعنی ۱۱۰۳/ ۹۲-۱۶۹۱ انھوں نے ایک دیوان خانہ کی تعمیر کی جیساکہ ایک تاریخی قطعہ سے معلوم ہوتا ہے[۳]۔ دیوان میں ایک اور قطعہ ہے جو مکان کی تعمیر سے متعلق ہے اور جس سے ۱۰۹۲/۱۶۸۱ کا سن برآمد ہوتا ہے۔

الحمد لواہب العطایا — اتمام نمودم این بنا را

ہاتف پی سال آن ندا داد — این خانہ ہمیشہ باد آباد[۴]

۱۰۹۲

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۲۶۷۔

[۲] دیوان عالی (نیشنل میوزیم نئی دہلی نمبر ۲۹۴۲/۲) ورق ۲۰۴۔

[۳] ایضاً۔ نولکشور، ۱۸۹۴ء ص ۲۳۵

[۴] ایضاً ص ۲۳۵۔

ایک قطعہ باغ سے متعلق ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالی کی مالی حیثیت مسلم تھی۔

۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ میں عالی کو شاہی مطبخ کا ناظم مقرر کیا گیا اور انھیں نعمت خاں کا خطاب عطا ہوا جس سے وہ عام طور پر مشہور ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد انھیں شاہی جواہرات کا نگراں بنایا گیا اور مقرب خان کا خطاب عنایت ہوا[2]۔ ان دونوں عہدوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگزیب کو عالی پر بہت اعتماد تھا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد جب اعظم اور معظم میں جنگ ہوئی تو عالی کے لیے کسی ایک کی طرفداری مشکل تھی۔ وہ اس وقت تمام جواہرات لیے ہوئے گوالیار میں مقیم تھے اور حالات کا اندازہ کر رہے تھے۔ آخر کار معظم کی فتح ہوئی۔ عالی نے فوراً تمام جواہرات معظم کی تحویل میں دے دیئے۔ معظم اس بات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے عالی کو سرکاری تاریخ نویس مقرر کیا۔ تین ہزاری منصب اور دانشمند خاں کا خطاب عنایت کیا[3]۔ عالی نے سرکاری تاریخ جو بہادر شاہ نامہ کے عنوان سے موسوم ہے، ذی قعدہ ۱۱۲۰/جنوری ۱۷۰۹ تک لکھی۔ اگلے سال یعنی ۱۱۲۱/۱۰-۱۷۰۹ میں ان کا انتقال ہوگیا[4]۔ غالباً عالی کی وفات دہلی میں واقع ہوئی مگر خوشگو کا بیان ہے کہ وہ لاہور میں فوت ہوئے[5] اور گلزار آصفیہ کے مصنف کا کہنا ہے کہ عالی دائرۃ المومن حیدر آباد میں مدفون ہیں[6]۔

---

[1] ایضاً ص ۲۳۴۔

[2] سرو آزاد ص ۱۳۷

[3] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۶۴-۶۳۔

[4] سرو آزاد ص ۱۳۷؛ ہمیشہ بہار، ورق ۷۱۔ ریو (۲/۷۰۳) نے تاریخ محمدی اور تاریخ چغتائی کے حوالہ سے یکم ربیع الاول ۱۱۲۲/مئی ۱۷۱۰ لکھا ہے اور خوشگو (ص ۶۱) نے ۱۱۲۳/۱۲-۱۷۱۱۔

[5] سفینۂ خوشگو (حوالہ بالا)

[6] خواجہ غلام حسین خاں: گلزار آصفیہ، مطبع محمدی، ۱۳۰۸ھ، ص ۶۱۲۔

عالی نے خاصی لمبی عمر پائی۔ انھوں نے شاہجہاں، اورنگزیب اور بہادر شاہ اول کا دور دیکھا۔ ان کے لڑکے حکیم حاذق خاں کا ذکر آگے آئے گا۔ دیوان میں ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک اور لڑکا محمد صادق تھا جو سال و کمال میں سب پر فائق تھا اور جس کے یہاں لڑکے کی پیدائش پر عالی نے یہ قطعہ کہا تھا۔[۱]

عالی نے طبابت کی مناسبت سے پہلے حکیم تخلص اختیار کیا لیکن وہ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ لفظ حکنم سے ملتا جلتا ہے اس لئے میں نے اسے بدل کر عالی کر لیا۔[۲] کلیات میں ایک قصیدہ تاج القصیدہ کے عنوان سے ہے جس میں نعت و منقبت ہے۔ اس میں عالی نے قدیم تخلص حکیم کا استعمال کیا ہے:-

بازبیا مد حکیم بر سر نعت رسول　　طرز سخن تازہ کرد کلک زبان دان او[۳]

بہر حال حکمت میں ان کا خاندان خاصا ممتاز تھا۔ ان کے والد حکیم فتح الدین کے علاوہ ان کا لڑکا حکیم حاذق خاں حکمت میں مشہور تھا۔ عہد محمد شاہی میں اسے حکیم الممالک کا خطاب اور پانچ ہزاری منصب عطا ہوا۔ عالی کے چچازاد بھائی حکیم محسن خاں شہزادہ اعظم کی سرکار سے وابستہ تھے۔ انھیں تقرب خاں کا خطاب ملا تھا۔ اور بعد میں وہ کام بخش کے وزیر ہو گئے تھے۔[۴]

فارسی ادب میں عالی کی شہرت ان کے بے پناہ طنز و ظرافت کی بنا پر ہے۔ انھوں نے اپنے تیر و نشتر سے شاید ہی کسی معاصر رئیس کو بخشا ہو۔ کلیات میں بہت سے قطعات ہیں جن

۱۔ دیوان عالی، نولکشور ص ۲۳۵۔

۲۔ سرو آزاد ص ۱۳۸

۳۔ کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۱۰۴۔

۴۔ سرو آزاد ص ۱۳۶؛ مآثر عالمگیری ص ۲۵۳؛ مآثر الامرا ۲/۳۲۷۔

میں معاصر امرا کی ہجو کی گئی ہے ۔ مآثر الامرا کے مصنف کا بیان ہے کہ :-

"اکثر امرا و نوئینان زخمی تیغ زبان او بودند و تشنۂ خونش بودند واو دست از کنایہ و ہجو بر نمی داشت"[1]

ان امرا میں سب سے زیادہ قابل رحم وزیر اعظم جعفر خاں کا لڑکا کامگار خاں تھا۔ ۱۰۹۹/۸۸-۱۶۸۷ میں کامگار خاں نے ابو الحسن والی حیدر آباد کے وزیر اعظم سید مظفر کی جوان لڑکی سے شادی کی۔ بس کیا تھا عالی نے ایک انتہائی تیز و ترش نظم کہہ ڈالی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

کدخدا شد بار دیگر خان عالی مرتبت ۔۔۔ باکمال عز و تمکین و وقار و زیب و زین

نظم خاصی فحش ہے لیکن شاعرانہ خوبیوں سے اتنی بھر پور ہے کہ بہت جلد مشہور ہو گئی اور اس کی تین شرحیں لکھی گئیں جن میں ایک آزاد بلگرامی جیسے ثقہ عالم کے قلم سے ہے[2]۔ کہتے ہیں کہ کامگار خاں نے اورنگزیب سے عالی کے خلاف شکایت کی اور درخواست کی کہ اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے مگر اورنگزیب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہجو نگار کو چھیڑنا مناسب نہیں[3]۔

مندرجہ ذیل شعر میں محمد علی خانساماں دم۔ رجب ۱۰۹۸/مئی ۱۶۸۷) کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو بڑی سی پگڑی باندھے تھے :-

در سرداری بزرگی بسیاری ۔۔۔ ما ہیچ نداریم بجز مختاری[4]

---

[1] مآثر الامرا ۲/۶۸۹ -

[2] آزاد کی شرح خزانہ عامرہ میں شامل ہے۔ بعد میں لکھنؤ سے ۱۲۰۹ھ میں وہ علیحدہ شائع کی گئی۔ دوسری شرح والہ موسوی کی ہے (آصفیہ ۲/ص ۱۷۲۲)۔ تیسری شرح بے نام ہے۔ (ایتھے نمبر ۱۶۷۱)

[3] احکام عالمگیری۔ حمید الدین (مترجمہ جدو ناتھ سرکار) ص ۱۱۳

[4] مآثر الامرا ۳/۶۲۷ -

مطلب خاں کو جب مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا تو عالی نے یہ شعر کہا :-

مرتضیٰ گر این بود، من خارجی خواہم شدن — راستی را می گذارم، و رکجی خواہم شدن[1]

مہابت خاں ابراہیم کے انتقال پر یہ تاریخ کہی :-

گفتم این گیدیی کہ مرد. کہ بود؟ — ہاتفی بانگ زد 'مہابت خان'[2]
۱۰۹۹ ھ

یہ شعر مختار خاں کے بارے میں ہے ۔

ہیچ کس در خانۂ مختار خان بیکار نیست — ہرکرا دیدیم آنجا، فاعل مختار بود[3]

لیکن مختار خان کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ بھی ہے جس کے چند اشعار قابل توجہ ہیں ۔

اکنوں کنم صریح کہ آن نامدار کیست ؟ — کز خاتمش عقیق یمن لعل بی بہا است

نواب عرش مرتبہ مختار خان کزو — کس نیست در زمانہ فزون تر مگر خدا است[4]

آخر میں کہتا ہے :-

عالی مدیح لایق شانش نگفتہ ام — اما خوش است این کہ سخن خالی از ریا است

منظور من رجا و طمع نیست زین ثنا — چون شاعران نظر نہ بہ تحسین نہ بر عطا است

گنج گہر نبود کہ ریزم بہ پای او — درویش را ز دست تہی پیشکش دعا است[5]

ان کے علاوہ مرزا یار علی بیگ ، تاج الدین دیوان گوالیار ، باقی خاں تھانیدار نارنول ، ملا عبدالقادر ، وغیرہ کی ہجویں کلیات میں ملتی ہیں[6] ۔ ان متفرق ہجویات کے علاوہ وقائع میں بہت سے

---

[1] ایضاً ۳/ ۶۵۱ ۔ مطلب خاں کو یہ خطاب اعظم نے دیا تھا اور اسی کی طرف سے لڑتے ہوئے اس نے جان دی ۔

[2] دیوان عالی (نولکشور) ص ۲۳۹ ۔

[3] مآثر الامرا ۳/ ۶۶۰ ۔ مختار خاں کی لڑکی شہزادہ بیدار بخت کو بیاہی تھی ۔

[4] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۹۷ ۔

[5] ایضاً ورق ۹۸

[6] ایضاً ورق ۹۹ ، ۱۰۰

فوجی عہدہ داروں اور منصب داروں کا خاکہ اڑایا گیا ہے جس کا تفصیلی ذکر وقائع کے ذیل میں آئے گا۔

اورنگزیب اور شاہی خاندان کے افراد بھی عالی کے تیز نشتروں سے محفوظ نہیں تھے۔ حالانکہ اورنگزیب کی شان میں اس نے ایک مدحیہ قصیدہ اور کئی چھوٹے موٹے قطعات نظم کیے ہیں لیکن وقائع میں اس پر جو طنز و تعریض ہے، وہ بڑی جرأت مندانہ اور بیباک ہے۔ اور واقعتاً عالی کی گستاخی اور دریدہ دہنی پر حیرت ہوتی ہے۔ یہاں دو شعر اورنگزیب سے متعلق نقل کیے جاتے ہیں:۔

تا چند کسی دست دعا بردارد — کاین ظالم ازین کلکلہ پا بردارد

بنشستہ چنان قوی کہ برداشتنش — کار دگری نیست، خدا بردارد[1]

جب کامگار خاں نے اورنگزیب سے عالی کے خلاف شکایت کی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ جب کبھی ہماری ہجو کرتا ہے، ہم انعام سے اس کا منھ بند کر دیتے ہیں[2]۔

ایک بار عالی نے شہزادی زیب النسا، کی خدمت میں فروخت کے لیے ایک جیغہ بھیجا شہزادی نے کچھ دنوں تک خبر نہیں لی تو نعمت خاں عالی نے اس قطعہ کے ذریعہ یاد دہانی کی:۔

ای بندگیت سعادت اختر من — در خدمت تو عیان شدہ جوہر من

گر جیغہ خریدنی است، پس کو زر من؟ — ور نیست خریدنی، بزن بر سر من[3]

تعجب ہے کہ عالی نے اپنے ہم عصر شعرا اور ادیبوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، ان کے کلیات میں کسی شاعر کی ہجو نہیں ہے پھر بھی بیدل خائف تھے اور انھیں حاجی ہجوی کہا کرتے تھے۔ البتہ عالی نے حکیموں اور طبیبوں کی خوب خبر لی ہے۔ انھوں نے ایک مضمون مناظرہ اطبا کے نام سے لکھا ہے جس میں طبیبوں کی جہالت اور اندھا دھند علاج کا خاکہ اڑایا ہے۔ دیوان میں کسی حکیم طاہر کی

---

[1] ایضاً ورق ۱۰۰۔

[2] معارف، جون ۱۹۳۷ء۔

[3] دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق ۹۵۔

کی وفات پر بھی ایک طنزیہ مرثیہ ہے جس کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :۔

طرفہ کاری حکیم طاہر کرد | در طبابت وقوف ظاہر کرد
گشت بیمار و شد معالج خویش | ہر دوائی نبود کم از نیش
ملک الموت دید ، می میرد | بی اجل خود چگونہ جان گیرد!
بر سرش رفت تا کند آگاہ | کہ اجل نیست وست دار نگاہ
کرد آغاز مدعا بہ دلیل | کیستی ؛ گفت ، گفت عزرائیل
جست و چسپید بر گریبانش | کرد قصد گرفتن جانش
نعرہ می زد کزین دیار برو | کار و بار ہرا شریک مشو
ہست این شہر در اجارۂ من | مرگ وقف علاج و چارۂ من[1]

عالی نے نظم و نثر میں کئی ایک تصانیف یادگار چھوڑیں. ان کا دیوان غزل، مثنوی، قصیدہ اور دیگر اصناف سخن پر مشتمل ہے جس کے آغاز میں خود ان کا نثری مقدمہ ہے ۔اس کے علاوہ نثر میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں ہیں :۔

ا۔ وقائع حیدر آباد

ب۔ جنگ نامہ

ج۔ بہادر شاہنامہ

د۔ رسالہ حسن و عشق

ہ۔ نعمت عظمیٰ ۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے ۱۱۱۵ھ۔۱۷۰۳ء میں مکمل ہوئی اور اورنگزیب کے نام معنون ہے[2]

---

[1] ایضاً (نولکشور) ص ۲۳۹ ۔

[2] ایشیاٹک ۲/ نمبر ۲۳۷ ۔

۶۔ رقعات و مضحکات

۷۔ منثورات عالی یعنی عالی کے متفرق مضامین کا مجموعہ جس میں رسالہ راحت القلوب اور ہجو حکماء وغیرہ اہم ہیں۔

دیوان

دیوان عالی کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ دیوان میں چند قصائد بھی ہیں جن میں ایک قصیدہ اورنگزیب کی مدح میں ہے اور اس شعر سے شروع ہوتا ہے:۔

شاہا! نظر بہ روی تو کردن عبادت است مژگاں بہم زدن چو نماز جماعت است [1]

اس قصیدہ میں شاعر نے اورنگزیب کے تقویٰ اور عدل، سخاوت اور ہمت، شجاعت اور عفت، فقر اور ریاضت کی تعریف کی ہے۔ خاص طور پر اس کی مذہبی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

ہر چار مذہب از تو درین عہد استوار ہمچون چہار پایۂ تخت خلافت است [2]

دو قصیدے خان جہان بہادر کوکلتاش کی مدح میں ہیں۔ ایک قصیدہ مخلص خاں کی شان میں ہے [3]۔ تاج القصیدہ کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک اور قصیدہ احوال زمانہ پر ہے جس میں شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی کے پچاس سال گذر چکے مگر مجھے ابھی تک خالص محبت نہیں ملی:۔

چنین بہ تجربہ پنجاہ سال عمر گذشت کہ در ریاض محبت نرست غیر از خار [4]

عالی کے قصیدوں کی کوئی خاص ادبی اہمیت نہیں ہے۔ یہ محض مشق شاعری ہے۔ پھر بھی خان جہان بہادر والے قصیدے میں جو عرفی کے قصیدے کی نقل ہے، شاعر کہتا ہے:۔

---

[1] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۹۴۔

[2] ایضاً

[3] دیوان عالی (نولکشور) ص ۲۴ - ۲۲۱۔

[4] ایضاً ص ۲۲۸۔

درین قصیدہ کہ گفتہ است عرفی مغرور | زجوش خرمی طبع مطلعی گفتم
خدا زیادہ کند قدر ناظر و منظور[۱] | نہ من ز عرفی و ادنی زخانخانان کم

دیوان میں چند رباعیاں بھی ہیں جو مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے کمتر ہیں۔ چار رباعی کسی مرزا کی طرف سے قرآن کا تحفہ ملنے پر ہیں۔ گیارہ رباعیاں بچۂ فیل سے متعلق ہیں جو شاعر کو تحفہ میں ملا تھا۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:-

این لعبت موزون کہ غم از دل برداشت | بینندہ غلط کرد کہ نیلش پنداشت
نقاش ازل چو صورت صنع نگاشت | بر چہرۂ آفرینش این خال گذاشت[۲]

دیوان میں بہت سے تاریخی، غیر تاریخی اور ہجویہ قطعات ہیں۔ ان میں کئی ایک اورنگزیب کی فتوحات سے متعلق ہیں جن میں وہ اورنگزیب کو بادشاہ دین امیر المومنین کہتا ہے۔ دوسرے اہم قطعات اسد خاں کی وزارت، شمبھوجی کی گرفتاری اور قتل، علی مردان خاں کو عطائے خلعت شہزادہ اعظم اور شہزادہ بیدار بخت کے یہاں لڑکے کی ولادت، بیجاپور اور حیدر آباد کی فتح اور ملک میدان توپ کے قبضہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ایک قطعہ نواب روح اللہ کی تعریف میں ہے[۳] زیب النساء نے ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ء میں ابرق کا ایک مکان بنوایا تھا۔ اس کی تاریخ اور تعریف میں عالی نے ایک مختصر قطعہ لکھا ہے جس کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

بود زیب النساء بیگم بہ عالم | شرف بخش وجود نوع آدم
صفاتش چون صفات کردگار است | کہ خود پنہان و فیضش آشکار است
پی تاریخ آن گفتا زمانہ | "برد زنگ دلم آئینہ خانہ"[۴]
(۱۰۹۸ھ)

---

[۱] ایضاً ص ۲۲۵۔

[۲] ایضاً ص ۲۱۸۔

[۳] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۱۰۱۔

[۴] دیوان (نیشنل میوزیم) ورق ۲۰۴۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا دیوان عالی کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ عالی کی شاعری کا اصل کمال طنز و مزاح میں ہے مگر ان کی غزلیں سنجیدہ اور متین ہیں بلکہ بیشتر اشعار مذہبی اور اخلاقی جذبات سے مملو ہیں۔ ایک غزل کی ردیف "برخیز و بگو اللہ" ہے۔ بعض بعض جگہ ہمیں عالی کی شاعری میں مذہبی تقشف کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً

دلم لرزد کہ این زورق خطر دارد بہ ساحل ہم ‏ دم آخر نگہ دارد خدا ایمان عالی را[1]

درحقیقت عالی کی جو عام تصویر ذہن میں بنی ہے، وہ ان کی غزلیہ شاعری سے لگا نہیں کھاتی۔ یہاں ہم ایک ایسے شخص سے ملتے ہیں جو بلند ہمت، پروقار انداز اور قلندرانہ استغنا رکھتا ہے۔ اس کے ہجویہ اشعار پڑھنے کے بعد جب ہم ایسے اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں شاعر عظمت انسانیت کا درس دیتا ہے اور آدمیت کی موت کا ماتم کرتا ہے، تو ہمیں واقعی مسرت انگیز حیرت ہوتی ہے۔

این دو گام از پی مطلب چہ دویدن دارد ‏ ہر دو عالم زمہ و مہر بود جای دو گام[2]

نشستہ ایم درین خانۂ جہان تنہا ‏ کسی ز دودۂ آدم نمی شود پیدا[3]

عالی کی غزل بڑی بھرپور اور بہت جاندار ہے۔ غالب کے متعدد شعروں کا سرچشمہ عالی کے اشعار کو بتایا جاتا ہے[4]۔ عالی کا نظریۂ شعر بہت بلند اور صحت مند تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری عرفان اور بصیرت کا نتیجہ ہے فقط دماغی ورزش کا عمل نہیں۔ شاعر جذبہ اور تاثر کے لئے کسی خارجی محرک کا محتاج نہیں بلکہ جذبات کے سوتے خود اس کی ذات سے پھوٹتے ہیں۔

---

[1] ایضاً ورق ۸۹۔

[2] ایضاً ورق ۴۵۔

[3] دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق ۷۴۔

[4] مولانا غلام رسول مہر: (ماہ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۵ء)

نظامی وصف خسرو گفت و خسرو قصۂ مجنون | تو حال خود بگو عالی، چہ حاجت قصہ خوانی ہا[1]

ہم عصر شعرا کے برخلاف عالی کے یہاں تعلی کی سخت کمی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں :۔

بہ رنگی صاف کردم بادۂ نازک خیالی را | کہ دُرد ساغر من مست می سازد زلالی را[2]

ورنہ ان کے انکسار کا یہ عالم ہے :۔

ندارد رتبۂ شاگردی اہل سخن، عالی | عجب دارم چرا صاحبدلان خوانند استادش[3]

صائب اور باذل عالی کے محبوب شاعر ہیں۔ خصوصاً موخر الذکر کی شان میں عالی نے جو عقیدت پیش کی ہے وہ تعجب خیز ہے :۔

این غزل را در جواب صائبا عالی نوشت | آنکہ ہر جا معنیی چون آب گوہر بستہ است

ہر کجا آئینہ باشد، بایدش روشنگری | طبع عالی را جلا از شعر صاف باذل است[4]

عظیما نیشاپوری کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے :۔

قاصد آمد، گفتمش "آن ماہ سیمین بر چہ گفت"؟ | گفت "با ہجرم بسازد" گفتمش "دیگر چہ گفت"؟[5]

عالی نے بھی اس کے تتبع میں ایک غزل کہی ہے اور مقطع میں عظیما پر اعتراض کیا ہے۔

ہست عالی از عظیما در غزل سہو عظیم | زانکہ از قاصد بود یک گفت پس دیگر چہ گفت؟[6]

---

[1] دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق ۷

[2] ایضاً ورق ۱۲

[3] ایضاً ورق ۶۲

[4] ایضاً ورق ۲۹، ۳۴

[5] خزانۂ عامرہ ص ۴۴۰۔ عظیما نظیری کا عزیز تھا۔ اس کا بھائی فوجی شہزادہ شجاع کی سرکار سے متعلق تھا مگر عظیما ہندوستان نہیں آیا۔ (کلمات الشعرا ص ۸۷، ریو ۲/ ۶۹۰)

[6] دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق ۲۲۔

یہ غزل بول چال کی زبان ہیں ہے۔ روزمرہ اور مکالمہ کے بے ساختہ پن سے عالی کی غزلوں میں بڑی دلکشی آگئی ہے۔ کہیں وہ الفاظ کی تکرار سے اس خوبصورتی کو ابھارتے ہیں اور کہیں صنائع بدائع سے دامن بچا کر وہ فطری سادگی کو نکھارتے ہیں۔ ان کے یہاں بیدل اور ناصر کی سی پیچیدگی خال خال ملتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سرت گردم من پروانہ مشرب را چہ می سوزی؟   بسان شمع خواہم شد تمام آہستہ آہستہ

بیخودم کردی و رفتی و نیامد رحمت   باز اگر من بہ خود آیم، بہ خدا باز بیا

نشنید آخر از من و دل را خراب کرد   ہر چند گفتمش مکن ای بیوفا مکن[1]

عالی کا تصور حسن اور تصور عشق دونوں ہی جاندار اور دل آویز ہے۔ یوں تو انھوں نے سراپا پر بھی شعر کہے ہیں مگر ایسے شعروں سے ان کی انفرادیت قائم نہیں ہوتی، البتہ اس طرح کے شعر ان کے تصور حسن کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں:۔

بیخودی فرصت تصویر بہ نقاش نداد   جان کشید از تن و جانان نکشیدہ است ہنوز[2]

سپیدۂ مہ و شنجرف لالہ کم رنگ است   بگو چگونہ مصور کشد مثال ترا؟[3]

عالی کا تصور عشق روایتی ہوتے ہوئے بھی اپنی الگ انفرادی شان رکھتا ہے۔ اس میں حزنیہ عنصر غالب ہے۔ مزاح و ظرافت اور طنز و ہجو کا بادشاہ عشق کے حضور میں بے بس نظر آتا ہے۔ سوز و گداز اور درد و الم نے عالی کی عشقیہ شاعری میں گہرائی اور گیرائی اور تاثیر و تاثر کی عجیب کیفیت پیدا کی ہے:۔

دل من خون شد و از دیدہ ہمان لحظہ چکید   این کہ در سینہ گرہ گشتہ تمنای کسی است

---

[1] ایضاً ورق ۸۹، ۱۵، ۸۵۔

[2] ایضاً ورق ۶۰

[3] ایضاً (نولکشور) ص ۲۶۔

تپش دل بود سراپایم —— قطرۂ ناچکیدہ را مانم

دلم از بیم فراق تو بہ خود می لرزد —— ہمچو آن قطرہ کہ از گل نچکیدہ است ہنوز[1]

اس سے قبل کہ عالی کی غزل پر بحث ختم کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک عمدہ غزل یہاں پیش کی جائے جس سے ان کی غزلیہ شاعری کا عمومی طرز واضح ہو جائے:۔

عکس یارم کہ بہ یغمای ندیدن رفتم —— عمر صبحم کہ بہ یک آہ کشیدن رفتم

توبہ بودم کہ شکستی ہمہ جا پیش آمد —— مژدہ بودم کہ بہ تاراج شنیدن رفتم

جلوہ ای کرد کہ از حسرت دل آب شدم —— قطرہ ای گشتم و آخر بہ چکیدن رفتم

از سر کوی دلم تا بہ تماشاگہ جان —— قدمی بود کہ آن را بہ تپیدن رفتم

خاک بودم کہ مگر یار گدازی بکند —— گلشنی گشتم و بیہودہ بہ چیدن رفتم

عالی افسوس کہ داد و ستد عمر خطا است

زر قلبم کہ بہ دشنام خریدن رفتم[2]

مثنوی عالی نے ایک طویل مثنوی بھی یادگار چھوڑی ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:۔

حمد و شکر او را کہ ہر چہ ہست از و است —— دام ہستی حلقہ دار ہای و ہو است[3]

سرو آزاد نے اس مثنوی کا نام سخن عالی[4] لکھا ہے ورنہ عموماً یہ مثنوی نعمت خاں عالی

---

[1] دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق ۲۹، ۷۱، ۶۰۔

[2] ایضاً (نولکشور) ص ۱۸۰۔

[3] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۱۰۷۔

[4] سرو آزاد، ص ۱۳۷۔ مرزا محمود مازندرانی نے مطارح الانظار کے نام سے ایک انتخاب شائع کیا تھا (بمبئی جمادی الثانی ۱۲۸۷ھ) اس میں مثنوی کا انتخاب 'من سلویٰ' کے نام سے دیا ہے (ص ۱۹۳ و مابعد)

کہلاتی ہے۔ یہ ایک طویل اخلاقی مثنوی ہے اور اس میں کم وبیش چار ہزار شعر ہیں۔ یہ مثنوی بھی عالی کے اخلاقی اور مذہبی احساسات کی آئینہ دار ہے۔ شاعر نے عمومی اخلاق اور مذہب کے مختلف پہلوؤں پر ناصحانہ انداز میں بحث کی ہے اور عام دستور کے مطابق اپنی بات تمثیلوں اور حکایتوں سے واضح کی ہے۔ ان میں بعض حکایتیں خاصی فحش ہیں مگر اس دور کا معیار اخلاق کچھ عجیب رندی اور مذہبیت کا آمیزہ تھا۔ ادبی اعتبار سے یہ مثنوی روکھی پھیکی اور بے جان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عالی کے قلم کی تیزی یہاں آکر گند ہوگئی ہے۔ شاعر نے ایک چشم دید حکایت بیان کی ہے کہ ۱۰۶۸/۱۶۵۸ میں ایک نوجوان اچانک بیہوش ہوگیا۔ اطبا جمع ہوئے۔ ہر ایک نے اپنی فہم وفراست کے مطابق اندھا دھند تجویز و تشخیص کی۔ یہاں تک کہ ایک طبیب حاذق آیا اور اس نے بتایا کہ یہ نوجوان عشق کا مریض ہے۔ پہلے لوگوں نے اس کی بات کی تردید کی مگر گھر کی دایہ نے حکیم کی بات کی تائید کی[1]۔

ایک حکایت میں بڑے دلکش انداز میں مثنوی معنوی کے ابتدائی اشعار کی تضمین کی گئی ہے۔ ایک شخص نے اپنے آپ کو شہزادہ جتا کر بادشاہ کی لڑکی سے شادی کرلی لیکن جب اس کی قلعی کھلی تو حکم ہوا اسے پھانسی دیدی جائے۔ اس دوران میں بادشاہ کو خود نوجوان سے ایک طرح کا انس ہوگیا۔ چنانچہ وہ قتل سے پہلے والی رات کو ایک نے نواز کا بھیس بدل کر داماد کے محل تک گیا اور دیوار کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے یہ دھن بجائی :-

بشنو از نی چون حکایت می کند | وز جدائیها شکایت می کند

کز نیستان تا مرا ببریده اند | از نفیرم مرد وزن نالیده اند[2]

تصوف کے بارے میں عالی کے خیالات ملاحظ فرمائیے :-

---

[1] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۱۶۷۔

[2] ایضاً ۳۰۲۔

حرف تو طفلانہ است ای صوفیک | من ز امثالت شنیدم یک بیک
آنچہ نامش را تصوف کردہ ای | شتی از پیش خود آوردہ ای
تو تصوف گفتہ ای الحاد را | معدلت دانستہ ای بیداد را
گر تصوف علمی و دینی بدی | بر یکی از انبیا نازل شدی[1]

خالص اصفہانی

میر سید حسین خالص مرزا باقر وزیر قورچی کے لڑکے اور اصفہان کے رضوی سید تھے۔[2] وہ زیارت حرمین کے بعد ہندوستان آئے اور دکن میں شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔[3] وہیں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔[4] اورنگزیب کے ایما پر انھوں نے فضائل خاں کی لڑکی سے شادی کی۔[5] رفتہ رفتہ ان کے منصب میں اضافہ ہوا جس میں اورنگزیب کے میر بخشی و میر آتش روح اللہ خان

---

[1] ایضاً ورق ۲۳۳۔

[2] سرو آزاد ص ۱۳۸؛ سفینۂ خوشگو ص ۴۸۔

[3] قانع ٹھٹھوی: مقالات الشعرا ص ۱۸۸؛ سرو آزاد ص ۱۳۹۔

[4] کلمات الشعرا ص ۳۴؛ ہمیشہ بہار ورق ۳۲۔

[5] سفینۂ خوشگو ص ۴۹۔ میر ہادی فضائل خاں شہزادہ اعظم کا دیوان تھا۔ ۱۰۹۴/۱۶۸۳ میں وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں میر منشی کے عہدہ پر بحال کیا گیا۔ اپنے انتقال کے وقت (۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲) وہ بیوتات اور خانساماں تھا۔ (مآثر الامرا، ۳/۳۸؛ مآثر عالمگیری ص ۱۷۴)

❖ ❖ ❖

یزدی کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔[1]

شہزادہ عظیم الشان کے ماتحت خالص کو پٹنہ کا دیوان بنا کر بھیجا گیا۔ یہاں انھوں نے گنگا کے کنارے ایک شاندار حویلی بنوائی۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں انھیں امتیاز خاں کا خطاب عطا ہوا اور انھیں داروغۂ اصطبل بنایا گیا۔[2]

قیام ہندوستان کے دوران خالص کو برابر وطن کی یاد ستاتی رہی۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں :-

مرا می باید دم خالص بہ ایران رفت این موسم
بہ یاران صفاہان این غزل را از دکن آرم[3]

آخر کار وہ ۱۱۲۱/ ۱۰-۱۷۰۹ میں ایران کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ بے شمار دولت تھی جو انھوں نے یہاں کے قیام میں جمع کی تھی۔ بھکر میں خالص کی ملاقات میر عبد الجلیل بلگرامی سے ہوئی۔ میر صاحب نے بتایا کہ وہ اتنی دولت لے کر سفر نہ کریں کیونکہ خدا یار خاں[4] کی ان پر نظر ہے۔ مگر خالص نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا اور سفر جاری رکھا۔ جب وہ سیوستان پہونچے تو وہاں کے نائب ناظم میر محمد اشرف کے یہاں مہمان ہوئے جو میر عبد الجلیل کے عزیز تھے۔ خدا یار خاں نے میر اشرف کو کسی بہانہ سے خدا آباد بلوا لیا اور اس کے آدمیوں نے خالص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ حادثہ ۱۱۲۲/ ۱۱-۱۷۱۰ میں واقع ہوا۔ میر عبد الجلیل نے "آہ آہ امتیاز خاں" سے تاریخ

---

[1] نتائج الافکار ص ۲۲۰۔

[2] سفینۂ خوشگو ص ۸۹

[3] دیوان خالص۔ سالار جنگ میوزیم نمبر ۳۴۳، ورق ۹۸۔

[4] خدا یار خاں (م۔ ۱۱۳۱/ ۱۹-۱۷۱۸) سندھ کی کلہورہ سلطنت کا بانی ہے۔ اس نے شہزادہ معز الدین گورنر ملتان کے ہاتھوں اپنے بھائی دین محمد کے قتل کے بعد اورنگزیب کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ (مآثر الامرا ۱/ ۸۲۵؛ مقالات الشعراء ص ۲۱۲)

وفات نکالی [1]

دیوان خالص کی تصانیف میں ایک دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ مؤخر الذکر کا انتخاب خلاصۃ الکلام میں درج ہے [2]۔ خالص کے دیوان پر مخلص خاں پیدا نے تفصیلی مقدمہ لکھا [3]۔ جو اورنگزیب کے بخشی تن تھے۔ دیوان میں غزل، قصیدے اور رباعیاں وغیرہ ہیں۔ اور تقریباً تین ہزار اشعار ہیں [4]۔

دیوان خالص کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صائب اور سلیم تہرانی ان کے محبوب شاعر تھے۔ صائب کو وہ اپنا استاد بتاتے ہیں:-

میان اہل سخن اوستادیم خالص   ہمین بس است کہ شاگرد صائبا شدہ ام [5]

اور سلیم تہرانی کو اپنی شاعری کا حقیقی قدرداں سمجھتے ہیں:-

سلیم نیست کہ بیند بہ شعر من خالص   دگر بہ دہر مرا از کہ چشم امید است [6]؟

ان کے علاوہ انھوں نے جلال اسیر اور وارث کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:-

خالص اسیر طور اسیرم کہ گفتہ است   'نومید یم رسا است، رسائی توان گرفت'

این جواب آن غزل خالص کہ وارث گفتہ است

'آن کہ رخسار ترا گل کرد، ما را خار کرد' [7]

---

[1] سرو آزاد ص ۱۳۹؛ مقالات الشعرا (ص ۱۰۸) میں خالص کا سن قتل ۱۱۱۹/۰۸-۱۷۰۷ درج ہے۔

[2] اشپرنگر ص ۴۶۰؛ بوڈلین نمبر ۳۹۰۔

[3] سفینۂ خوشگو ص ۴۹؛ ید بیضا (علی گڈھ) ص ۸۸۔

[4] ریاض الشعرا (علی گڈھ) ورق ۱۴۱۔

[5] دیوان خالص، ورق ۹۶؛ مخزن الغرائب (علی گڈھ) ورق ۱۲۴۔

[6] ایضاً ورق ۲۸۔

[7] ایضاً ورق ۲۸، ۵۹۔

خالص کو یہ بھی زعم تھا کہ ان کی شاعری کے حریف صرف کلیم کاشانی ہو سکتے تھے۔

کسی حریف سخندانی تو خالص نیست — مگر بہ روز قیامت کلیم برخیزد[۱]

سرخوش[۲] کا بیان ہے کہ وہ یہ اشعار اکثر قوالی کی محفلوں میں سنا کرتا تھا مگر اسے یہ جان کر تعجب سا ہوا کہ وہ خالص کے ہیں :-

غبار راہ گشتم، سرمہ گشتم، توتیا گشتم — بہ چندین رنگ گشتم تا بہ چشمش آشنا گشتم
بہ ہر صورت کہ گردیدم، نبردم راہ در کویش — نوای بلبل و بوی گل و باد صبا گشتم

رقیبا! من نمی گویم گل و باغ و بہار از من — بہار از تو، گل از تو، ہر دو عالم از تو، یار از من
مرا ای باغبان! از داغ دل برگ و نوا باشد — چمن از تو، گل از تو، بلبل از تو، لالہ زار از من

اسی طرح آزاد بلگرامی نے یہ مشہور شعر خالص کی طرف منسوب ہے :-

دیوانہ بہ راہی رود و طفل بہ راہی — یاران مگر این شہر شما سنگ ندارد![۳]

خالص کی شاعری کلاسیکی انداز کی ہے۔ ان کا طرز سیدھا سادا، بے تکلف اور پیچیدگی یا عبارت آرائی سے مبرا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی شاعری میں غیر معمولی چونکا دینے والی بات نہیں، پھر بھی ان کا بے لوث انداز دل کو بھاتا ہے اور پڑھنے والے کو مسرت بخشتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ غزل ملاحظہ فرمائیے :-

نی سیر گل، نہ سیر گلستانم آرزو است — یک رہ نظارۂ رخ جانانم آرزو است
یک لالہ زار داغ بہ دل دارم از غمش — یک غنچہ وار چاک گریبانم آرزو است
دل در غبار کلفت و چشم بہ راہ اشک — تخمی بہ خاک دارم و بارانم آرزو است[۴]

۱۔ ایضاً ورق ۷۵

۲۔ کلمات الشعرا ص ۴۳۔
۳۔ بہارستان...

۵۔ سرو آزاد ص ۱۴۲۔ ریو...
۶۔ خلاصۃ الافکار ورق ۲۸۔

۷۔ دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق

یہ حیرت کی بات ہے کہ عہد اورنگزیب میں تصوف اور مذہبیت کی اشاعت کے باوجود اس دور کے شعرا نے نعتیہ شاعری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مثنویوں میں جو کچھ نعت ملتی ہے وہ بیشتر رسمی ہے۔ غزل یا قصیدے میں تقریباً اس کا فقدان ہے۔ اس سلسلہ میں خالص کی یہ نعتیہ غزل نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ شاعر کی عقیدت اور محبت کی آئینہ دار ہے:۔

گردون حباب بحر کمال محمد است	خورشید شمع بزم جمال محمد است
من کیستم کہ فخر نمایم بہ نعت او؟	پرواز جبرئیل بہ بال محمد است
عطر نسیم خلد کہ یارب نصیب باد!	یک شمہ از شمیم شمال محمد است[۱]

باذل

محمد رفیع باذل مخاطب بہ رفیع خاں شیخ سعدی کے مربی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان (م ۶۸۳/۸۵-۱۲۸۴) کی اولاد سے تھے[۲] ان کے والد مرزا محمود اپنے بھائی محمد طاہر وزیر خاں کے ہمراہ مشہد سے ہجرت کر کے عہد شاہجہاں میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت سے سرفراز ہوئے[۳] باذل کی ولادت دہلی میں ہوئی اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ والہ داغستانی

---

[۱] دیوان خالص ورق ۳۵۔

[۲] سرو آزاد ص ۱۴۱۔

[۳] ایضاً۔ محمد طاہر وزیر خاں شہزادہ اورنگزیب سے متعلق تھا۔ وفات کے وقت (۱۰۸۳/۷۳-۱۶۷۲) وہ مالوہ کا گورنر اور پنج ہزاری منصب دار تھا۔ اس نے اورنگ آباد میں ایک خوبصورت محل اور مسجد بنوائی تھی۔ بڑے بھائی مرزا محمود نے اورنگ آباد اور برہان پور میں دو محلے محمود پورہ کے نام سے آباد کیے۔ ان کی قبر موخر الذکر محلہ میں ہے۔ مآثر الامرا ۳/۹۳۷؛ سرو آزاد ص ۱۴۱؛ کلمات الشعرا ص ۹۴)

[۴] سرو آزاد (حوالہ بالا)

کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ باذل اپنے خال محمد طاہر مشہدی کے ساتھ مشہد سے ہندوستان آئے[۱]۔ بڑے ہونے پر باذل شہزادہ معزالدین کی سرکار سے والبستہ ہو گئے۔ دراصل شہزادہ باذل کا بھانجہ تھا[۲]۔ اس نسبت سے باذل کی حیثیت اور منصب میں وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہی۔ پہلے وہ گوالیار کے فوجدار بنا کر بھیجے گئے[۳] اور بعد میں انھیں بانس بریلی کی نظامت سپرد ہوئی[۴] اورنگزیب کی وفات تک باذل اسی عہدہ پر فائز رہے مگر اس کے بعد ان کی نوکری جاتی رہی۔ چنانچہ وہ دہلی میں آ کر گوشہ گیر ہو گئے اور یہیں ۱۱۲۳/۱۷۱۱ میں ان کا انتقال ہوا۔ جاجہر علی بخشش داد ان کی تاریخ وفات ہے[۵]۔

باذل نے قصائد اور غزلیات کا ایک دیوان مرتب کیا تھا[۶] جو اب ناپید ہے ان کی واحد تصنیف مثنوی حملۂ حیدری ہے جو ان کی عظمت کے لئے کافی ہے۔ اس سے پہلے باذل کے سلسلہ میں ناصر علی کے طنزیہ ریمارک کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ عرض بھی کیا گیا کہ نعمت خاں عالی باذل کو ایک قابل قدر نقاد مانتے تھے جیسا کہ اس شعر میں کہتے ہیں:

ہر کجا آئینہ باشد، بایدش روشنگری طبع عالی را جلا از شعر صاف باذل است[۷]

۱۔ ریاض الشعرا (علی گڈھ) ورق ۶۵؛ نشتر عشق ص ۲۹۱۔

۲۔ ریو ۲/۷۰۴۔ عالمگیر نامہ (ص ۷۵۴) میں معزالدین کی ماں کا نام نہیں دیا ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ وہ ایک خراسانی امیر کی لڑکی تھی۔ ٹامس بیل نے (اورینٹل بایوگرافکل ڈکشنری، کلکتہ، ۱۸۸۱ء، ص ۱۲۷) اس کا نام نظام بائی لکھا ہے۔

۳۔ مجمع النفائس ورق ۶۴۔

۴۔ بہارستان سخن ورق ۲۲۹؛ ید بیضا (علی گڈھ) ص ۴۹۔

۵۔ سرو آزاد ص ۱۴۲۔ ریو (۲/۷۰۴) نے مرآۃ الصفا اور تاریخ محمدی کے حوالے سے ۱۱۲۴/۱۷۱۲-۱۳ لکھا ہے۔

۶۔ خلاصۃ الافکار ورق ۲۸۔

۷۔ دیوان عالی (نیشنل میوزیم) ورق ۳۴۔

حملۂ حیدری باذل کا شاہکار ان کی طویل مذہبی نظم حملۂ حیدری ہے جو آنحضورؐ کی نبوت سے ان کے وصال تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ تمہیدی اشعار کے بعد باذل کہتے ہیں:۔

ز بعثت کنون ابتدا می کنم	شروعش بہ نام خدا می کنم
بہ نام خدا و بہ نام نبی	بہ نام علی ولی وصی[1]

سرخوش[2] کا بیان ہے کہ باذل نے ملا معین مسکین کی معارج النبوۃ کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ معارج النبوۃ میں آنحضورؐ کی پیدائش سے لے کر وصال تک کے واقعات درج ہیں لیکن حملۂ حیدری میں واقعات کا آغاز بعثت سے ہوتا ہے۔

مثنوی کے آغاز میں باذل اس مخصوص موضوع کے انتخاب کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غزل کا تاثر چند لمحے کا ہوتا ہے اس لئے اس میں خون کھانے کا بظاہر کوئی حاصل نہیں نظر آتا چنانچہ میں نے سوچا کہ کوئی داستان نظم کروں لیکن جب عام داستانوں پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا وہ سب افسانہ اور دروغ ہیں۔ اس لئے میں نے نبی اور علی کے سچے واقعات نظم کئے:۔

کہ از عالم غیب فرخ سروش	در آمد چو مرغ سحر در خروش
بہ من گفت ای نقشبند خیال	بری چند بیہودہ رنج و ملال؟
بہ فکر غزل تا بہ کی خون خوری؟	چنین خون بی حاصلی چون خوری؟
چہ حاصل ترا از غزل غیر ازین	کہ بر رو کند سامعت آفرین
چو برخیزد از بزم و گردد روان	نیاید دگر ہیچ یادش ازان
چو ناچار می بایدت خورد خون	چنان خور کہ رنگی دہی زان برون

---

[1] حملۂ حیدری (آصفیہ، نمبر تاریخ ۴۶۷) ورق ۵

[2] کلمات الشعراء ص ۱۰۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے (مثلاً مخزن الغرائب، ورق ۵۵) اسی بیان کو دہرایا ہے۔

زہاتف شنیدم چو این گفت نغز | بہ سر آمد از ذوق در جوش مغز
دواندم بہ ہر سوی پیک خیال | ندیدم یکی قصہ بی قیل وقال
زدم رای با دل درین مدعا | بہ پاسخ دلم گفت 'باذل چرا'
نہ بندی عروس سخن را حلی | زنعت نبی و زمدح علی؟[۱]

لیکن باذل نے جب مثنوی لکھنے کا فیصلہ کیا تو انھیں یہ احساس ہوا کہ اس صنف میں تو بڑے بڑے اساتذہ اپنا جوہر دکھا چکے ہیں اور رزمیہ، عشقیہ اور اخلاقی ہر طرح کی مثنویاں لکھی جا چکی ہیں۔ فردوسی، نظامی، ہاتفی، خواجو اور قدسی وغیرہ کے مقابلہ میں شاعر کو اپنی کم مائگی کا شدید احساس ہونے لگا لیکن اس نے شیر خدا سے مدد طلب کی اور اپنی تصنیف میں منہمک ہو گیا:۔

رسیدم بہ فردوسی ارجمند | بدیدم سر راہ را کردہ بند
زشہنامہ بر دوش گرز گران | وزان گشتہ سرکوب بر ہمگنان
دگر سو نظامی ستادہ چو کوہ | زفر سکندر گرفتہ شکوہ
بہ سوی دگر خواجو آراستہ | زسام نریمان مدد خواستہ
بہ جای دگر ہاتفی در فغان | کہ این بند را بستہ صاحبقران
دگر جانب استاد قاسم دلیر | بہ تائید فرزند حیدر چو شیر
بہ راہ دگر قدسی پہلوان | ستادہ بہ اقبال شاہ جہان
چو دیدم سر راہ ہا جملہ بند | بہ نیروی مردان اقبال مند
بہ دل گفتم اکنون چہ چارہ کنم؟ | چسان پیش بگذارم آنجا قدم؟
کہ افتاد بر ہفت خوان رہ مرا | مدد جستم آن دم ز شیر خدا
ببردم سوی تیغ حیدر پناہ | دلیرانہ بگذاشتم پا بہ راہ[۲]

۱؎ حملہ حیدری ورق ۵۔

۲؎ ایضاً

باذل نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ حملۂ حیدری کی تصنیف میں صرف کیا۔ خان آرزو کا بیان ہے کہ جب وہ سترہ سال کے تھے تو ایک دن باذل کی خدمت میں حاضر ہوئے، باذل اس وقت گوالیار کے قلعہ دار تھے اور حملۂ حیدری میں مصروف تھے، مگر انھوں نے ازراہ شفقت خان آرزو کو اپنے چند شعر سنائے[۱]۔ انھوں نے پچاس سال صرف کرنے کے بعد ۱۱۱۹/۰۸-۱۷۰۷ء میں اسے نامکمل چھوڑ دیا[۲]۔

باذل کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ بعثت سے حضرت علی کی خلافت تک کے واقعات قلمبند کریں گے اور خاص طور پر خلافت علی پر تفصیل سے لکھیں گے۔ غالباً اسی مناسبت سے انھوں نے مثنوی کا نام بھی حملۂ حیدری رکھا تھا۔ مگر ان کی مثنوی آنحضور کے وصال پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ باذل کی وفات کے بارہ سال بعد ۱۱۳۵/۲۳-۱۷۲۲ء میں ایک شخص نجف نے باذل کا کام تکمیل کو پہونچایا۔ اصل میں باذل سے پہلے ایک شاعر ابوالقاسم فندرسکی اصفہانی نے حربۂ حیدری[۳] کے عنوان سے حضرت علی کی تاریخ وہاں سے نظم کی تھی، جہاں پر باذل کی مثنوی آکر ختم ہوتی ہے۔ یہ مثنوی اتفاق سے نجف کو مل گئی اور اس نے چند تمہیدی اشعار کے ساتھ اسے حملۂ حیدری کے ساتھ ضم کر دیا[۴]۔

ابوالقاسم کی مثنوی کے علاوہ اور شعرا نے بھی باذل کی حملۂ حیدری پر اضافے کئے اور اسے مکمل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں ایک اضافہ آزاد کا ہے جس کا تعین کرنے میں ڈاکٹر ریو سے غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اسے مرزا ارجمند آزاد پسر عبدالغنی بیگ قبول اور آزاد بلگرامی

---

[۱] مجمع النفائس ورق ۶۴۔

[۲] اشپرانگر ص ۳۶۸ (بحوالہ فہرست مخطوطات برلن)

[۳] حربۂ حیدری ابوالقاسم فندرسکی، سالار جنگ نمبر ۱۸۸۔

[۴] ایضاً ورق ۲۲۱؛ ریو ۲/۷۰۴۔

سے اشتباہ کیا ہے[1]۔ حالانکہ یہ آزاد محمد صادق آزاد ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے :۔

"ابتدای ملحقات حملۂ حیدری من کلام محمد صادق آزاد" [2]

محمد صادق آزاد تہران کا باشندہ تھا اس کی ایک اور تصنیف دلکشا نامہ بھی جس سے اس کے مزید احوال پر روشنی پڑتی ہے۔ آزاد نے یہ اضافہ باذل کے چچازاد بھائی فخرالدین محمد م ۱۱۳۹/۲۷۔۱۷۲۶) کے ایما پر کیا تھا[3]۔

ابوالقاسم اور آزاد کے اضافوں کے علاوہ حملۂ حیدری کے یہ مزید تکملے ہیں :۔

۱۔ حربۂ حیدری از کرم (مؤلفہ ۴۹ - ۱۱۳۵/ ۳۷۔۱۷۳۶ ـــ ۲۳۔۱۷۲۲) [4]

۲۔ صولت صفدری از محب علی حکمت (مؤلفہ ۱۱۴۳/ ۳۱ - ۱۷۳۰) [5]

۳۔ تکملۂ حملۂ حیدری از پسند علی[6]۔

حملۂ حیدری کی ہمنام ایک اور منظوم تاریخ ہے جس کے مصنف مامون علی معروف بہ راجی کرمانی ہیں جنھوں نے ۱۸۰۵ء میں شہزادہ ابراہیم خاں کی خواہش پر اسے نظم کیا۔

حملۂ حیدری تکملہ سمیت فارسی کی سب سے طویل مثنوی ہے اس کے اشعار کی مجموعی تعداد نوے ہزار ہے[7] اور اس طرح اس کی ضخامت شاہنامہ سے ڈیڑھ گنی ہے۔ صرف حملۂ حیدری میں

---

[1] ریو ۲/۷۰۴ ؛ ۳/ ۱۰۹۱۔

[2] بانکی پور ۳/ ۱۸۴ مخطوطہ نمبر ۳۷۴

[3] بانکی پور ۳/ ۱۸۰۔

[4] ایشیاٹک ۱/ نمبر ۸۵۰ نیز اشپرنگر ص ۴۵۶۔ [5] ریو ۲/ ۷۰۸

[6] فہرست کتب مطبوعہ برٹش میوزیم مرتبہ ای۔ ایڈورڈ، لندن، ۱۹۲۲، (انگریزی) ص ۶۰۵۔ یہ کتاب آگرہ سے ۱۳۰۵ ہجری میں طبع ہوئی تھی۔

[7] بہارستان سخن ورق ۲۲۹۔

تقریباً چالیس ہزار اشعار ہیں[1]۔ یہاں آنحضور کے وصال اور حضرت علی کی طرف انتقال معرفت سے متعلق اشعار درج کیے جاتے ہیں :۔

چنین گفت پس عازم آن سرا	کہ آرید پیشم حبیب خدا
چو حفصہ شنید از رسول آن طلب	چنین گفت با عائشہ از طرب
کہ بوبکر را خواست خیر البشر	بدو عایشہ گفت "ای بیخبر"
حبیب خود از امرت خود نبی	نداند کسی را بہ غیر علی
علی را نمایید حاضر برش	کہ کس جز علی نیست در خاطرش
علی را خبر شد ازان ماجرا	برآمد برش کردہ گم دست و پا
اشارت نمودش رسول خدا	کہ در زیر پشت من اکنون در آ
بدانسان کہ فرمود او را نبی	بہ خود تکیہ دادش علی وصی
بہ گوشش نبی راز گفتن گرفت	علی از دل و جان شنفتن گرفت
پس از جای برخاست شیر خدا	بخوابید بر پشت آن مقتدا[2]

---

[1] سفینۂ خوشگوص ۵۶ ؛ مجمع النفائس ورق ۶۴

[2] حملۂ حیدری ورق ۱۹۹

واضح

مرزا مبارک اللہ واضح ایک رئیس خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد میر اسحق[1] اور ان کے دادا میر باقر دونوں جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز اور خطاب یافتہ منصب دار تھے[2]۔ واضح کی والدہ زاہد خاں کوکہ کی صاحبزادی تھیں[3]۔ اور ان کی دادی آصف خاں جعفر (م ۱۰۲۱/۱۳-۱۶۱۲) کی بیٹی تھیں[4]۔

واضح کی ولادت ۱۰۵۹/۱۶۴۹ میں ہوئی کیونکہ ۱۱۲۶/۱۷۱۴ میں وہ اپنی عمر ۶۷ سال بتاتے ہیں[5]۔ خوشگو کا بیان ہے کہ ابتدا میں وہ شہزادہ اعظم کی سرکار سے وابستہ تھے اور اس کی شان میں یہ رباعی نظم کی۔

---

[1] تاریخ ارادت خاں کے بعض نسخوں (ایتھے نمبر ۳۸۹؛ ریو ۳/۹۲۸ وغیرہ) میں ان کے والد کا نام کفایت خاں شکستہ نویس غلط لکھا ہے۔ کفایت خاں اپنے عہد کا مشہور خطاط تھا اس کا انتقال ۱۰۹۵/ ۱۶۸۴ میں ہوا۔ اس کا لڑکا درایت خاں بھی خطاطی میں ماہر تھا (مرآۃ العالم ورق ۶۴۴؛ مآثر عالمگیری ص ۲۴۷ وغیرہ)

[2] واضح کے دادا میر باقر کو جہانگیر نے ارادت خاں کا اور شاہجہان نے اعظم خاں کا خطاب دیا تھا۔ ان کا انتقال جونپور میں ۱۰۵۹/۱۶۴۹ میں ہوا (مآثر الامرا ۱/۱۷۴) واضح کے والد میر اسحق کو شاہجہاں نے ارادت خاں کا خطاب عطا کیا۔ ان کا انتقال ذی الحجہ ۱۰۶۸/ستمبر ۱۶۵۸ میں ہوا (مآثر الامرا ۱/۲۰۳)

[3] مآثر الامرا ۱/۲۰۴

[4] ایضاً ۲/۱۷۴۔

[5] تاریخ ارادت خاں (علی گڈھ) ص ۲۔

ای ذات تو ہم بقای عالم بادا　　تیغ تو بہ آفتاب ہمدم بادا

گویند ملک بہ کنگرۂ عرش بلند　　آمین مطیع اسم اعظم بادا[1]

لیکن خود واضح اپنی تاریخ میں (جس کا ذکر آگے آئے گا) یہ کہتے ہیں کہ میں شہزادہ اعظم کی ملازمت میں کبھی نہیں رہا بلکہ اس کے لڑکے بیدار بخت سے وابستہ رہا ہوں[2]۔

بہرحال گیارہویں صدی ہجری کے اختتام پر واضح سرکاری عہدہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ انھیں ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ء میں چاکنہ (پونہ کے قریب) کا فوجدار مقرر کیا گیا[3]۔ آٹھ سال بعد یعنی ۱۱۰۸/۹۷-۱۶۹۶ء میں انھیں خاندانی خطاب ارادت خاں عطا ہوا[4]۔ واضح کی ایک مہر پر یہ سن اور مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے:

از ارادت بر عدوی دین شدم چون فتحیاب　　شاہ عالمگیر غازی کرد ارادت خان خطاب[5]

اسی سال واضح کو نواح اورنگ آباد کی فوجداری عطا ہوئی اور ان کا منصب ہفت صدی ہزار ذات کر دیا گیا[6]۔ بعد میں انھیں ادونی (امتیاز گڈھ) کا قلعہ دار بنا کر بھیجا گیا[7]۔ ۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲ء میں ان کا ذکر گلبرگہ کے قلعہ دار کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اب ان کا منصب یک ہزاری ہو گیا تھا[8]۔

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۸۴

[2] تاریخ ارادت خاں (ایلیٹ اینڈ ڈوسن: تاریخ ہندوستان (انگریزی) ج ۷، لندن ۱۸۷۷، ص ۵۴۰)

[3] مآثر عالمگیری ص ۳۳۰۔

[4] ریو ۳/ ۹۳۸

[5] مثنویات و دیوان واضح، سالار جنگ میوزیم نمبر ۹۳۷، ص ۱۰۔

[6] مآثر عالمگیری ص ۳۸۳۔

[7] ایلیٹ اینڈ ڈوسن ۷/ ۵۳۴۔

[8] مآثر عالمگیری ص ۴۷۲۔

جیسا کہ واضح کا بیان ہے وہ شہزادہ بیدار بخت سے وابستہ رہے۔ کہتے ہیں جب شہزادہ مالوہ کا گورنر تھا تو واضح اس کے مشیر خاص تھے اور شہزادہ کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں کرتا تھا۔[1]

اورنگ زیب کی وفات کے وقت واضح مانڈو کے قلعہ دار اور فوجدار تھے۔ وہ فوراً شہزادہ بیدار بخت سے ملنے کے لئے اجین روانہ ہوئے کیونکہ شہزادہ نے انھیں طلب کیا تھا۔ بیدار بخت اور اس کے باپ اعظم کے قتل کے بعد واضح نے آگرہ میں پناہ لی حالانکہ دشمن کی فوج میں انھیں پناہ دینے والے کئی ایک تھے۔[2] بہادر شاہ اول کے عہد میں واضح وزیر اعظم منعم خاں (م ۱۱۲۳/۱۲-۱۷۱۱) سے بڑے اچھے تعلقات ہو گئے۔ منعم خاں واضح کو اپنا استاد کہتے تھے۔[3] غالباً انھیں کوئی سرکاری عہدہ بھی ملا کیونکہ ان کا منصب چار ہزار ہو گیا تھا۔[4]

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد واضح نے سیاسی وفاداری میں پھر غلطی کی۔ انھوں نے شہزادہ عظیم الشان کی حمایت کی اور اس طرح ان پر جہاندار شاہ اور امیر الامرا ذوالفقار خاں کا عتاب نازل ہوا۔ واضح کے خلاف یہ سرکاری اعلان کیا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ملیں، انھیں قتل کر دیا جائے۔ کسی کسی طرح ان کی جان بخشی ہوئی اور انھیں ایک گوشہ میں زندگی گذارنے کی اجازت مل گئی۔[4] انھوں نے فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۲۸/۱۶-۱۷۱۵ میں وفات پائی۔[5]

---

[1] ایلیٹ اینڈ ڈوسن ۵۳۸/۷۔

[2] سفینۂ خوشگو ص ۸۴۔

[3] ید بیضا ص ۳۰۷

[4] ایلیٹ اینڈ ڈوسن ۵۵۹/۷

[5] سرو آزاد ص ۱۴۷۔ تاریخ محمدی (بحوالہ ریو ۱۰۹۶/۳) میں ان کی تاریخ وفات ۱۱۲۹/ ۱۷-۱۷۱۶ لکھی ہے۔ ڈاکٹر اشپرانگر نے واضح کی ایک رباعی سے ۱۱۳۴ھ کے اعداد نکالے ہیں مگر ایتھے کے مخطوطہ (نمبر ۱۶۷۴) میں اسی رباعی سے ۱۱۸۳ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

واضح کی شادی ان کے مرشد میر سنجر نقشبندی لاہوری کی لڑکی سے ہوئی۔[۱] ہمیں ان کے دو بیٹوں کا علم ہے ہدایت اللہ خاں اور روح اللہ خاں اول الذکر کو ہوشدار خاں اور ارادت خاں کے خطابات ملے۔ وہ بہادر شاہ سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک سرکاری عہدہ پر فائز رہے، اور ۱۱۵۷/۴۴-۱۷۴۴ میں وفات پائی۔[۲] روح اللہ خاں کا ذکر ان کی تصنیف تحفۃ الشجاعۃ کے ذیل میں آئے گا۔

ارادت خاں واضح کا اشتباہ اسی تخلص کے دوسرے شاعر سے نہیں ہونا چاہیے جس کا دیوان انڈیا آفس[۳] میں موجود ہے۔ اس واضح کا نام مرزا علی اصغر تھا۔ وہ اصفہان کا باشندہ تھا۔ وہ دہلی آیا اور حیدرآباد میں ۱۱۳۴/۲۲-۱۷۲۱ میں وفات پائی۔[۴] اسی اشتباہ کی بنا پر بیخبر[۵] نے دو واضح کا ذکر کیا ہے۔ پہلے کا نام ارادت خاں بتایا ہے اور دوسرے کا مرزا مبارک اللہ۔ حالانکہ دونوں ایک ہیں۔

ارادت خاں واضح شاعری میں راسخ سرہندی کے شاگرد تھے۔[۶] وہ بید لکھاڑ تھے انھوں نے نظم میں ایک ضخیم کلیات اور نثر میں کئی ایک کتابیں تصنیف کیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

۱- کلمات عالیات۔ تصوف میں۔

۲- تاریخ ارادت خاں۔ ان واقعات پر مشتمل جو اورنگزیب کی وفات سے لے کر دہلی

---

[۱] سفینۂ خوشگو ص ۸۴۔

[۲] مآثر الامرا ۱/۲۰۵

[۳] ایتھے نمبر ۳۰۳۸۔

[۴] ریاض الشعرا (علی گڑھ) ورق ۴۵۸۔

[۵] سفینۂ بیخبر ص ۳۵۳۔

[۶] مرآۃ الخیال ص ۳۴۲۔

میں فرخ سیر کی آمد (جنوری ۱۷۱۳) تک ظہور پذیر ہوئے۔

۳۔ رسالہ دربیان غسل خانۂ شاہی۔

مندرجہ ذیل تین تصانیف بھی واضح کی طرف منسوب کی جاتی ہیں:۔

۱۔ قصہ وامق عذرا (نثر)

۲۔ مینا بازار۔

۳۔ پنج رقعہ۔

کلیات واضح کا کلیات شعر خاصا ضخیم ہے اور جیسا کہ کہا گیا وہ اطناب کے شوقین تھے اور دوغزلہ سہ غزلہ کہنے کے عادی تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے کلیات کا انتخاب کیا گیا۔ انڈیا آفس میں ان کے کلیات کے دو انتخاب موجود ہیں جس کے نمبر ۱۶۷۴ اور ۱۶۷۵ ہیں۔ ایتھے کا بیان ہے کہ موخرالذکر انتخاب ان کے استاد راسخ کا کیا ہوا ہے اگرچہ اس میں بعد کے اضافے ہیں۔ اتفاق سے اول الذکر کا عکس راقم کے سامنے ہے۔ اس کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخ نے ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ میں واضح کی صرف ہم طرح غزلوں کا انتخاب کیا تھا۔

"درشہور سنہ یک ہزار و نود و ہشت میر محمد زمان راسخ .... در سفر آخر کہ بہ عزم پا بہ دامن کشیدن .... مرخص می شد، از دیوان ما اشعاری کہ در آن ہم طرح بود، جدا نوشتہ، بہ طریق یادگار با خود برد۔ آن را بہ طالبان سخن .. رسانید و در آن وقت دیوان غزل ما از دو ہزار بیت درنگذشتہ بود و قریب بہ ربع آن کہ میر مرحوم در آن ہم طرح بود، با خود داشت۔ آن قبلۂ ارباب سخندانی .... چون ز صحبتم جدائی ورزید، اشعار مرا کہ او جدا کرد و نوشت، تاریخ "جدا کردۂ راسخ" گردید۔"[1]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخ نے کلیات کا نہیں بلکہ صرف ہم طرح غزلوں کا

---

[1] انتخاب کلیات واضح (عکس ایتھے نمبر ۱۶۷۴) ورق ۲۔

انتخاب کیا تھا۔ ایتھے کا یہ بیان بھی ہے کہ واضح نے دو الگ الگ دیوان غزلیات مرتب کئے تھے کیونکہ ایک میں نثری مقدمہ ہے اور دوسرے میں نہیں ہے۔ مندرجہ بالا مقدمہ میں واضح کہتے ہیں کہ میں نے رتبۂ سخن کے لحاظ سے اپنے اشعار کے تین انتخاب کئے ہیں اولین سحابۂ صبوحی فیض، دومی نشأۂ دوبالا و سیومی خاصیت خاص[۱]؛

بہرحال واضح کو اپنا کلام محفوظ کرنے کا بیحد خیال تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی نقلیں کرائیں۔ شفیق نے ان کا وہ کلیات دیکھا تھا جو انھوں نے ۱۱۱۸/ ۰۷-۱۷۰۶ میں لکھوایا تھا[۲]

اس سے قبل کہ واضح کی غزلوں پر بحث کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قصائد اور دیگر نظموں کا جائزہ لیا جائے۔ کلیات میں دو طویل قصیدے ہیں پہلا قصیدہ فلک المعارج ۳۲۲ اشعار پر مشتمل اور ۱۱۱۱/ ۱۷۰۰-۱۶۹۹ کی تصنیف ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے:-

در سال یک ہزار و صد و یازدہ کہ بود	سال جلوس بادشہی اربعین و چار
در یک شب و دو روز بہ دہ ساعت نجوم	آمد چو وحی بر دل این شعر آبدار
بر وفق نام پاک علی و محمد است	ابیات این قصیدہ چو آرند در شمار[۳]

دوسرا قصیدہ فخر دارین حضرت علی کی منقبت میں ہے اور ۱۰۸۹/ ۷۹-۱۶۷۸ میں لکھا گیا اس کے اشعار کی تعداد ۱۸۷ ہے:-

بہ سال الف و ثمانین و تسع از ہجرت	گذشت بیست و دو سال از جلوس سلطانی
شمار بیت قصیدہ بہ اعتبار جمل	بود بہ وفق علی الولی چو برخوانی[۴]

---

[۱] ایضاً

[۲] گل رعنا ورق ۲۴۳ -

[۳] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۳

[۴] ایضاً ورق ۱۹ -

اس قصیدہ میں ہمت خاں کی تعریف میں یہ شعر ہے:۔

ولیک شکر عنایات لطف ہمت خان	کہ فخر می کند از ذات پاک او خانی

یہ دونوں قصیدے اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے شاعر کے خیالات اور عقائد پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلے قصیدے میں آنحضورؐ کی نعت صحابہ اور حضرت علی کی منقبت کے بعد حالات زمانہ کی ناسازگاری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

لیکن غم شماتت اعدا قیامت است	دونان کہ گشتہ اند ہمہ صاحب اقتدار
محتاج شان بزرگ نژادان باکمال	چون برگ کاہ کوہ دلان گشتہ بی وقار
آن گفتہ 'دخترم شدہ شہزادہ را قرین'	وین گفتہ 'مادرم شدہ نواب را تبار'
آن گفت 'ہست عمہ من خالہ فلان'	وین گفتہ 'بود جدہ من سخت نامدار'
یک فرقہ دگر کہ ز پاجی طبیعتی	ناآشنا بہ این کہ چہ چیز است ننگ و عار
با ہر مقربی و امیری و خواجہ ای	از صبح تا بہ شام بہ درماندہ حلقہ وار
او رفتہ سوی مزبلہ، این آفتابہ گیر	او یاد راز کردہ و این پایتابہ دار
ہرگہ بہ جنگ رفتہ نمودہ بہ خصم پشت	اما بہ گوش شاہ رسانید این کبار
کاندر زمانہ رستم و گودرز و سام کو؟	ہستند پیش رستمیش جملہ شرمسار
این ناخلف بہ این ہمہ نامردی و لجاج	گشتہ بہادر و شدہ سر فوج نامدار[۱]

لیکن صرف یہی لوگ معاشرہ کے ناسور نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں۔ جن سے معاشرہ میں گھن لگ رہا ہے:۔

یک جمع دیگر اند بہ دزدی ربودہ گوی	چون زاغ و چون زغن ہمہ شان حرام خوار
ضال و مضل فرقہ دیگر ز راہ مکر	خود را نمودہ در عمل و علم از کبار

---

[۱] ایضاً ورق ۱۲-۱۱۔

آراستہ بہ شرع نبی ظاہر ہمہ   شیطان زفعل باطن شان گشتہ شرمسار
ہستند مار جملہ، بہ سوراخ اگر روم   ہستند اژدہا چو پناہ آورم بہ غار[1]

سترہویں صدی کے اختتام میں ہندوستانی معاشرہ کا یہ حال تھا اس طرح کچھ اور نظمیں عطا ٹھٹھوی اور جعفر زٹلی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ ایک اور خصوصیت جوان قصیدوں کو ممتاز کرتی ہے، وہ واضح کی شاعرانہ تعلی اور بے پناہ انا ہے۔ واضح اپنے استاد راسخ کے علاوہ بہت کم ہم عصر شعرا کی قدر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صائب کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ایک بار محمد حسین ناجی (م۔ ۱۱۲۶/۱۷۱۴) نے انھیں یہ شعر لکھ کر دکھایا:۔

بشکند از جور گردون گر نسوزد دل زعشق   دانہ ای کز برق سالم ماند، رزق آسیا است

تو واضح نے اس پر یہ رائے دی:۔

ای بسا ابلیس آدم روی ہست، صائبا نہ چرامی گویند؟[2]

لیکن قصیدوں میں ان کی تعلی اور بھی جارحانہ ہے۔ مثلاً پہلے قصیدہ کی تشبیب میں جب معشوق ان سے شعر کی فرمائش کرتا ہے تو واضح کہتے ہیں:۔

گر مثنوی است، شعر زلالی بیاورم   ہم حاضر است خمسۂ آن شیخ نامدار
ور از غزل زصائب وقاسم سفینہ ایست   ہم از علی است صفحۂ چندی بہ یادگار
ور از قصیدہ شمس مناقب زموسوی   دارم کہ کردہ است بدآن شعر افتخار۔

اس پیشکش پر معشوق کی طرف سے یہ تنقید ہوتی ہے:۔

خندید و گفت این ہمہ نافہم نیستم   زین جہلات چند بگوئی؟ سخن بیار
زو چند مطلعی بہ غلط، مثنوی بہ نام   وین قصہ گو زتازہ خیال است یک کنار

---

[1] ایضاً ورق ۱۲

[2] سفینۂ خوشگو ص۔ ۷۰

وآن از مثل فریب دہ عام در غزل — وین را خیال نارس و خام است بی شمار
وآن یک بہ فارسی نشدہ آشنا ہنوز — وین در قصیدہ اش بنود نیم جو عیار[1]

ظاہر ہے واضح کا یہ تبصرہ صحیح نہیں اور کم از کم ان کی غزل یا مثنوی ناصر علی کی تخلیق سے کسی طرح برتر نہیں۔

اسی طرح دوسرے قصیدہ میں فرماتے ہیں :-

مرا کہ نام سخن پروری ز عرش گذشت — مرا کہ ننگ بود از کمال حسانی
دگر چہ ماند کہ امروز باز می سنجند — بہ عرفی و بہ ظہیر و مجیر و خاقانی
کرا مجال کہ در پیش من سخن گوید — کرا خطور بہ خاطر کند سخن دانی[2]

انھوں نے اپنے کلیات کے اول صفحہ پر آب زر سے یہ لکھوا رکھا تھا :-

خیال عرش کمال است کز کلام خدا
شدش ز آیہ فاتوا بسورۃ طغرا[3]

بات یہیں تک ختم نہیں کہ کوئی ان کے مقابلہ میں شعر نہیں کہہ سکتا تھا بلکہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کا شعر سمجھ لینا ہی بڑی بات تھی :-

فہمیدن شعر ما کمال است — ہم چشمی ما کرا مجال است[4]

مثنوی آئینۂ راز کے دیباچہ میں واضح کہتے ہیں کہ میں نے قصیدے کم لکھے کیونکہ میں ہاجی یا مداح نہیں ہوں 'عالی نسبم نہ گد القب، امارت پایہ ام نہ بی سرمایہ ... در نعت و منقبت

---

[1] انتخاب کلیات واضح ورق ۵۔۴۔

[2] ایضاً ورق ۱۹۔۱۸۔

[3] مجمع النفائس ورق ۵۲۰۔ ان کی مہر پر ابحق واضح 'کندہ تھا جسے وہ ہر تصنیف پر ثبت کرتے تھے (گل رعنا ورق ۲۴۳)

[4] سفینۂ خوشگو ص ۸۵۔

قصایدِ غرا دارم[1] اور یہ حقیقت ہے کہ ان کا پہلا قصیدہ فطرت موسوی کے قصیدہ سے زیادہ پُر زور ہے۔

کلیات میں واضح کے مرشد میر سنجر کی وفات پر ایک دردناک مرثیہ بھی ہے۔ میر سنجر واضح کے خسر اور لاہور کے نقشبندی صوفی تھے۔ واضح کو تصوف سے خاص شغف تھا۔ انھوں نے نثر میں اس موضوع پر کلمات عالیات تصنیف کی جس کا ذکر آئے گا۔

واضح اصلاً غزل اور رباعی کے شاعر تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ ان کی رباعی غزل سے زیادہ جاندار ہے۔ بہر حال ان کی زود نویسی اور بسیار نویسی کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کی غزلیہ شاعری بڑی حد تک قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واضح کو فن پر کمال قدرت تھی اور اگر وہ تمام اصناف سخن کی تخلیق کا لمبا چوڑا منصوبہ نہ بناتے اور اپنی توجہ صرف غزل پر مرکوز رکھتے تو وہ یقیناً اس دور کے بہت بڑے غزل گو ہوتے۔

انھوں نے چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہی ہیں وہ بڑی بحر کی غزلوں سے نسبتاً سادہ اور پراثر ہیں۔ ایسی غزلوں میں جذبات اور احساسات کی بڑی حسین آمیزش ہے اور اظہار و ابلاغ کا بڑا متوازن انداز ہے۔ یہی بات بڑی حد تک بیدل کی خفیف بحر کی غزلوں پر بھی صادق آتی ہے۔ یہاں ایسے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :-

می برد بختم از کجا به کجا[1] —— گرد بادِ غمم، نمی دانم

نکنی یاد آشنایی‌ها[2] —— ای دلت شاد از جدایی‌ها

بیدلان معلوم کردند، آن خدا است —— آنچه می جوید دل، معلوم نیست

---

[1] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۱۶۔

[2] ایضاً ورق ۲۵۔

[3] ایضاً ورق ۲۷

نیستم از دین و دنیا کاجو — آنچه می جوید دل ما آن کجا ست؟[1]

آب و آتش بہم آمیختہ اند — شمع سان پیکر دل ریختہ اند

نمک حسن نزاکت دارد — گویی از پردۂ دل ریختہ اند[2]

لیکن واضح کی دوسری غزلیں کم اہم نہیں ہیں۔ دراصل واضح کے کلام میں سخت انتخاب کی ضرورت ہے اور اس انتخاب کے بعد بھی ان کے یہاں عمدہ اور عظیم اشعار کی تعداد اس دور کے کسی بڑے شاعر سے کم نہیں ہوگی۔ جس شاعر کے دیوان میں اس انداز کے اشعار ہوں، اس کی شاعری کی عظمت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

خاری کہ در رہ تو خلد رہروانِ شوق — در چشم دل نہند، گر از پا برون کنند

ای ناامید رفتہ ز محراب، باز گرد — وقت دعا ست چون در میخانہ وا کنند[3]

تنم آسودگی بستر مہتاب نداشت — کسوت شعلہ رفو کردم و در بر کردم[4]

جادہ و سلسلہ و خار ز پا آگاہ ہند — کس ندانست چہا بر سر دیوانہ گذشت

از سواد کتب آگاہ نشد ہیچ دلی — ہمہ را این شب دیجور بہ افسانہ گذشت[5]

واضح نے طویل عمر پائی، انھوں نے چڑھتے سورج اور گہناتے چاند کے جلوے دیکھے۔ کبھی وہ شہزادہ بیدار بخت کے معتمد مشیر تھے اور کبھی ان کے قتل کا پروانہ گشت کرتا تھا۔ انھوں نے حیات و کائنات کی بے اعتباری اور جلال و زوال کی ایکا ایکی پر حکیمانہ انداز میں غور کیا اور اس سے

---

[1] ایضاً ورق ۷۴

[2] ایضاً ورق ۷۲

[3] ایضاً ورق ۷۹۔ ۷۸۔

[4] ایضاً ورق ۸۳ ۔

[5] ایضاً ورق ۴۴ ۔

کچھ نتیجے اخذ کئے۔ غالباً واضح کے یہاں دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کے جو اشعار ملتے ہیں وہ ان کی ڈھلتی ہوئی عمر کی یادگار ہیں :۔

رشک فرمای دلم نیست بجز عیش حباب | یافت یک پیرہن ہستی و آن ہم کفن است[1]

ہوشم ربود خواندن تاریخ روزگار | افسانہ نام کردۂ افسون نوشتہ اند[2]

پیدا است بہ جام جم و مرآت سکندر | جز خشت لحد نیست کہ بر صورت تاج است[3]

ای ہما از کلبۂ ما سایۂ خود دور دار | خود بہ صحرای تو مشت استخوان خواہیم ریخت[4]

جب حیات کا ثبات اتنا ناقابل اعتبار ہے تو انسان کو چاہیے کہ اپنی تخلیق کے اصل مقصد پر نظر رکھے اور اس مختصر زندگی کو غفلت میں نہ گذارے۔ عزیزوں اور رفیقوں کے ساتھ محبت اور خلوص کا برتاؤ کرے۔ واضح کے ان ناصحانہ اشعار پر غور کیجیے :۔

سنگین مشو کہ زود فرو می روی بہ خاک | دیدم بہ لوح تربت قارون نوشتہ اند[5]

یک حرف خوشدلی نہ بود در کتاب عمر | گردانده ام بسی ورق ماہ و سال را[6]

با دل صد پارہ رفتیم از خود و بہر سراغ | مشت برگ گل بہ راہ دوستان خواہیم ریخت[7]

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :۔

---

[1] ایضاً ورق ۴۶۔

[2] ایضاً ورق ۴۸۔

[3] ایضاً ورق ۵۷۔

[4] ایضاً ورق ۵۱۔

[5] ایضاً ورق ۴۸۔

[6] ایضاً ورق ۳۶۔

[7] ایضاً ورق ۵۱۔

سرفرازان جہان را بہ تواضع منگر | چون فلک سر بہ تہہ انداختہ می باید رفت
ایکہ دل باختۂ ساختن کار خودی | این طریقی است کہ بی ساختہ می باید رفت
ہمچو آئینہ درین بزمگہ حیرانی | ہمہ را دیدہ و نشناختہ می باید رفت[1]

اوپر واضح کی شاعرانہ انا کا ذکر کیا گیا۔ لیکن بعض شعرا سے انھیں بہت عقیدت تھی۔ اس سلسلہ میں وہ بار بار حافظ کا نام لیتے ہیں اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہتے ہیں[2]۔ حافظ کے بعد ان کے استاد راسخ ان کے محبوب شاعر ہیں۔ فرماتے ہیں:-

درکمین گاہ سخن واضح سراغ راسخ است | صید گاہ فکر را معنی شکاری می رسد[3]

اس کے علاوہ انھوں نے طاہر وحید اور ابن یمین[4] کا ذکر بھی کیا ہے۔ بلکہ ایک غزل میں صائب کو بھی خوشگو کے لقب سے یاد کیا ہے

این جواب غزل صائب خوشگواست کہ گفت | 'خشم را ہر کہ فرو برد، توانا گردد'[5]

واضح کے ہم عصر بیدل ان کی شاعری کے شیدائی تھے اور خاص طور پر وہ ان کے اس شعر کی بڑی تعریف کرتے تھے:-

بہ کاغذ اخگری پیچیدہ ام یعنی دل خود را | مبادا گریہ بر حالم کنی ای نامہ بر رحمی[6]

بقول خوشگو[7] خان آرزو کا خیال ہے کہ اگرچہ واضح کا انداز عام نہیں تھا مگر وہ اپنے طرز

---

[1] ایضاً ورق ۶۰

[2] ایضاً ورق ۲۴، ۶۵، ۸۱۔

[3] مثنویات و دیوان واضح (سالار جنگ) ص ۱۱۷۔

[4] ایضاً ص ۱۰۰؛ انتخاب کلیات واضح ورق ۹۱۔

[5] مثنویات و دیوان واضح ص ۱۰۰۔

[6] سفینۂ خوشگو ص ۸۵؛ انتخاب کلیات واضح ورق ۹۲۔ یہ راسخ کی غزل پر غزل کہی تھی۔ مقطع میں کہتے ہیں:-

بہ درد آمد دل من واضح از این مصرع راسخ | ہجوم گریہ طوفان می کند ای بیخبر رحمی

[7] سفینۂ خوشگو ص ۸۵۔

کے کامیاب شاعر تھے۔

کشف طریق

واضح اس دور کے ممتاز رباعی گو شعرا میں سے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس صنف میں ان کا درجہ بیدل کے بعد دوسرا ہے۔ واضح نے کشف طریق کے نام سے اپنی رباعیوں کا ایک الگ مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ میں بقول مصنف ۶۲۷ رباعیاں ہیں۔ اور مصنف کے خود نوشت نسخے پر ۱۵ جمادی الاخر ۱۱۲۶/۱۷ جون ۱۷۱۴ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ یہ رباعیاں درحقیقت کلمات عالیات کا جزو تھیں جنھیں بعد میں شاعر نے الگ کتابی صورت میں جمع کر دیا۔ دیوان کی رباعیاں اس کے علاوہ ہیں:۔

واضح کلمات را چو ترتیب نمود ۔۔۔ در ہر کلمہ رباعیی شد موجود
وانہا چو ہمہ جدا بہ ترتیب نوشت ۔۔۔ در کشف طریق نسخہ ای شد موجود[1]

واضح کہتے ہیں کہ چونکہ رباعی میں کوئی تخلص یا عنوان نہیں ہوتا اور وہ لوگوں کی زبان پر اور بیاض میں چلتی رہتی ہیں، اس لئے ان کی آوارہ گردی کا زبردست خطرہ رہتا ہے اور جہاں کوئی رباعی مشہور ہوئی، اسے سحابی یا خیام کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے اپنی رباعیات کا باقاعدہ مجموعہ مرتب کیا تاکہ وہ ایسے اختلاط سے محفوظ رہیں:۔

خیام و سحابی کہ رباعی گفتند ۔۔۔ بس نادرہ گوہر معانی سفتند
مردند، ہنوز ہم سخن می گویند ۔۔۔ این خوب رباعی بہ عزیزان مفتند[2]

واضح کی رباعیوں کا موضوع بڑی حد تک ان کی غزلوں کے مماثل ہے۔ انسان کی عظمت، عشق و وفا کی اہمیت، دنیا اور زندگی کی بے ثباتی، تصوف اور تخلیق کے رموز اور اس طرح کے دیگر مسائل پر واضح نے بڑے حکیمانہ اور شاعرانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ تعجب یہ ہے

---

[1] کشف الطریق، سالار جنگ نمبر ۷۱۳، ورق ۴

[2] انتخاب کلیات واضح ورق ۹۵۔۹۴۔

کہ واضح جو المناب کے بادشاہ تھے، رباعی میں اعجاز کا معجزہ کیسے دکھاتے ہیں، مگر ان کی رباعیاں اتنی پرمغز، مختصر اور پراثر ہیں کہ اکثر خیام کا دھوکا ہوتا ہے:۔

ناگاہ خبر شوی کہ تن رنجور است — وز طبل رحیل در سر و دل شور است
وز بام در سر اندائی آید — زین خانہ برآ کہ خانۂ تو گور است [۱]

یک عمر رفیق بزم احباب شدیم — یک عمر بہ ہجر در تب و تاب شدیم
خفتند ہمہ آخر و افسانہ شدند — ما نیز بر آن فسانہ در خواب شدیم [۲]

در بزم زمانہ کز طرب می نوشی است — ہر دم بہ اجل حیات را سرگوشی است
شمع روشن بہ شمع افسردہ بگفت — گویائی ما بیان این خاموشی است [۳]

واضح نے بیک وقت سات مثنویاں لکھنے کا پروگرام بنایا اور مشہور کلاسیکی مثنویوں کے انداز پر ان کی ترتیب کی، آئینہ راز کے دیباچہ میں وہ کہتے ہیں کہ جب میں غزل، قصیدہ اور رباعی میں کمال کو پہونچ گیا تو میں نے مثنوی کا ہفت خواں طے کرنے کا منصوبہ بنایا۔

"چون در غزل و قصیدہ و رباعی مقام بہ سرحد کمال رسید کہ خیال برتری از آن نماند، جواسیس معانی (گفتند)، ... اگر قطع ہفت خوان مثنوی نمائی، پنج نوبت در شش جہت زدنت سزا است" [۴]

ان ساتوں مثنویوں کی اس طرح ترتیب کی گئی

۱۔ مرآۃ دیدار بجواب مخزن اسرار نظامی

۱؎ ایضاً ورق ۹۸۔

۲؎ ایضاً ورق ۱۰۲۔

۳؎ ایضاً ورق ۹۷۔

۴؎ ایضاً ورق ۱۱۶۔

۲۔ نغمہ وشیون بجواب نل ودمن فیضی

۳۔ کمند وحدت۔ بجواب سلسلۃ الذہب جامی

۴۔ آئینۂ راز بجواب محمود وایاز زلالی۔

۵۔ تاب زنارہ بجواب سبحۃ الابرار جامی

۶۔ ساقی نامہ بجواب سکندرنامہ نظامی

۷۔ اسرار معنوی بجواب مثنوی معنوی رومی[1]

آئینۂ راز ان سب میں سب سے پہلے آئینۂ راز مکمل ہوئی جس کا آغاز ۱۰۷۵/۶۵۔۱۶۶۴ء میں ہوا اور تین سال بعد ۱۰۷۸/۶۸۔۱۶۶۷ء میں تکمیل کو پہونچی[2]۔ اس کے دیباچہ میں شاعر نے اپنا تفصیلی پروگرام درج کیا ہے مگر آئینہ راز کے ایک نسخہ میں یہ مضمون ملتا ہے کہ واضح نے اس مثنوی کے بکھرے ہوئے اشعار کی تدوین احمد نگر میں ۱۲ جمادی الاول ۱۰۹۴/۲۹ اپریل ۱۶۸۳ء کو شروع کی۔ اور یہ کہ یہ مثنوی کا آخری متن نہیں ہے اس لئے قاری کو اس سے نقل نہیں کرنا چاہیئے ورنہ وہ اسی الجھن کا شکار ہوگا جو اسے زلالی کی محمود وایاز کے مطالعہ میں پیش آتی ہے نیز یہ کہ شاعر اس پر بعد میں نظر ثانی کرے گا[3]۔

آئینہ راز دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ کا عنوان جلوۂ امید ہے اور دوسرے کا جلوۂ یاس[4]۔ واضح کا بیان ہے کہ اس مثنوی میں متقدمین کے خلاف میں نے اپنے عشق کی داستان بیان کی ہے۔

بہ نام دیگران در ہر بیانی نہان می گویم از خود داستانی[5]

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً ۱۱۸۔

[3] مثنوی آئینہ راز، سالار جنگ نمبر ۹۴، ورق ۱

[4] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۱۸۔

[5] ایضاً۔

عشق کی یہ داستان آدم سے سنائی جارہی ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی کہانی سنا کر چل دیتا ہے۔:

ہر کہنہ خزانہ از دری می گوید — ہر نقش قدم حرف سری می گوید
دنیا است فسانہ، پارہ ای ما گفتیم — وآن پارہ کہ ماند، دیگری می گوید[1]

آئینہ راز عشق کی داستان ہے۔ آغاز میں واضح نے عشق سے متعلق جو اشعار کہے ہیں وہ سوز و گداز اور کیف و کم کے اعتبار سے غنیمت اور ناصر علی کے اشعار سے کسی طرح کم نہیں:۔

الٰہی عشق را در دل مکان دہ — ز ملک عشق خود ما را نشان دہ
غبارم را بہ خونم آشنا کن — طراز دامن گلگون قبا کن
الٰہی گریہ ام را خندہ خو کن — شراب جام برقم در گلو کن
ز خون خویشتن می در کام من کن — گداز دل شراب جام من کن[2]

عشق کے لیے یہ درد بھری دعا اس لیے کی جارہی ہے کہ زندگی اور شاعری کا نازک فن اس کے بغیر نکھر نہیں سکتا:۔

نخستین موج کاندر جام من شد — شکست ساغر آرام من شد
ندانم بیخودی آخر کجا برد؟ — دلی دانم بہ کوی آشنا برد
کہ انداز سخن نازک دماغ است — نوا باد سحر، معنی چراغ است
بشد عمری کہ خالی ہست ایا غم — خمارم، دل ملولم، بید ماغم
خیال غیر ہم پہلو مبادا — بہ یک بستر بخوابم با تو تنہا
ندانم عاشقم یا بت پرستم — وفا ورزم بہ ہر رنگی کہ ہستم[3]

---

[1] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۱۹۔

[2] ایضاً ورق ۱۲۰۔

[3] ایضاً ورق ۲۲-۱۲۱۔

جلوۂ امید میں واضح نے کسی داؤ داور اس کی معشوقہ کی داستان معاشقہ اور ان کے وصال کا منظر پیش کیا ہے۔ وصال کا منظر پیش کرتے ہوئے فارسی کے ثقہ شعرا کس طرح بہک جاتے ہیں، اس کا حال واضح سے سنیئے :۔

زجامی بس عجب کان عارف پاک ‎ ‎ چه در حق زلیخا رفته بیباک!
زعرفی و زلالی این عجب نیست ‎ ‎ که آئین چنین مردم ادب نیست[1]

پھر ان شعرا نے تو سنی سنائی باتیں سنائیں۔ میں خود اپنی داستان سنا رہا ہوں :۔

چو من گر یک نفس دل باختندی ‎ ‎ زسوز عشق جان بگداختندی
به نام کس نه بندم تہمت عشق ‎ ‎ نتابد ننگ اخفا ہمت عشق

اس کے بعد بہت سی قسمیں کھا کر شاعر کہتا ہے :۔

که گفت و گویم از سودای خویش است ‎ ‎ زبانم موجۂ دریای خویش است[2]

یہاں سے دوسرا حصہ یعنی جلوۂ یاس شروع ہوتا ہے جس میں واضح اپنے عشق کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جوانی میں ایک روز میں معشوق کے ساتھ سیر دریا کو گیا۔ وہاں محبوب کو نہانے کا شوق ہوا اور

شفق پیکر پرندی بر میان زد ‎ ‎ که عکسش آب را آتش به جان زد
بلورین پیکرش چون رفت در آب ‎ ‎ بر آن آئینه دریا گشت سیماب[3]

اتنے میں دریا میں طوفان اٹھا اور عاشق و معشوق کو ایک موج نے ملا دیا۔ بس کیا تھا واضح کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی :۔

---

[1] ایضاً ورق ۱۴۷۔

[2] ایضاً ورق ۱۵۰۔

[3] ایضاً ورق ۱۵۲۔

من و دلبر بہ یک موج اوفتادیم | چو موج آغوش بیتابی کشادیم
گرفتم آن صنم را تنگ در بر | در آغوش صدف جا کردہ گوہر
بہم لب بر لب و سینہ بہ سینہ | چو الوان بادہ در یک آبگینہ[1]

خدا خدا کر کے وہ طوفان ختم ہوا اور صحیح و سالم کنارے پر پہونچے. حکایت یہاں اچانک ختم ہو جاتی ہے. اسی طرح ایک ہندوستانی شادی اور بدائی کی بھی ناتمام حکایت ہے جو شاعر نے 'قطب زمانہ نظام اولیا' کی روایت سے نقل کی ہے. اس حکایت میں ہندوستانی شادی کی رسوم کا دلچسپ بیان ہے. مثلاً لڑکی مائیوں بیٹھی :-

چو خورشیدش لباس زرد دادند | گہر گوئی بہ خوان زر نہادند[2]

اور اسے مہندی لگائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ :-

مبارک باد این فال خجستہ | کہ باشی پیش دلبر دست بستہ[3]

آئینہ راز واضح کی سب سے کامیاب اور مکمل مثنوی ہے. اس میں شاعر نے اورنگزیب میر سنجر اور ہمت خاں کی مدح بھی کی ہے. پوری مثنوی کا انداز بیان پر جوش اور موثر ہے. واضح نے اس کے بارے میں صحیح کہا ہے :-

این نسخہ کہ موسوم بہ 'آئینہ راز' است | ہر مصرع او داغ دل سوز و گداز است[4]

ساقی نامہ

واضح کی دوسری مثنوی ساقی نامہ سکندر نامہ نظامی کی بحر میں ہے. یہ مثنوی ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ میں مکمل ہوئی. 'ساقی نامہ واضح' اس کی تاریخ ہے کچھ

---

[1] ایضاً ورق ۱۵۳

[2] ایضاً ورق ۱۶۰

[3] ایضاً ورق ۱۶۱

[4] ایضاً ورق ۱۱۸

عرصہ کے بعد ۱۱۰۷/۹۶-۱۶۹۵ میں احباب کی فرمائش پر واضح نے اس پر قلم برداشتہ ایک دیباچہ لکھا اور اتفاق سے "دیباچہ ساقی نامہ واضح" اس کی تاریخ قرار پائی۔[1] سکندر نامہ کی طرح ساقی نامہ بھی دو دفتر میں منقسم ہے۔ پہلے دفتر میں مینا و جام کا ذکر ہے اور دوسرے میں سہام و صمصام کا۔ دیباچہ میں واضح نے شعرگوئی کے لوازمات پر روشنی ڈالی ہے کہتے ہیں :۔

"عنقای سخن آشیانی بی نشانی است۔ بہ دام الفاظ وقتی در می آید کہ طبع رسا در رنگ بیرنگیش برآید۔۔ تا دماغ از صدای مختلف خالی و مرآت قلوب از عکوس متلونہ صافی گردد۔ بی این دو رکن رکین اساس سخن نقش برآب است "[2]

ساقی نامہ کا انداز رومانی اور والہانہ ہے۔ پوری مثنوی میں سپردگی اور بیخودی کی کیفیت ہے اور لطف یہ ہے کہ مثنوی کا ابتدائی شعر بھی اسی کیف میں ڈوبا ہوا ہے :۔

بہ ہشیار مستی کہ تاک آفرید ۔۔۔ بہ ہر برگ افسون نشہ دمید[3]

اسی طرح دیباچہ کی ابتدا اس عربی شعر سے ہوتی ہے :۔

شربنا علیٰ ذکر الحبیب مدامۃً ۔۔۔ سکرنا بھا من قبل ان یخلق الکرم

ذیل میں مثال کے طور پر ساقی نامہ کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ شاعر پہلے ماحول کی دلکشی کا نقشہ کھینچتا ہے :۔

ہوا می فروش و چمن گل بہ دوش ۔۔۔ دف اندر خروش است و صہبا بہ جوش

ترشح موافق، ہوا معتدل ۔۔۔ زمین نم کشیدہ، نہ گرد و نہ گل

زمین مخمل سبز گستردہ است ۔۔۔ زآب زمرد نمی خوردہ است

---

[1] ایضاً ورق ۱۰۹۔

[2] ایضاً ورق ۱۰۸۔

[3] ایضاً ورق ۱۱۰۔

اب اس کے بعد وہ ساقی سے التجا کرتا ہے :۔

بیا ساقیا جان فدایت کنم	بہار است، دل رونمایت کنم
بہ دور است تا ماہ، با ما نشین	چو امید ما یکدم از پا نشین
بیا ساقی مجلس آرای من	فدای خرامت سراپای من
زعکست شدہ جام ماہ تمام	بہ گلگشت مہتاب بیرون خرام
بیا ساقیا خود نمایی بکن	بدہ جام صہبا، خدایی بکن
بیا ای بہ کف ابر برق شفق	ہلالی جبین، عقد پروین عرق[1]

ان ابیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساقی نامہ واقعتاً ساقی نامہ ہے اور اس میں خمریہ شاعری کی تمام نزاکتیں پورے کمال کے ساتھ موجود ہیں ۔

اسرار معنوی

واضح کی تیسری مثنوی اسرار معنوی تصوف کے موضوع پر اور مثنوی معنوی کے طرز پر ہے۔ ہمیشہ بہار کے مؤلف کا بیان ہے کہ اسرار معنوی چھ دفتر میں منقسم ہے اور اس کا معیار خاصا پست ہے[2]۔ ڈاکٹر ایتھے کو اس بیان سے اشتباہ ہوا اور وہ کلیات واضح کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس مجموعہ میں جو چھ مثنویاں ہیں وہ اسرار معنوی کے دفتر نہیں ہیں[3]۔ درحقیقت ایتھے کے نسخہ میں چھ دفتر نہیں بلکہ چھ الگ الگ مثنویاں ہیں۔

اسرار معنوی کا پہلا دفتر ۱۱۲۴/۱۲-۱۷۱۲ میں مکمل ہوا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے :۔

واضحا! این دفتر اول تمام	چونکہ شد از فضل حق لطف کرام
سال ہجری چون درآمد در شمار	یک ہزار و یک صد و بست و چہار[4]

---

[1] ایضاً۔

[2] ہمیشہ بہار ورق ۱۰۲۔

[3] ایتھے نمبر ۱۶۷۴۔

[4] اسرار معنوی (مشمولہ کشف الطرایق (سالار جنگ نمبر ۷۱۳) ورق ۲۹۲۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ واضح اس پر نظر ثانی اور اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴
میں اس کی تکمیل ہوئی اور اس کے اشعار کی تعداد ۶۶۶۶ تک پہونچ گئی :-

دفتر اول کہ ابیاتش خوش است | شش ہزار و شش صد و شصت و شش است
سال ہجری نیز در این وقت خوش | یک ہزار و یک صد است و بست و شش [1]

اسرار معنوی کا آغاز بھی نی سے ہوتا ہے مگر واضح نے نی کے تلازمہ سے حمد کے بڑے
خوبصورت شعر کہے ہیں :-

بشنو از نایی کہ چون نی در دمید | نالہ با ہر دل موافق بر کشید
نالہ فیاض است و نی آتش فروز | داد نایی امتزاج ساز و سوز
ای دلم بادا فدای ساز او | سوز من از شعلۂ آواز او
سجدہ بر ہر جا کہ شد، مسجود تو | در جمال ہر صنم مشہود تو [2]

مثنوی رومی کی طرح واضح نے چھوٹی چھوٹی تمثیلوں اور حکایتوں کے ذریعہ تصوف اور
اخلاق کے رموز پیش کئے ہیں۔ مثلاً ایک ویرانہ اور ایک دیوانہ کا یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیے :-

در سخن آمد سحر ویرانہ ای | گفت بیتابانہ با دیوانہ ای
کای ز خود آزاد، الفت گیر من! | ای بہارت بستۂ زنجیر من!
من بہ این بی الفتی ویران شدم | در سر و کار تو سرگردان شدم
تا مرا بینی، دلت پر خون شود | کار تو آخر ندانم چون شود؟
گفت آن مجنون عقل ایجاد ساز | کای ز الفت بیخبر بیدل نواز!
الفت صاحب غرض دل بستگی است | ہر کہ خواہش سوخت، در وارستگی است

---

[1] ایضاً ورق ۲۹۶

[2] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۶۶۔

هر کجا سوزی است، ذات پاک اوست — درد در هر دل که شد، غمناک اوست
سوز باید، نیست لازم ورک سوز — بزم خود روشن شود، شمعی فروز[1]

دنیا میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، صرف نظر کا فرق ہے ورنہ وہی چاند شہر اور صحرا دونوں پر چمکتا پھر لوگ صحرا سے گھبرا کر شہر کی طرف کیوں بھاگتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ حکایت نقل کی ہے کہ ایک دیہاتی سے ایک شہری نے پوچھا "تو نے کبھی شہر دیکھا ہے؟" دیہاتی بولا "شہر کیسا ہوتا ہے؟ چاند کی طرح، سورج کی طرح، بادل کی طرح یا آسمان کی طرح" شہری نے کہا "وہ بھی روئے زمین پر ایک جگہ ہے" دیہاتی نے کہا دیہات بھی روئے زمین پر ایک جگہ ہے۔ شہری زچ ہو کر بولا "شہر کی بات ہی اور ہے وہ تیرے تصور سے بالا ہے"۔ آخر وہ دیہاتی شہر گیا، گلی گلی گھوما اور پھر شہری سے آکر بولا کہ شہر کہاں ہے۔ وہاں تو یہی بازار اور گھر بار ہے:۔

این همه سوق است و دار و بیت و باب — آدمی و خاک و باد و آفتاب[2]

مثنوی میں جگہ جگہ رومی کا ذکر اور ان کے شعروں کی پیوند کاری ہے۔ فخر رازی ابن عربی اور دوسرے فلاسفہ اور صوفیہ کا ذکر ہے۔ رومی ہی کے انداز میں واضح قصہ کے دوران فلسفہ طرازی شروع کر دیتے ہیں اور پھر یکایک چونک کر کہانی کا رشتہ سنبھالتے ہیں۔

یہاں اسرار معنوی سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔ ان شعروں میں شاعر اپنی بھولی بسری یادوں کے گھروندے سجاتا ہے اور بیتی ہوئی زندگی پر عجیب حسرت بھری نظر ڈالتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ واضح نے یہ مثنوی اپنی موت سے دو سال پہلے تکمیل کی تھی اور اس وقت ان کی عمر کوئی ۶۷ سال کی تھی:۔

ای صبا! بگذر به سوی آن دیار — آن مکان مشرقی دریا کنار

---

[1] ایضاً ورق ۶۸ - ۱۶۷۔

[2] ایضاً ورق ۱۶۹۔

طوف کن اشجار و آن اطلال را — باز پرس از طائران احوال را

یک کبوتر داشت جا بر طرف بام — آشیانی بد در آن عالی مقام

هست یا او همچو ما آواره شد؟ — پیش شاهین قضا بیچاره شد

قمری هر صبح و شام از شوق مست — بر فلان سرو بلندی می نشست

هست یا از ناله و فریاد رفت؟ — چون کف خاکستری بر باد رفت

طوطی چندی بر آن شاخ بلند — صبح ها چون غنچه یکجا می شدند

مجتمع هستند یا گم شد نشان؟ — همچو برگ از دست تاراج خزان

بود دیواری که اکثر صبح ها — مجتمع بودند زیرش تا ضحی

جدول آبی ز پایش می گذشت — آن مکان باقی است یا ویرانه گشت؟

بود میدانی که در مهتاب شب — داشتند اطفال بازی و طرب

هیچ کس می آرد آن هنگامه یاد؟ — یا فلک آن خاک هم بر باد داد؟

رفت یار و کس نماند از همرهان — این چنین بوده است اوضاع جهان

هر کرا پرسم فلان گویند کو؟ — لیس فی الآفاق باقی غیر هو

بگذر آنجا یک نفس بهر خدا — ناله کش کای هم نفس وی آشنا!

ای فلان مشفق! کجایی؟ های های — وی فلان مطلوب! دیداری نمای

بوسه زن بر هر گلی از آن زمین — خاک هر جا را چو گل مشتی بچین

سرمهٔ او را برای دیده ام — بوی یوسف کو؟ عمی گر دیده ام[1]

ان اشعار میں احساسات وجذبات کی جو شدت اور حسرت ویاس کا جو دلدوز مرقع پیش کیا گیا ہے، اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ شاعر نے جس پیار، حسرت اور سوز سے ان

---

[1] ایضاً ورق ۱۸۰۔

چھوٹی چھوٹی یادوں کے نقوش پیش کیے ہیں۔ اس کی مثال فارسی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔

واضح کی بقیہ چار مثنویاں یعنی مرآت دیدار، نغمہ وشیون، کمند وحدت اور تاب زنار بالکل ادھوری رہ گئیں ان میں کمند وحدت میں ۹۱ شعر ہیں۔ اس میں شیخ ابو محمد مرتعش کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ شیخ مرتعش اولیائے وقت میں سے تھے۔ ان کا انتقال ۳۲۸/۴۰-۹۳۹ میں ہوا۔[1] شیخ ایک روز بغداد کی ایک گلی میں جا رہے تھے۔ انھیں پیاس لگی۔ تو ایک دروازہ پر پانی مانگا اتفاق سے ایک حسینہ پانی لے کر باہر آئی۔ شیخ اسے دیکھ کر بیخود ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو لڑکی کا باپ وہاں موجود تھا۔ شیخ نے اس سے معذرت کی:۔

شیخ گفتا کہ ای ستودہ شعار　　شرم دارم [ز طاقت گفتار][2]

از درت خواستم دمی آبی　　بر غبارم شتافت سیلابی

نازنینی بہ عشوہ آمادہ　　شعلہ، خرقہ، برق سجادہ

آمد و دل زمن ربود ربود　　ہای ہای! آن ستم طراز کہ بود؟

عمرہا صرف کار دل کردم　　آخر آن را باو بحل کردم[3]

بوڑھے نے کہا "وہ میری لڑکی ہے اگر آپ چاہیں تو شادی کر لیں"۔ چنانچہ شادی ہو گئی، اور لڑکی شیخ کے گھر آ گئی۔ اب شیخ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا:۔

شد رجوعش بہ جانب دل خویش　　یاد کرد از مقام و منزل خویش

شیخ فریاد کرد و جست از نوم　　قال ہاتوا مرقعی یا قوم

پر غیور است مہربان عمیم　　سوخت جانم عتاب یار قدیم[4]

---

[1] گل رعنا ورق ۱۴۴۔

[2] تصحیح قیاسی۔

[3] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۹۲۔

[4] گل رعنا ورق ۲۴۴۔

بقیہ تین مثنویاں یعنی نغمہ وشیون، مرآۃ دیدار اور تاب زنار چند اشعار تک محدود رہیں مرآۃ دیدار میں بقول شفیق کل ۵۵ شعر ہوئے تھے[۱] یہ مخزن اسرار نظامی کے انداز پر اس شعر سے شروع ہوتی ہے:۔

لوحہ دیوان کلام قدیم ۔۔۔۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم[۲]

نغمہ وشیون نلدمن فیضی کے انداز میں تھی۔ اس کے ابتدائی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ مثنوی مکمل ہوتی تو واضح کی بہترین نگارشات میں سے ہوتی۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

ای مطلع فکر خوش خیالان ۔۔۔۔ بیت الغزل رم غزالان

لیلی منشان کہ دل پذیر اند ۔۔۔۔ مجنون کشی از تو یاد گیرند[۳]

تاریخ ارادت خاں

یہاں ارادت خاں کی تاریخ کا ذکر مناسب ہے جو عام طور پر تاریخ ارادت خانی کے نام سے موسوم ہے اور کئی لحاظ سے اہم اور وقیع ہے اس میں اورنگزیب کی وفات سے محرم ۱۱۲۵/ جنوری ۱۷۱۳ یعنی دہلی میں فرخ سیر کی آمد تک کے واقعات درج ہیں۔ کتاب ایک سال بعد یعنی ۱۱۲۶/ ۱۷۱۴ میں لکھی گئی۔ واضح کی عمر اس وقت ۶۷ سال تھی[۴] وہ زمانہ کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور ایک طرح عزلت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس تاریخ کے ذریعہ انھوں نے درحقیقت اپنی زندگی کے اہم سیاسی واقعات کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

"غرض تحریر بادشاہنامہ نیست کہ احوال امرا و قضایای سلطنت باید نوشت دو کلمہ سرگذشت حالت خود است و بس"[۵]

---

[۱] ایضاً

[۲] انتخاب کلیات واضح ورق ۱۹۶

[۳] ایضاً ورق ۱۸۰۔

[۴] تاریخ ارادت خانی (علی گڈھ، سبحان اللہ) ص ۲

[۵] ایضاً

تاریخ ارادت خانی اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس میں ایک بحرانی دور کی بڑی واضح تصویر ملتی ہے۔ یہ تصویر بہتوں کو پسند نہیں آئی اور اس پر اعتراضات ہوئے[1] لیکن واضح نے وہی لکھا جو وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اب ان کے سامنے دربار کی مصلحتیں نہیں تھیں وہ دنیا سے تقریباً کنارہ کش ہو چکے تھے۔

تاریخ ارادت خانی کے دو ترجمے ہوئے۔ پہلا مختصر ترجمہ جو نیتھن اسکاٹ نے انگریزی میں کیا[2] اور دوسرا ترجمہ اردو میں سوانح عمری ارادت خانی کے نام سے اشرف شمسی حیدرآبادی نے کیا[3]۔

وامق عذرا ان تصانیف کے علاوہ واضح کی طرف تین اور تصانیف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں اول وامق عذرا کا قصہ ہے۔ یہ قصہ مقفیٰ نثر میں ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:

"نقش مراد ہر غالب حریف تختۂ نرد سخن و منصوبۂ درست بین این نوآئین فن حمد عشق طرازی و حسن پردازی است الخ[4]"

قصہ کے متن میں مصنف یا تاریخ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ آخر میں ایک قطعہ ہے جس میں شاعر اپنا تخلص ارادت استعمال کرتا ہے اور جس کی بنا پر اسے ارادت خاں واضح کی تصنیف سمجھا گیا ہے:-

ارادت بعد ازین خاموش می باش — بہ بزم نکتہ سنجان گوش می باش
مشو رانم ازین دریا خروشی — بہ لب نہ چون صدف مہر خموشی

---

[1] ریو ۳/۹۳۸ -

[2] مطبوعہ لندن، ۱۸۷۰ء

[3] اسٹوری ۱/۶۰۲

[4] وامق عذرا، ہارڈنگ لائبریری. دہلی مخطوطہ نمبر ۳۶، ۳۷ -

یہ بھی اتفاق ہے کہ نظم میں وامق عذرا کی داستان کئی ایک شاعروں نے لکھی ہے لیکن نثر میں یہ غالباً واحد تصنیف ہے۔

مینا بازار و پنج رقعہ
دوسری دو کتابیں مینا بازار اور پنج رقعہ ہیں جن کا انتساب واضح کی طرف کیا جاتا ہے[1] اول الذکر مغلوں کے دور کے مشہور مینا بازار کے بیان پر مشتمل ہے اور آخر الذکر پانچ انشائیہ رقعات کا مجموعہ ہے۔ دونوں کتابوں کا انداز بیان انتہائی مقفیٰ اور پیچیدہ ہے۔ مینا بازار کا انتساب ظہوری ترشیزی کی طرف بھی کیا جاتا ہے لیکن دونوں کتابوں میں کوئی ایسی داخلی شہادت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر مصنف یا زمانۂ تصنیف کا تعین کیا جا سکے[2]

بیدل

اس دور کے سب سے بڑے شاعر ابو المعانی مرزا عبد القادر بیدل[3] پر یہاں بہت کچھ نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ اس کتاب میں تمام شعرا اور نثر نویسوں کا جائزہ لینا ہے۔ ان کی شاعری اور فلسفہ کی تشریح و تفصیل کے لیے دفتر درکار ہیں۔ البتہ یہاں اس مختصر جگہ میں خاص طور پر ان کے حالات زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ خود بیدل نے شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں چہار عنصر کے نام سے اپنی ایک

---

[1] محمد حسین آزاد: نگارستان فارس، لاہور، ۱۹۲۲، ص ۱۴۳

[2] اس سلسلہ میں استادی ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر محمد احمد (الہ آباد یونیورسٹی) میں ایک بحث چلی تھی۔ موخر الذکر کا دعویٰ ہے کہ مینا بازار کا مصنف قطعاً ظہوری ہے مگر ڈاکٹر نذیر احمد کا کہنا ہے کہ کسی داخلی شہادت کے بغیر یہ دعویٰ بے معنی سا ہے (ملاحظہ ہو معارف، اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۵۴)

[3] کلیات بیدل، نولکشور، ۱۸۷۵ء، ص ۲۹۶۔

سرگذشت قلمبند کی تھی جس سے ان کے حالات زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے. ورنہ تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات زندگی کی جو تفصیل دی ہے وہ بڑی حد تک متضاد اور غلط ہے۔

عبدالقادر بیدل ۱۰۵۴/۴۵-۱۶۴۴ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ لفظ انتخاب اور فیض قدس سے نکلتی ہے[۱]۔ بیدل نسلاً ترک تھے اور ارلاس کے چغتائی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے[۲]. ابھی وہ مشکل سے پانچ سال کے تھے کہ ان والد مرزا عبدالخالق[۳] فوت ہو گئے۔ بیدل کی والدہ بڑی خداترس عورت تھیں، انھوں نے اپنے بچے کو قرآن پڑھانا شروع کیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی انتقال کر گئیں. بیدل یتیم و یسیر ہو گئے۔ خوش قسمتی سے ان کے ایک چچا مرزا قلندر رکھتے تھے[۴]. جو واقعی قلندر اور درویش صفت انسان تھے. انھوں نے بیدل کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لے لی. بیدل تعلیم کے لئے مدرسہ بھیجے گئے۔ دس سال کی عمر تک انھوں نے تعلیم پائی. ایک روز ان کے چچا نے مدرسہ جاکر دیکھا کہ دو طالب علم کسی مسئلہ پر بری طرح بحث کر رہے ہیں۔ مرزا قلندر نے یہ کہہ کر بیدل کو مدرسہ سے اٹھا لیا کہ جس علم کی تحصیل سے گردن کی رگ پھولتی ہے، اس کا نہ سیکھنا بہتر ہے[۵]. اب بیدل گھر پر مطالعہ کرتے رہے. صوفی سنتوں کی صحبت نے ان کے علم کو اور جلا بخشی اور رفتہ رفتہ ان کا شمار اپنے عہد کے عظیم ترین دانشوروں میں ہونے لگا. انھوں نے ریاضی اور طبیعیات میں مہارت حاصل کی. اور رمل، جفر اور نجوم میں بھی دستگاہ پیدا کی۔ ہند و اساطیر کا بخوبی مطالعہ کیا. بیدل کو مہابھارت

---

۱ سفینۂ خوشگو ص ۱۰۵۔ کلیات بیدل، کابل، ج ۲، سرطان ۱۳۴۲ شمسی ۱۳۶/۲

۲ سفینۂ خوشگو ص ۱۰۴؛ خزانہ عامرہ ۱۵۲. سرو آزاد ص ۱۴۸ میں برلاس ہے۔ ریو (۲/۷۰۶) میں ارلات ہے اور سفینۂ ہندی (ص ۲۸) میں ارلاش ہے. نشترِ عشق (ص ۳۱۲) میں برلاس واوس جغتا ہے۔

۳ سفینۂ خوشگو ص ۱۰۴۔

۴ ایضاً ص ۱۰۵۔

۵ کلیات بیدل، نولکشور، ص ۳۴۱۔

کی پوری کہانی یاد تھی۔ انھوں نے موسیقی میں مہارت حاصل کی[1] اور نزکی اور ہندی سے واقفیت پیدا کی[2]۔

بیدل کے وطن یا مولد کے بارے میں متضاد بیانات ملتے ہیں۔ خوشگو جو بیدل کی خدمت میں برابر حاضر رہتے تھے، کہتے ہیں کہ بیدل کا وطن اکبر آباد ہے اور طاہر نصرآبادی کے اس بیان کی تغلیط کرتے ہیں کہ بیدل لاہوری ہیں[3]۔ آزاد بلگرامی نے پٹنہ کو بیدل کا مولد قرار دیا ہے[4]۔ حالانکہ انھیں خوشگو کے بیان کا علم تھا۔ دوسرے تذکروں میں بخارا[5] اور دہلی[6] کو ان کا وطن بتایا گیا ہے۔ بخارا بیدل کا نہیں بیدل کے آبا کا وطن ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ساری عمر ہندوستان سے باہر نہیں گئے۔ دہلی کو اس لئے وطن بتایا جاتا ہے کہ بیدل نے اپنی زندگی کا آخری حصہ یہیں گذارا۔ جہاں تک خود بیدل کا تعلق ہے انھوں نے چہار عنصر میں اپنے وطن یا مولد کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا بچپن بہار میں گذرا۔ بیدل جب چھوٹے تھے تو اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ رانی ساگر جایا کرتے تھے جو آرہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ وہ آرہ بھی گئے[7]۔ ۱۰۶۹/۹-۱۶۵۸ء میں وہ اپنے ایک چچا مرزا عبداللطیف کے ساتھ ترہت میں مقیم تھے۔ مرزا عبداللطیف شجاع کی فوج میں افسر تھے۔ شجاعی فوجوں کی شکست کے بعد بیدل غالباً اپنے چچا کے ساتھ چاند پور

۱؎ سفینۂ خوشگو ص ۱۱۸۔

۲؎ بانکی پور ۳/۱۹۴۔

۳؎ سفینۂ خوشگو ۱۰۴۔

۴؎ ید بیضا (علی گڈھ) ص ۵۰۔ سفینۂ خوشگو (مخطوطہ بانکی پور) پر آزاد بلگرامی کا دستخط ہے۔

۵؎ قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز، لاہور، ۱۹۳۳، ص ۱۱۵۔

۶؎ ریاض العارفین، علی قلی ہدایت (معارف، اگست ۱۹۴۶ء)

۷؎ کلیات بیدل (نولکشور) ص ۳۱۹۔

چلے گئے جو پٹنہ کے قریب ہے۔[1] چند ہی دنوں کے بعد ہم انھیں پٹنہ کے قریب ایک اور جگہ ہسی میں پاتے ہیں[2] اس طرح بیدل پندرہ سولہ سال کی عمر تک بہار ہیں نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں بھی وہ قیام بہار کا بڑے مزہ سے ذکر کرتے ہیں[3] جہاں تک آگرہ کا تعلق ہے، بیدل تین بار آگرہ گئے۔ ان کا پہلا سفر آگرہ ۱۰۸۱/ ۷۱-۱۶۷۰ میں ہوا[4] مگر خوشگو کے بیان کے علاوہ اور کوئی شہادت آگرہ سے تعلق کی نہیں ملتی۔

۱۰۷۰/ ۶۰-۱۶۵۹ میں بیدل اپنے چچا مرزا قلندر کے ہمراہ بہار سے بنگال کے لئے روانہ ہوئے[5] اور اگلے سال وہ اپنے دوسرے چچا مرزا ظریف کے ساتھ کٹک (اڑیسہ) چلے گئے۔ اڑیسہ میں بیدل تین سال رہے اور مرزا ظریف سے تفسیر وغیرہ پڑھتے رہے۔ یہیں ان کی ملاقات شاہ قاسم سے ہوئی جو اپنے وقت کے مشہور صوفی تھے[6] ان کی صحبتوں سے بیدل نے بہت کچھ تصوف اور ادب سیکھا۔ اس کے بعد بیدل شمالی ہند کی طرف روانہ ہوئے۔ ۱۰۷۵/ ۶۵-۱۶۶۴ میں وہ متھرا میں نظر آتے ہیں[7] اور اس کے بعد آگرہ اور دہلی جاتے ہیں۔ ۱۰۸۰/ ۷۰-۱۶۶۹ میں انھوں نے شادی کی[8] اب انھیں باقاعدہ ملازمت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ چنانچہ آبائی پیشہ کی مناسبت سے وہ شہزادہ محمد اعظم کی

---

[1] ایضاً ص ۵۵۱-۵۵۴۔

[2] ایضاً ۵۶۲

[3] ایضاً ص ۲۱۵

[4] ایضاً ص ۵۸۱

[5] ایضاً ص ۵۶۲۔

[6] ایضاً ص ۳۴۷۔ شاہ قاسم ۱۰۸۳/ ۷۳-۱۶۷۲ میں فوت ہوئے۔ بیدل کو یہ خبر آگرہ میں ملی (ایضاً ص ۴۴۲)

[7] ایضاً ص ۴۲۳۔

[8] بیدل کا بیان ہے کہ انھوں نے شاہ کابلی سے دوسری ملاقات (۱۰۷۸ ہجری) کے دو سال بعد شادی کی (ایضاً ص ۴۲۹-۳۰)

فوج میں نوکر ہو گئے۔ انھیں پانچ صدی منصب اور داروغہ کو فتگر خانہ کا عہدہ ملا[1]۔ محرم ۱۰۸۵/ اپریل ۱۶۷۴ میں جب شاہی فوج حسن ابدال گئی تو بیدل بھی ساتھ تھے اور ربیع الاول ۱۰۸۶/ مئی ۱۶۷۵ تک وہیں مقیم رہے جیسا کہ ریاض الوداد ایزد بخش رسا کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے[2]۔ اس کے بعد شہزادہ اعظم کے ہمراہ گجرات گئے۔ اتفاق سے اس وقت اعظم کی سرکار میں راسخ سرہندی، حکیم شہرت، اسلم کشمیری اور ایجاد وغیرہ ملازم تھے۔ بیدل ان کی معیت میں رہے[3]۔ بعض حکایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں بھی رہے ہیں۔

اس وقت تک بیدل کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ان کی دو مثنویاں محیط اعظم اور طلسم حیرت لوگوں سے داد تحسین لے چکی تھیں۔ کہتے ہیں کہ شہزادہ اعظم نے بیدل سے مدحیہ قصیدہ کی فرمائش کی۔ انھوں نے دیکھا یہ بات چلنے والی نہیں۔ چنانچہ وہ ملازمت ترک کرکے دہلی چلے آئے[4]۔ اعظم نے بیدل سے واپس آنے کو کہا مگر انھوں نے یہ رباعی لکھ کر بھیج دی :۔

از شاہ خود آنچہ این گدا می خواہد　　افزونی منصب رضا می خواہد
تا ہمت فقر ننگ خواہش نکشد　　سرخیلی لشکر دعا می خواہد[5]

مگر اس سے قبل بیدل شہزادہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ چکے تھے جو کلیات میں موجود

---

[1] سفینۂ خوشگو، ص ۱۰۸۔ گل رعنا (ورق ۵۶) کا بیان ہے کہ بیدل پہلے شاہ شجاع کی فوج میں ملازم ہوئے۔ شجاعی فوج میں بیدل کے چچا مرزا عبداللطیف ملازم تھے۔ نیز اس وقت بیدل کی عمر صرف چودہ سال تھی۔

[2] ایزد بخش رسا : ریاض الوداد (علی گڈھ) ورق ۲۸۔ اس خط پر ۱۰/ ربیع الاول ۱۰۸۶ ھ کی تاریخ ہے۔

[3] سفینۂ خوشگو ص ۸۔

[4] مرآۃ الخیال ص ۳۲۵ ؛ ید بیضا ص ۵۰۔

[5] رقعات بیدل، نولکشور، ۱۸۸۵ء ص ۱۹۔

٭　٭　٭

ہے اور ۲۷ شعر پر مشتمل ہے۔[1]

یہ واقعہ ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ کے لگ بھگ ہوا جیسا کہ شکر اللہ خاں کے نام بیدل کے ایک خط سے اور چہار عنصر کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ بیدل نے شکر اللہ خاں سے درخواست کی کہ اگر کوئی مکان فراہم کر دیا جائے تو بقیہ زندگی وہ اطمینان سے گذار سکیں گے۔

"اگر درین سواد موضعی کنار دریا یا لب شہر بہ سہولت در اتفاق کشاید یا تکیہ ای اختیار نماید، مابقی مدت مہلتی ... بی تشویش تغیر مکان بگذرد"[2]

شکر اللہ خاں نے ان کی خواہش کے مطابق پرانے قلعہ کے پاس محلہ کھکھیڑیان میں ایک مکان خرید دیا اور دو روپیہ روزانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔[3] بیدل نے اپنی زندگی کے بقیہ چھتیس سال یہیں گذارے اور ۴ صفر ۱۱۳۳/۲۴ نومبر ۱۷۲۰ کو وفات پائی۔[4][5] انھیں ان کے اپنے مکان کے صحن میں دفن کیا گیا جہاں انھوں نے دس سال سے قبر بنوا رکھی تھی۔[6] ان کے مزار پر سالانہ عرس لگتا تھا جہاں دہلی کے شعرا جمع ہوتے تھے اور ان کا کلیات پڑھتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس عرس کی حیثیت سالانہ ادبی اجتماع کی سی ہو گئی اور کسی شاعر کے لئے اس میں شرکت فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔[7]

بیدل بڑے تنومند اور قد آور آدمی تھے۔ وہ روزانہ آٹھ سیر کھانا کھاتے تھے۔ ان کی چھڑی

---

[1] کلیات بیدل، کابل، سرطان ۱۳۴۲ شمسی ج ۲/ص ۱۰۴

[2] رقعات بیدل، نولکشور، ص ۸۸۔

[3] سفینۂ خوشگو ص ۱۰۹۔

[4] خلاصۃ الکلام، علی ابراہیم خاں (بحوالہ معاصر، پٹنہ، جنوری ۱۹۵۲)

[5] سفینۂ خوشگو ص ۱۲۱۔ آزاد بلگرامی (سرو آزاد ص ۱۵۰، خزانۂ عامرہ ص ۱۵۳) نے ۳ صفر دیا ہے۔ بیدل کے ایک مجموعہ رباعیات (موقومہ ۸ ربیع الاول ۱۱۳۳ھ) میں بھی ۴ صفر درج ہے۔ (اردو ضمیمہ ص ۲۱۲)

[6] گل رعنا ورق ۵۷۔ [7] سفینۂ خوشگو ص ۱۲۱۔

کا وزن ۳۶ سیر تھا۔ انھوں نے چار شادیاں کیں۔[۱] بڑھاپے میں "آدینہ اول شہر رجب ۱۱۲۰/ ستمبر ۱۷۰۸ کو ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے عبدالخالق رکھا۔ مگر صبح نہم از ماہ ربیع الثانی ۱۱۲۳/۱۶ مئی ۱۷۱۱ کو وہ بھی داغ مفارقت دے گیا۔[۲] بیدل نے اس کی وفات پر ایک دردناک مرثیہ کہا جس کا پہلا بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

ہیہات چہ برق پرفشاں رفت! | کاشوب قیامتم بہ جان رفت
گرتابی بود در توان ۰ رفت | طفلم زین کہنہ خاکدان رفت

بازی بازی بر آسمان رفت[۳]

بیدل کو لوگ صاحب کرامات صوفی مانتے تھے اور بعض معتقدین ان کا مرتبہ جنید اور شبلی تک پہونچاتے تھے۔ ابن عربی اور مولٰنا روم کے تصوف پر ان کی گہری نظر تھی۔[۴] بچپن سے وہ صوفیوں کی صحبت میں رہے اور تصوف کی کتابیں پڑھتے رہے۔ بچپن ہی سے ان میں کشف و کرامت کے آثار بھی دکھائی دینے لگے تھے جیسا کہ چہار عنصر سے معلوم ہوتا ہے۔ شروع سے وہ دو صوفی شاہ کمال اور شاہ ملوک کی خدمت میں برابر حاضر رہتے تھے اور دونوں سے بڑی حد تک متاثر تھے حالانکہ ان دونوں کا طریق تصوف تقریباً متضاد تھا۔ شاہ کمال شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ اور شاہ ملوک جذب کے عالم میں ننگے پڑے رہتے تھے۔[۵] اڑیسہ میں شاہ قاسم نے ان کی روحانیت کو نکھارا اور دہلی میں شاہ کابلی سے انھوں نے معرفت کے رموز حاصل کیے۔

---

[۱] ایضاً ص ۱۰۹ و مابعد۔

[۲] کلیات بیدل، کابل، ۱۶۹/۲، ۵۲۵۔

[۳] سفینہ خوشگو ص ۱۰۹۔

[۴] ایضاً ص ۱۱۵۔

[۵] کلیات بیدل، نولکشور، ص ۳۰۱، ۳۰۳، ۳۰۷ وغیرہ۔

فقر و گوشہ گیری کے باوجود بیدل دنیا سے الگ تھلگ نہیں تھے۔ اس دور کے ممتاز امرا سے ان کے اچھے تعلقات تھے جن میں سب سے قریبی ربط شکر اللہ خاں اور ان کے تینوں لڑکوں سے تھا جس کی تفصیل مکاتیب بیدل کے ذیل میں آئے گی۔ عاقل خاں رازی سے انھیں خصوصی ربط تھا اور وہ تصوف کے سلسلہ میں بڑی حد تک رازی سے بھی فیض یافتہ تھے[1]۔ ایک قصیدہ خاندوراں کی مدح میں ہے[2]۔ نظام الملک آصف جاہ اپنے آپ کو بیدل کا شاگرد کہتے تھے۔ انھوں نے ۱۱۳۲/ ۲۰-۱۷۱۹ میں بیدل کو دکن آنے کی دعوت دی مگر بیدل نے یہ کہہ کر انکار کر دیا :-

دنیا اگر دہند، نخیزم زجای خویش　　　من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش[3]

اسی طرح بہادر شاہ اول نے اپنے وزیر منعم خاں کی معرفت کئی بار بیدل سے شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی لیکن بیدل برابر ٹالتے رہے[4]۔ سید برادران سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے فرخ سیر کو قتل کیا تو بیدل نے ان کے خلاف یہ رباعی کہی :-

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند؟　　　صد جور و جفا از رہ خامی کردند

تاریخ چو از خرد بجستم، فرمود　　　'سادات بوی نمک حرامی کردند'[5]

اس رباعی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فرخ سیر ہمیشہ بیدل پر نظر عنایت کرتا تھا اور ان کی خیریت معلوم کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے بیدل کو دو ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی انعام دیا تھا[6]۔ بیدل

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۱۳۔
[2] کلیات بیدل، کابل ۲/ ۱۱۲
[3] خزانہ عامرہ ص ۵۳ - ۱۵۲۔
[4] سفینۂ خوشگو ص ۱۱۵
[5] سرو آزاد ص ۱۵۴۔ میر عظمت اللہ بیخبر نے اس رباعی کا جواب لکھا :-

با شاہ سقیم آنچہ شاید کردند　　　از دست حکیم آنچہ آید، کردند

بقراط خرد نسخۂ تاریخ نوشت　　　'سادات دوروش آنچہ باید، کردند

[6] سفینۂ خوشگو ص ۱۴ - ۱۱۵ -

نے بڑے جوش وخروش سے اس کے جلوس پر شعر کہے تھے۔ کلیات میں اس کے سکہ اور شادی کی تاریخ بھی ہے[1]۔ محمد شاہ کے جلوس پر بھی تاریخ ہے[2]۔

شہنشاہ وقت اورنگزیب سے بظاہر بیدل کا بلاواسطہ ربط نہیں معلوم ہوتا۔ مگر وہ شاہی عنایت کے امیدوار ضرور تھے۔

کلیات میں چراغان دہلی کے نام سے ایک مختصر قصیدہ ہے جو دراصل اورنگزیب کی مدح میں ہے۔ اس قصیدہ میں بیدل شاہی التفات کے لئے اس طرح التماس کرتے ہیں:۔

خسروا! معنی پناہا! کو سروبرگ قبول | تا بہ عرض حال دل جویم درین درگاہ بار
صورت احوالم از طرز تخلص روشن است | بیدلیہا چیدہ ام برخود ز وضع روزگار
من سراپا احتیاج و چرخ دون پرور خسیس | من طراوت انتظار و ابر احسان شعلہ بار
گر شود ابر عنایت آبیار مزرعم | خوشہ سان از پا ی تا سر جملہ دل آرم بہ بار[3]

۱۰۸۱/۷۱-۱۶۷۰ میں شہزادہ کام بخش کی ولادت پر بیدل نے کئی ایک تاریخی قطعے کہے[4] اور یقیناً اورنگزیب کی خدمت میں پیش کئے ہونگے۔ اس کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح پر بھی انھوں نے تاریخیں کہیں اور شمبھوجی کی گرفتاری پر بھی مبارکباد گذرانی[5]۔ اول الذکر تاریخیں شکراللہ خاں کے توسط سے اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے مگر بظاہر استغنا مانع تھا۔ اس لئے شکراللہ خاں کو یہ خط لکھتے ہیں:۔

---

[1] کلیات بیدل، کابل، ۵۶/۲-۱۵۴۔

[2] ایضاً ۱۷۱/۲

[3] کلیات بیدل، کابل ۱۰۶/۲

[4] ایضاً ۱۲۸/۲

[5] ایضاً ۱۳۰/۲

"مژدۂ فتح بادشاہ . . . . دلیل فکر تاریخی گردید، متوقع مطالعۂ اقبال اثر است
. . . . للہ الحمد اندیشہ دعاگوی بہانہ جوی تقریبی است کہ بآن وسیلہ تحفۂ فقرا درپیش
گذارد . . . . وگرنہ چہ نواب مستطاب بلکہ چہ عالمگیر وکدام بدر منیر! بہ طریق شوق
بی پروا نگارشی دارد"[1]

بہرحال اورنگزیب بیدل کی شاعری سے واقف تھا. اس کے خطوط میں ہمیں بیدل کے
یہ دو شعر ملتے ہیں:-

من نمی گویم زیان کن یا بہ فکر سود باش	ای زفرصت بیخبر! در ہر چہ باشی زود باش
بترس از آہ مظلومان کہ ہنگام دعا کردن	اجابت از در حق بہر استقبال می آید[2]

بیدل پہلے رمزی تخلص کرتے تھے. مگر ایک بار انھوں نے یہ مصرع پڑھا:

بیدل از بی نشان چہ جوید باز؟

تو رمزی چھوڑ کر بیدل اختیار کرلیا. انھوں نے شیخ عبدالعزیز عزت سے کچھ اصلاح لی
ہے[3]. خود بیدل کے تلامذہ کی تعداد بہت طویل ہے اور اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں.

(ہندوستان کے فارسی شعرا میں بیدل نے غالباً سب سے زیادہ اشعار کی تعداد چھوڑی
ہے. خوشگو[4] کے بیان کے مطابق اس کی تفصیل درج ذیل ہے.

۱. عرفان	۱۱۰۰۰	شعر
۲. طلسم حیرت	۴۰۰۰	"
۳. طور معرفت	۳۰۰۰	"
۴. محیط اعظم	۲۰۰۰	"

۱؎ رقعات بیدل، نولکشور ص ۴۵ — ۲؎ سفینۂ خوشگو ص ۱۱۵

۳؎ ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۸ — ۴؎ ایضاً ص ۲۵ - ۱۲۳

۵۔ تنبیہ المہوسین ۱۰۰۰ شعر

۶۔ ایک ترجیع بند باندازِ عراقی ۱۰۰۰ ″

۷۔ قصائد، ترکیب بند وغیرہ ۷۰۰ ″

۸۔ رباعی ۸۰۰۰ ″

۹۔ ہزلیات ۳۰۰۰ ″

۱۰۔ چہار عنصر ۱۸۰۰۰ ″

۱۱۔ غزل ۵۰،۰۰۰ ″

اس طرح اشعار کی مجموعی تعداد ایک لاکھ آٹھ ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ گل رعنا[1] کا مؤلف قصائد اور ترکیب بند کے اشعار کی تعداد صرف ایک ہزار اور رباعی کے اشعار کی تعداد چار ہزار بتاتا ہے۔ اس کے حساب سے مجموعی تعداد اٹھانوے ہزار ہوتی ہے مگر خود اس نے ننانوے ہزار لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعداد بالکل صحیح نہیں۔ نسخوں کے اختلاف سے اس میں کم و بیش کا ہونا لازمی ہے مثلاً افغانستان سے کلیات بیدل کا جو سب سے جامع نسخہ چھپا ہے اس میں ترجیع بند کے اشعار کی تعداد ایک ہزار کے بجائے ۱۴۷ ہے۔ اسی طرح رباعیات کے ذیل میں ۲۹۴۹ رباعیاں درج ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۵۸۹۸ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف عنوانوں کے تحت اور بھی رباعیاں درج ہیں۔ یہی حال محیط اعظم اور طورِ معرفت کا ہے۔ اول الذکر میں تقریباً چھ ہزار اور موخر الذکر میں تیرہ سو اشعار ہیں۔

بیدل کی نثری تصانیف میں ان کی سوانح عمری چہار عنصر، نکات بیدل اور بہت سارے رقعات ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔ انھوں نے دو جلدوں میں ایک بیاض بھی مرتب کی تھی جس میں خاقانی سے لے کر اپنے عہد تک کے مشہور شعرا کا منتخب کلام، طویل مثنویاں اور ہم عصروں کے

---

[1] گل رعنا ورق ۵۷۔

یا

یاسمین

خطوط ہیں۔ ایک بیوقوف برہمن کی کہانی بھی ہے۔ جسے اس کی چالاک بیوی نے دھوکا دیا تھا۔ عبدالاحد وحدت کے چند لطائف ہیں اور ملا علی رضا تجلی کی عشقیہ مثنوی معراج الخیال کا انتخاب ہے۔ اس کے علاوہ بیاض میں افیون اور تمباکو کا مکالمہ، صوفیوں کی کہانیاں اور عرفی کے ایک ترجیع بند گلشن راز کا انتخاب شامل ہے [۱]۔

کلیات

کلیات بیدل غزل، قصائد، رباعیات اور قطعات کا ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ بیدل کی شاعری کا اصل کمال ان کی غزل، رباعی اور مثنوی میں ہے۔ انھوں نے اگرچہ نعت اور حضرت علی کی منقبت میں لمبے لمبے قصیدے کہے ہیں، مگر ان سے ان کے ادبی مرتبہ میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ ان قصائد سے بیدل کی عقیدت ضرور ٹپکتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان قصائد میں انھوں نے خاقانی کے تتبع کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے دو طویل ترکیب بند اور ترجیع بند بھی ہیں۔ جو ان کی قدرت کلام کے شاہد ہیں۔ ترکیب بند میں ردیف وار ۳۱ بند ہیں اور تقریباً ساڑھے چھ سو شعر ہیں۔ ترجیع بند میں ۳۴ بند ہیں اور ۱۴۷ شعر ہیں۔

بیدل نے متفرقات کا ضخیم مجموعہ چھوڑا ہے۔ ان میں اخلاقی قصائد، مخمسات، خیر مقدم کے اشعار، موضوعاتی نظمیں، مرثیے، تاریخی قطعے اور ہجویات شامل ہیں۔ ان سے بیدل کے خیالات عقائد، تعلقات اور تاثرات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی شخصیت اور شاعری کے تجزیہ میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً بعض قطعات میوات سے متعلق ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بیدل کے مربی شکر اللہ خاں میوات میں مامور تھے۔ بیدل خود بھی ان کے ساتھ وہاں گئے تھے اور ان کی مثنوی طور معرفت کا پس منظر وہی علاقہ ہے۔ میوات کی صبح کے بارے میں کہتے ہیں:

صبح کشور میوات، یاسمین بہاراست این   بوی تازگی آباد، جلوہ گاہ یاراست این [۲]

یاسمین

---

[۱] ریو ۲/ ۷۳۷۔

[۲] کلیات بیدل، کابل، ۲/ ۱۴۵۔

میوات کے کسی بجی رام نے بہت سرکشی مچا رکھی تھی۔ اس کے سات لڑکے تھے اور سب کی جمعیت مغل حکومت کو خاصا پریشان کرتی تھی۔ شکراللہ خاں نے جب ان پر فتح پائی تو بیدل نے دو تاریخیں کہیں۔ پہلی تاریخ سے ۱۰۹۷/۸۶-۱۶۸۵ اور دوسری یعنی "غزو عجیب" سے ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ کے سن برآمد ہوتے ہیں[۱]۔ پہلی تاریخ یہاں درج کی جاتی ہے:۔

سرخیل نزوکہ بابجی رام	از باد بروت پشم در دست
باہفت پسر کہ ہر کدامش	چون کوہ سری بہ تیغ می بست
عمری در کوہسار میوات	می تافت چو خرس از خری مست
باشکر خان آسمان جاہ	گردید طرف زفطرت پست
در تاریخش مہندس فکر	فرمود "دل نزوکہ بشکست"[۱]

۱۰۹۷ھ

اسی طرح ایک اور قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت جنگ (ذوالفقار خاں) نے ۱۱۱۵/۱۷۰۳ میں میواتیوں کا قلعہ سنگار فتح کیا تھا۔

ہزار شکر کہ امروز خان نصرت جنگ	شکست قلعہ سنگار بر سر میوان
رساند از دو ترنم بہ پردۂ تاریخ	"فتوح عید طرب گوش" "ہدیہ رمضان"[۳]

۱۱۱۵ھ ۱۱۱۵ھ

ذوالفقار خاں نے بیدل کو سیب اور انار بھیجے تھے۔ اس کے تشکر پر ایک نظم ہے۔ ایک قطعہ بیدل کے ایک دوست پریم داس کے یہاں لڑکے کی پیدائش پر ہے جس سے ۱۱۲۷/۱۷۱۴-۱۵ کے اعداد نکلتے ہیں[۴]۔ ایک دلچسپ نظم خیمۂ بیدل کے عنوان سے ہے۔ بیدل کا بسیرا بھی میر کے گھر سے کچھ کم نہ تھا۔ کہتے ہیں:۔

بہ غیر از نام گردی نیست در بنیاد موہومش	طلسم بی نشانی از پر عنقا اثر دارد

---

[۱] ایضاً ۲/۱۳۳ [۲] ایضاً ۲/ ۱۴۵۔

[۳] ایضاً ۲/ ۱۵۵ [۴] ایضاً ۲/۱۱۶، ۴۳۴

چو اہل قبر باید بی نفس درزیر ادبودن | کہ از باد دم ہستی حباب آسا خطر دارد[1]

کیمیا گروں کے خلاف ایک مختصر مثنوی ہے جس میں دو سو سے کچھ زیادہ شعر ہیں۔ خوشگو نے اس کا عنوان تنبیہہ المہوسین لکھا ہے۔ کیمیا گری ہمیشہ سے مسلم معاشرہ کا ناسور رہی ہے۔ اس کے چکر میں نہ جانے کتنے خاندان برباد ہوئے اور لوگوں نے کیا کیا عجیب حرکتیں کیں۔ بیدل نے ایک مصری کیمیا گر کے حرص وہوس کی ایک فحش کہانی بھی پیش کی ہے۔ اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیمیا گر سونا بنانے کے چکر میں کیا کیا چیزیں استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:-

دود کبریت تو جز پرواز نیست | نغمہ بال افشاندہ است و ساز نیست
ہیچ تیزابی چو اشک گرم نیست | لیک در چشم تو آب شرم نیست
از معاجین پای در گل ماندہ ای | کز گداز عمر غافل ماندہ ای
ہمچو خر دارد بہ چندین پیچ و تاب | فکر سیماب غلیظت در خلاب
دل مکن در سودن احجار ریش | دست بر ہم سودنی داری زپیش
نورہ و زرنیخ مالیدی بہم | یک سر مو ہم نشد حرص تو کم
ملح و قلیا کام ہوشت شور کرد | شورہ آخر چشم عقلت کور کرد
می کنی نوشادر اندر رودہ حل | غافلی لیکن زنکرار عمل
توتیا آورد در چشمت غبار | کرد شنگرفت سیاہی آشکار[2]

اس کے بعد بیدل بڑے خلوص سے یہ سمجھاتے ہیں:-

ورنہ اصل کیمیا رنگ است وبس | سیم وزر فہمید نت ننگ است وبس
درلغت حیلہ است نام کیمیا | می برد این لفظ مجہولت کجا؟
ہیچ کس مضمون این نامت نگفت | کز مزاجت حرص سیم وزر شگفت[3]

---

[1] ایضاً ۲/۰۸-۱۰۷۔
[2] ایضاً ۲/۲۴-۲۲۲۔
[3] ایضاً

ایسی موضوعاتی نظموں میں ایک فرسنامہ ہے اور دوسری فیل پر ہے مگر ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ۔

غزل بیدل دراصل غزل کے شہنشاہ تھے۔ ان کی غزلیں کیف وکم دونوں حیثیت سے خسرو سے قریب تر ہیں لیکن خسرو اول اور آخر صوفی اور عاشق ہیں اور بیدل کے یہاں تصوف اور عشق کی چاشنی کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی گہری چھاپ بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیدل نے بہترین عشقیہ شعر کہے ہیں اور بعض شعروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ بھی عشق کی آگ میں تپے تھے :۔

یاد آن عیشی کہ عیش جاودانی داشتیم　　سجدہ ای چون آسمان بر آستانی داشتیم

برہمن ای بیخبر! از کیش بیدردی مباش　　پیش ازین ما ہم بت نامہربانی داشتیم[1]

لیکن بیدل کی عشقیہ شاعری میں مکمل سپردگی اور بیخودی کی کمی ہے۔ خالص جذباتیت ان کے فکر و فلسفہ سے لگا نہیں کھاتی۔ ان کے یہاں ایک دھڑکتا ہوا دل ضرور ہے مگر ان کے پاسبان عقل کی نظر تیز بھی ہے اور دور رس بھی۔

بیدل نے شاعری کا ایک الگ دبستان قائم کیا۔ یہ دبستان صرف ان کی ذات سے عبارت ہے۔ اس کی روایتیں سبک ہندی کی شکل میں پہلے سے موجود تھیں۔ دبستان بیدل درحقیقت سبک ہندی کی معراج ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دبستان کی روح نغمہ و آہنگ اور فلسفہ و فکر ہے۔ اس کی روایتیں دور دور تک پھیلیں۔ بیدل کے بعد کی نسل دبستان بیدل کی خوشہ چیں ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کے آخری دو عظیم شاعر یعنی غالب اور اقبال بیدل سے بیحد متاثر ہیں۔

یہاں بیدل کے فلسفہ پر بحث کی گنجائش نہیں صرف ان کی غزل کے چند انفرادی خصائص

---

[1] کلیات بیدل، نولکشور، ص ۲۸۱۔

کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ جو بڑی حد تک ان کی مثنوی اور رباعی پر بھی صادق آتے ہیں۔

بیدل نے اپنی شخصیت اور شاعری دونوں کے اردگرد تکلف، وقار، متانت اور جلال کا ایک ہالہ کھینچ رکھا تھا۔ ان کی زبان اور خیال، استعارے کنائے، تشبیہہ و تمثیل، ترکیب و بندش سب تکلف اور وقار کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ انھیں پیچیدگی اور ایہام پسند ہے۔ صنائع بدائع کی آرائش انھیں اچھی لگتی ہے۔ دراصل بیدل کا فن طویل اور انتھک ریاض اور دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعری پر اس ریاض کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ پڑھنے والا مرعوب بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی اور اس کی نظر کسی ہلکی بندش یا بے ربط خیال کی طرف نہیں جاتی۔

بیدل نے غزلیات کا جو عظیم سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی فارسی غزل گو نہیں کر سکتا۔ اوپر ذکر کیا گیا کہ ان کی غزلوں کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار سے زائد ہے۔ کابل والے کلیات میں ۲۸۳۶ غزلیں ہیں۔ یہ سارا سرمایہ ایک خاص انداز اور طرز کا حامل ہے حالانکہ بیدل کی شاعری کی عمر کم و بیش ساٹھ سال ہے۔ ان کی غزلیں عموماً فلسفہ سے بوجھل اور تغزل سے معمور ہیں۔ نئی مبہم اور پیچیدہ ترکیبوں کی وجہ سے ان میں اشکال بھی ہے اور بعض بعض جگہ ہمیں اس نزاکت اور لطافت کی کمی کا بھی احساس ہوتا ہے جو غزل کا لازمہ ہے۔ ان غزلوں کا موضوع وسیع اور رنگا رنگ ہے اور ان کی تہہ تک پہونچنے کے لئے ریاض اور بصیرت درکار ہے۔

بیدل نے فارسی غزل کو نئی ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کا ایک اہم خزانہ عطا کیا۔ ان کی قوت اختراع نے اظہار و ابلاغ کے لئے الفاظ کی بندش میں ایسی ایسی مینا کاری کی ہے کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو بذات خود ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ لیکن غالب کی طرح بیدل کے یہاں بھی مختصر بحروں کی غزلیں ہلکی پھلکی، سبک اور رواں ہیں۔ غالباً یہ ان کی فنکارانہ صناعی کے ہلکے لمحات کی آئینہ دار ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

یاس من امتحان نمی خواھد	بیدلم، عبرت خدا دادم
نیستی ہم بہ داد من نرسید	مرگ مردان زمان کہ من زادم[1]

---

[1] کلیات بیدل، نولکشور، ص ۲۸۲۔

بیدل نے غزل کی بحروں میں بھی جدت کی۔ انھوں نے ایسی بحروں میں غزلیں کہیں جو غیر معروف یا متروک تھیں۔ مثلاً کامل، متدارک، مطوی وغیرہ۔ خوشگو کا بیان ہے کہ بیدل نے بیسویں بحر ایجاد کی جو اب تک فارسی شاعری میں مستعمل نہیں تھی۔ مثلاً

می و نغمہ مسلم حوصلہ ای کہ قدح کش گردش سر نبود
بحل است سبک سری آن قدرت کہ دماغ جنون زدہ تر نشود[1]

یہاں بیدل کی ایک غزل بطور تبرک پیش کی جاتی ہے۔ یہ وہی مشہور بحر ہے جس کا یہ مطلع زبان زد ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم ندمیدہ ای، در دل گشا، بہ چمن درآ

گہر محیط تقدسی مکن آبروی حیا سبک — چو حباب جیفت اگر شوی ز غرور سر بہ ہوا سبک
نسزد ز مسند سیم و زر بہ وقار غرہ نشستنت — کہ زمانہ می کشد آخرش چو گلیمت از تہہ پا سبک
ز ترنم نی و ارغنون بہ دل گرفتہ مخوان فسون — کہ ز سنگ دامن بیستون نکند کسی بہ صدا سبک
ہمہ گر بہ نالہ علم کشی وگر اشک گردی و نم کشی — بترازوی کہ ستم کشی نشود بغیر جزا سبک
بہ علاج ننگ فسردگی نفسی ز تنگی دل برآ — کہ چو سنگ رنج گرانیت نشود مگر بہ جلا سبک
کند احتیاجت اگر ہدف، مگشای لب، مفراز کف — کہ وقار گوہر این صدف نکنی بہ دست دعا سبک
غم بی ثباتی کاروان ہمہ کرد بر دل ما گران — بہ کجاست جنبشی ازین دکان کہ شود بہ بانگ درا سبک
مخروش خواجہ بہ کرّ و فر کہ ندارد این ہمہ آن قدر — دو سہ گام آخر ازین گذر تو گران قدم زن و پا سبک
اگرت بہ منظر بی نشان دم ہمتی کشد عنان — چو سحر بہ جنبش یک نفس ز ہزار ریشہ برآ سبک
ز گرانی سر آرزو شدہ خلق غرقۂ ہای ہو — تو اگر تہی کنی این کدو، شود اتفاق شنا سبک

نکشید بیدل ازین چمن عرق خجالت پر زدن
چو غبار بی نم ہرزہ فن نشود چرا ہمہ جا سبک[2]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۱۲۵ -
[2] کلیات بیدل، کابل، ۱۳۴۱ شمسی ۱/ ۸۰۴ -

رباعی بیدل فارسی کے صف اول کے رباعی گو شعرا میں ہیں۔ رباعی میں بھی ان کی تخلیق کی مقدار دوسرے سبھی رباعی گو شعرا سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کی تعداد کے متعلق اوپر ذکر آچکا ہے۔ مگر اس کے علاوہ رقعات اور نکات وغیرہ میں بھی بہت سی رباعیاں ہیں جو اس کے علاوہ ہیں۔ بیدل نے ۱۱۱۵/۰۴-۱۷۰۳ء میں رباعیات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا[1] اور ظاہر ہے اس پر مزید اضافہ ہوتا رہا۔

بیدل کو سمجھنے کے لیے ان کی رباعیوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ درحقیقت ان کی غزل اور رباعی موضوع اور مضمون کے لحاظ سے مماثل اور ایک دوسرے کے سمجھنے میں معاون ہیں۔ ان میں فلسفۂ حیات و کائنات بھی ہے، سیدھی سادی نصیحتیں بھی اور ہلکی پھلکی ہجو و تعریض بھی۔ مگر بیدل کی بہترین رباعیاں وہی ہیں جو ان کے مخصوص فلسفہ یا انداز فکر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مثلاً یہ رباعیاں ملاحظہ کیجیے:-

نہ شعلہ در آستین، نہ گل در طبقیم ‌‌ ‌ سامان بضاعت خجالت در قیم
عمریست کہ انفعال محمل کش ماست ‌ ‌ ‌ چون شمع غبار کاروان عرقیم[2]

فارغ فارغ ز فکر مہر و مہ باش ‌ ‌ ‌ در خلوت دل بزم چراغ شہ باش
ای آئینہ پرداز جمال لاہوت ‌ ‌ ‌ از حیرت خویش اندکی آگہ باش[3]

ان رباعیوں میں غیر شعوری طور پر خیام کا طرز جھلکتا ہے

فریاد کہ ما را بہ حقیقت رہ نیست ‌ ‌ ‌ سر رشتۂ نومیدی ما کوتہ نیست
مردیم و زفہم خود نبردیم اثر ‌ ‌ ‌ از ما غیر خدا کسی آگہ نیست

---

[1] بانکی پور ۳/۲۰۲۔

[2] کلیات بیدل، کابل ۲/۳۱۳

[3] ایضاً ۲/۲۵۱۔

تا چند فریب چنگ و نی باید خورد؟ یا عشوهٔ نو بہار و دی باید خورد
قامت خم گشت، فرصت عیش کجا است؟ کج شد قدح، اکنون غم می باید خورد[1]

بیدل کے ہم عصران کی رباعی کے شیدائی اور مداح تھے. شاہ گلشن کہا کرتے تھے کہ "رباعی گوئی حق اوست"[2] اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نہ صرف عہد اورنگزیب بلکہ ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ میں بیدل کا نام رباعی گویوں میں سرفہرست ہے۔ رودکی نے مکالمہ کے انداز میں ایک دلچسپ رباعی کہی تھی، بیدل نے بھی اسی انداز میں ایک رباعی کہی ہے۔ دونوں کا موضوع جدا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ رودکی کی رباعی بیدل پر فوقیت رکھتی ہے مگر اس ایک مثال سے بیدل کی غیر معمولی قدرت فن کا اندازہ ہوتا ہے. ذیل میں دونوں رباعیاں درج کی جاتی ہیں :-

رودکی :-

آمد بر من. کہ؟ یار، کی؟ وقت سحر ترسید، زکہ؟ ز خصم، خصمش کہ؟ پدر
دادمش، چہ؟ بوسہ، بر کجا؟ بر لب و بر لب بد؟ نہ، چہ بد؟ عقیق، چون بد؟ چو شکر

بیدل :-

دی خفت، کہ؟ ناقہ، در کجا خفت؟ بہ گل کو دم، چہ؟ فغان، از چہ؟ ز یاد منزل
داد از کہ؟ ز خود، چرا؟ ز سعی باطل کافتاد، چہ؟ بار، از کہ؟ ز سر، بر کہ؟ بہ دل[3]

محیط اعظم

بیدل نے چار طویل مثنویاں لکھیں. محیط اعظم، طلسم حیرت، طور معرفت اور عرفان۔ ان میں پہلی مثنوی محیط اعظم ۱۰۷۸/۶۸-۱۶۶۷ کی تصنیف ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے :-

این نسخہ کہ از خامۂ الہام رقم گردید مسمّی بہ "محیط اعظم"

---

[1] ایضاً ۲/۱۰۰، ۱۶۸۔
[2] سفینۂ خوشگو ص ۱۲۵۔
[3] کلیات بیدل، کابل ۲/۲۳۴۔

دریافت دبیر خرد از روی حساب   سال تاریخ ہم بہ نامش مدغم [۱]

یعنی محیط اعظم کے اعداد ۱۰۷۸ سے تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہے۔

محیط اعظم کے شروع میں بیدل کا ایک نثری مقدمہ بھی ہے۔ کسی اور مثنوی میں ایسا مقدمہ نہیں۔ اس مقدمہ میں بیدل نے محیط اعظم کے موضوع اور دوسری مشہور مثنویوں کے مقابلہ میں اس کے مرتبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"این میخانہ ظہور حقائق است، نہ ساقی نامۂ اشعار ظہوری، آئینہ پرداز کیفیت دقائق است، نہ زنگار فروش خمار بی شعوری ..... ہلالی درِ اندیشۂ این سپہر کمال چون ماہ نو باریک است و زلالی در تماشای این محیط اعظم بہ آب حسرت نزدیک، .... اینجا نوعی گویا از خموشان، نہ از خنبوشان و مینای قلقل نوا از پنبہ بگوشان است نہ از معنی نیوشان" [۲]

بیدل مزید یہ تاکید کرتے ہیں کہ محیط اعظم کا ادراک ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں ہے کیونکہ اس کا موضوع عرفان و تصوف ہے :-

"لاجرم ہر بی مغز را کیفیت مطالعہ اش نشہ تر دماغی نرساند و ہر تنگ ظرف را پیمانۂ ورق گردانیش جرعۂ ادراک نچشاند ... سالک تا طی مراتب عرفان ننماید از جادۂ استفہام آن دور است و طالب تا بسر منزل کمال نرسد، از اصول ادراک آن معذور" [۳]

---

[۱] محیط اعظم و مشمولہ کلیات بیدل، کابل ج ۳، دلو، ۱۳۴۲ شمسی ص ۵۔ بعض نسخوں میں سال تاریخ از بنا بش مدغم، ہے اور مدغم کے اعداد ۱۰۸۴ ہوتے ہیں۔

[۲] ایضاً ص ۴-۳

[۳] ایضاً

Zaheer Ahmed Dar
R/P/o Department
13-6-89

محیط اعظم آٹھ دور میں منقسم ہے۔

۱۔ جوش اظہار خمستان وجود۔

۲۔ جام تقسیم حریفان شہود

۳۔ موج انوار گہرہای ظہور

۴۔ شور سر جوش شراب بیقصور

۵۔ رنگ اسرار گلستان کمال

۶۔ بزم نیرنگ اثرہای خیال

۷۔ حل اشکال خم و پیچ زبان

۸۔ ختم طومار نگ دپوی زبان

محیط اعظم کے پہلے دور میں شاعر نے اس وقت کی منظر کشی ہے جب خدا کے سوا کچھ نہ تھا پھر خدا کے دل میں تخلیق کی خواہش نے کروٹ لی اور کائنات ایک لفظ کن سے وجود میں آگئی۔ یہ حصہ محیط اعظم کا بہترین جزو ہے۔ یہاں بیدل کی قوت متخیلہ اور قوت متفکرہ نے ایجاد و ابداع کی ایسی فضا قائم کی ہے کہ واقعی تھوڑی دیر کے لئے یہ تصور ہوتا ہے کہ ہم اسی دور قبل تخلیق میں سانس لے رہے ہیں۔

خوش آندم کہ در بزمگاہ قدم — میی بود بی نشۂ کیف و کم

منزہ ز اندیشۂ حادثات — مبرا ز دود و غبار صفات

نہ صہباش نام و نہ رنگش نشان — لطیف و لطیف و نہان و نہان

نہ شور نفس نقل بزم شہود — نہ برق نگہ شمع عرض نمود

فرو رفتہ در نشۂ زار احد — ابد در ازل چون ازل در ابد

بہ معنی ہمہ بود و چیزی نبود — بہ ہر رنگ رنگ تمیزی نبود[1]

---

[1] ایضاً ص ۶۰۷

اب خدا کے دل میں تخلیق کی خواہش نے انگڑائی لی اور اس نے فرشتوں سے اپنے حسن کے خزینہ کو ظاہر کرنے کا اعلان کیا :-

که آمد خم واحدیت به جوش | به هستان صلا زد به گلبانگ نوش
چه گلبانگ؟ یعنی همین من منم | کز آواز بر خود نقاب افگنم
به ذوق تماشا جهان گشته ام | نهان کیست؟ اکنون عیان گشته ام[1]

چنانچہ کائنات وجود میں آئی :-

بطون رنگ گرداند و اظهار شد | خیالی پر افشاند، گلزار شد
مرتب شد از لای خم وجود | به بزم تجلی ظروف شهود
خروشی ز اجرام و اجسام زاد | بم و زیری از پرده بیرون فتاد
نبات از زمین سرزد و تاک کاشت | جماد آمد و در بغل شیشه داشت[2]

دوسرا دور یعنی جام تقسیم حریفان شہود کے عنوان سے شاعر نے دنیا میں مختلف پیغمبروں کی بعثت پر بحث کی ہے۔ یہ سلسلہ آدم سے شروع ہوتا ہے اور حضرت ادریس، نوح، یونس، ابراہیم، یعقوب، یوسف، داؤد، سلیمان، ایوب، موسیٰ اور عیسیٰ سے ہوتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔ بیدل نے تقریباً محیط اعظم کے علاوہ دوسری مثنویوں میں بھی بارگاہ رسالت میں عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ وہ درحقیقت شمع محمدی کے پروانہ اور عشق رسول میں دیوانہ تھے۔ یہاں کہتے ہیں :-

درین دور چون نوبت آن نبید | به آن صاحب بزم وحدت رسید
نبوت شراب خمستان قدس | هدایت نسیم گلستان قدس
ز لفظ محمد گر آگه شوی | ادا فهم الحمد لله شوی

---

[1] ایضاً ص ۸ ۔ [2] ایضاً ص ۹

به هرنشه مرآت حسن کمال | جلالش جلال و جمالش جمال
زشوق نثارش به ملک وجود | عدم کیسهٔ نقد هستی گشود
ازل تا ابد عرض اظهار او | جهان باده ونشه دیدار او[1]

انسان نے اس روئے زمین پر آنے کے بعد اپنی فہم وفراست کے مطابق حقیقت کی تلاش شروع کی، کسی نے مظاہر کو پوجنا شروع کیا. کسی نے نادیدہ طاقت کو خدا مانا. کسی نے کہا انسان اور خدا ایک ہیں اور کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ میں خدا ہوں. غرضکہ عقائد وافکار کی افراتفری وجود آدم سے شروع ہوئی اور آج تک باقی ہے. اسی افراتفری کو ختم کرنے اور اعتدال کی راہ دکھانے کے لیے خدا نے پیغمبروں کو مبعوث کیا.

اس سلسلہ میں بیدل منصور اور فرعون کی مثال دیتے ہیں کہ حقیقت کی تلاش وتعین میں دونوں افراط وتفریط کا شکار ہوگئے:-

به منصور از آن بادهٔ بی مثال | چو یک قطره افزود از اعتدال
بیاورد از موج شوخی زبان | ز ظرفش برآمد انا الحق زنان
چو فرعون جام رعونت کشید | به موسیٰ طرف گشت و آفت کشید
بجوشید درد از می ناب او | گل جلوه شد پردهٔ خواب او[2]

لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کا راستہ دکھایا اور آپ نے جو شراب معرفت عطا کی اس میں نہ شراب منصوری کی بے اعتدالی تھی اور نہ شراب فرعونی کی تلچھٹ. بیدل اسی شراب معرفت کے متلاشی ہیں. ایک جگہ عرفی کے انداز میں بہت ساری قسمیں کھانے کے بعد کہتے ہیں:-

که بی بادهٔ عمری جگر خورده ام | کجا عمر؟ تیغی به سر خورده ام[3]

---

[1] ایضاً ص ۲۹-۲۶   [2] ایضاً ص ۴۴-۴۱

[3] ایضاً ص ۱۱۲-

محیط اعظم میں دلچسپ حکایتوں کے ذریعہ بیدل نے اپنے خیالات و افکار کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً لیلیٰ و مجنوں کی فرسودہ حکایت میں یہ نکتہ پیش کرتے ہیں:۔

گذر کرد مجنون لیلی خیال   برآبی کہ شوید غبار ملال
عیان گشت لیلی بہ چشم ترش   چو گرداب درگردش آمد سرش
مژہ تا برافشاند، از خویش رفت   بہ رنگی کہ نتوان از و پیش رفت

مجنون ہوش میں آنے کے بعد کہتا ہے کہ محبت کی آگ مجھے پانی میں بھی چین نہیں لینے دیتی

چسان آتش از آب ننشیندم   کہ لیلی در آن پردہ می بیندم
ندانم محبت چہ برق افگن است   کہ در آب ہم لیلی آتش زن است[1]

ایک اور حکایت میں کہتے ہیں ایک پروانہ ویرانہ میں ایک شمع مزار پر جل رہا تھا اور اپنی جان فدا کر رہا تھا۔ اس سے ایک طاؤس نے کہا جلنا ہے تو محفل میں آکر جل، شمع انجمن صحرا کے خورشید سے بہتر ہے۔ پروانہ بولا میرا کام جلنا ہے۔ مجھے کیا پتہ انجمن کون سی ہے اور ویرانہ کیا ہے۔

کہ پروانہ را کار با جمع نیست   مرادش جز اندیشۂ شمع نیست
محال است بی طاقت سوختن   کند فرق ویرانہ از انجمن
چو پروانہ ام زین بساط سبب   غرض روی شمع است باقی تعب[2]

ایک طویل حکایت ایک ہندوستانی بادشاہ اور اسپ چوبیں کی ہے۔ اس حکایت کا سرچشمہ بظاہر ہندوستان کی نیم مذہبی کہانیاں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بیدل مہابھارت سے واقف تھے۔ ان کی دوسری مثنویوں میں بھی اس طرح کی ہندوستانی کہانیاں ملتی ہیں۔ حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا جو علم و معرفت کا متلاشی اور رعایا پر بہت مہربان تھا۔ ایک بار اس نے یہ اعلان کیا کہ اہل ہنر میرے دربار میں آئیں اور اپنا اپنا ہنر پیش کر کے انعام و اکرام

---

[1] ایضاً ص ۶۵۔   [2] ایضاً ص ۹۱

حاصل کریں۔ چنانچہ ایک بازیگر بھی دربار میں پہونچا۔ وہ لکڑی کا ایک گھوڑا لے کر آیا تھا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جو اس گھوڑے پر سوار ہوگا، ساتوں آسمان کی سیر کرے گا۔ بادشاہ اشتیاق میں اس پر سوار ہو گیا اور گھوڑا اسے لے کر اڑ گیا:۔

به اوج فلک گشت جولان نما	چو شبنم بر آمد بر اوج ہوا[1]

گھوڑا بادشاہ کو لے کر کئی دن اڑتا رہا۔ یہاں تک کہ سوار کی طاقت نے جواب دیدیا اور وہ ایک لق ودق صحرا میں گر پڑا۔ بادشاہ وہاں بیہوشی کے عالم میں تین دن تین رات پڑا رہا، جب ہوش آیا تو بھوک سے جان نکلی جارہی تھی، اتنے میں اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی روٹی لئے ہوئے جارہی ہے:۔

پس از رفع موج حجاب غبار	پری دختی از پردہ شد آشکار
خرامی چو سیلاب غارت فروش	نگہ وحشی دام الفت بہ دوش
چو نادیدگان بہر آب و طعام	خروش از نفس ریخت جای سلام[2]

وہ لڑکی درحقیقت مہترانی تھی۔ اس نے فریادی سے کہا ہم اچھوت ہیں اور دنیا کے ڈر سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ہمارا کھانا تم نہیں کھا سکتے:۔

ز خجلت بہ صحرا وطن کردہ ایم	بہ خود دوزخی را چمن کردہ ایم
ہمہ خانہ بر دوش و نان در بغل	ز جمعیت دل جہان در بغل
غذا ہای ما ہم بہ ما شد حلال	بہ قوم دگر نیست غیر از دبال[3]

لڑکی بولی ہاں اگر تم مجھ سے شادی کا وعدہ کرو تو میں تمھیں کھانا کھلا سکتی ہوں۔ بادشاہ نے فوراً وعدہ کرلیا۔ لڑکی نے اسے کھانا کھلایا اور اس کے بعد اسے لے کر مہتروں میں آئی۔

---

[1] ایضاً ص ۱۴۹۔	[2] ایضاً ص ۱۵۱۔

[3] ایضاً ص ۱۵۲۔

اور وہاں کے دستور کے مطابق دونوں کی شادی ہو گئی۔

بادشاہ دس سال مہتروں میں رہا۔ ہر سال اس کے یہاں ایک اولاد ہوتی رہی اور اس کے تعلقات کے بندھن بڑھتے گئے۔ اتفاقاً اس علاقہ میں بہت سخت قحط پڑا۔ تمام مہتر ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ بادشاہ بھی اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل پڑا۔

زبیم ہلاکت ہمہ مرد و زن نمودند تدبیر ترک وطن
ازآن جملہ این بادشاہ غریب دگربارہ شد از وطن بی نصیب[1]

ایک ہفتہ تک وہ چلتا رہا۔ لیکن دانہ پانی نصیب نہیں ہوا آخر پورے خاندان نے یہ طے کیا کہ اپنے آپ کو جلا کر ختم کر ڈالیں۔

بسوزیم خود را بہ جای سپند ہمین است تدبیر رفع گزند
برافروختند آتش بی شمار بہ طوفش رسیدند پروانہ وار[2]

بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ جلے گا تاکہ اولاد کی موت نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ وہ آنکھ بند کر کے آگ میں کود پڑا۔ تھوڑی دیر تک اس نے یونہی آنکھ بند رکھی جب اسے جلنے کا احساس نہیں ہوا تو اس نے آنکھ کھولی۔ اب کیا دیکھتا ہے کہ وہی محل ہے اور وہی دربار ہے۔ تمام امرا حاضر ہیں۔ البتہ بازیگر غائب ہے۔ بادشاہ اس سارے واقعہ پر بیحد حیران ہوا۔ اسے اس کی تعبیر بتانے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ اب "بیوی بچوں" کی یاد اسے ستانے لگی اور تخت و تاج کھٹکنے لگے۔ آخر کار ایک روز وہ شکار کے لئے نکلا اور لشکر سے الگ ایک طرف جنگل میں چل دیا۔ آگے چل کر اس نے دیکھا وہی مہتروں کی بستی ہے۔ اور لوگوں کا عجیب حال ہے۔ سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ کئی سال ہوئے ایک شریف زادہ غریب الوطن ہمارے یہاں آیا تھا اور ہم نے اسے دامادی میں قبول کر لیا تھا۔ اس قحط میں وہ بھی اپنے اہل و عیال سمیت گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ صحرانوردوں

---

[1] ایضاً ص ۵۵-۱۵۴۔ [2] ایضاً ص ۱۵۵

سے معلوم ہوا کہ وہ خاندان سمیت جل مرا۔ بادشاہ یہ سن کر بیحد حیران ہوا آخر اس نے پیغمبر عصر سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ تو انھوں نے فرمایا:۔

کہ ای ماندہ از مرکز اصل دور	نداری خبر از طلسم ظہور
بہ رویت دل راز وا کردہ اند	بہ رمز خودت آشنا کردہ اند
دلت صورت و معنی عالم است	وگرنہ وجود و عدم مبہم است
دل آنجا کہ باشد غبار خیال	بود جملہ منقوش لوح مثال
مشو غافل از ساز نیرنگ دل	کہ علم و جہان نیست جز رنگ دل[1]

محیط اعظم کے آخر میں بیدل نے پان اور اس کے لوازمات پر بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں بیدل سے پہلے بھی فارسی شعرا نے پان پر طبع آزمائی کی ہے لیکن کسی نے اس تفصیل سے خامہ فرسائی نہیں کی تھی۔ بیدل نے پان کی خوبیاں، بیڑہ کی شان، کتھا، چونا اور چھالیا کی خوبیاں بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض ہندی الفاظ خود بخود شعر میں آگئے ہیں۔ پان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

بدہ از گلستان پانم سبق	چو تنبولی اکنون بگردان ورق
کہ در آخر بزم پان لازم است	پس از میکشی نقل آن لازم است
چہ پان انتخاب گلستان ہند	ہمہ نسخۂ ناز سبزان ہند
زبانہا ز رنگینش برگ گل	لب از الفتش نسخۂ جام مل
زیمنش شگون بساط طرب	بہ حکمش حنا بندی لعل لب[2]

کروڑی پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

خروش مباہات کت شد بلند	برون جست از جای خویش این سپند

---

[1] ایضاً ص ۱۶۰۔ [2] ایضاً ص ۲۱۴

نفہمیدہ ناقص نگیرم بہ چشم | زبس انتخابم حقیرم بہ چشم
اگر ہیئتم مختصر کردہ اند | ز بحر انتخاب گہر کردہ اند
زمن رنگ پان طرح طوفان فگند | گر افیون شود نشۂ می بلند[۱]

اب چھالیہ اور چونہ کا مباہات دیکھئے۔ چھالیہ کہتی ہے :-

کہ بی من ندارد لب گلرخان | تبولی زکیفیت برگ پان
بہ آرایش محفل آگہی | زمن بیرہ مشکل کہ باشد تہی
سپاری کند تا وداع بیان | شرر کاری چونہ شد پر فشان
زمن می شود حسن پان بے نقاب | بود صبح روشنگر آفتاب[۲]

طلسم حیرت بیدل کی دوسری مثنوی طلسم حیرت ایک تمثیلی نظم ہے جس کا انداز عطار کی منطق الطیر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ محیط اعظم کے دو سال بعد ۱۰۸۰/۷۰-۱۶۶۹ میں تصنیف ہوئی۔ کتاب کا عنوان اور تاریخ ان اشعار میں درج ہے :-

بہ ملک مخترع چون یافت اتمام | چو عالم شد طلسم حیرتش نام
گہی تاریخی عقل زبان یاب | پی تاریخ نظمش بود بیتاب
سر اندیشۂ ای تا دید در جیب | برون آورد "گنج" "از" "عالم غیب"[۳]
۱۰۸۰ - ۷۲ - ۱۱۵۳

بیدل ایک خط میں شکر اللہ خاں کو لکھتے ہیں کہ وہ ان کی خدمت میں طلسم حیرت بھیج رہے ہیں۔ اور یہ کہ انھوں نے خان عالی شان کے بارے میں اگرچہ بہت کچھ سنا ہے لیکن ابھی تک

---

[۱] ایضاً ص ۲۸ - ۲۲۷۔ [۲] ایضاً ص ۳۲ - ۲۲۹

[۳] طلسم حیرت۔ سالار جنگ نمبر ۹۲۹۔ ورق ۱۸۔ اشپرانگر (ص ۳۷۹) کا یہ بیان صحیح نہیں کہ طلسم حیرت ۱۱۲۵/۱۴-۱۷۱۳ میں لکھی گئی۔

ان کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع نہیں ملا[1] ایک دوسرے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی کے دوران میں جو عنوانات ہیں وہ شکر اللہ خاں نے قائم کیے ہیں[2]

طلسم حیرت میں ایک تمثیلی حکایت بیان کی گئی ہے اور اس کے ذریعہ بیدل نے اپنے عقائد، افکار اور خیالات پیش کیے ہیں۔ یہ حکایت بیحد دلچسپ ہے کیونکہ اس کا پس منظر بالکل عام یعنی جسد انسانی ہے۔ حکایت اس انداز کی ہے کہ ملک تقدس میں ایک بادشاہ تھا۔

لب حیرت بیان نسخۂ راز	چنین گردید درس معنی آغاز
کہ در ملک تقدس بود شاہی	معلی مسندی، عزت کلاہی
تنزہ بادۂ پیمانۂ او	تلون نقش خلوت خانۂ او[3]

ایک دن وہ سیر کو نکلا اور ایک معمورۂ شوق میں پہونچا۔ یہ مملکت جسم تھی۔ یہاں چار حاکم تھے۔ بلغم، خون، صفرا اور سودا۔ لیکن یہ چاروں حاکم بے اختیار تھے۔ اصل حکومت ایک پری دخت کی تھی جس کا نام مزاج تھا:۔

پری دختی بہار آن چمن بود	شرر خویی چراغ آن لگن بود
مزاجش نام و در معنی یگانہ	سراپا خویش و ارکانش بہانہ[4]

بادشاہ اس پری دخت پر فدا ہو گیا اور اس سے عروسی کر لی۔ ایک عرصہ تک وہ دونوں خوش و خرم زندگی گذارتے رہے اور ان کے وجود سے مملکت جسم باغ و بہاری رہی:۔

جدائی از میان برچید دامان	خس و خاشاک شد در شعلہ پنہان
من و تو بود مدتہا ہم آہنگ	نہ یک پیرہن چون بادۂ و رنگ

---

[1] رقعات بیدل، نولکشور، ص ۳۔

[2] طلسم حیرت (مشمولہ کلیات بیدل، ج ۳، کابل) ص ۱ (حاشیہ)

[3] ایضاً ص ۲۰۔ [4] ایضاً ص ۲۳۔

بدن را مقدمش تشریف جان داد　　زمین را غبار آسمان داد[1]

مملکت جسم میں تین قلعے تھے۔ پہلا قلعہ دماغ کا تھا جہاں دس نگہبان تھے، سامعہ باصرہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، حس مشترک، خیال، متفکرہ، واہمہ اور حافظہ۔

دوسرا قلعہ جگر کا تھا جس کی حفاظت آٹھ استاد کر رہے تھے، غاذیہ، نامیہ، مولدہ، مصورہ، جاذبہ، ماسکہ، ہاضمہ اور دافعہ۔

تیسرا قلعہ دل کا تھا اور سب سے خوبصورت تھا:۔

بساطی دید در عین نزاہت　　گلستان جلوۂ صد رنگ راحت

طراوت سایہ پرور در رہینش　　بہشت خرمی گرد زمینش

دو عالم عیش فرش آن مکان یافت　　ولی شش کس مقیم آستان یافت[2]

یہ چھ اشخاص تھے امید، محبت، فرح، خوف، عداوت اور غم۔ بادشاہ نے قلعۂ دل میں رہنے کا فیصلہ کیا تو مؤخر الذکر تینوں اشخاص نے اسے منع کیا مگر امید، محبت اور فرح نے اسے دعوت دی:۔

محبت گفتش "ای شاہ دل آرا!　　بہ دل جا کن، بہ دل جا کن، بہ دل جا"[3]

چنانچہ بادشاہ نے خوف، عداوت اور غم کو قلعۂ دل سے نکال دیا اور امید، محبت اور فرح کو اپنا ندیم بنا کر وہاں سکونت اختیار کی۔ اب اس نے مملکت کے تمام سرداروں کو بلایا اور انھیں حسب مرتبہ خلعت عطا کی:۔

مہان مملکت را پیش خود خواند　　چو ابر فیض طرف دامن افشاند

کرامت شد بہ خون تشریف گلگون　　کہ از رشکش چمن زد غوطہ در خون

---

[1] ایضاً ص ۲۴۔　　[2] ایضاً ص ۳۹۔

[3] ایضاً ص ۴۳

قبای زعفری صفرا بہ بر کرد — زجیب نرگستان سر بدر کرد
لباس عنبرین شد وقف سودا — سراپا سرمۂ چشم تماشا
بہ بلغم خلعت برگ سمن داد — چو صبحش سر بہ سیر نسترن داد[1]

یہ سردار کچھ دن تو سکون سے رہے اس کے بعد آپس میں جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے پر اپنی فوقیت جتانے لگے۔ سودا نے صفرا سے کہا:-

عبث وامانده ای در کشور تن — پرافشان زین غبار و ہم دامن
ز بزم عافیت گرمی کشی جام — بیا در سایۂ من گیر آرام
سواد فکر لاہوت آشیانم — بود طبع روان تخت روانم[2]

صفرا نے پلٹ کر جواب دیا:-

بہ آن دردی کہ از پیمانہ ام ریخت — قضا آب و گل بنیادت انگیخت
ہمان بہتر کہ میری در غم خویش — بہ چہ شمع کشتہ داری ماتم خویش[3]

جب خون نے صفرا کا یہ فخریہ سنا تو اسے اس طرح ڈانٹا:-

کہ ای از نشۂ اوہام مغرور — ز خود کامی بہ حرف تلخ مسرور
علاج روی زرد خویشتن کن — دگر از ہر چہ می خواہی، سخن کن
شبستان بدن را شمع طورم — چو برق آگہی یک شعلہ نورم[4]

بلغم یہ باتیں سن کر کب خاموش رہتا۔ اس نے بھی دون کی لی اور بولا:-

بہ میدان صفا صلح است جنگم — بہ رنگ خون عنابی نیست رنگم
گداز آلودہ جسمی ناتوانم — ملایم تر ز مغز است استخوانم[5]

---

[1] ایضاً ص ۴۴۔ [2] ایضاً ص ۴۶۔
[3] ایضاً ص ۴۷۔ [4] ایضاً ص ۴۸۔
[5] ایضاً ص ۴۹۔

بادشاہ کو جب ان جھگڑوں کا علم ہوا تو صلح صفائی کی کوشش کی مگر کسی نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ غم، خوف اور عداوت نے جب یہ افراتفری دیکھی تو حملہ کر کے قلعہ دل کو پھر فتح کر لیا۔ بادشاہ نے امید، محبت اور فرح سے مشورہ کیا، فرح نے کہا میں شہسوار حسن سے مدد طلب کرتی ہوں، محبت بولی میں عشق سے کمک کی درخواست کرتی ہوں اور امید نے کہا میں عقل کو طلب کرتی ہوں۔ مگر جب فرح حسن کے پاس گئی تو حسن نے استغنا جتایا۔ محبت بھی عشق کے دربار سے بے نیل مرام لوٹی۔ البتہ امید کی درخواست پر عقل مدد کو آئی اور ظالموں کو پسپا کر کے قلعہ دل خالی کرا دیا۔ لیکن فرار ہونے کے باوجود عداوت چین سے نہیں بیٹھی۔ اس نے ایک ظالم شخص مرض سے فریاد کی۔ مرض نے کہا میں مملکت جسم کو بھسم کر سکتا ہوں مگر مجھے آگ لگانے کے لئے تھوڑا سا خاشاک چاہیے۔ یہ خاشاک انھیں غذا کی صورت میں مل گیا جو دل کے محل میں خوان سالار تھی۔ غرضیکہ مرض غذا کے ذریعہ جسم میں پہونچ گیا اور فساد کا عمل شروع کیا پہلے سودا کا غلبہ ہوا، پھر تپ چڑھا پھر استسقا اور یرقان ہوا اور ان سب کا نتیجہ ضعف اور اضطراب روح کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جب بادشاہ نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے صحت سے کہا:۔

صلاح کار جز ترک وطن نیست　　　در آتش خانہ غیر از سوختن نیست
بہ خود تا کی چنین محبوس بودن؟　　　چراغ وہم را فانوس بودن[1]

صحت نے کہا "بادشاہ سلامت گھبرائیں نہیں، میرا ایک دوست ہے ہمت نام۔ اس کی مدد سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بادشاہ نے اس کی بات پر اعتماد کیا اور توکل کے ساتھ ہمت کی مدد حاصل کی۔ ادھر ملکہ مزاج نے سلطنت کا یہ انتشار دیکھا تو سرداروں کو للکارا اور انھیں آپس کے اختلافات پر سرزنش کی۔ اخلاط نے ملکہ کی بات پر دھیان دیا اور مل کر مرض کی

---

[1] ایضاً ص ۴۷۔

مدافعت شروع کی یہاں تک کہ مرض کو شکست ہوئی اور جسم پھر رو بصحت ہو گیا۔

کدورت زان قلمرو یک قلم رفت　　صفا جوشید از آئینہ نم رفت[۱]

اب فرح اور محبت دونوں واپس آئے۔ بادشاہ نے جنون عشق میں پوری مملکت جسم کی سیر شروع کی۔ اور ایک ایک منزل سے گذرا۔ ان مقامات کی سیر سے بادشاہ کی چشم بصیرت وا ہوئی اور وہ لامکاں کو واپس چلا گیا:۔

چو سلطان از حقیقت گشت آگاہ　　بہ سیر خود نظر افگند ناگاہ

جہانی دید پاک از عرض صورت　　بہاری فارغ از رنگ کدورت

دری بر ہستی کونین بستہ　　غبار ما و من بیرون نشستہ

مقام اصلی خود دید و بشناخت　　ہمہ جولان شد و از خود برون تاخت

تنزہ دامن از تشبیہ افشاند　　غبار کثرت و وحدت برون ماند[۲]

اس تمثیل کے بعد بیدل کہتے ہیں کہ عرفان حاصل کرنے کے لئے ہم کہاں کہاں بھٹکتے ہیں۔ اصل سیر تو مقامات بدن کی ہے۔ منزل مقصود کا پتہ یہیں سے ملتا ہے:۔

بکن سیری مقامات بدن را　　ببین تبدیل حال خویشتن را

دگر ہر سو روی، وہم است، مشتاب　　تو ئی مطلوب خود، دریاب، دریاب[۳]

طلسم حیرت اسم بامسمیٰ ہے۔ پوری مثنوی میں ایک طلسماتی اور حیرت انگیز فضا ہے۔ بیدل نے بلغم، صفرا، سودا، خون جیسی چیزوں میں جو شاعرانہ فنکاری دکھائی ہے اس نے ہر چیز کو انتہائی جاذب اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ اس تمثیل سے بیدل نے سیاست، معاشرت اور عرفان کا جو سبق دیا ہے، وہ مثنوی کے جستہ جستہ اقتباسات سے ظاہر ہے۔ مثنوی تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار

۱؎ ایضاً ص ۸۷　　۲؎ ایضاً ص ۱۳۴

۳؎ ایضاً

پر مشتمل ہے۔

طور معرفت بیدل کی تیسری مثنوی طور معرفت سب سے مختصر اور دلچسپ ہے۔ طور معرفت کا دوسرا نام گلگشت حقیقت بھی ہے۔ درحقیقت یہ مثنوی کے خاتمہ کا عنوان ہے جیساکہ بیدل کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے[1] ورنہ خود بیدل اس کا نام طور معرفت بتاتے ہیں۔

به یمنش آخر این مکتوب منظوم ‌ ‌ ‌ به طور معرفت گردید موسوم[2]

طور معرفت کے سال تصنیف کا صراحتاً ذکر نہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ جب میں نے گوشہ گیری اختیار کی تو میرے ایک عزیز نے مجھے سیر کے لئے اکسایا۔ اتفاق سے انھیں دنوں شکر اللہ خاں کا لشکر بیراٹ[3] کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا:۔

درایامی که دل صبر آزما بود	طبیعت نو نیاز انزوا بود
چو شمع کشته بودم الفت آغوش	به آن هستی که بود از دل فراموش
... که ای عنصر متاع ملک ایجاد!	طلسم آب و خاک و آتش و باد
دلت آئینه و عالم ندیدن	نگاهت باده و غفلت کشیدن
به دریا گر نداری آشنایی	کف خاکی ز ساحل کن گدایی
که کهسار است یکسر عالم رنگ	هجوم آباد آب و آتش و سنگ
تو خواهی سنگ شو خواهی شرر باش	زبانی جلوه داری، جلوه گر باش
چه صحرا و چه دریا و چه کهسار	همه مشتاق تست ای غافل از کار![4]

---

[1] رقعات بیدل ص ۶۸۔

[2] طور معرفت (مشمولہ کلیات بیدل، کابل ج ۳) ص ۴۹

[3] بیراٹ راجستھان میں جے پور کے قریب ایک پہاڑی اور جگہ کا نام ہے۔

[4] طور معرفت (مشمولہ کلیات بیدل ج ۳) ص ۱-۲۰۲۔

اس دوست نے کہا لیلیٰ مجنون کی داستان پارینہ ہو چکی۔ فرہاد اور بے ستون کی باتیں افسانہ ہوگئیں اب تو ہر سنگ بے ستون ہے اور ہر مقام زیارت کدۂ عشق وجمال، بدخشان اور نیشاپور دور سہی، ہرات تو قریب ہے لیکن بیدل کے لئے سیر کو نکلنا کہاں ممکن تھا، البتہ شکراللہ خاں کی فوج اسی طرف جارہی تھی :۔

گل رایات شکراللہ خانی　　　به فرق آن زمین کرد آسمانی
من بیدل به آهنگ دعایش　　　گرفتم طرف دامان لوایش
به پای شوق آنجا سر کشیدم　　　به این کیفیت آن ساغر کشیدم[1]

جیساکہ اوپر ذکر ہوا بیدل ۱۰۹۶/ ۸۵-۱۶۸۴ میں گوشہ گیر ہوئے۔ اور ۹۸-۱۰۹۷/ ۸۷-۱۶۸۵ میں شکراللہ خان میوات میں بجی رام نروکہ سے مصروف پیکار ہیں۔ اس لئے قیاس ہے کہ بیدل نے یہ مثنوی اسی کے لگ بھگ تصنیف کی۔

طور معرفت بظاہر ایک بیانیہ مثنوی ہے جس میں شاعر نے ہرات کی پہاڑیاں، وہاں کی برسات، چمن، سبزہ، کان، پھول وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی تہہ میں عرفان وبصیرت کی ایک لہر برابر دوڑ رہی ہے۔ اور اس طرح یہ نظم ورڈسورتھ کی نظم Tintern Abbey سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ شاعر کو بیجان چٹانوں، لہلہاتے پھولوں اور لہراتے ہوئے سبزے میں ایک روح جاری وساری نظر آتی ہے۔ وہ بڑے غور سے ایک ایک چیز کو دیکھتا ہے اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہے۔ ایک طرف لشکر کی دوا دوش اور دوسری طرف بیدل کا یہ تحیر آمیز اور عبرت انگیز سفر واقعی دلچسپ بھی ہے اور دلگداز بھی۔

زنی اینجا اگر یک شیشه بر سنگ　　　ز ساز هر دو عالم جوشد آهنگ
اگر درس تأملها روان است　　　دل شب صفحهٔ خورشید خوان است

---

[1] ایضاً ص ۵۔

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جانی است　　نہان در ہر کف خاکی جہانی است[1]

میر نے کاسۂ سر پہ پاؤں رکھ کر جو بات سیکھی تھی، بیدل وہ سبق صرف ایک پتھر سے حاصل کرتے ہیں:-

شبی بر تیغ کوہی بود جایم　　زبیتابی بہ سنگی خورد پایم
توانایی بہ طاقت گشت مغرور　　کہ از راہش بہ جرأت افگنم دور
ندا آمد کہ ای محروم اسرار!　　خرابات نزاکتہا است کہسار
مبادا اینجا زنی بر سنگ دستی　　کہ مینا در بغل خفتہ است مستی[2]

بیراٹ کی پہاڑیوں میں دراصل سونے چاندی کی کان تھی۔ اور اسی بنا پر ان کی بیحد اہمیت تھی، بیدل نے اس دور کی کان کنی کا بڑا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ ہزاروں مزدوران کانوں میں کام کرتے تھے۔ ان کا حال ملاحظہ کیجیے:-

ہزاران چاہ و بر ہر چاہ خلقی　　نہ سامان ردایی و نہ دلقی
بہ عریانی سراپا قطرہ آب　　بہ آہنگ چکیدن اشک بیتاب
تردد پیشہ اطفال و زن و مرد　　بہ نہہا خاک مال و چہرہ ہا زرد[3]

کنویں جیسی گہری اور تاریک کانوں میں یہ مزدور اترتے تھے۔ ان کے سر پر ایک جلتی ہوئی مشعل ہوتی تھی۔

بہ چاہ از آرزوی جان کنی ہا　　روان چون دلو یکسر بی سر و پا
بہ فرق ہر یک افروزان چراغی　　سر سودایی و سامان داغی[4]

بڑی گہرائی تک کھودنے کے بعد کہیں سونے چاندی کی تہہ ہاتھ آتی تھی:-

---

[1] ایضاً ص ۱۸-۱۶　　[2] ایضاً ص ۲۴-۲۳
[3] ایضاً ص ۲۹　　[4] ایضاً

به پیش آید زمینی از مس ناب | که سیم و زر زخاکش می خورد آب
از آنجا تا نشان گاو و ماہی | قدم ہا بر زر و سیم است راہی[1]

کان کنی کا پیشہ انتہائی خطرناک تھا۔ اکثر کان بیٹھ جاتی اور تمام کان کن اس میں دب کر مر جاتے۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ کتنے مزدور نیچے کام کر رہے ہیں، ہر کوئی اپنا جوتا اوپر چھوڑ آتا تھا۔ اور اس سے زندہ مردہ کا حساب معلوم ہوتا تھا۔

بسی باشد که آن چاه بلاکیش | چو اژدرها بهم آرد لب خویش
تردد پیشه ہا معدوم گردند | به چندین سخت جانی موم گردند
ز نعلینی که ماند بر سر چاه | برد اندیشه بر اعداد شان راه
و گر سنگی فرو آید ز کهسار | بپوشاند جهانی را شرر وار
ز هر چاهی لب گوری مقرر | ز هر سنگی اجل استاده بر سر[2]

زر پرستی کی ہوس انسان کو کیا کیا کام کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ چند روزہ عیش کے لئے کیسے کیسے خطرات مول لیتا ہے۔ بیدل یہ بات سوچ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ دولت پرستی کے خلاف ہر شاعر نے قلم اٹھایا ہے لیکن بیدل نے کانوں میں جان کنی کا انداز دیکھا تھا اور انھوں نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ انتہائی پرسوز اور دلدوز ہے :-

کجایی ای ہوس مزدور دنیا؟ | به ذوق جان کنی مسرور دنیا
تراشیدی به وہم خویش جاہی | عروجی را بر آوردی ز چاہی
درین محفل کجا سیم و کجا زر؟ | مژه واری بپوشان چشم و بنگر
جهان پست با آن افسر و جاه | چو پاپوش است با پای تو ہمراه
یکی جان کند و آن دیگر زر اندوخت | گداز سعی این آن دیگر اندوخت

---

[1] ایضاً ص ۳۰۔   [2] ایضاً

که هستی ریسمان باف معاش است به چاه زندگی گرم تلاش است[۱]

بیدل نے یہ عجیب نکتہ پیدا کیا کہ چونکہ شیشۂ شراب اور زر و سیم دونوں سنگ سے حاصل ہوتے ہیں اس لئے شرابی کی طرح زردار بھی مست رہتا ہے :۔

چرا منعم نباشد مستی آہنگ! که زر ہم صحبت میناست در سنگ

نگویی سیم و زر می جوشد از سنگ ز مینا می دہد مستی به این رنگ[۲]

ہیراٹ کی پہاڑیوں میں بیدل کو گرم پانی کا ایک چشمہ بھی ملا جو صحت بخش تھا۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

به خاصیت چراغی صحت افروز به گرمی آتشی اما مرض سوز

لب موجش مسیحی ساز کرده در دارالشفایی باز کرده[۳]

اس سفر میں بیدل کے ساتھ بہترین دوستوں کا اجتماع تھا جنھیں وہ ادب سنج اور وفادوست کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن اصل سہارا نواب شکر اللہ خان کا تھا، جن کی مدح پر مثنوی ختم ہوتی ہے :۔

عصای من درین گلگشت مقصود نسیم فیض شکر اللہ خان بود

وگرنہ من کجا، کو پر فشانی سرشکی بودم آن ہم بی روانی

درین گلشن خرامی داشت کلکش که پیوستم من بیدل به سلکش

به یمنش آخر این مکتوب منظوم به "طور معرفت" گردیده موسوم[۴]

عرفان

عرفان بیدل کی آخری اور سب سے طویل مثنوی ہے جو ان کے قول کے مطابق گیارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور ۱۱۲۴/۱۷۱۲ میں تصنیف ہوئی :۔

۱؎ ایضاً ص ۲۲۔ ۳۱۔ ۲؎ ایضاً ص ۲۸

۳؎ ایضاً ص ۳۵ ۴؎ ایضاً ص ۴۹

شکر ایزد کہ نسخۂ عرفان — یافت اقبال از اختتام بیان
وضع ابیات این خیال نمود — جز خطی چند در خیال نبود
لیک ہرگاہ در شمار آمد — بر زبان یازدہ ہزار آمد
کردہ تاریخ او نیاز ارقام — "ہدیہ ذوالجلال والاکرام"[۵]

عرفان بیدل کی پوری زندگی کے خیالات، اذکار، تاثرات، کیفیات، جذبات اور احساسات کا نچوڑ ہے اور فارسی ادب میں مثنوی معنوی کے بعد علم و عرفان کا سب سے اہم خزانہ ہے۔ اور مثنویوں کے برخلاف عرفان کا انداز بیانیہ نہیں ہے۔ نہ اس میں حکایات اور تمثیلات کی بہتات ہے۔ شروع سے آخر تک بیدل نے اس میں ایک فکری انداز قائم رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی شاعری خشک، مبہم اور گنجلک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بیدل نے جن اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور جس متین اور باوقار انداز میں شروع سے آخر تک بحث کی ہے وہ نہ صرف ان کی فنکارانہ استادی کی بین مثال ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے دل و دماغ کے تمام مرحلوں سے گذر کر اس کے وجود کا جزو بن گیا ہے۔

عرفانیات، اخلاقیات اور عمرانیات کا شاید ہی کوئی ایسا اہم پہلو ہو جس سے عرفان کا وسیع دامن خالی ہے۔ بعض مسائل سے اس دور کی اخلاقی اور سماجی قدروں کا بڑی حد تک تعین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں پیشہ کی شرافت اور رذالت کی بڑی اہمیت رہی ہے شرفا کوئی ہاتھ کا کام نہیں کرتے اور دستکار یا صنعت کار شریف نہیں سمجھے جاتے۔ یہ احساس سماج کو گھن کی طرح کھاتا رہا۔ بیدل کو اس تضاد کا شدید احساس تھا۔ وہ کہتے ہیں جب پیغمبروں نے اپنے ہاتھ سے کام کیے، تو ہمیں عار کیوں ہے؟

---

[۵] عرفان (مشمولہ کلیات بیدل، کابل، ج ۳) ص ۴۲۴۔ مرتب نے تاریخ کے نیچے ۱۱۲۴ کا سنہ دیا ہے۔ غالباً اس نے ذوالجلال والاکرام کے دونوں الف کو نہیں شامل کیا ہے

از شبانی چه عار داشت کلیم؟ وز عمارت چه ریخت ابراهیم؟
چند ازین پیشه ها تبرا یت؟ ای ز دست تو تیشه بر پایت![1]

اور یہ چبھتی ہوئی حکایت پیش کرتے ہیں :-

خسروی دید قومی از جولاہ سوی دستور میل داد نگاه
تا بدانند چه فرقه اند اینها؟ گفت "استار عیب شاہ و گدا"[2]

بیدل کو ہندوستان سے جو محبت تھی، اس کے اشارے ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ عرفان میں بھی کئی ایک حکایت ہندوستانی ماخذ سے لی گئی ہے۔ اور بعض بعض حکایتوں میں انھوں نے ہندوستان کو پر جوش خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

ہند باغی است کز تصور او می رود آرزو به خلد فرو
آگہی را سواد او محک است شب نشین نگاه مردمک است
از زمینش غبار اگر خیزد بر ہوا مشک سوده می بیزد
بگذر از خواب مخمل کاشان سرمه گیر از سواد ہندوستان
چیست ہندوستان؟ بہار حضور کاین زمان چشم تست ازو پر نور[3]

عرفان میں ہندوستانی عقائد سے متعلق کئی ایک کہانیاں ہیں خصوصاً تناسخ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے بیدل کہتے ہیں :-

عمرہا شد که علم ازین آیات داده بر ذہن شان رسوخ ثبات
من ہم از اختراع صورت حال عالمی دیده ام به خواب و خیال

---

[1] ایضاً ص ۱۳۷ [2] ایضاً ص ۱۴۰
[3] ایضاً ص ۱۵-۱۴

گر بہ تفصیل رد بہ عرض دارم — از جہانی زبان بہ قرض آرم[1]

اس سلسلہ میں جنوبی ہندوستان کے ایک ہندو کی کہانی نقل کی ہے جس کا لڑکا بیدل کی صحبت سے مانوس تھا اور جس نے بیدل کو تناسخ کا ایک عجیب واقعہ سنایا جو اس کے باپ کو پیش آیا تھا[2] اسی سلسلہ میں ایک اور برہمن کی حکایت نقل کی ہے جو مرکر خاکروب کے گھر پیدا ہوا اور قسمت سے راجہ بن گیا۔ جب لوگوں کو اس کی ذات کا پتہ چلا تو انھوں نے سر پیٹ لیا۔

برہمن ہا قیامت آوردند — موکنان خاک رہ بہ سر کردند

در وبالی عظیم افتادیم — کہ بہ کناس راجگی دادیم[3]

تناسخ پر بحث کرتے ہوئے بیدل نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ عورت کے ستی ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ شوہر کی روح عدم میں بیتاب رہتی ہے۔ عورت ستی ہو کر اس سے جا ملتی ہے اس سلسلہ میں صوبہ بہار کے ایک دولتمند کی سات سالہ لڑکی راجونتی کے خود بخود ستی ہونے کی دلدوز داستان نقل کی ہے[4]۔

عرفان میں اور بھی ایسی کہانیاں ہیں جن کے شاہد بیدل خود ہیں۔ اس سے شاعر کے تعلقات اور اس کی سیاحی کا مزید علم ہوتا ہے۔ مثلاً بنگال میں واقع کالوطاق کے ایک مالدار کی کہانی ہے جو گردش وقت سے مفلس ہو گیا تھا۔ بابالیسر بندرگاہ کے ایک مفلس کی داستان ہے جسے غیب سے اچانک دولت مل گئی تھی[5]۔

ان ہندوستانی کہانیوں میں سب سے دلچسپ کہانی کامدی اور مدن کی ہے اس کہانی کی تلخیص ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ کہانی اس لئے اہم ہے کہ تقریباً یہی کہانی نام وغیرہ کے

---

[1] ایضاً ص ۲۸۲ ۔ [2] ایضاً ص ۲۸۲ ۔

[3] ایضاً ص ۳۹۴ ۔ [4] ایضاً ص ۲۸۷ ۔

[5] ایضاً ص ۳۶۵، ۳۷۴ ۔

معمولی رد وبدل کے ساتھ اس دور کے ایک اور شاعر حقیری نے نظم کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے :۔

کامدی ہندوستان کے ایک راجہ کی رقاصہ تھی رقص میں اس کی مثال ملنی مشکل تھی مدن اس دور کا ایک فنکار مطرب تھا۔ اتفاق سے مدن اس راجہ کے دربار میں پہونچا اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ راجہ نے خوش ہوکر اپنے گلے کا ہار اتار کر مدن کو انعام دیدیا۔ اب کامدی نے اپنا رقص شروع کیا لیکن راجہ اور درباری مدن کے نغمہ سے اتنے محو ہو چکے تھے کہ وہ کامدی کے رقص سے کما حقہ لطف نہیں اٹھا سکے۔ البتہ مدن اس کے فن کو دیکھ کر اتنا بیخود ہوا کہ اس نے راجہ کا دیا ہوا ہار کامدی کے قدموں میں نچھاور کر دیا۔ بادشاہ نے اپنے انعام کی یہ توہین دیکھی تو اس نے مدن کو شہر بدر کرنے کا حکم دیا۔ مگر کامدی نے سپاہیوں کو رشوت دے کر رات بھر کے لئے مدن کو اپنے گھر میں چھپا کر رکھ لیا۔ اگلے روز مدن اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ کامدی نے اس سے کہا شمال میں ایک درخت ہے۔ جو کوئی اس کے سایہ میں بیٹھتا ہے اس کی مراد برآتی ہے۔ تم وہاں جاؤ میں ادھر دعا کرتی ہوں۔

مدن اس درخت تک پہونچ گیا۔ وہ دن رات کامدی کامدی کی رٹ لگاتا تھا یہاں تک کہ وہاں کی چڑیاں بھی یہی لفظ چہچہانے لگیں۔ اتفاق سے ایک بادشاہ شکار کھیلتے ہوئے وہاں پہونچا۔ اس نے ساری فضا میں کامدی کا لفظ گونجتے ہوئے سنا تحقیق کی تو مدن کا حال معلوم ہوا۔ بادشاہ نے قسم کھائی کہ وہ مدن کی مدد کرے گا اور اسے اس کے محبوب تک پہونچائے گا۔ چنانچہ اس نے کامدی کے شہر پر لشکر کشی کی اور اپنے حریف بادشاہ کو شکست دی۔ مگر اس سے قبل کہ وہ کامدی کو مدن کی آمد کا مژدہ دے اس نے ایک قاصد کے ذریعہ امتحاناً کامدی کو یہ کہلوایا کہ مدن مرچکا ہے۔ یہ جانگداز خبر سن کر کامدی کی روح فنا ہوگئی۔ ادھر مدن نے کامدی کی موت کی خبر سنی تو محبوبہ سے لپٹ کر جان دیدی۔

اب بادشاہ کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے طے کیا کہ وہ بھی جان دیدیگا کیونکہ مدن اور کامدی

کا اصل قاتل وہی ہے۔ مگر طبیبوں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یہ موت نہیں بلکہ سکتہ ہے۔ آخر کار علاج سے کامدی اور مدن دونوں جی اٹھے۔ اور اس طرح بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق مل گئے۔

بیدل نے اس کہانی کا ماخذ نہیں بتایا ہے۔ ممکن ہے حقیری کی مثنوی کا انھیں علم ہو کیونکہ موخر الذکر مثنوی ۱۰۹۱/۱۶۸۰ء میں تصنیف ہو چکی تھی۔ البتہ دونوں کہانیوں میں نام اور دوسرے جزوی اختلافات ہیں۔ حقیری نے رقاصہ کا نام کام کندلا اور مغنی کا نام مادھونل لکھا ہے۔ حقیری کی مثنوی میں رقاصہ کا اصل کمال یہ تھا کہ جب وہ ناچ رہی تھی تو ایک بھڑ اس کے سینہ پر آ کر بیٹھ گئی مگر کام کندلا نے اسی اضطراب کے عالم میں رقص جاری رکھا۔ حقیری کے یہاں درخت کا کوئی ذکر نہیں نیز وہاں مغنی کی مدد اجین کا راجہ بکرم کرتا ہے اور وہ خود ہی قاصد بن کر رقاصہ کے پاس جاتا ہے۔ حقیری کی روایت میں عاشق و معشوق کو سکتہ نہیں ہوتا بلکہ دونوں واقعی مرجاتے ہیں اور خضر کے آب حیات سے دوبارہ زندہ ہوتے ہیں۔

بیدل نے فارسی شاعری میں جو جگہ بنائی ہے وہ منفرد بھی ہے اور عظیم بھی۔ ہندوستان کے فارسی ادب کی عمارت جن چار عظیم ستونوں پر قائم ہے ان میں ایک بیدل ہیں۔ باقی تین امیر خسرو، غالب اور اقبال ہیں۔ یہ بھی عجیب خوش قسمتی ہے کہ بیدل کو افغانستان کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اور بعض معتقدین ان کی قبر کابل میں بتاتے ہیں۔ وہاں بیدل شناسی فارسی تنقید کا ایک اہم پہلو ہے اور اس سلسلہ میں صلاح الدین سلجوقی اور حافظ نور محمد کہگوالی کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔

٭

"Hakim Gulam Dana Fouladi USTAAD Mahmood Chan Ki 9"

عطا ٹھٹھوی

سندھ ہندوستان میں مسلم معاشرت کا اولین گھوارہ رہا ہے۔ وہاں کے باشندوں نے فارسی علم وادب کی جو خدمتیں کی ہیں، اس کی تحقیق وتشریح بذات خود ایک مستقل اور اہم موضوع ہے۔ اس سلسلہ میں سندھ کا شہر ٹھٹھ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو اپنے دانشوروں کی بدولت فارسی ادبیات کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ عہد اورنگزیب میں ٹھٹھ نے دو ادیب ایسے پیدا کیے جن کا مقام فارسی ادب میں منفرد بھی ہے اور اہم بھی۔ اول اورنگزیب کے میر منشی ابوالفتح قابل خاں اور دوسرے ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی۔

عطا نے طویل عمر پائی۔ انھوں نے شاہجہاں سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک مغل سلطنت کا عروج وزوال دیکھا۔ ان کے دیوان میں آخری تاریخ ۱۱۲۹/۱۷-۱۷۱۶ء سے متعلق ہے[1]۔ لیکن ایک قطعہ[2] مہابت خاں خانخان گورنر ٹھٹھ کے استقبال پر ہے جو ۱۱۳۲/۲۰-۱۷۱۹ء میں ٹھٹھ میں بحیثیت گورنر وارد ہوئے[3]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطا اس وقت تک حیات تھے۔ اور انھوں نے اسی سال سے زیادہ عمر پائی:-

شد بہ سر ہشتاد سال از سن عمر این فقیر　　ہیچ در خواب وخیال انسان نبوده ابتلائے[4]

ایک اور ناقص شعر ہے:-

پاس ہشتاد ونود . . . .　　عزت شیب وشبابم جملہ برہم ساختی[5]

---

1. دیوان عطا ٹھٹوی مرتبہ مطیع اللہ راشد کراچی، ص ۴۴۵
2. ایضاً ص ۴۱۸
3. مقالات الشعرا، ص ۶۵۷؛ مآثر الامرا ۳/ ۶۷۷
4. دیوان عطا، ص ۴۳۰۔
5. مقدمہ دیوان عطا، ص ۴۔

عطا کو ٹھٹھ کے کئی ایک گورنروں اور امیروں کی سرپرستی حاصل رہی جیسا کہ ان کے مختلف مدحیہ اور تاریخی قصائد سے معلوم ہوتا ہے. ان میں سب سے پہلا نام ظفر خاں احسن کا ہے جو ۱۰۶۳-۶۹ھ/۱۶۵۲-۵۹ء کے دوران ٹھٹھ کے گورنر رہے اور جنھوں نے عطا کا ادبی ذوق نکھارا[1]. دوسرے گورنروں میں احمد یار خاں برلاس[2]، لطف علی خان اور شاکر خاں[3] قابل ذکر ہیں جن کی شان میں کئی ایک مدحیہ قطعات دیوان میں موجود ہیں. ٹھٹھ کے ممتاز رؤسا میں جن سے ہمارے شاعر کے تعلقات تھے، ملا عثمان فاضل خاں (م. ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ء)، محمد اکرم، جمال خاں، نیکنام خاں اور متین الدین کے نام اہم ہیں. عطا کے شاعر دوستوں کا حلقہ بھی وسیع تھا. ان میں سے اکثر عطا کی حیات میں مرحوم ہو گئے. بعض اشعار میں عطا ان کی بے وقت موت اور اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں.

کو صفائی، قیصر و ملا اسلامی و شکر؟ در گذشت القصہ ہر یک اختری روشنگری[4]

جیسے جیسے عطا کی زندگی کا سورج ڈھلتا گیا ان کے احباب اور سرپرستوں کا سایہ ان کے سر سے اٹھتا گیا. ان کی زندگی کے آخری ایام ایک عجیب بیکسی اور تنہائی سے دوچار نظر آتے ہیں

بہار عمر و جوانی چو برق و باران رفت — زسیر باغ چہ حظ؟ موسم بہاران رفت

صفای شیب یکایک چو صبح خندان شد — شب شباب زغفلت چو سوگواران رفت

امید روز بہی در زمان پیری نیست — رخ مراد ز چشم امیدواران رفت

---

[1] مقالات الشعرا، ص. ۳۸۰.

[2] احمد یار خاں یکتا (م. ۱۱۴۷/۳۵-۱۷۳۴ء) ۱۱۱۶-۱۹/۱۷۰۴-۰۸ء کے دوران ٹھٹھ کا گورنر تھا. وہ خود اچھا شاعر تھا. اس کی مثنوی ہیر رانجھا چھپ چکی ہے (مرتبہ سید محمد باقر، لاہور، ۱۳۲۷ھ) مقالات الشعرا، ص ۸۷۹.

[3] شاکر خان ۱۱۲۳/۱۲-۱۷۱۱ء میں ٹھٹھ کا گورنر ہوا. اور لطف علی خاں ۱۱۲۷/۱۷۱۵ء میں (خداداد خاں، لب تاریخ سندھ، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خاں، کراچی ۱۹۵۹، ص ۱۰۶؛ مقالات الشعرا، ص ۸۷۳)

[4] دیوان عطا، ص ۴۹۶.

به زندگانی ناخوش چه خوشدلی؟ هیهات! | که زور بازوی امداد عهده داران رفت [1]

دیوان عطا غزلیات، مقطعات، ترجیع بند اور تاریخی قطعات پر مشتمل ہے

دیوان اگرچہ عطا یہ دعوی کرتے ہیں کہ :

سال ها فکر بلند از پی انشا کردم | ماه ها دفتر اشعار محشی کردم

قرن ها نظم نویسان شدم و نثر نگار | عمر ها جد و کد اندر خط و املا کردم [2]

لیکن ان کی نثر کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

عطا مذہبی انسان تھے انھیں تصوف سے لگاؤ تھا اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے عقیدت تھی [3]۔ ان کا وقت ریاضت میں اور ان کی راتیں عبادت میں بسر ہوتی تھیں۔ ان کے اشعار کابل، پشاور وغیرہ کے مذہبی اجتماع میں ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے [4]۔

عطا روایتی غزل گو تھے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں فکر کی گرمی اور جذبے کی شدت دونوں کی کمی احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں خیال وبیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ یک سرا پن بھی ہے جو کہیں کہیں کھٹکتا ہے۔ درحقیقت عطا علم شاعری کے استاد تھے، عربی اور عروض پر انھیں قدرت تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں غیر مانوس عربی الفاظ اور سنگلاخ زمین اور مشکل قافیوں کا استعمال ملتا ہے۔ جس سے غزل کی لطافت وروانی اور ترسیل وابلاغ کی نزاکت دونوں مجروح ہوتی ہے پھر بھی عطا کے یہاں جستہ جستہ دبی ہوئی چنگاریاں مل جاتی ہیں :-

ز تلخکامی او گرچه سال ها بگذشت | هنوز قصهٔ شیرین و کوهکن باقی است

صبر از دل و دل هم ز کفش برد نگاری | عیار وشی، عشوه گری، عربده کاری

گل پیرهنی، سرو قدی، غنچه دهانی | یاقوت لبی، ماه رخی، لاله عذاری [5]

---

[1] ایضاً ص ۳۷۔

[2] ایضاً ص ۴۰۷

[3] ایضاً ص ۱۸۸۔

[4] مقالات الشعراء ص ۴۴۲

[5] دیوان عطا ص ۴۳، ۲۷۰۔

عطا کی شاعری کا اصل کمال ان کے مقطعات یا مختصر نظموں میں ہے۔ اور خاص طور پر ان نظموں میں ہے جو حالات و واقعات پر شاعر کے خیالات کی آئینہ دار ہیں۔ ان اشعار سے نہ صرف اس دور کے معاشرہ کی واضح تصویر سامنے آتی ہے بلکہ ہندوستان کے ایک دور دراز شہر میں تہذیب و تمدن کی بدلتی ہوئی قدروں کا بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ یہ نظمیں ایک طرح کا شہر آشوب ہیں۔ جن میں شاعر دم توڑتی ہوئی قدروں کا ماتم کرتا ہے اور شرفا کی زبوں حالی، ادیبوں کی بے قدری اور رذیلوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا بڑا دلدوز مرقع کھینچتا ہے:

بشنو کہ بیان می کنم احوال وطن را	یعنی کہ بہ تتہ بود این کیف و کماہی
طرز جہلا و صنع خلا ہا و ملاہا	وقتی است کہ رائج شدہ کولی و کپاہی
در تتہ ندیدیم بہ جز پلوۂ ماہی	اشراف و اکابر شدہ جولاہ و کپاہی
انصاف توان داد کہ در شہر چہ حال است!	چون میمن و تخفیمن شدہ اقبال پناہی
زینسان کہ زبونی کشی از فرقۂ اوباش	شاید کہ کنی ترک وطن خواہ مخواہی[1]

یہ اور اس طرح کی دوسری نظموں میں سندھی الفاظ کا آزادانہ استعمال ہے ان نظموں سے سندھی معاشرہ کی واضح تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

اورنگزیب کے عہد سے سندھ میں کچھ علیحدہ پسند طاقتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور بعد میں انھوں نے اپنی آزاد ریاست قائم کر لی۔ شہر اور دیہات میں لوٹ مار کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ خالص اصفہانی کے قتل کی روداد کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جو ایک سرکش زمیندار کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ معاشرہ کی یہ اتھل پتھل ہر حساس انسان کو مضطرب کرنے کے لئے کافی تھی۔ عطا بھی ان واقعات سے افسردہ اور غمگین تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ ٹھٹھ چھوڑ کر کسی اور سکون کی جگہ پر جا بسیں لیکن وطن سے انھیں سچا لگاؤ تھا اور وہ حضرت یعقوب کی طرح بیت الحزن

---

[1] ایضاً ص ۳۳۰۔

میں تنہائی کے دن کاٹ رہے تھے :-

درتتہ چون غریب وطن بیکسم عطا　　دارم زبس اقامت بیت الحزن، حزن[۱]

دیوان عطا میں ۴۴ شعر کی ایک مختصر مثنوی ہے جس کا عنوان مہر و ماہ ہے۔ یہ مثنوی عطا نے ۱۱۲۸/۱۶-۱۵-۱۷ء میں اعظم خاں بن صالح خاں گورنر ٹھٹھ کی آمد پہ کہی تھی[۲] عطا کہتے ہیں کہ میں نے یہ مثنوی فارسی کی مشہور مثنویوں کے انداز میں کہی ہے :-

درین بحر است نسخہ از زلالی　　زنوعی نیز نسخہ نظم عالی

زعاقل خان بود پروانہ و شمع　　زبیدل بلبل و گل درچمن جمع

عطا را نسخہ ای از مہر و ماہ است　　کہ بر تصنیف این یاران گواہ است[۳]

عطا کے دیوان میں چھ اردو غزلیں بھی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عطا کے قلم سے ہوں۔ مگر ان کی روانی اور صفائی دیکھتے ہوئے بغیر کسی مزید شہادت کے انھیں عطا کی تصنیف ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

عطا خبطا کہاں خاموش رہتا　　سخن گر از زبان بر گوش رہتا

مری جان دیکھنا پھر دکھ نہ دینا　　کہ محتاج تو کے مفلوک رہتا[۴]

عطا نے طویل عمر پائی اور بے تکان شعر کہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے اشعار کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے :-

نسخہ ابیات دیوانم گذشت از سی ہزار　　لیک این در و گہر را نیست اکنون جوہری[۵]

---

[۱] ایضاً ص ۲۳۳۔

[۲] مقالات الشعراء ص ۲۸۔ مرتب دیوان نے یہ مثنوی شاکر خان کے لیے بتائی ہے جو تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔

[۳] دیوان عطا ص ۴۰۷

[۴] دیوان عطا، ص ۴۵۹، ۴۶۰۔

[۵] ایضاً ص ۲۹۷۔

قانع ٹھٹھوی کا بیان[1] ہے کہ عطا نے ایک لاکھ شعر کہے۔ مگر مطبوعہ دیوان میں تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔

میر عبد الجلیل بلگرامی

میر عبد الجلیل بلگرامی کا شمار درحقیقت اورنگزیب کے بعد کے شعرا میں ہوتا ہے کیونکہ ان کا اصل ادبی کارنامہ فرخ سیر کے عہد سے متعلق ہے۔ مگر یہاں ان کا ذکر دو وجہ سے کیا گیا ہے ایک تو یہ کہ انھوں نے اورنگزیب کے عہد میں بھی کم از کم دو مثنویاں تصنیف کی تھیں اور دوسرے یہ کہ ان کے اشعار سے خوش ہو کر اورنگزیب نے انھیں دوبار انعام دیا تھا۔

میر عبد الجلیل بلگرامی، میر احمد کے لڑکے تھے، جو اپنے عہد کے مستند خطاط تھے[2]۔ اور لغت پر ان کی ایک کتاب زاد الصراط ہے[3]۔ ان کا تعلق سادات واسطی سے تھا جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ لوگ ۶۱۴/ ۱۸-۱۲۱۷ کے قریب بلگرام میں آکر آباد ہوئے تھے[4]۔ میر کی ولادت بلگرام میں ۱۳/ شوال ۱۰۷۱/ یکم جون ۱۶۶۱ کو ہوئی[5]۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد وہ یوپی کے مختلف شہروں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں وہ آگرہ بھی گئے جہاں وہ اورنگزیب کے میر منشی فضائل خاں[6] کے مہمان رہے۔ وہاں سے وہ لکھنؤ پہونچے اور شیخ غلام نقشبند کے حلقۂ درس

---

[1] مقالات الشعرا ص ۴۴۲

[2] آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، آگرہ، ۱۹۱۰ء، ص ۲۵۷؛

[3] بانکی پور ۷/ ۱۳۸

[4] تبصرۃ الناظرین محمد بن عبد الجلیل بلگرامی (بحوالہ ریو ۳/ ۹۶۳)

[5] سرو آزاد ص ۲۵۶۔

[6] فضائل خاں کو اواخر ۱۰۹۴/ ۱۶۸۳ میں آگرہ ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ (مآثر عالمگیری ص ۲۳۷)

میں شامل ہوئے۔ یہاں میر صاحب نے پانچ سال قیام کیا۔[۱] پھر وہ پٹنہ کے دیوان شاہ حسین خاں کی معیت میں پٹنہ گئے اور کچھ دن وہاں رہ کر بلگرام واپس آ گئے۔

۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ء میں میر عبدالجلیل دکن کے لئے روانہ ہوئے۔ اسی سفر کے دوران اورنگ آباد میں ان کی ملاقات ناصر علی سرہندی سے ہوئی، جس کا ذکر اوپر آیا لیکن دکن کا قیام انھیں راس نہیں آیا اور وطن واپس آ گئے۔ ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹ء میں وہ پھر جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اسلام پوری پہونچے جہاں اورنگزیب کی فوج کا مرکزی کیمپ تھا۔[۲] یہاں ان کا تعارف مرزا یار علی بیگ داروغہ ڈاک کچہری سے ہوا اور اس کے توسط سے انھوں نے فتح ستارا سے متعلق چند تاریخیں اورنگزیب کی خدمت میں پیش کیں۔ یہ تاریخیں چار زبان فارسی، عربی ترکی اور ہندی میں تھیں۔ اورنگزیب ان سے بہت محظوظ ہوا اور اس نے میر کو انعام عطا کیا۔[۳] اس سے قبل میر اس مدحیہ رباعی پر بھی اورنگزیب سے انعام حاصل کر چکے تھے:-

کسری کہ بہ عدل بود عالم پرور | بی جرم آویخت پای زنجیر بہ در
ذاتت زکمال عدل تجویز نکرد | آویختن سلسلہ ہم در کشور[۴]

اورنگزیب نے میر کو بلگرام کے پاس سائی پور میں جاگیر عطا کی اور کچھ عرصہ کے بعد انھیں گجرات شاہ دولہ کا بخشی اور وقائع نگار مقرر کیا۔ میر کو یہ خدمت ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰ء میں سپرد ہوئی جیسا کہ اس تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے:-

---

۱؎ مآثر الکرام ص ۲۵۸ و مابعد۔

۲؎ سرو آزاد ص ۲۵۴۔

۳؎ خزانۂ عامرہ، ص ۵۵۳۔ حیات جلیل (مقبول صمدنی، الہ آباد، ۱۹۲۹، ص ۱۶۲) کا بیان ہے کہ میر کا تعارف مرزا یار علی بیگ سے اس طرح ہوا کہ میر نے قاموس کے چند اشکالات ان کے سامنے واضح کئے تھے۔

۴؎ خزانۂ عامرہ، (حوالہ بالا)

مرا از جناب خلافت عطا شد   ز روی کرم خدمت عیش فردا

خرد گفت تاریخ تفویض خدمت   "وقائع نگاری گجرات زیبا"[1]

میر نے ۱۱۱۶/ ۰۵-۱۷۰۴ تک یہ خدمت انجام دی. اس کے بعد کچھ عرصہ وہ بیکار رہے.[11][12] ۲۴ رجب ۱۱۱۷/ ۳۱ اکتوبر ۱۷۰۵ کو وہ پھر وقائع نگار کی حیثیت سے بھکر پہونچے.[2] اورنگزیب کی وفات کے بعد جو سیاسی خلفشار پیدا ہوا، میر اس سے بڑی حد تک محفوظ رہے اور ان کے عہدہ پر کوئی اثر نہیں ہوا. لیکن فرخ سیر کے عہد میں انھوں نے ایک نادانستہ غلطی ایسی کی کہ وہ اپنا عہدہ کھو بیٹھے. ہوا یہ کہ سندھ میں ایک بار ایسی بارش ہوئی جس میں شکر کے سے میٹھے ریزے تھے. میر نے اس واقعہ کی اطلاع دربار میں اس رباعی کے ذریعہ دی :-

فرخ سیر آن شہنشہ با برکات   چرخ از ادب او شدہ شیرین حرکات

در سند زیمن عہد عشرت مہدش   بارید سحاب ریزۂ قند و نبات

میر جملہ نے اسے شاعرانہ اختراع پر محمول کیا اور میر کو ان کے عہدہ سے معزول کر دیا.[3] یہ واقعہ ۱۱۲۶/ ۱۷۱۴ کا ہے. میر پریشان ہو کر دہلی آئے. سید برادران کے توسط سے انھیں بحالی ملازمت کا پروانہ ملا اور میر محمد رضا (م - ۱۱۴۳/ ۳۱-۱۷۳۰) ان کے نائب مقرر کیے گئے.[4]

۱۱۳۰/ ۱۸-۱۷۱۷ میں میر عبد الجلیل اپنے لڑکے میر محمد[5] کے حق میں نوکری سے دستبردار ہو گئے. دو سال کے بعد وہ بلگرام واپس آئے. وہ سولہ سال وطن سے دور رہے تھے. مگر یہاں چند روز قیام کے بعد وہ پھر دہلی روانہ ہو گئے تھے اور یہیں ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۳۸/ ۱۸ دسمبر ۱۷۲۵ کو انھوں نے وفات

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۶۱   [2] ایضاً ص ۲۶۲

[3] سرو آزاد ص ۲۵۵   [4] مآثر الکرام ص ۲۶۳

[5] میر محمد بھی شعر و سخن کے شیدائی تھے اور شاعر تخلص کرتے تھے. ان کی تصانیف میں تبصرۃ الناظرین اور مثنوی ناز و نیاز کا ذکر ملتا ہے (سرو آزاد ص ۲۸۹؛ سفینۂ خوشگو ص ۲۹۹)

پائی۔ ان کی وصیت کے مطابق نعش بلگرام لے جائی گئی جہاں انھیں ان کے والد کے مزار کے پہلو میں جمعہ ۶ رجمادی الاول / ۳۰ دسمبر کو دفن کیا گیا[1]

میر عبدالجلیل فارسی، عربی اور دینیات کے زبردست عالم تھے۔ انھیں ترکی اور ہندی سے بخوبی واقفیت تھی اور ان دونوں زبانوں میں بھی شعر کہتے تھے۔ عروض اور فن شعر پر انھیں غیر معمولی دستگاہ تھی۔ جس کی مثالیں آزاد بلگرامی نے دی ہیں۔ لغت، تاریخ اور موسیقی میں انھیں مہارت تھی حدیث اور تفسیر پر ان کی گہری نظر تھی، وہ حافظ قرآن تھے۔ تصوف میں وہ سید یٰسین حموی کے مرید تھے[2] میر کے اساتذہ بھی ان کے علمی تبحر کے قائل تھے۔ ان کے ایک استاد شیخ غلام نقشبند نے ان الفاظ میں ان کی تعریف کی، میر نے انھیں اپنا بنایا ہوا دائرہ عروض بھیجا تھا۔

"میر والا مدارج انسانی، مجمع فیوضات ربانی! سلامت۔

رسالۂ اعجاز طراز دائرہ رسید، زبان از مدحت آن قاصر است، حقا کہ ذات سامی آیات درین زمانہ بی عدیل است[3]!

سید علی معصوم مدنی کہا کرتے تھے "من در تمام عمر خود جامع غرائب علوم مثل میر عبدالجلیل ندیدم[4]"

میر کی سیادت اور علمی فضیلت کی بدولت امرائے عصر بھی ان کا احترام کرتے تھے اور ان سے عزت سے پیش آتے تھے۔ سید برادران سے ان کے خصوصی روابط تھے۔ جب امیر الامرا سید حسین علی نے نیکو سیر کی بغاوت فرو کی تو میر نے ایک تہنیتی نظم لکھی اور اس پر پانچ ہزار روپیہ انعام پایا[5]۔ امیر الامرا کی وفات (۱۱۳۲/۲۰-۱۷۱۹) پر بھی میر نے ایک دردناک مرثیہ کہا جس کا آغاز اس

---

[1] مآثر الکرام ۶۶، ۲۶۳۔

[2] ایضاً ص ۲۵۸

[3] ایضاً ص ۲۵۹۔

[4] سرو آزاد ص ۲۵۴۔

[5] سرو آزاد ص ۲۶۶۔

شعر سے ہوتا ہے :-

آثار کربلا است عیان از جبین ہند　　زد جوش خون آل نبی از زمین ہند[۱]

نواب امین الدولہ انصاری اور صمصام الدولہ (م۔ ۱۷۳۸-۳۹/۱۱۵۱) سے بھی ان کے خصوصی مراسم تھے۔ اول الذکر کے لڑکے کی شادی پر انھوں نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا ذکر آگے آئے گا نظام الملک آصف جاہ بھی میر پر عنایتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک قصیدہ پر انھوں نے پانچ ہزار روپیہ انعام دینا چاہا مگر میر نے حسب دستور قبول نہیں کیا۔[۲]

جیسا کہ اوپر کہا گیا میر عبد الجلیل بنیادی طور پر ایک عالم تھے۔ اور علم و فضل کے مختلف شعبوں میں ان کی دلچسپی تھی۔ ان کے پاس ایک عمدہ لائبریری تھی جس سے وہ استفادہ کیا کرتے تھے۔ انھیں درس و تدریس سے خاص شغف تھا۔ آزاد بلگرامی ان کے شاگرد تھے۔[۳] فرصت کے اوقات میں وہ خطاطی اور شاعری کرتے تھے۔[۴] انھوں نے شروع میں واسطی تخلص اختیار کیا۔ بعد میں وہ طرازی کے نام سے لکھتے تھے۔ لیکن اپنا نام بھی تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مزاحیہ شاعری میں وہ اٹل تخلص کرتے تھے۔[۵]

میر کے علم و فضل نے ان کی تنقیدی صلاحیت کو اور ان کے تنقیدی ملکہ نے ان کی شاعری کو جلا دی۔ ناصر علی جیسے استاد نے ان کے مشورے پر اپنی مثنوی میں اصلاح قبول کی۔ ایک اور شاعر فارغ قمی اس شعر میں میر کو عقیدت پیش کرتے ہیں۔

چو تو بی کجا است شاہی بہ قلمرو معانی ؟　　بہ تو ہیچ کس نماند تو بہ ہیچ کس نمانی[۶]

میر عبد الجلیل کثیر التصانیف تھے۔ ان کی کئی ایک تصنیف دستبرد زمانہ سے ضائع ہوگئی

---

[۱] ایضاً　　[۲] ید بیضا (علی گڈھ) ص ۱۹۰

[۳] مآثر الکرام ص ۲۶۴۔　　[۴] حیات جلیل ص ۱۶۷ -

[۵] سرو آزاد ص ۲۵۹۔　　[۶] سرو آزاد ص ۲۶۰ -

تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے :-

نظم :-

۱۔ مثنوی امواج الخیال۔

۲۔ میر کے نوکر کی وفات پر ایک مثنوی

۳۔ مثنوی در عروسی فرخ سیر۔

۴۔ مثنوی در عروسی ارشاد خان۔

۵۔ پدماوت[1]۔

۶۔ جواہر الکلام۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کا منظوم لغت[2]

نثر :-

۱۔ انشای جلیل مشتمل بر سفرنامۂ دکن

۲۔ متفرقات مشتمل بر رقعات، مرتبہ میر محمد بلگرامی[3]

سید اصغر علی بلگرامی[4] نے ان تصانیف کو بھی میر کی طرف منسوب کیا ہے

۱۔ رسالہ تعریب

۲۔ رسالہ موسیقی

۳۔ انشای عقد الثمین۔ ممکن ہے یہ انشای جلیل یا رقعات ہو۔

۴۔ رسالہ ریاض النعیم فی احوال النبی الکریم۔

۵۔ خلاصۃ السیر۔

۶۔ بیاض۔ اس بیاض کے بارے میں میر کہتے ہیں :-

---

[1] ریو ۳/۱۰۳۶- [2] بانکی پور ۸/۱۴۳

[3] مآثر الکرام ص ۲۶۷-

[4] سید اصغر علی بلگرامی: فارسی بلگرام۔ حیدرآباد، ۱۳۴۷ہجری، ص ۲۲-۱۱۔ آخری تین تصانیف اصغر علی کے پاس موجود تھیں۔

سفینہ ہا ہمہ در بحر دیدہ اند ولی   سفینہ ای کہ در و بحر ما بود، این است

میر عبدالجلیل نے میر ضیاء اللہ بلگرامی کے خطوط بھی مرتب کئے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

میر عبدالجلیل غزل اور قصیدہ کے شاعر نہیں تھے، انھوں نے کوئی دیوان غزل نہیں مرتب کیا۔ البتہ تذکروں میں غزل کے جو متفرق اشعار ملتے ہیں ان پر کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ میر صاحب کو مثنوی سے خاص لگاؤ تھا اور ان کی چار مثنویاں ہم تک پہونچی ہیں۔ ان کی پدماوت کا پتہ نہیں چلتا جو مخلوط بھاکا اور فارسی میں تھی۔ انھوں نے جوانی میں اٹل تخلص سے مزاحیہ شاعری کی۔ انھیں ہندی شاعری میں بھی درک تھا۔ ہندی کے شعرا سے ان کے تعلقات تھے۔ انھوں نے بلگرام کے ایک شاعر دواکر مصرا کی سفارش امیرالامرا حسین علی خاں سے کی تھی۔ جب میر کا انتقال ہوا تو دواکر نے یہ شعر کہا:-

ہوا نہ ہے او ہوئے گا ایسو کنیں سوسیل   جیسو احمد نند جگ ہوی گیو میر جلیل[1]

میر عبدالجلیل نے اپنی جامعیت اور فضیلت کی بدولت خسرو عصر ہونے کا دعوی کیا تھا فرماتے ہیں:-

گرچہ میر خسرو بود استاد   ندارد چرخ چون او دیگری یاد

دلی من ہم ازین گلدستۂ نو   درین عصرم بجای میر خسرو[2]

ان میں اور امیر خسرو میں اتفاق سے کئی باتیں مشترک تھیں۔ خسرو کی طرح انھوں نے بھی اورنگزیب سے محمد شاہ تک سات مغل بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا۔ خسرو کی طرح وہ بھی محض شاعر نہیں تھے، بلکہ ایک دانشور، انشا پرداز اور ماہر موسیقی تھے۔ اور خسرو ہی کی طرح وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو اور میر عبدالجلیل میں بہت فاصلہ ہے۔ خسرو پہلے شاعر تھے اور بعد میں کچھ اور۔ لیکن میر عبدالجلیل کا مرتبہ ان کے علم و فضل سے ہے۔

---

[1] سرو آزاد ص ۳۷۰   [2] ایضاً ص ۲۶۳

شاعری ان کے علم وفضل کا زیادہ سے زیادہ تکملہ ہے۔ یہ علم وفضل ان کی شاعری کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ انھوں نے بعض بعض جگہ ایسے غیر مانوس عربی الفاظ یا اصطلاحیں استعمال کی ہیں کہ شعر کی نزاکت بری طرح مجروح ہوگئی ہے

امواج الخیال میر عبدالجلیل کی پہلی مثنوی امواج الخیال ہے جو بلگرام کی تعریف پر مشتمل ہے یہ مثنوی مختصر اور سادہ ہے اس سے میر کے جذبۂ حب الوطن پر روشنی پڑتی ہے اور مغل دور میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے قصبے صنعت و حرفت یا علم وفضل کے لئے مشہور تھے۔ بلگرام انھیں میں سے ایک قصبہ تھا جس نے بڑے بڑے عالم فاضل پیدا کئے۔ میر کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ خاک بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں :-

آب و گل من کہ فیض عام است	از خطۂ پاک بلگرام است
سبحان اللہ چہ بلگرامی !	کوثر می و آفتاب جامی
خاکش گل نوبہار عشق است	آبش می بی خمار عشق است
ہر گل کہ دمیدہ است زین خاک	خونی جگر است، پیرہن چاک[1]

مثنوی میر کی دوسری مثنوی ان کے پہلے سفر دکن سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا میر عبدالجلیل ۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ میں دکن کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ ان کا ایک پرانا وفادار ملازم تھا۔ اتفاق سے ملازم کا اچانک انتقال ہوا۔ انھیں کوئی سرکاری ملازمت بھی نہیں ملی چنانچہ میر ناکام و نامراد وطن واپس لوٹے۔ اور غالباً اسی عالم میں انھوں نے یہ مثنوی لکھی۔ مثنوی کی ابتدا اس حزنیہ انداز سے ہوتی ہے :-

بیا ای خامۂ ماتم روایت	پریشان ساز گیسوی حکایت
کہ در سال ہزار و یک صد و چار	کہ ساعت داهشت بر رخ گرد ادبار

---

[1] مثنوی امواج الخیال، علی گڈھ، ذخیرہ سبحان اللہ، ص ۲ -

سفر کردم ز ہندوستان درین وقت   سفر کی نیک باشد در چنین وقت[1]

میر کو دکن راس نہیں آیا۔ وہاں کی آب وہوا اور سیاسی حالت دونوں نے ان میں غم و غصہ پیدا کیا۔ انھوں نے نعمت خان عالی کی طرح دکن کے خلاف تیز اور چبھتے ہوئے شعر کہے ہیں

دکن آن نسخۂ دود جہنم   سواد انتخاب یک جہان غم

نباشد حاصل آن تیرہ کشور   بہ جز سنگ سیاہ و باد صرصر

عادل شاہی دار الخلافہ بیجاپور کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

سفر کردم بہ بیجاپور بی نور   کہ بیجا باد از نفخ دم صور[2]

اس وقت کلکلہ میں اورنگزیب کی فوجیں مقیم تھیں۔ کلکلہ کا حال اور بھی خراب تھا:۔

سلامت در دکان کلکلہ نیست   متاع کلکلہ جز زلزلہ نیست[3]

کلکلہ ہی میں میر کے ملازم کی موت واقع ہوئی

اجل آمد بہ بالینش جلو ریز   بہ شوخی حرف زد "برخیز برخیز"

وجود او عدم را مستقر گشت   و بیقیٰ وجہ ربک جلوہ گر گشت[4]

پوری مثنوی میں سوز و گداز اور غم و غصہ کی لہر جاری و ساری ہے۔ زندگی کی ناپائداری اور انسان کی بے بسی کا خیال پوری نظم پر غالب ہے۔ کہتے ہیں کہ میر نے جب یہ مثنوی ناصر علی کو سنائی تو وہ بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کے ایک نسخہ کی فرمائش کی[5]۔ زندگی کی ناپائداری کے

---

[1] مثنوی میر عبد الجلیل، علی گڑھ لٹن فارسی ۱۱۹۰، ورق ۱۔

[2] ایضاً ورق ۲

[3] ایضاً ورق ۳۔

[4] ایضاً ورق ۵

[5] سرو آزاد ص ۲۶۱۔

متعلق یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے :۔

جہان ای دل عجب فانی سرایی است | کہ ہرکس را درو خواب فنایی است
درین دریا مکن از خود فراموشش | کہ امواج اند یک دیگر ہم آغوشش
یکی رفت و دگر از پی روان است | ہمین رسم است تا ہر دو جہان است[1]

مثنوی در عروسی فرخ سیر میر کا اصل شاہکار ان کی تیسری مثنوی[2] ہے جو انھوں نے فرخ سیر کی شادی پر نظم کی تھی۔ یہ شادی ۱۱۲۷/۱۵-۱۷۱۴ میں راجہ اجیت سنگھ راٹھور کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ یہ مثنوی میر کے علم و فن کی بہترین نمایندہ ہے اور میر کو بجا طور پر یہ امید تھی کہ اس کے ذریعہ وہ شاہی عنایت سے سرفراز ہوں گے۔ مگر قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا فرخ سیر کے جیتے جی یہ مثنوی اس کے حضور تک نہیں پہونچ سکی، اور میر کو اس کا ہمیشہ ملال رہا۔

کہ گر این مثنوی در محفل شاہ | بیاید چون نسیم اندر چمن راہ
ولی بر عکس اخلاق جمیلہ | نشد از بار یابان کس وسیلہ
درین امر آن قدر تاخیر گردید | کہ شاہنشہ سوی جنت خرامید[3]

میر اس ناکامی پر اتنے بد دل ہوئے کہ انھوں نے طے کیا وہ پوری مثنوی ضائع کر دیں گے پھر انھیں یہ خیال آیا کہ مرحوم بادشاہ کا نام زندہ رکھنے کے لیے یہ مثنوی بہترین ذریعہ ہے۔

بہ دل دادم قرار عہد پرور | کہ این اوراق را شویم سراسر
بہ خاطر چون مصمم گشت این عزم | خرد با دل چنین گفت از رہ حزم
ز جمع نوکران شاہ اقدس | بجا ناوردہ از من خدمتی کس

---

[1] مثنوی میر عبد الجلیل، ورق ۵۔

[2] سید اصغر علی بلگرامی (فارسی بلگرام ص ۱۴) نے اس کا عنوان جواہر الفردوس لکھا ہے۔

[3] مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی، نولکشور، ۱۸۸۲، ص ۶۸۔

من او را خدمتی فرخندہ کردم — کہ نامش تا قیامت زندہ کردم[1]

مثنوی کا آغاز بہاریہ انداز سے ہوتا ہے، تمہید کے بعد شاعر فرخ سیر کی مدح میں یہ پرجوش اشعار کہتا ہے :-

شہنشاہ سریر سرفرازی — خدیو عصر فرخ شاہ غازی

معین الدین محمد شاہ جم جاہ — شہ گیتی ستان فرخ سیر شاہ

تفوق یافت بر شاہان عالم — چو در اسمای حسنیٰ اسم اعظم[2]

جیسا کہ معلوم ہے اس شادی کی وجہ اجیت سنگھ راٹھور کی بغاوت اور شکست تھی۔ فرخ سیر نے امیر الامرا سید حسین علی خان کی کمان میں اجیت سنگھ کو زیر کرنے کے لئے فوج روانہ کی۔ اجیت سنگھ نے شکست کھانے کے بعد شہنشاہ وقت سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کی تجویز رکھی :-

بہ ارسال جگر پر کالۂ خویش — توسل جست با شاہ ظفر کیش[3]

یہ مثنوی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے مغلوں کی شادی بیاہ کے مختلف رسوم پر بڑی تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ شادی کے جوڑے، کھانے، آتش بازی، موسیقی، رقص، روشنی تحفے تحائف غرضکہ ہر پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مثنوی درحقیقت ایک سماجی دستاویز ہے جس سے مورخین اور عمرانیات کے ماہر بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں دولھے کے لباس کی ایک جھلک ملتی ہے :-

نگارین جامہ ای چون گل بہ بر کرد — کہ دولت تارش از نور نظر کرد

نزاکت در قماشش آنچنان بود — کہ بار بوی گل بروی گران بود

---

[1] ایضاً — [2] ایضاً ص ۲

[3] ایضاً ص ۱۳۔

جواہر پوش شد شاہ فلک قدر	زانجم می شود پیرایۂ بدر[1]

بادشاہ کی برات کا منظر بہت دلچسپ ہے۔ برات کے جلوس میں تمام وزرا اور اعلیٰ منصب دار شامل تھے۔ لیکن نواب قطب الملک اس میں شریک نہیں تھے کیونکہ دلھن کے والد کی جگہ وہ میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ برات کے جلوس میں ہاتھی، گھوڑے، موسیقار اور رقاص ساتھ ساتھ تھے اور آتشبازی کا یہ عالم تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ یہاں میر عبدالجلیل نے آتشبازی کی مختلف قسمیں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کی ہیں:۔

ہوائی بیر عزم آسمان کرد	بہ ہر جانب جریب زر روان کرد
انار از دانہ بالبہای خندان	چو مشت شاہ شد یاقوت افشان[2]

موسیقی کے بیان میں میر نے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف مختلف سازوں کے زیر و بم کو انتہائی شاعرانہ نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ ساتھ ہی ہندی کے تمام راگ راگنیوں کے نام بھی گنا دیئے ہیں۔ یہ نام ایسے غیر شعوری طور پر بیچ میں آگئے ہیں کہ قاری کو پتہ ہی نہیں چلتا:۔

زدستان کرد دل را گرم پرواز	بہ تالان متاع صبر دمساز
نوا می کرد کار سرمۂ می	شدی ہر رہ گرامست از دم نی[3]

موسیقی کی مستی کو رقص کی کیفیت دو آتشہ کر رہی تھی:۔

بہ ہر عضوی طرب مستانہ رقصد	چو جوش می کہ در خمخانہ رقصد[4]

دلھن کی رخصتی ہوتی۔ بادشاہ سلامت ملکہ عصر کے ساتھ لوٹ رہے ہیں۔ زمین و آسمان تہنیت کے پھول برسا رہے ہیں:۔

شہنشہ شد روان با شوکت و شان	گہر بارندہ ہمچو ابر نیسان

---

[1] ایضاً ص ۱۷۔ [2] ایضاً ص ۴۳۔

[3] ایضاً ص ۳۸۔ [4] ایضاً ص ۵۶۔

عقیب تخت شہ چون دول رانی | نگارین محمل بلقیس ثانی
به جسم کوچہ ہا در سیر و در گشت | شہنشہ ہمچو عمر رفتہ برگشت [۱]

مثنوی کے اختتام میں شاعر نے اپنا نام اور تاریخ نظم کیا ہے :-

بیا عبد الجلیل بلگرامی | سخن را بر دعا ہا ہست تمامی
بود تاریخ طوی شادمانی | "نشاط اندوز وصل شاہ ورانی" [۲]
۱۱۲۷ ہجری

مثنوی

میر کی چوتھی مثنوی موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے سابق مثنوی کی ہو بہو نقل ہے۔ یہ مثنوی نواب امین الدولہ انصاری کے لڑکے ارشاد خاں کی شادی پر لکھی گئی جو ۱۱۲۷/ ۲۵-۱۷۲۴ میں ہوئی تھی۔ میر فرماتے ہیں :-

کہ فصل شادی ارشاد خان است | کہ عالی قدر والا دودمان است
ازین واضح ترا ر تاریخ پرسی | ہزار و یک صد و ہفت است برسی [۳]

چونکہ نواب امین الدولہ میر عبد الجلیل کے گہرے دوست تھے اس لئے میر نے اپنی محبت کا مظاہرہ اس مثنوی کے ذریعہ کیا۔

چو نواب امین الدولہ با من | ہمی جوشید ہمچو روح با تن
بہ نظم آوردم این اسعار رائق | کہ ماند یادگار اندر خلائق
منم عبد الجلیل بلگرامی | تمام اندر مقام ناتمامی [۴]

امین الدولہ سنبھل (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے تھے۔ شادی وہیں سنبھل میں ہوئی تھی۔ تیس سال کے بعد نواب اپنے وطن واپس آئے تھے۔ ان کے استقبال میں شہر کو بڑے سلیقہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔

---

[۱] ایضاً ص ۶۲ [۲] ایضاً ص ۶۷

[۳] مثنوی عبد الجلیل در عروسی ارشاد خاں، علی گڑھ، لٹن نمبر ۱۲۳، ورق ۱۔ [۴] ایضاً ورق ۱۹۔

به دولت داخل سنبھل چنان شد | که سنبھل ہمچو جسم، او ہمچو جان شد
که آمد در وطن از بعد سی سال | به انواع مراد دل به اقبال[1]

جیساکہ اوپر کہا گیا فرخ سیر والی مثنوی اور موجودہ مثنوی دونوں موضوع، ترتیب، انداز اور افکار میں بالکل مماثل ہیں۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ میر نے پہلی مثنوی سامنے رکھ کر اس میں معمولی ردوبدل کے ساتھ اس کی ایک نقل تیار کر دی ہے۔ اس مثنوی میں بھی عربی اور ہندی الفاظ کا استعمال آزادانہ ہے۔ بلکہ بعض بعض شعر تو بجنسہ نقل کر دیئے گئے ہیں۔ دونوں مثنویوں کے ادبی درجہ میں وہی تفاوت ہے جو شہنشاہ وقت فرخ سیر اور نواب زادہ ارشاد خان کی شادی میں ہو سکتا ہے۔ اول الذکر ادبیت، صناعی اور سماجی اہمیت کی بنا پر ہندوستان کی فارسی مثنویوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے جب کہ مؤخر الذکر اگر کسی اور کے قلم سے ہوتی تو سرقہ کی بہترین مثال مانی جاتی۔ اس کے باوجود مثنوی میں بعض چھپے ہوئے اچھے شعر مل جاتے ہیں مثلاً دلھن کا بیان ان الفاظ میں ہے :-

چو صبح پاکدامن پاک تخمیر | حیا چون سرمه در چشمش وطن گیر
خموشی گوہر درج دہن بود | چو غنچه مجتمع ہر عضو تن بود[2]

---

[1] ایضاً ورق ۸

[2] ایضاً ورق ۱۸ -

باب ۵

اس عہد کے دیگر شعرا

اوپر جن شاعروں کا ذکر ہوا وہ اپنے فن پاروں کی بدولت اس دور کے بڑے شعرا کی صف میں ہیں۔ انھوں نے شاعری کے جو نمونے چھوڑے ہیں، ان سے ان کی عظمت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ البتہ عظمت کے مدارج مختلف ہیں۔ بیدل اور ناصر علی سے لے کر خالص اصفہانی اور عطا ٹھٹھوی تک عظمت اور ابدیت کے درجے الگ الگ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب اہم شعرا ہیں۔

ان کے علاوہ اس دور کے شاعروں کی ایک اور بڑی تعداد ہے جنھوں نے اپنی اکا دکا تخلیق کے ذریعہ شمع ادب روشن کرنے کی کوشش کی۔ اس صف میں مثنوی نگار بھی ہیں اور غزل گو بھی۔ ان شعرا کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں اور خصوصاً تاریخ عصر کی تشکیل میں انھوں نے جو خدمت انجام دی ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے۔ پھر بھی ان کا ذکر ایک علٰحدہ باب میں اس لئے کیا گیا ہے کہ اس صف کے شعرا نسبتاً اتنے مشہور یا اہم نہیں ہیں۔ آسانی کی خاطر ان شعرا کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول مثنوی نگار، دویم غزل گو۔

(الف) مثنوی نگار

حقیری

اس عہد کا ایک اہم مثنوی نگار حقیری ہے جو دو مثنویوں اورنگ نامہ اور نصرۃ المرتضیٰ کا مصنف ہے۔ حقیری کے بارے میں بہت حقیر معلومات فراہم ہیں۔ وہ کاشان کا باشندہ تھا اور میر جملہ کی فوج میں بنگال میں مامور تھا۔ وہ شیخ روزبہان کا ماننے والا تھا۔ اورنگ نامہ میں کہتا ہے:

چنین یاد دارم ازان پاک دین — ببودم در آن دم بہ تاناڑہ زمین
بدم جاکر آن فریدون کلاہ — کہ خلقش بخوانند اورنگ شاہ
تعینات میر جملۂ پاک دین — ببودم دران جنگ و پیکار و کین
نژادم بدانی تو روزبہان — ہمہ سرفرازند نزد شہان
وطن کاہشان گوہر زاد و بوم — بود درمیان صفاہان و روم[1]

اورنگ نامہ اورنگ نامہ عہد اورنگزیب کے ابتدائی چند سالوں کی منظوم تاریخ ہے۔ یہ مثنوی ڈیڑھ سال کے عرصہ میں محرم ۱۰۷۲/اگست ۱۶۶۱ء میں تکمیل کو پہونچی۔

ز لطف خداوند عرش مجید — ہمہ داستانہا بہ آخر رسید
کشیدم بسی رنج ہا سال و ماہ — نہادم برین نام اورنگ شاہ
بہ یک سال و شش ماہ بہ لطف وہاب — فراہم بکردم جمیع کتاب
ز دنیا گذشتہ رسول کبار — دو بودی و ہفتاد و دیگر ہزار
محرم بدی آن زمان درمیان — کہ آخر بشد نسخۂ ہر زبان[2]

---

[1] حقیری: اورنگ نامہ، آصفیہ، نمبر تاریخ ۶۰۳، ورق ۲۴۸۔ [2] ایضاً ورق ۲۷۸۔

اورنگ نامہ میں واقعات کا آغاز شاہجہان کی بیماری اور اورنگزیب کی یلغار سے ہوتا ہے اور سلیمان شکوہ اور سلطان محمد کی گرفتاری پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اس میں اورنگ زیب اور دارا کی لڑائی، اورنگزیب اور شجاع کی جنگ اور مشرقی ہندوستان میں ہونے والے دوسرے واقعات کا تفصیلی بیان ہے۔ چونکہ حقیری ان میں سے بہت سی لڑائیوں میں خود موجود تھا، اس لیے اس کے یہاں کاظم اور معصوم سے زیادہ جزوی تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً جب اورنگزیب نے مراد کو قید کیا تو مراد نے بھائی کو یہ رباعی لکھی :-

ای عاشق زندہ بود و نا بودت کو؟	آتش بہ وجود خود زدی، دودت کو؟
دل دادی و دین دادی و ایمان دادی	اینہا ہمہ سودا است، مگر سودت کو؟

اورنگزیب نے اس رباعی کے ذریعہ جواب دیا :-

نابود شدم، بود نمی دانم چیست؟	اخگر شدہ ام، دود نمی دانم چیست؟
دل دادم و دین دادم و ایمان دادم	سودا زدہ ام، سود نمی دانم چیست؟[1]

اورنگ نامہ میں سوز و گداز کی عجیب کیفیت ہے۔ حقیری کو ایسے واقعات بیان کرنے تھے جو بڑی حد تک روح فرسا تھے۔ شاہجہاں کی حیات میں تینوں بیٹوں کی بغاوت، بیٹوں کی آپس کی جنگ، مراد اور دارا کا قتل، شجاع کا فرار، سلیمان شکوہ اور سلطان محمد کی گرفتاری، یہ سب بڑے ولدوز واقعات تھے ان پر قلم اٹھانا آسان نہیں تھا۔ یہاں شاعر نے خون جگر میں انگلیاں ڈبو کر ان واقعات کی تصویر پیش کی ہے۔ شاہجہان کو جب بیٹوں کی یلغار کا علم ہوا تو اس پر عجیب عالم گذر گیا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا :-

چو بشنید شاہ جہان این خبر	برآورد یک دورباش از جگر
بگفتا کہ من اندرین روزگار	ندیدم اخی با اخی کینہ دار
ہنوزم نشستہ بہ تخت کیان	شدند کینہ ور جملہ شہزادگان

---

[1] ایضاً ورق ۵۹۔

چو من برگذشتم ازین خاکدان	چه خواهند کردن بهم سرکشان[۱]

پھر شاہجہان نے افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف کیا کہ میں نے شہزادوں کو ضرورت سے زیادہ چھوٹ دے رکھی تھی:۔

بگفتا کہ جملہ گناہ من است	کہ کردم چنین کودکان زور دست
ہزار آفرین بر شہان عجم	نسازند شہزادگان محترم
بہ ہوش و بہ تدبیر و رای بلند	بہ خوردی بدارند طفلان بہ بند[۲]

دارا اور اورنگزیب کی جنگ میں شاہجہاں اگرچہ بظاہر دارا کا حامی تھا، لیکن دل سے وہ اس لڑائی کا مخالف تھا۔ مگر دارا نے اسے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ تخت طاؤس کا مالک ولی عہد کے سامنے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔ جب دارا شکست کھا کر بھاگا اور شاہجہاں کو علم ہوا تو اس نے کہا:۔

بگفتند شاہ جہان این چنین	کہ شد فتح اورنگزیب گزین
بگفتا کہ دارای ناہوشمند	نکردی نصیحت ز من او پسند
چنان است در دل گواہی من	کہ زیبد بہ اورنگ شاہی من
ہمہ ملک خود را فراز و نشیب	سراسر سپارم بہ اورنگزیب
نشینم بہ یک گوشہ ای بانیاز	بیارم بجا پنج نوبت نماز[۳]

جنگ میں فتح کے بعد اورنگزیب کے لئے سب سے بڑا فتنہ دارا کا وجود تھا۔ حقیری کا خیال ہے کہ اورنگزیب دارا سے محض اس لئے خائف نہیں تھا کہ وہ تخت شاہی کا دعویدار تھا اس کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ عوام عام طور پر دارا کے طرفدار تھے۔ چنانچہ اورنگزیب

---

[۱] ایضاً ورق ۲۷۔ [۲] ایضاً ورق ۲۸۔

[۳] ایضاً ورق ۵۴۔

کے یہ اندیشے ملاحظہ فرمائیے :-

اگر من برادر نسازم تباہ	زجنگم رود زود اکلیل وگاہ
کہ چون یکسرہ ملک ہندوستان	بوندش ہمہ یار چون دوستان
بہ شاہی وی یکسرہ راضی اند	بہ من در فریب و دغا بازی اند[1]

ان اندیشوں کے پیش نظر اورنگزیب نے دارا کو قتل کرایا. دارا کے قتل کا منظر پوری مثنوی میں سب سے زیادہ دردناک ہے. یہاں سکندر نامہ کے دارا کا قتل سامنے آجاتا ہے. دارا ان الفاظ میں آخری فریاد کرتا ہے :-

اندر زیر خنجر بہ وقت ہلاک	بنالید دارا بہ یزدان پاک
بگفتا کہ ای کردگار جہان	تویی واقف رازہای نہان
اگر من گناہی چنین کردہ ام	کہ بیہودہ شخصی بیازردہ ام
سزاوار اینم کہ دیدم کنون	کہ شد پیکر و بال من پر زخون
دگرنہ کہ جرمی کہ من کردہ ام	کسی را بہ ناحق نیازردہ ام
توگیری قصاصم ایا کردگار	کہ ہستی ہمیشہ عدالت شعار[2]

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ اورنگ نامہ میں متروک الفاظ اور پھسپھسی ترکیبوں کا استعمال کم نہیں ہے. غالباً الف زائد لاکر حقیری نے فردوسی کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے. شاہجہان کے تخت طاؤس کو تخت کیاں کہنا بھی اسی قبیل سے ہے. کہیں کہیں نظامی کا چربہ اڑانے کی کوشش کی گئی ہے. مجموعی طور پر اورنگ نامہ معمولی نظم ہے. جو زبان کی لطافت و نزاکت اور ابلاغ و ترسیل کی خوبیوں سے بڑی حد تک محروم ہے. البتہ اس کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں. عہد اورنگزیب کے ابتدائی دو تین سال کی تاریخ مرتب کرنے

---

[1] ایضاً ورق ۲۶۸ .

[2] ایضاً ورق ۲۶۹ .

میں اس کا درجہ بنیادی ماخذ کا ہے۔

نصرۃ المرتضیٰ حقیری کی ایک اور مثنوی نصرۃ المرتضیٰ ہے جو تین سال بعد ۱۰۷۵/ ۶۲-۱۶۶۱ء میں مکمل ہوئی جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:۔

به تاریخ هفتاد و پنج و هزار | نمودم من این نامه را آشکار
بود نام این نصرة المرتضیٰ | شکستی نیابد ز دست قضا[۱]

اس مثنوی میں حضرت علی اور ان کے لڑکے محمد بن حنفیہ کی جنگوں کا ذکر ہے جو حقیری نے ابن حسام کی روایت سے لیا ہے۔

نشستم به فکر سخن پروری | بگفتم من این نامهٔ حیدری
سه جنگش ز حیدر سپهدار دین | دگر از محمد حنیفی گزین
که این داستانی که کردم تمام | تتبع نمودم به ابن حسام[۲]

حقیری کہتا ہے کہ یہ پوری کتاب مجھے خواب میں ایک بزرگ نے عطا کی۔ اور فرمایا کہ اسے اپنے خط میں لکھ کر میرے بیٹے کو دیدو تاکہ وہ اسے پڑھ کر اپنی زندگی سنوارے:۔

ز لطف خداوند خیر البشر | حقیری رساند این مقاله به سر
نه من کردم این داستانها تمام | که آن را بگویم بر خاص و عام
شبی من برفتم به بستر به خواب | کسی داد بر دست من این کتاب
به من گفت کای عاقل محترم! | بکن این کتب را به خطت رقم
نوشتی ورا چون به دستور من | وزان پس رسانیش بر پور من
که تا او بخواند مر او را تمام | ببیند ز گردون گردنده کام[۳]

---

[۱] نصرۃ المرتضیٰ (مثنوی حقیری در بیان جنگ محمد بن حنفیہ) سالار جنگ نمبر ۸۶۱، ورق ۱۰۰

[۲] ایضاً ورق ۱۰۰، ۴   [۳] ایضاً ورق ۱۰۰۔

غالباً یہ بزرگ میر خاں ہیں، جن کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے :۔

سر بندۂ کمترینہ حقیر بباد اتصدق بہ این خان میر
ہمین بود مطلب ہمین بد سخن نگہدار جانش بود پنج تن[۱]

مثنوی مادھونل کام کندلا جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ اسی دور میں ۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰ء میں حقیری تخلص کے ایک شاعر نے مادھونل اور کام کندلا کی عشقیہ داستان نظم کی۔ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اورنگ نامہ اور نصرۃ المرتضیٰ کا حقیری اور یہ شاعر دونوں ایک ہی ہیں یا الگ الگ۔ کیونکہ مادھونل اور کام کندلا سے شاعر کی شخصیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مثنوی کے آغاز میں البتہ اس نے شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی منقبت اور رسول کی نعت میں بڑے والہانہ شعر کہے ہیں۔ اول الذکر کے متعلق کہتا ہے :۔

آن تخت نشین ہفت اقلیم بخشندۂ گوہر زر و سیم
دارای سریر لامکانی دانای ضمیر کن فکانی
زد تخت کرم درون بغداد بغداد زفیض گشت آباد
بغداد ز روضہ ات چو جان باد جان و دل من فدای آن باد[۲]

مثنوی میں شاعر نے صرف تین جگہ اپنا تخلص ذکر کیا ہے :۔

مخروش حقیریا ! ازین بیش ہمت بطلب زکعبۂ خویش
بگذار حقیریا ! سخن را زان بیش مکار خویشتن را
بربند حقیریا ! زبان را زحمت مدہ این لب و دہان را[۳]

---

[۱] ایضاً ورق ۱۰۲۔

[۲] مثنوی مادھونل کام کندلا (محض اعجاز) مرتبہ یوگ دھیان آہوجہ، دہلی ۱۹۶۵ء ص ۱۴-۱۲۔

[۳] ایضاً ص ۲۲، ۱۱۷، ۱۲۳۔

حقیری کی روایت کی رو سے رائے گوبند کا درباری مادھونل نغمہ اور حسن میں لاجواب تھا اور ان خوبیوں کی بدولت اس نے شہر کی عورتوں کا دل اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ آخر کار شہر والوں نے تنگ آکر راجہ سے شکایت کی :۔

آخر بہ جہان بلا بر آمد — فریاد ز شہریان بر آمد
گفتند کہ ای یگانۂ دہر! — مادھونل فتنہ ایست در شہر
از دست فریب آن فسونگر — گشتند زنان شہر ابتر[1]

چنانچہ رائے گوبند نے مادھونل کو اپنی ریاست سے نکال دیا، وہاں سے وہ کام وتی شہر پہونچا جہاں راجہ کام سین راج کرتا تھا، وہاں معلوم ہوا کہ راجہ کے دربار میں ریاست کی مشہور رقاصہ کام کندلا کا رقص ہے۔ مادھونل بھی وہاں پہونچا لیکن دربانوں نے پردیسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخر مادھونل وہیں کہیں بیٹھ کر دربار کی موسیقی سننے لگا اور اسے یہ انکشاف ہوا کہ ایک مردنگ نواز کے انگوٹھا نہیں ہے۔ اس نے یہ بات حاجب کو بتائی۔ حاجب نے راجہ کے گوش گزار کی اور جب مادھونل کی بات سچ نکلی تو راجہ نے اسے اعزاز سے بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور اسے اپنا ہار انعام دیا۔ ادھر کام کندلا سر پر شمعوں کی تھالی لیے ناچ رہی تھی۔ اتنے میں ایک کالی بھڑ اس کے سینہ پر آن بیٹھی اور :۔

زد بوسہ بر و چو عاشق مست — از جام نشاط رفت از دست
آسودہ بہ صد نشاط دلکش — سرمست پیالہ ہای بیغش
ناگہ صنمی کرشمہ تمثال — از سینہ دمی کشید فی الحال
آن سوختہ دل چو مرغ جانباز — نومید شد و گرفت پرواز[2]

شاہی ہار دینے پر مادھونل پر عتاب نازل ہوا اور وہ جنگل جنگل پھرتا رہا، یہاں تک کہ اجین

---

[1] ایضاً ص ۳۶۔ [2] ایضاً ص ۵۷۔

کے رائے بکرم نے اس کی مدد کی۔

اس داستان کا آغاز قدیم سنسکرت میں کہیں کھو یا ہوا ہے۔ سب سے پہلے اسے قدیم راجستھانی کے شاعر گنپتی نے نظم کا جامہ پہنایا گنپتی کی تصنیف کا سال ۱۵۲۷ء ہے۔ بتیس سال بعد ایک اور شاعر نے اسی زبان میں اسے پھر نظم کیا۔ اس داستان کی اصل شہرت جب ہوئی جب اسے شیخ عالم نے ۱۵۸۳/۹۹۱ میں ہندی نظم کا روپ دیا۔ ہمارے شاعر کا ماخذ بھی ہندی روایت ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے :-

زین پیش درین خجستہ ایام	آن شیخ کہ بود عالمش نام
چون خامہ بکف گرفت از غم	این قصہ بہ ہندوی زدہ دم
اکنون کہ بکلک در نشستم	بر لوح دری نگار بستم
این قصہ کہ کس نگفت گفتم	این در کہ کسی نسفت سفتم[۱]

مادھونل اور کام کندلا ایک پسندیدہ ڈرامہ بھی رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں نئی دہلی کے اسٹیج پر اسے پیش کیا گیا تھا جس کا ایک سین مرتب نے کتاب میں پیش کیا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا کی یہ مثنوی جسے شاعر محض اعجاز کا نام دیتا ہے[۲]۔ شاعرانہ اعتبار سے کوئی خاص نہیں، بلکہ اس میں کئی ایک خامیاں موجود ہیں، رومانی مثنوی میں جو محاکاتی حسن اور روانی ہوتی ہے، اس سے یہ مثنوی بڑی حد تک خالی ہے۔ شاعر نے بحر بھی ایسی منتخب کی ہے جو عشقیہ داستانوں کے لئے زیادہ مناسب نہیں۔ پھر بھی حقیری کی یہ کاوش اتنی حقیر نہیں۔ ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے :-

عشق است جہان ناشکیبی	عالم عالم جہان فریبی

۱؎ ایضاً (مقدمہ) ۲؎ ایضاً ص ۱۲۶

۳؎ ایضاً ص ۱۲۶ این نامہ کہ ہست گلشن راز موسوم شدہ بہ "محض اعجاز"

عشق است کمال دردمندی | در پستی او ہمہ بلندی
عشق آمد و زد صلا جنون را | حسن آمد و خواند صد فسون را
این حسن بہ عشق زد ترانہ | این فتنہ بہ فتنہ شد فسانہ
افسانۂ عشق بس دراز است | افسون جنون خرد گداز است
دستم تہی و دلم خریدار | یوسف طلبم بہ شہر و بازار[1]

یا نعت کے یہ اشعار دیکھیے ان میں کتنی سادگی اور گداز ہے :-

لطف تو مرا چو عیب پوش است | دیوانگیم تمام ہوش است
گیرم کہ چو نامہ روسیاہم | سرتا سر غرق در گناہم
چون بحر عنایت تو پاک است | از موج گنہ مرا چہ باک است
سنگی چو رسید بر سبویم | بر خاک مریز آبرویم
آن را کہ چو تو بود یگانہ | محتاج نگردد از زمانہ[2]

ساعی

ساعی شہزادہ شجاع کا درباری شاعر تھا، اور اس کے بیشتر قصیدے شہزادے کی مدح میں ہیں۔ تذکرے اس شاعر کے متعلق کوئی اطلاع بہم نہیں پہنچاتے یہاں پر جو کچھ معلومات فراہم کی گئی ہے وہ کلیات ساعی سے ماخوذ ہے۔

ساعی مشہد کے ایک سید خاندان کا فرد تھا لیکن اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔[3] ایک قصیدہ میں وہ اپنا تقابل شاہجہان کے وزیر اعظم سعداللہ خاں سے کرتا ہے

---

[1] ایضاً ص ۲۲ - ۱۸ — [2] ایضاً ۱۶ - ۱۵

[3] کلیات ساعی نیشنل میوزیم، نئی دہلی، نمبر ۲۹ء ۵۵ ۱۵ ، ورق ۲۰۱

اور وزیر اعظم پر اپنی فوقیت جتاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں سپاہی اور عالم دونوں ہوں [۱] شجاع کے زوال کے بعد ساعی غالباً اورنگزیب سے متعلق ہوگیا جیسا کہ پری پیکر کے مدحیہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

ساعی نے ایک ضخیم کلیات یادگار چھوڑا ہے۔ یہ کلیات مندرجہ ذیل اصناف پر مشتمل ہے۔

۱۔ قصائد (۴۷)

۲۔ دو ترجیع بند جن میں سے ایک شاعر کے مرشد شاہ نعمت اللہ نارنولی کی منقبت میں ہے

۳۔ تین ترکیب بند۔

۴۔ قطعات (۸۱۷ اشعار)

۵۔ غزلیات

۶۔ رباعیات

۷۔ ایک رومانی مثنوی

۸۔ ساقی نامہ (تصنیف ۱۰۶۷/۵۷-۱۶۵۶)

۹۔ مثنوی غم دل (تصنیف ۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳)

۱۰۔ پری پیکر

۱۱۔ مثنوی

۱۲۔ خورشید و ماہ۔ نثری داستان۔

ساعی نے ساقی نامہ [۲] میں اپنی تصانیف کی تفصیل بتائی ہے جن میں سے چار ہندی میں ہیں:۔

۱۔ خورشید و ماہ (منثور و منظوم)

---

[۱] ایضاً ورق ۱۷۴۔ [۲] ایضاً

۲. ہفت گوہر (ہفت پیکر نظامی کے جواب ہیں)

۳. دیوان غزلیات

۴. راحت خواب

۵. فیض نامہ

۶. ساقی نامہ

۷. سرس رس (ہندی)

۸. سورج من (")

۹. جوتک ست (")

۱۰. دولہ نبود (")

ساقی نامہ کے ایک منثور دیباچہ سے یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ فیض نامہ پندنامہ سعدی کے طرز پر لکھا گیا۔ خورشید و ماہ جامی کی یوسف زلیخا اور راحت خواب، خسرو شیریں کے جواب میں تصنیف ہوئی۔ علاوہ ازیں جب ساعی شجاع کی لائبریری میں بحیثیت نگراں کام کرتا تھا تو اس نے اپنے ایک لاکھ اشعار کا انتخاب کیا تھا۔[۱]

ساعی عہد شاہجہاں کا شاعر ہے اور غالباً دربار شجاعی کا واحد اہم فنکار ہے۔ شجاع کے زوال کے بعد اسے مجبوراً اورنگزیب کی طرف آنا پڑا۔ لیکن چند سال تک وہ خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اورنگزیب کی تخت نشینی کے چھ سال بعد ۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳ء میں ساعی نے مثنوی غم دل لکھی مگر اس میں اورنگزیب کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ مزید چھ سال اور گذر گئے اور ۱۰۸۰/۷۰-۱۶۶۹ء میں جب اس نے مثنوی پری پیکر لکھی تو اورنگزیب کی دل کھول کر تعریف کی:

به دور عدل شاه هفت اورنگ | دل رہزن خروشش افزا تر از زنگ

---

[۱] ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی: کلیات ساعی (مجلہ علوم اسلامی، علی گڈھ: دسمبر ۱۹۶۲ء)

دلم از شوق نامش بی شکیب است　　قضا قدرت شہ اورنگزیب است[1]

پری پیکر ساعی کی تصانیف میں یہاں صرف پری پیکر کا ذکر کیا جائے گا۔ یہ مثنوی ایک ہندی تصنیف مدھومالتی کا فارسی ترجمہ ہے :۔

کتابی ہندوی وصف بت رند　　به مدھومالت شدہ موسوم در ہند

به اہل ہند بود از وی سوادی　　به صاحب فرس لذت می ندادی

ضرورت شد کہ در نظمش در آرم　　به دست خود خط ہندی نگارم[2]

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ساعی نے ہندی میں چار کتابیں تصنیف کی تھیں، پری پیکر میں بھی وہ اپنی ہندی پر فخر کرتا ہے اور ہندوستان سے وابستہ ہونے پر ناز کرتا ہے :۔

به ہندی بید خوانم چون برہمن　　زبان ہندوی را ماہرم من

بسی تصنیف در ہندی نمودم　　ضرورت شد از ان کز ہند بودم

چگویم خوبی ہندوستان را　　وطن بادا ہمیشہ دوستان را

زمینش گلشن فردوس ثانی　　بود آبش جواب زندگانی[3]

خود پری پیکر میں شاعر جگہ جگہ ہندی کے مرادفات کا ذکر کرتا ہے :۔

ز سر تا ناخن پا می ستانید　　به ہندی نام او نکھ سکھ نمایند

به مدھمالت بیانش آشکار است　　به ہندی نام او نکھ سکھ سنگار است[4]

؞

---

[1] کلیات ساعی (نیشنل میوزیم) ورق ۱۹۷۔

[2] ایضاً ورق ۲۰۰۔

[3] ایضاً ورق ۲۰۲۔

[4] ایضاً

دستورِ ہمت

اس عہد کی رومانی مثنویوں میں ایک بہت خوبصورت مثنوی دستورِ ہمت ہے جو کامروپ اور کام لتا کی عشقیہ داستان پر مبنی ہے۔ اورنگزیب کا امیر ہمت خاں میر عیسٰی علم و فن کا بہت دلدادہ تھا[1]۔ اس نے نثر میں کامروپ اور کام لتا کی داستان لکھی، جو بہت مقبول ہوئی۔ پھر اس نے اپنے دوستوں سے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ داستان نظم کے قالب میں ڈھالی جائے۔ چنانچہ اس کے ایک درباری لائق نے یہ مثنوی تصنیف کی اور اپنے مربی کی یادگار میں (جو مثنوی کی تکمیل سے پہلے گذر چکا تھا) اس کا نام دستورِ ہمت رکھا۔ ذیل میں متعلقہ اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

محمد خصلتی، عیسیٰ کلامی　　نگاہ مردمی، مرد تمامی

خطابش مطلع دیوان ہمت　　فروغ شمسۂ ایوان حکمت

دل و چشم طمع از خوان او پر　　جہان جود، ہمت خان بہادر

متاعی را در آوردہ بہ بازار　　کہ گشتہ مست و ہشیارش خریدار

بہار آغوش رنگین فقرہ هائش　　زگل پر جیب لفظ خوشنمائش[2]

ایک دن ہمت خاں نے یہ خواہش ظاہر کی :-

---

[1] ہمت خاں میر ضیاء الدین اسلام خان کا بیٹا تھا۔ اورنگزیب نے اسے یہ خطاب عطا کیا۔ ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ میں اسے آگرہ کا گورنر بنایا گیا۔ بعد میں اسے داروغہ غسل خانہ متعین کیا گیا۔ ۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰ میں اورنگزیب نے اسے اجمیر طلب کیا اور اسے میر بخشی کا عہدہ عطا کیا مگر وہ ۵ محرم ۱۰۹۲/۲۵ جنوری ۱۶۸۲ کو فوت ہوگیا۔ ہمت خاں فارسی اور ہندی کا عالم تھا۔ اس کا تخلص میرن تھا۔ سرخوش نے اس کے لئے ایک ساقی نامہ اور ایک مثنوی خسخانہ لکھا تھا۔ (مآثر الامرا ۳/۹۴۶ و مابعد، کلمات الشعراء ص ۲۳)

[2] دستورِ ہمت، ہارڈنگ لائبریری، دہلی، نمبر ۵۰، ورق ۸

کہ گر این قصۂ عشق آفریدہ — زشہرستان معنی نو رسیدہ
در آید در لباس نظم عالی — برافروزد رخ از رنگین خیالی[1]

لیکن کسی نے آمادگی ظاہر نہیں کی۔ آخر ہمت خاں نے ہمارے شاعر سے کہا:

بکن زین داستانی شور انگیز — بہ بحر خسرو شیرین شکر ریز
من از ہمسایگی خجلت کشیدم — بہ غیر از خامشی عذری ندیدم[2]

مگر مثنوی کی تکمیل سے پہلے ہی ہمت خاں انتقال کرگیا:

خمارش را شراب چارہ بشکست — زجام مرگ شد آخر بسیہ مست
شدہ از مرگ آن مجموعۂ داد — نشاط آباد عالم، ماتم آباد[3]

بہرحال یہ مثنوی ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ء میں مکمل ہوئی۔

بحمد اللہ کہ این نظم دل آرام — گرفت از فکر لائق رنگ انجام
چو سال ختم کردم انتخابش — بہ "ہمت خان" موافق شد حسابش
ازان ساعت کہ می کردم تمامش — خرد 'دستور ہمت' گفت نامش[4]

دستور ہمت کے مصنف کے بارے میں کافی اختلافات ہیں۔ ریوؔ[5] نے اسے محمد مراد کی طرف منسوب کیا ہے۔ گارساں دتاسی[6] ہمت خاں کو اس کا مصنف بتاتا ہے حالانکہ ہمت خاں منثور روایت کا مصنف ہے۔ ڈاکٹر اشپرانگر[7] نے بھی 'ہمت' سے دھوکا کھایا

---

[1] ایضاً ورق ۹ — [2] ایضاً ورق ۱۰۔

[3] ایضاً ورق ۱۱۔ — [4] ایضاً

[5] ریو ۲/۶۹۷ — [6] خطبات گارساں دتاسی (اردو) اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء ص ۱۵۵

[7] اشپرانگر ص ۴۷۵۔

ہے۔ انھوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ اس کا مصنف مندرجہ ذیل تین اشخاص میں سے ایک ہو سکتا ہے:

۱۔ خان جہاں بہادر

۲۔ اس کا لڑکا ہمت خاں

۳۔ محمد عاشق ہمت۔

خانجہاں (ملک حسین ظفر جنگ کوکلتاش) اورنگزیب کا رضاعی بھائی تھا اس کا انتقال بربہمپوری میں ۱۹ جمادی الاول ۱۱۰۹ / یکم دسمبر ۱۶۶۷ کو ہوا۔ اس کا لڑکا محمد حسن ہمت خاں اورنگزیب کے معزز امرا میں تھا اور ۱۱۰۶ / ۹۵-۱۶۹۴ میں لڑائی میں مارا گیا[1]۔ محمد عاشق ہمت مؤخرالذکر کا متوسل تھا اور اچھا شاعر تھا۔ اس نے ناصر علی کے ایما پر اسلام قبول کیا اور شاعری میں اس کی شاگردی اختیار کی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک عورت منوں پر فریفتہ ہو گیا اور اس نے ہمت خاں سے یہ درخواست کی کہ:-

زہمت خاں بہادر آنقدر چشم وفا دارم — رساند دست کوتاہ مرا بر دامن منوں

اس بدتمیزی پر ہمت خاں نے اسے نکال دیا۔ ہمت بنگال چلا گیا مگر پھر واپس اپنے وطن گورکھپور آ گیا۔ یہیں عہد بہادر شاہ میں اس کا انتقال ہوا[2]۔ ہمت کا ایک مختصر دیوان غزلیات و قصائد، علی گڈھ یونیورسٹی میں محفوظ ہے[3]۔

بہرحال ان تینوں میں سے کوئی دستور ہمت کا مصنف نہیں ہو سکتا۔

دستور ہمت کے شاعر لائق کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں۔ غالباً یہ محمد مراد لائق ہے۔ جو جونپور کا رہنے والا تھا اور صائب سے ملنے ایران گیا تھا۔ ایران سے واپسی پر لائق کو لاہور

---

[1] مآثر الامرا ۱/ ۷۹۸، ۳/ ۹۴۹

[2] سفینۂ خوشگو ص ۱۳۱؛ تذکرۂ بینظیر ص ۱۴۵۔

[3] دیوان محمد عاشق ہمت، حبیب گنج، علی گڈھ، نمبر ۴۷/۱۴۱

کا وقائع نویس مقرر کیا گیا۔ غالباً یہیں اس کی ملاقات میر عبدالجلیل بلگرامی سے ہوئی جن کی تجویز پر لائق نے خمسہ لکھا اس خمسہ کی چار مثنویاں آزاد بلگرامی نے دیکھی تھیں۔ میر عبدالجلیل سے متعلق یہ اشعار بھی انھوں نے نقل کیے ہیں:۔

راقم این نامہ معنی سواد — محو سخن، بندہ محمد مراد
بود شبی انجمن آرای فکر — داشت سری گرم ز سودای فکر
از درم القصہ درآمد درون — اہل سخن را بہ سخن رہنمون
صورت ازو گشتہ بہ معنی دلیل — سید علامہ عبدالجلیل[1]

محمد مراد کی مثنویاں خاصی مقبول تھیں پنجاب کے ایک منشی مل رای شوقی نے بھی اس سے استفادہ کے لیے دو مثنویاں مانگی تھیں۔ شوقی نے منظوم خط لکھا تھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

ای مولوی زمانہ بی ریب — از مثنویت کلام را زیب
سرمایہ راستان حق بین — یعنی کہ دو داستان رنگین
کحلی است برای دیدۂ عقل — خواہم دو سہ روزی از پی نقل
زینگونہ دگر ہر آنچہ دارند — معجون خرد بہ من سپارند[2]

لائق کے علاوہ ٹیک چند اور حسامی نے بھی اسی عہد میں یہ داستان نظم کی۔ اول الذکر بلرام کالڑ کا اور ریہ (سرہند) کا باشندہ تھا۔ اس کی مثنوی کا نام گلدستۂ عشق ہے[3]۔ حسامی خان آرزو کے والد ہیں۔ مگر یہ اپنی مثنوی مکمل نہیں کر سکے ہیں[4]۔ ان کے علاوہ بیدل کے شاگرد

---

[1] سرو آزاد ص ۲۵۷؛ نشتر عشق، ص ۱۵۴۷۔

[2] مل رای شوقی: گلدستۂ سخن، بانکی پور نمبر ۸۵۹، ورق ۱۰۵۔

[3] اشپرنگر ص ۳۸۷۔ [4] مجمع النفائس، ورق ۱۱۶

گرو بخش حضوری نے بھی یہ داستان نظم کرنی شروع کی تھی۔ اور سفینۂ خوشگو کی تالیف کے وقت ۴۷۔ ۱۷۲۴ ـ ۳۵/۱۱۳۷ بھی ان کی مثنوی مکمل نہیں ہوئی تھی[1] فائق ٹھٹھوی نے ۵۶۔ ۱۷۵۵/۱۱۶۹ میں کامروپ اور کام لتا کی داستان نظم کی جو تین ہزار اشعار پر مشتمل تھی[2]۔ حاجی بدیع الجب نے اس سے قبل ۱۱۵۷/۱۷۴۴ میں فلک اعظم کے عنوان سے یہ مثنوی تصنیف کی تھی[3]۔

اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ راجہ اودھ کے لڑکے کامروپ نے ایک رات خواب میں سراندیپ کی شہزادی کام لتا کو دیکھا اور اس پر جی جان سے عاشق ہوگیا۔ شہزادی بھی اسی طرح خواب میں کامروپ کو دل دے بیٹھی۔ اتفاق سے سراندیپ سے ایک برہمن اودھ کے دربار میں پہونچا اور اس نے شہزادے کو کام لتا کے غیر معمولی حسن کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ شہزادہ عشق کی مہم پر روانہ ہوا مگر راستہ میں اس کا جہاز طوفان کی نذر ہوگیا۔ خوش قسمتی سے تمام لوگ بچ گئے مگر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ کامروپ ایک تختہ پر تیرتے تیرتے ایک جزیرہ میں پہونچا جہاں صرف صنف نازک کی آبادی تھی۔ وہاں سے ایک پری اسے لے اڑی۔ بہر حال وہ کسی طرح سراندیپ پہونچا جہاں اس کے ساتھی پہلے ہی پہونچ چکے تھے کچھ دن کے بعد کام لتا کا سویمبر ہوا۔ شہزادی نے کامروپ کا انتخاب کیا مگر اس سے قبل کہ دونوں کی شادی ہو کامروپ کو پھر مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار وہ تمام آزمائشوں میں پورا اترا اور اپنی محبوبہ سے شادی رچا کر خوش خوش گھر لوٹا۔

دستور ہمت صاف اور رواں نظم ہے۔ لائق کے انداز بیان میں بڑی بے تکلفی اور گھلاوٹ ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۳۴۸

[2] مقالات الشعرا ص ۱۳، ۲۳۴

[3] ریو ۲/۷۱۱۔

چنین کرد آن فسون پرداز استاد	زشور عشق این افسانه بنیاد
که شاهی بود دولت پرور هند	سریر آرای اودھ از کشور هند
جهان جود را فرمانروایی	به تیغ بخردی کشور گشایی
ز مهرش سینه ها گنجینهٔ راز	درش چون باب رحمت بر همه باز
درین رنگین سرای مهر پیوند	نبودش آرزوی غیر فرزند
نبستی نخل دولت بار امید	اثر در مه بکردی نور خورشید
بتان ناز پرور داشت بسیار	همه مشکوی شاهی را سرافراز
ولیکن ابر نیسان کم اثر بود	صدف لب تشنهٔ آب گهر بود
چمن آباد رنگ و بو نگشتی	صدف آبستن لولو نگشتی[1]

هفت اختر عیشی

عیشی نے نظامی کی ہفت پیکر کے انداز پر مثنوی ہفت اختر لکھی. عیشی کا نام غالباً محمد فاضل تھا. اور وہ دہلی کے رہنے والے تھے[2] ان کی مثنوی اورنگزیب کے نام معنون ہے اور اس میں ۴۶۲۰ شعر ہیں. موجودہ نسخہ ناقص الاول ہے. اور اس شعر سے شروع ہوتا ہے

فیض جاری است از در و بامش | قفل دل را کلید از نامش[3]

ہفت اختر کی وجہ تصنیف بھی دلچسپ ہے. شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی تمام

---

[1] دستور ہمت، ہارڈنگ لائبریری، نمبر ۵۰، ورق ۳ -

[2] اشپرانگر ص ۳۶۳

[3] عیشی: ہفت اختر، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۶۸، ورق ۱ -

دولت کیمیا کے چکر میں گنوا ڈالی۔ آخر جب قلاش ہو گیا تو بڑے چھوٹے بھائی نے جس کا نام انور تھا، مجھے یہ مشورہ دیا کہ اگر تم اپنا نام یادگار چھوڑنا چاہتے ہو تو کوئی شعری تصنیف کرو۔

منکہ از مہر و ماہ وارستم | مدتی لب ز گفتگو بستم
در تمنای کیمیا سازی | کردم تمام عمر زر بازی (؟)
بہ عمل رہ نیافت اندیشہ | خود پشیمان شدم ازان پیشہ
پس توکل بہ نام حق کردم | نام حق را بہ خود سبق کردم
بود کوچک برادر بندہ | نوجوانی بہ خلق آگندہ
نام او انور، انوری مانند | ہمہ گفتار او لذید چو قند[1]

علیشی نے انور کے یہ دو شعر بھی درج کئے ہیں:-

انورا! مال و زر تو جمع مکن | با تو ہمرہ خسی نخواہد رفت
عاقبت آہ گور، تنہا گور | کس بہ گور کسی نخواہد رفت[2]

ادا نوف[3] نے ۱۰۷۰/۶۰-۱۶۵۹ ہفت اختر کا سال تصنیف بتایا ہے مگر مثنوی میں بعد کے واقعات درج ہیں۔ شاعر نے اورنگزیب کی مدح کرتے ہوئے شمبھوجی کی گرفتاری اور قلعہ گولکنڈہ کی فتح کا بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی شہزادوں کی نااتفاقی پر افسوس کا اظہار کیا ہے:-

شاہ کیوان مکان چرخ سریر | شاہ اورنگزیب عالمگیر
گرچہ رانا بہ ہند سرکش بود | لیک عاجز ز تیر ترکش بود
آخر او را چو مرغ صید نمود | زن و فرزند او بہ قید نمود
بوالحسن شاہ حیدرآبادی | کہ علیک فلک نمی دادی

---

[1] ایضاً ورق ۳ [2] ایضاً ورق ۴

[3] ایشیاٹک ۱/نمبر ۷۶۸۔

موکب بادشاہ عالمگیر — ہم درآن قلعہ اش نمود اسیر
شاہ را چار قرۃ العین است — ہر یکی ہمچو شیر یہ شنین است
ہمہ را اتفاق اگر بودی — کی بہ عالم شہ دگر بودی [1]

ہفت اختر بہرام گور سے متعلق سات کہانیوں پر مشتمل ہے۔ قصہ یوں ہے کہ بہرام گور اپنی محبوب کنیز مہ پارہ سے کسی بات پر ناراض ہوگیا اور اسے کنویں میں پھنکوا دیا۔ بعد میں بہرام اپنے کئے پر نادم ہوا اور بہتیرا تلاش کیا مگر مہ پارہ ہاتھ نہیں آئی۔ درباریوں سے بہرام کا اضطراب نہیں دیکھا گیا۔ چنانچہ انھوں نے یہ طے کیا :۔

ہفت اقلیم ہفت شہ دارد — ہر شہی دختری چو مہ دارد
ہمہ باید کہ رد بہ راہ آریم — ہفت دختر ز ہفت شاہ آریم
خواستند از برای شاہ جہان — ہفت دختر چو اختر تابان [2]

اس طرح یہ سات ستارے جمع کئے گئے۔ ان میں سے ہر لڑکی ہفتہ کے ایک دن بہرام کی مجلس عیش کی زینت بنتی اور اسے ایک داستان سناتی۔ ان لڑکیوں میں ہندوستان کے رائے کی لڑکی ماہ سیما بھی تھی جو شنبہ کو بہرام کا دل بہلاتی تھی، خراسانی شہزادی کے لئے یک شنبہ کا دن مقرر تھا اور بلغاری شہزادی کے لئے دوشنبہ کا۔ انھیں سات ستاروں کی وجہ سے مثنوی کا نام ہفت اختر رکھا گیا ہے۔

ہفت اختر میں ہر باب کے خاتمہ پر ساقی نامہ کے انداز میں چند شعر اور عیشی کی ایک غزل ہے۔ مثنوی کا انداز صاف اور رواں ہے۔ مثال کے طور پر مہ پارہ کے سراپا سے متعلق اشعار درج کئے جاتے ہیں :۔

سرو قدی کشیدہ بالائی — شوخ شنگی ظریف رعنائی

---

[1] ایضاً ورق ۲-۱۔ [2] ایضاً ورق ۸

دہنش گل شکر بہ زیبائی — لب او برگ گل بہ رعنائی
خال او ہمچو مردم دیدہ — بلکہ از دیدہ ہم پسندیدہ
زلف او ہمچو عمر زیبندہ — چشم جادوش دل فریبندہ
جعد مشکین او عبیر آمیز — چین بہ چین، حلقہ حلقہ دل آویز[1]

جہان نامہ فنائی کشمیری

تاریخی یا نیم تاریخی مثنویوں میں فنائی کشمیری کی جہان نامہ ہے جس میں انبیا اور ہندوستان کے قدیم بادشاہوں کی تاریخ نظم کی گئی ہے۔ فنائی ہندوستان اور ایران کی قدیم تاریخ اور انبیا کے واقعات نظم کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنا منصوبہ پورا نہ کر سکا۔ شاعر شیخ لقمان بن شیخ عثمان کا مرید اور شہنشاہ وقت اورنگزیب کا مداح تھا۔ اور اس نے جہان نامہ میں دونوں کی تعریف کی ہے۔ یہ مثنوی غالباً ۱۰۹۹/۸۸-۱۶۸۷ کے بعد لکھی گئی کیونکہ اس میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی فتح کا ذکر ہے۔ جہان نامہ کا ابتدائی شعر یہ ہے:-

بہ نام جہاندار جان بخش و ہوش — نوازندۂ جسم با چشم و گوش[2]

لطیفۂ شوق

لطیفۂ شوق منظوم لطائف کا مجموعہ ہے۔ اس کا مؤلف جنونی ہے۔ جس کے بارے میں تذکروں میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جنونی عہد اورنگزیب کا شاعر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اورنگزیب

---

[1] ایضاً ورق ۵
[2] ریو ۲/ ۷۰۲

کا خانہ زاد کہتا ہے :-

فخر من این بود بہ جان و سرش   کہ جنونی است خانہ زاد درش
آبرویم ز خانہ زادی اوست   کہ مراد من از مرادی اوست[1]

لیکن شاعر کے بیان سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اسے کوئی خاص عہدہ نہیں حاصل تھا۔ اور اس کے لیئے یہی خیال کافی تھا کہ وہ اورنگزیب کے عہد میں ہے :-

لیکن این بس کہ در زمان دیہم   سرخوش از بادۂ بیان دیہم
تا کہ ہر کس بخواند این تحریر   گوید او بد بہ عہد عالمگیر[2]

اس انکسار کے باوجود جنونی کو یہ احساس بھی تھا کہ شاعر ہی اپنے بادشاہ اور مربی کا نام امر کرتا ہے، چنانچہ وہ فردوسی اور دیگر متقدمین کا ذکر کرتے ہوئے اپنا سلسلہ ملاتا ہے :-

گر جنونی نکردی این تحریر   کہ نوشتی ز مدح عالمگیر[3]؟

ایک لطیفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنونی شاہی فوج کے ساتھ حسن ابدال گیا تھا، اور وہاں تقریباً دو سال قیام پذیر رہا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شاہی فوج محرم ۱۰۸۵/ مارچ ۱۶۷۴ میں حسن ابدال کی مہم پر روانہ ہوئی تھی۔ اس مہم میں یہ شاہی حکم تھا کہ کوئی شخص اپنی عورت کو ساتھ نہ لے جائے۔ اتفاق سے مہم نے طول کھینچا اور اس عالم میں مغل فوج پر کیا گذری، اس کا حال جنونی سے سنیئے :-

شاہ اورنگزیب نیک اقبال   رفت چون جانب حسن ابدال
حکم شد کز توانگر و درویش   نبرد ہیچ کس زنی با خویش
بندہ چون خانہ زاد بد ہمراہ   رفت با کام دل بہ ہمرہ شاہ

---

[1] جنونی: لطیفہ شوق، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۸، ورق ۱۹۔
[2] ایضاً   [3] ایضاً ورق ۲۱۔

چون رسیدیم در حسن ابدال — شاہ آن جایگہ بماند دو سال
لشکر از بیزنی بہ تنگ شدند — فارغ از قید نام و ننگ شدند
از سگ و خوک رو نہ تابیدند — در پرش کردہ و بخوابیدند[1]

لطیفہ شوق کے تمہیدی ابواب میں جنونی کہتا ہے کہ مجھے غزل اور رباعی جیسی متفرق اور بے ربط صنف شعر سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے میں مستقل تصنیف زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں نے یہ تصنیف کی اور اس کا نام لطیفہ شوق رکھا

کہ دل من بہ حق عز و جل — نیست مائل بہ شعر و بیت و غزل
مر مرا گفتن کتاب خوش است — کہ دل از من درین حساب خوش است
زین کتابی کہ کردہ ام تصنیف — ہست از بحر طبع در لطیف
ماندہ ام نام او لطیفہ شوق — کہ فزاید از و بہ ہر دل ذوق[2]

ان لطائف کے سلسلہ میں جنونی کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے افسانہ تراشی نہیں کی ہے بلکہ اگلوں کی بیان کردہ روایتوں کو نقل کیا ہے :۔

کہ جنونی ہر آنچہ می گوید — در رہ راستی ہمی پوید[3]

جنونی نے ضمناً امرائے عہد کی بے حسی کا ماتم بھی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے میرے پاس لاکھ علم و فضل سہی لیکن اس کی قدر کا کیا حال ہے :۔

تو اگر صد کتاب زیر بغل — بروی، گردہ پیش اہل دول
کس نپرسد کہ از کجا توئی؟ — آمدہ از پی چہ را توئی؟
بہ سوی چوبدار و خدمتگار — تند بینند ہر زمان در کار

---

[1] ایضاً ورق ۲۲

[2] ایضاً ورق ۱۰۷

[3] ایضاً ورق ۲۵۔

که چرا بار این کسان دادی؟	در طربگاه من فرستادی[1]

جنونی نے جو لطائف درج کیے ہیں۔ ان میں بہت سے اتنے فحش ہیں کہ ان کا انتخاب نہیں پیش کیا جا سکتا۔ یہ لطائف اس نے کتابوں سے بھی اخذ کیے ہیں اور سنی سنائی روایتوں کا بھی سہارا ہے۔ بعض مشہور شخصیتوں مثلاً نورجہاں، عرفی، الاوردی خاں اور علی مردان خان وغیرہ سے متعلق بھی لطیفے ہیں۔ شاعر کا انداز بیان عموماً کمزور اور سپاٹ ہے اور لطیفہ بازی کے لیے جس صناعی کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ بڑی حد تک محروم ہے۔ ایک سنجیدہ لطیفہ مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے :-

روز عید صیام در شہری	بود مر خلق را از آن بہری
دو قلندر بہم چو در خوردند	ہر دو باہم مصافحہ ای کردند
آن یکی گفت با یکی ناگاہ	چند روزہ تو داشتی این ماہ؟
گفت زان دم کہ سر فراشتہ ام	خود یکی روز روزہ داشتہ ام
آن دوم در جواب گفتش باز	کہ تو از من درین فنی ممتاز
زانکہ یک روز تو زیادہ ز من	روزہ بگرفتہ ای، چہ ماند سخن![2]

لطیفۂ شوقی کی تکمیل ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ء میں ہوئی، اس میں ۶۰۱۶ شعر ہیں۔ تاریخ درج ذیل ہے :-

چار صد از غنیمت آر برون (۴۰۰ / ۱۵۰۰ / ۱۱۰۰)	وانچہ باقی بود، شمار برون
گر بہ خواہی درین خزانہ کنون	چقدر گنج ماندہ ام بہ درون[3]
پس بیاو شمر ز خاطر شاد	شش ہزار و شانزدہ(؟) از زیاد[4]

---

[1] ایضاً ورق ۲۸-۲۷۔ [2] ایضاً ورق ۳۰

[3] ایضاً ۱۹۶۔

رامائن

اس عہد میں جو مذہبی، اخلاقی یا صوفیانہ مثنویاں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک چندر من بیدل کی رامائن موسوم بہ نرگستان ہے۔ جسے ناشر نے غلطی سے عبدالقادر بیدل کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ کتاب کے آغاز ہی میں شاعر کا نام اور وطن درج ہے :-

ازآن رو بیت سازد این مصنف — کہ چندر من بود نام مؤلف

چو اندر مدھپوری گوشہ نشینم — گل از باغ بہار او بچینم[1]

بیدل کا بیان ہے کہ اس نے اس سے قبل نثر میں رامائن لکھی تھی، یہ منثور نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے اور بقول ایتھے اس کا سال تصنیف ۱۰۹۷/۸۶-۱۶۸۵ ہے[2] :-

اگرچہ پیش ازین این داستانی — بہ نثر آوردہ ام در یک زمانی

کنون خواہم کہ در نظم آورم باز — شوم زین داستان پاک ممتاز[3]

موجودہ مثنوی کی تکمیل ۵-۱۱۰۴/۹۴-۱۶۹۲ میں ہوئی جیسا کہ مندرجہ ذیل تاریخوں سے واضح ہوتا ہے :-

گہر سفت آن مرشد خاص و عام — بگفتا 'زہی نرگستان رام'
۱۱۰۴ھ

چو جستم از خرد گفتا کہ برخوان — طراوت بخش دلہا باغ ایمان[4]
۱۱۰۵ھ

بیدل نے منظوم اور منثور رامائن کے علاوہ چند اور کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن

---

[1] نرگستان (رامائن بیدل)، نولکشور، ۱۸۷۵ء، ص ۵

[2] ایتھے نمبر ۱۹۶۴

[3] رامائن بیدل، ص ۵-۴

[4] ایضاً ص ۱۴۴، ۶

کی تفصیل یہ ہے:۔[1]

۱۔ قصہ کرشن

۲۔ ضمیمۂ رامایَن۔

۳۔ حکایات بکرم

۴۔ بہار سخن

۵۔ ظفر نامہ

معلوم ہوتا ہے کہ بیدل اس مثنوی کی تصنیف کے وقت عمر کی ساٹھ منزلیں طے کر چکا تھا۔

درین شصت سالی کہ من کردہ ام　　زساقی خود فیضہا بردہ ام[2]

رامایَن بیدل کا مخصوص نام نرگستان ہے۔ کتاب شہنشاہ وقت اورنگزیب کے نام معنون ہے۔ بیدل نے اورنگزیب کی شان میں جو مدحیہ اشعار لکھے ہیں اس سے شاعر کی عقیدت اور اورنگزیب کی وسیع المشربی اور مذہبی رواداری پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ بیدل نے خاص طور پر اورنگزیب کی عبادت گزاری، پاک شعاری اور انسان دوستی کی تعریف کی ہے۔

نرگستان چھ دفتر پر مشتمل ہے۔ پہلے پانچ دفتر بحر ہزج میں ہیں۔ آخری دفتر میں چونکہ لڑائی کے واقعات نظم کرنے تھے، اس لئے شاعر نے اس کے لئے رزمیہ بحر متقارب کا انتخاب کیا ہے۔

چو در دفتر آخرین بود جنگ　　بہ بحر سخن طبع شد چون نہنگ

بہ صد طمطراقی سخن در نمود　　چو شہنامہ این نامہ را بر گشود

نرگستان شاعرانہ خوبیوں سے بڑی حد تک عاری ہے اور تک بندی کی اچھی مثال ہے۔ الفاظ کے غلط استعمال، قوانین عروض سے لاپروائی اور غلط قوافی کے استعمال

---

[1] ایضاً۔ پہلی دونوں تصانیف ایتھے کے مخطوط نمبر ۱۹۶۴ میں موجود ہیں۔

[2] ایضاً ص ۱۴۴۔

سے مثنوی بڑی حد تک سرسری اور بے جان ہو گئی ہے۔ اس کے نقائص پر محترم قاضی عبدالودود صاحب نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔[1]

واجب الحفظ

واجب الحفظ یا مجمع البیان عاقل کی فلسفیانہ مثنوی ہے جس کی تصنیف ۱۱۰۵/ ۹۴-۱۶۹۳ء میں ہوئی۔ عاقل کی شخصیت کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے یہ خواجہ محمد عاقل ہوں جو شیخ احمد جام زندہ پیل کی اولاد سے تھے۔ ان کے آبا و اجداد سونی پت میں آبسے تھے۔ عاقل یہیں پیدا ہوئے۔ بعد میں انھوں نے شہزادہ اعظم کی سرکار میں نوکری کر لی تھی۔ خان آرزو جو عاقل سے بارہا ملے تھے، کہتے ہیں کہ عاقل ملازمت چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۴۳/ ۳۱-۱۷۳۰ء میں ہوا۔ شاعری میں وہ حکیم شہرت کے شاگرد بتائے جاتے ہیں۔ عاقل ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور بدھ ونت تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے مثنوی ناصر علی کے طرز پر مرآۃ الجمال لکھی تھی۔[2]

واجب الحفظ میں مذہب، تصوف، اخلاق، حدیث وغیرہ پر ترسٹھ مختصر ابواب ہیں۔ مثنوی اورنگزیب کے نام معنون ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں شاعر کا تخلص مذکور ہے:

زعاقل این دعا، از خلق آمین[3] — زراہ گمرہان قوم ضالین

٭

---

[1] معاصر، پٹنہ، جنوری ۱۹۵۲ء

[2] سفینۂ خوشگو ص ۱۷۲، ۸۲؛ گل رعنا ورق ۱۸۱۔

عاقل تخلص کا ایک اور شاعر ہنرور خاں عاقل دہلوی (م۔ ۱۱۵۰/ ۳۸-۱۷۳۷) ہے جو نظام الملک آصف جاہ سے وابستہ تھا۔ (خزانۂ عامرہ ص ۳۴۷)

[3] ایتھے نمبر ۲۲۱۲۔

عشق نامہ

ایک غیر معروف شاعر بیانی نے دکن کی مشہور عشقیہ داستان مہیار اور چندر بدن عشق نامہ کے عنوان سے نظم کی۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۰۵/۹۴-۱۶۹۳ ہے:

کتابی است این عشق نامہ بہ نام — پر از عشق گفتم سخنہا تمام
ز ہجرت ہزار و صد و پنج سال — چو بگذشت در خاطرم این خیال
بیانی چنین قصہ آخر نمود — بہ ختمش بخوان فاتحہ یا درود[1]

بیانی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ غالباً وہ دکن کا باشندہ تھا۔ اس کی مثنوی کی کتابت بھی بیجاپور کے ایک گاؤں رتھلی میں ہوئی۔[2] مہیار اور چندر بدن کی داستان دکن میں خاصی معروف ہے۔ مقیمی پہلا شاعر ہے جس نے دکنی میں یہ داستان نظم کی۔ اس کے بعد دکنی اور فارسی میں کئی شاعروں نے اسے منظوم کیا۔ فارسی شعرا میں آتشی، عشق، مرزا قاسم بیگ اخگر اور مرزا یار بیگ یار کا تذکرہ ملتا ہے۔[3]

داستان کا خلاصہ بیانی کی زبانی سنیے۔ ملک گجرات میں سندر پٹن ایک شہر تھا۔

کہ نام نامیش سندر پٹن بود — بہ ہر تقطیع ہر یک انجمن بود[4]

سندر پٹن کے راجہ کے یہاں ایک لڑکی ہوئی جس کا نام چندر بدن رکھا گیا:

بہ اسم میمنت چوں فال دیدند — طلب کردند، بہ مطلب رسیدند
کہ اسم نیک او چندر بدن شد — چو گل خندان شد و گل پیرہن شد[5]

---

[1] بیانی: عشق نامہ، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۵۲۸، ورق ۷۱۔ فہرست انگریزی میں اس کا نمبر ۸۰۵ ہے۔

[2] ایضاً (ترقیمہ) ورق ۷۲۔

[3] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۷۵۔

[4] عشق نامہ، ورق ۶۱ [5] ایضاً ورق ۶۲۔

چندربدن جب چودہ سال کی ہوئی تو اس کے حسن پر

ہزاران عاشق و مخمور گشتند ۔۔۔ ندیدہ دیدہ وش پر نور گشتند

ہمہ دل بستہ و مدہوش گشتہ ۔۔۔ سراسر در شنیدن گوش بستہ[1]

ادھر ایک تاجر تھا جس کے لڑکے کا نام مہیار تھا۔

پسر او را یکی بود و نہ دختر ۔۔۔ ہمان یک تاج سر بود و نہ دیگر

نگہ کردند در طالع بہ یک بار ۔۔۔ چو نیکو نام او کردند مہیار

قضا جاسوس گر دید و خبر کرد ۔۔۔ کہ عشق آن صنم در وی اثر کرد[2]

آخر مہیار اپنی نادیدہ چندربدن کے دیدار کے لئے روانہ ہوا۔ سندر پٹن کے باہر ایک بڑا مندر تھا جہاں سال میں ایک بار یاتریوں کا میلہ لگتا تھا۔ چندربدن بھی پوجا کے لئے آئی تھی مہیار اسی دن وہاں پہونچا:۔

قضا را روز غوغای پری بود ۔۔۔ پرستیدن بت و جادوگری بود

چو دید او را مہیار وفادار ۔۔۔ بہ پایش اوفتاد و گفت ای یار

منم در عشق تو پروانۂ شمع ۔۔۔ بکن از لطف خود این خاطرم جمع

بہ غیر از تو کسی دیگر نخواہم ۔۔۔ تو یی شاہم، تویی شمسم، تو ماہم[3]

چندربدن بولی تو مسلمان ہے ہندو، میرا تیرا میل ممکن نہیں، اس لئے

اگر گویی چنین حرفی دگر بار ۔۔۔ عبث خواہی کشید آزار بسیار[4]

ایسا دو ٹوک جواب سن کر مہیار اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا، اور وہ جنگل جنگل گھومنے لگا۔

---

[1] ایضاً ۔۔۔ [2] ایضاً ورق ۶۳

[3] ایضاً ۔۔۔ [4] ایضاً ورق ۶۴

اتفاق سے ایک راجہ نے جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے مہیار کو دیکھا اور اس کی ناکام محبت پر ترس کھا کر اپنے یہاں لے آیا۔ راجہ نے اس کی دلدہی کے لیئے یہ حکم دیا کہ :-

به هر جایی که زنهای شکیل اند — نمایند جا به جا هر جا جمیل اند
به فرموده عمل کردند هر روز — همیشه می نمود عشق جانسوز
به قرب سال می بردند این را — نمودند بهتر از خوبان چنین را[1]

لیکن مہیار کا یہ حال تھا :-

نه کس را دید و نه بر کس نظر کرد — نه حرفی گفت و نه از خود خبر کرد[2]

آخر کار درباریوں کے مشورے سے بادشاہ مہیار کو لے کر سندرپٹن روانہ ہوا۔ دیار حبیب میں پہونچتے ہی مہیار کی افسردگی ختم ہو گئی :-

چو دیوانه مکان اصل خود دید — به خوش وقتی به یاد یار خندید
شه از خندیدن او شاد گشته — که شاید مطلبش ارشاد گشته
به زودی برد تا بتخانه او را — برای دیدن جانانه او را[3]

مندر میں چندربدن بھی پوجا کرنے آئی تھی۔ جب مہیار نے اسے دیکھا تو بے اختیار

دو پای آن صنم را بر گرفته — ز آب چشم پای یار شسته
همی میداد بوسه بر دو پایش — به سجده گشته هر دم جبهه سایش
چو آن معشوق بی پروا چنین دید — به رمزش گفت ای خواهان امید
نمردی، زنده ای تا حال؟ الله — قیاسم بود، مردی، بارک الله[4]

یہ طنز سنتے ہی مہیار کی روح پرواز کر گئی۔ اب ایک اور وقت یہ پیش آئی کہ مہیار کا

---

[1] ایضاً ورق ۶۶ [2] ایضاً
[3] ایضاً ورق ۶۷ [4] ایضاً ورق ۶۸

تابوت چندر بدن کے محل کی طرف چلا اور اس کے محل کے نیچے پہونچ کر رک گیا۔ جب تابوت آگے لے جانے کی ساری کوششیں بیکار ہوگئیں تو راجہ نے چندر بدن کے باپ کو صورت حال کی خبر کی۔ چندر بدن کو واقعہ کا علم ہوا تو اس نے غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، ایک عالم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی اور تابوت محل میں منگا کر عاشق کے پہلو میں ابدی نیند سو گئی:-

به اول غسل کرد و ساز پوشید	به تسبیح و عبادت باز کوشید
ز دل رو ساخت فکر چند سالش	به دین احمدی گشته وصالش
بگفت و رفت در خواب آن صنوبر	چو روح پاک او در رفت یکسر
ز قالب رفت جان آن پریزاد	به عشق جان جانان جان خود داد[1]

اس کے بعد مثنوی کی بحر تبدیل ہو جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:-

به سحر دگر شو که وقت وصال	نگردد ترا ہیچ بر دل ملال
بیا نی جہان آخرش فانی است	پی ہر کسی مرگ خوش بانی است
پی زندگی چند باشد کسی	که مرگ است خود در پی ہر کسی
کجا آن مہیار و چندر بدن	یکی سرو بود و یکی گلبدن
دو عاشق عجب عاشقی ساختند	پی یکدگر جانہا باختند[2]

دفن سے پہلے جب مہیار کا کفن سرکایا گیا تو وہ چندر بدن کے ساتھ بغل گیر تھا۔ آخر دونوں کو ایک ہی قبر میں سلا دیا گیا:-

میان شان جدائی نبود دلشد — دو تن بود و یک روح در ہر دو بد[3]

اوپر کے اقتباسات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ عشق نامہ ایک پھسپھسی نظم

---

[1] ایضاً ورق ۷۰۔

[2] ایضاً ورق ۷۰

[3] ایضاً ورق ۷۱۔

ہے جس میں زبان و بیان دونوں کی خامیاں موجود ہیں بیانی نے اپنے بارے میں صحیح کہا ہے:

بیانی شعر گوئی را چہ داند ہمیشہ مدح شعرا باز خواند[1]

لمعات الطاہرین

غلام علی بن محمد علی دکنی کی مثنوی لمعات الطاہرین شیعہ عقائد کی رو سے اخلاق اور تصوف پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک نثری دیباچہ ہے جس میں شاعر کہتا ہے کہ میں اورنگزیب کے عہد میں قلعہ مفتاح الفتوح کی حراست پر مامور تھا۔ ایک دن میرے پاس دقیقہ شناس حقائق اللہ محمد رضا آئے۔ ان کے پاس تصوف کی ایک کتاب تھی الم کے بیان میں۔ جس میں مصنف نے یہ بتایا تھا کہ الم میں الف اللہ کا ہے، لام رسول اللہ کا اور میم مظہر عالمیان کا۔ محمد رضا نے کہا کہ مجھے لام رسول کا مطلب نہیں سمجھ میں آیا۔ چنانچہ میں نے اس کی تشریح کے لئے یہ مثنوی لمعات الطاہرین تصنیف کی اور علی کے اعداد کی مناسبت سے اسے ایک سو دس لمعات میں منقسم کیا۔ لمعات الطاہرین کا سال تصنیف ۱۱۰۸/۹۷-۱۶۹۶ ہے[2]۔

مثنوی میں شعریت کم اور وعظ و پند زیادہ ہے۔ اس کی طوالت اکتا دینے والی ہے۔ یہاں نمونہ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

ایا شاہ ساقی بدہ جام را بکن پختہ زان می من خام را
کہ آن عشق آسان بہ اول نمود بسر بردنش سخت مشکل نمود

---

[1] ایضاً ورق ۶۱

[2] لمعات الطاہرین، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۸۱۸، ورق ۳-۲۔

عنایت کن از جام خود جرعہ ام | بہ مستی آن دار ثابت قدم
ایا ساقی خوش لقا مرحبا | بدہ جام می تا ببینم ترا
کہ راہ خرابات را سر کنم | دران ذکر یاد تو از بر کنم
بہ اوصاف عشقت شوم درفشان | نفسہای خوش آورم در بیان[1]

مثنوی اہل بیتی

مثنوی اہل بیتی مختلف حکایات پر مشتمل ایک اخلاقی اور صوفیانہ مثنوی ہے۔ اس کا مصنف اہل بیتی ہے جو شیخ محمد بن شیخ احمد کا مرید تھا، شاعر نے اپنے مرشد کی شان میں پرجوش مدحیہ شعر کہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دہلی میں ان کا وجود باعث نشاط و انبساط ہے۔
اہل بیتی نے اورنگزیب کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں اس کی مدح میں ایک مستقل قصیدہ لکھنا چاہتا ہوں۔ غالباً اس مثنوی کا سال تصنیف قبل ۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷ ہے، کیونکہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ پر یہی سال مہر ہے۔ مثنوی کے آخر میں کسی امیر سے خطاب ہے جو اہل بیتی کا مربی ہے اور جس کی ملازمت میں ہمارے شاعر کی زندگی صرف ہوئی۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:-

بہ ہنگام سحر مرغ خوش آواز | ترنم می کند در پردۂ راز[2]

*

---

[1] ایضاً ورق ۵۴۔

[2] ریو ۲/۸۷۵۔

عشقیہ پنجاب

ہیر رانجھا کی داستان فارسی شعرا اور نثر نویسوں کے لئے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے
دسیوں شاعروں نے اس داستان کو نظم کرنے میں اپنی صناعی کے جوہر دکھائے ہیں. عہد اورنگزیب میں
یہ داستان پنجاب کے ایک شاعر چنابی[1] نے نظم کی. ہمارے شاعر کا نام مینا تھا اور وہ ضلع گجرانوالہ
(مغربی پاکستان) میں گڑھ کلاس کے حکیم درویش کا بیٹا تھا. اس نے یہ مخصوص تخلص دریائے چناب
سے وابستگی کی بنا پر اختیار کیا. چنانچہ کہتا ہے:-

سعدی از شیراز و میر از دہلی و جامی زجام | صائب از ایران، چنابی تازہ گوئی از چناب[2]

چنابی شیخ فریدالدین گنج شکر کا معتقد اور ایک مقامی بزرگ شیخ نظام الدین کا مرید تھا.
اس نے مثنوی میں ان دونوں سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:-

معدن زبرای علم و دین است | این خسرو را نظام دین است

مرجع بہ طبم، دگر سخن سنج | شہرہ بہ مریدی شکر گنج[3]

دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ چنابی خود بھی اچھا طبیب تھا. اس کے والد حکیم
درویش بھی اپنے دور کے ممتاز طبیبوں میں تھے اور اپنی حذاقت کے صلہ میں شاہجہاں سے
جاگیر بھی پائی تھی. طب میں سکھ پران کے نام سے ان کی ایک تصنیف بھی ہے[4].

---

[1] چنابی کی یہ مثنوی اور غزلیات قاضی فضل حق صاحب (پاکستان) کے پاس محفوظ ہیں. انھوں نے اس پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا تھا جو "پنجابی قصے فارسی زبان میں" مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، لاہور جلد اول میں شامل ہے. موجودہ اطلاعات وہیں سے لی گئی ہیں.

[2] پنجابی قصے فارسی زبان میں ۱/ ۹-۱۰۸.

[3] ایضاً ۱/ ۱۱۴، ۱۱۲.

[4] ایضاً ۱/ ۱۱۰.

چنابی کی یہ مثنوی جس کا عنوان عشقیہ پنجاب ہے، ۹۹-۱۶۹۸/۱۱۱۰ میں کوٹ کمالیہ ضلع منٹگمری (مغربی پاکستان) میں مکمل ہوئی۔

این قصہ بہ عہد شاہ اورنگ — بگرفت بہ نظم فارسی رنگ

کردم بہ ہزار احتراممش — در کوٹ کمالیہ تمامش

تاریخ دعاست بہر این باغ — "بد" دور چنابی از چنین باغ [۱]

شاعر کہتا ہے کہ جب میں نے ہیر وماہی کا قصہ سنا تو مجھ پر ایک عجیب تاثر ہوا، اور میں نے اسے فارسی میں نظم کرنا شروع کیا کیونکہ اس سے پہلے پنجاب میں کسی نے یہ قصہ نظم نہیں کیا تھا، مگر اس کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ چنابی سے پہلے یہ داستان فارسی میں منتقل ہو چکی تھی:۔

مشغول شدم بہ ہیر و ماہی — چون خلق بہ ورد صبح گاہی

آرایش نظم دادم اورا — بر کرسی زر نہادم اورا

ممتاز بہ فارسیش کردم — آزاد ز ہند دیش کردم

کس بودہ نہ پیش زین بہ پنجاب — ساقی زپی می چنین ناب [۲]

چنابی کی مثنوی ہلکی پھلکی اور شیریں زبان میں ہے، اس میں محاکات اور مکالمہ کی خوبصورتی بھی ہے اور انداز بیان کی بے تکلفی بھی۔ دیکھئے ہیر جب گھر سے بیماری کا بہانہ کر کے رانجھا کے پاس پہونچتی ہے تو اس سے معذرت کرتی ہے:۔

گفتا کہ من از تو شرمسارم — حق غم تو کجا گذارم

کردی بہ من اختیار خواری — پوشیدن دلق خاکساری [۳]

لیکن رانجھا جواب دیتا ہے:۔

---

[۱] ایضاً ۱/ ۱۰۸۔

[۲] ایضاً ۱/ ۱۱۷۔

[۳] ایضاً ۱/ ۱۳۵۔

این دادۂ تست ہرچہ دارم   من کہ ز قدیم خاکسارم

اب ہیر کی باری ہے :-

من ہم بہ توسعی کم نکردم   از طعنۂ خلق غم نکردم
دیدم کہ چو شوہر است غیور   خود را بہ بہانہ کردہ رنجور[1]

اسی طرح جب ہیر اور رانجھا فرار کی کوشش میں پکڑے جاتے ہیں اور قاضی کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو ہیر کہتی ہے :-

گفتا من و او دو عشقبازیم   از خواہش نفس بی نیازیم
کابین بہ کفم اگرچہ ننہاد   دیگر چہ دہد چو دل بہ من داد

اور رانجھا اس کی تصدیق کرتا ہے :-

معشوق من است، زن چہ باشد؟   چون جان من است، تن چہ باشد؟[2]

چنابی ایک اچھا غزل گو بھی تھا۔ اس کی منتخب غزلیں اتفاق سے اسی مثنوی کے نسخہ میں محفوظ ہیں۔ ان سے اس کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے اور اس صنف میں اس کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً چنابی کی صحیح عمر کا علم نہیں لیکن غزل کے بعض اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا :-

خو کن بہ عبادت ای چنابی   کایام نشاط و عیش بگذشت
خمیدہ پشت زپیری خود چنابی نیست   بہ خاک کوی تو گم کردہ عمر می جوید[3]

ہمارا شاعر اپنے ہم عصر فنکاروں سے بھی کچھ خوش نہیں تھا :-

شعر گفتم طرب انگیز، چنابی، افسوس!   منصفی نیست کسی، تا بدہد داد مرا[4]

---

[1] ایضاً   [2] ایضاً ۱/۳۹ - ۱۳۸

[3] ایضاً ۱/۱۱۵، ۱۱۶ -   [4] ایضاً ۱/۱۱۳

ہیر رانجھا کی مثنوی سب سے پہلے حیات جان باقی نے ۸۷ - ۹۸۳/۸۰ - ۱۵۷۵ میں لکھی۔ اس کے بعد عہد شاہجہاں میں اسے سعیدی نے افسانۂ دلپذیر کے نام سے لکھا۔ ۱۱۴۳/۳۱ - ۱۷۳۰ میں شاہ فقیر اللہ آفریں نے اسے نظم کیا۔ اس کے چار سال بعد احمد یار خاں یکتا کی مثنوی تصنیف ہوئی۔ اس کے بعد دس اور منظوم روایتوں کا پتہ ملتا ہے جن کی تفصیل مثنویات ہیر رانجھا مرتبہ حفیظ ہوشیارپوری میں درج ہے۔ نثر میں پانچ روایتوں کا پتہ چلتا ہے جس میں گرو داس گھنڑی ساکن سنگھترہ کی روایت سب سے مقدم ہے اور اس کا مخطوطہ ۲۱ - ۱۱۳۰/۱۰ - ۱۷۰۸ کا لکھا ہے۔ دیگر مصنفین میں منسا رام خوشابی، سیوک رام عطارد (محبت نامہ مولفہ ۹۰ - ۱۱۸۵/۷۷ - ۱۷۷۱)، علی بیگ، اور وزیر علی عبرتی عظیم آبادی (سراج المحبت مؤلفہ ۱۲۵۲/۳۷ - ۱۸۳۶) کا ذکر ملتا ہے[۱]

ظفر نامہ

سکھوں کے دسویں اور آخری گورو گوبند سنگھ کی طرف ایک انقلابی مثنوی ظفرنامہ اور گیارہ دیگر منظوم حکایتوں پر مشتمل فتح نامہ منسوب کیے جاتے ہیں۔ گورو گوبند سنگھ پٹنہ میں دسمبر ۱۶۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ننانڈیڑ (دکن) میں ۱۷۰۸ء میں انتقال کیا۔ اپنے والد گورو تیغ بہادر کی شہادت کے بعد وہ گورو گدی پر بیٹھے۔ وہ ایک صاحب دل ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انقلابی روحانی پیشوا تھے۔ ان کی نگارشات کا مجموعہ دشم گرنتھ کہلاتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ظفر نامہ اور فتح نامہ گورو گوبند سنگھ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں مگر ان کی تاریخی صداقت کے بارے میں ہمارے پاس کوئی قطعی رائے نہیں ہے۔ جہاں تک

---

[۱] مثنویات ہیر رانجھا، مرتبہ حفیظ ہوشیارپوری، (دو جلدیں) کراچی، ۱۹۵۷ء

فتح نامہ کا تعلق ہے وہ ایسی گیارہ حکایات پر مشتمل ہے جو عام طور پر عریاں اور متانت سے گری ہوئی ہیں اور عام طور پر سکھ علما گرو گوبند سنگھ کی طرف ان کے انتساب سے احتراز کرتے ہیں۔ البتہ ظفر نامہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ واقعی ان کے قلم کا نتیجہ ہے یا ان کے کسی عقیدت مند شاگرد کے قلم کا نتیجہ ہے۔

ظفر نامہ تقریباً ایک سو گیارہ اشعار پر مشتمل ہے، ان اشعار کا روئے سخن اورنگزیب کی طرف بتایا جاتا ہے۔ ان کا انداز باغیانہ ہے۔ نظم کے بیشتر اشعار میں وزن اور عروض کی خامیاں ہیں مگر ان میں خاصا جوش اور ولولہ ہے۔ یہاں چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:-

به نام خداوند تیغ و تبر — خداوند تیر و سنان و سپر

خداوندان مردان جنگ آزما — خداوند اسپان پا در ہوا

ترا ترکتازی به مکر و ریا — مرا چاره سازی به صدق و صفا

تو خاک پدر را به کردار زشت — به خون برادر بدادی سرشت

زکوه دکن تشنه کام آمدی — زمیوار ہم تلخ کام آمدی

به سوگند تو اعتباری نماند — مرا جز به شمشیر کاری نماند[1]

مسعود نامہ

عارف لاہوری نے سلطان محمود غزنوی کے لڑکے مسعود کی شان میں ایک مثنوی تحریر کی اور اس کا نام مسعود نامہ رکھا۔ یہ مثنوی ۱۱۱۸/ ۱۷۰۷ء میں شروع ہوئی اور اگلے سال مکمل ہوئی۔[2] عارف لاہوری عہد[3] اورنگزیب کے مشہور شعرا میں تھے۔ ان کا نام خیراللہ

---

[1] ظفر نامہ گورو گوبند سنگھ مترجمہ سردار گوردیال سنگھ، دہلی جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۶۶

[2] ایضاً ۲/ نمبر ۳۰۳۶۔ [3] ریاض الشعرا ورق ۲۷۷۔

تھا[1]. وہ کچھ دنوں تک ہمت خاں ناظم الہ آباد سے متعلق رہے[2]. انھوں نے ملا سالک قزوینی کی صحبتیں دیکھی تھیں اور انھیں کے کہنے پر طاہر نصر آبادی نے ان کا تذکرہ کیا ہے. خان آرزو عارف کو سرزمین سخن کا یکہ نورد اور نقاد سخن کہتے ہیں اور ان کے قصیدوں کی پختگی کی تعریف کرتے ہیں[3]. عارف نے ایک اور مثنوی مہر و ماہ بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر آزاد بلگرامی نے درج کیا ہے[4] نشتر عشق[5] کے مؤلف کا کہنا ہے کہ عارف میں علمی فضیلت نہیں تھی مگر ذہن نکتہ رس تھا اور طبیعت میں درد و سوز تھا. مؤلف ہذا اور خان آرزو عارف کو عہد شاہجہاں کا شاعر بتاتے ہیں

مثنوی بیغم

اخلاقی اور صوفیانہ مثنوی نگاروں میں سوامی بھوپت[6] رای بیغم بیراگی کا مرتبہ بہت بلند ہے اگرچہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے وہ اس عہد کے متاخرین شعرا میں ہیں. بیغم ہماچل پردیش میں نہان کے باشندہ تھے[7]. اپنے آبا و اجداد کی طرح انھوں نے بھی قانون گوئی کا عہدہ سنبھالا[8] لیکن مزاج میں شاعری تھی اور طبیعت میں قلندری، انھیں دنوں ایک خوب رو لڑکے نرائن چند سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس کے دام عشق میں ایسے گرفتار ہوئے کہ گھر بار چھوڑ کر بیراگی بن گئے. ہمیشہ بہار کے مؤلف کشن چند اخلاص کا بیان ہے کہ اس کے والد نے بیغم کو انبالہ کے صوفی

---

1. ترقیمہ مسعود نامہ (بحوالہ ایتھے)
2. ید بیضا ص ۱۸۶
3. مجمع النفائس ورق ۳۲۵ -
4. ید بیضا ص ۱۸۶
5. نشتر عشق ص ۱۱۴۵ -
6. کلمات الشعرا ص ۱۹ میں بھونت ہے ! سفینۂ بیخبر ص ۵۵ -
7. سفینۂ خوشگو ص ۱۰۱ - گل رعنا (مطبوعہ) ص ۳۲ میں نہان کے بجائے جون ہے. ممکن ہے یہ جموں ہو۔
8. ہمیشہ بہار ورق ۱۸ -

پر شیخ محمد صادق تک رہنمائی کی[۱] لیکن بیغم کی آتش روح ابھی تک شعلہ بداماں تھی، آخر وہ اپنے محبوب کے ہمنام نرائن بیراگی کی خدمت میں حاضر ہوئے[۲]۔ اور ان سے دھیان گیان کی باتیں سیکھیں۔ بیغم کی بقیہ زندگی اسلامی تصوف اور ہندو بھگتی کے ملے جلے ماحول میں گذری۔ ان کا انتقال ۱۱۳۲/۲۰-۱۷۱۹ میں ہوا[۳]۔

بیغم بنیادی طور پر صوفی شاعر تھے۔ سرخوش ان کی شاعری کے استاد تھے اور اپنے شاگرد کی ترقی پذیر شاعری کے معترف[۴]۔ بیغم نے کئی ایک مثنویاں لکھیں[۵]۔ پربودھ چندر ناٹک نظم کیا اور ایک دیوان مرتب کیا۔ ان کے کلیات میں پندرہ ہزار اشعار تھے۔ اور ان کی غزلوں اور رباعیوں کے اشعار کی تعداد چھ ہزار تھی[۶]۔

بیغم کی تصانیف میں اب صرف ایک مثنوی محفوظ ہے۔ جسے عموماً مثنوی قصص فقرای ہند[۷] کہتے ہیں۔ جیساکہ نام سے ظاہر ہے اس مثنوی میں شاعر نے ہندوستان کے صوفیوں، درویشوں بھگتوں اور سادھوؤں کے قصے بیان کئے ہیں۔ اور اسلامی تصوف اور ہندو بھگتی کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی ہے۔ بیغم عرفان و تصوف کے اس دبستان سے وابستہ تھے جس کی سرپرستی داراشکوہ نے کی تھی۔ شیخ محمد صادق اور نرائن بیراگی سے ان کی بیک وقت وابستگی اسی میلان تصوف کی نمایندگی کرتی ہے۔ ساتھ ہی بیغم داراشکوہ کے مرشد ملاشاہ بدخشی سے بھی متاثر تھے۔ وہ اپنی

---

[۱] ایضاً — [۲] سفینۂ خوش گو ص ۱۰۱۔

[۳] ایضاً — [۴] کلمات الشعرا ص ۱۹۔

[۵] نتائج الافکار ص ۱۱۲۔ — [۶] سفینۂ خوشگو ص ۱۰۲۔

[۷] سفینۂ بیخبر (حوالہ بالا) میں بیغم کی ایک مثنوی بحر المعارف کا ذکر ہے۔ مثنوی قصص فقرای ہند کا مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔ جس پر محترم ڈاکٹر سید عبداللہ نے بہت تفصیلی مقالہ لکھا ہے۔ اور ان کی کتاب 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' (دہلی، ۱۹۴۲) میں شامل ہے۔

مثنوی میں بار بار ان کا ذکر کرتے ہیں :-

وہ چہ خوش فرمود ملا شاہ ما　　　شاہ ما، آن عارف آگاہ ما

سین انسان گر نبودی درمیان　　　اول و آخر نبودی غیر آن[۱]

ملاشاہ کے علاوہ بیغم پیغمبر تصوف مولانا روم کے بیحد معتقد ہیں ان کے اشعار میں جگہ جگہ مثنوی معنوی کی چھوٹ دکھائی دیتی ہے۔ اپنی مثنوی کا آغاز بھی انھوں نے مولانا روم کے نقش قدم پر کیا ہے :-

دل تپیدنہا حکایت می کند　　　چشم خونباران روایت می کند

تا ز اصل خود جدا افتادہ ام　　　داد بیتابی چو بسمل دادہ ام[۲]

مثنوی بیغم فکر و فن کی نزاکتوں اور شعر و تصوف کی روایتوں کے اعتبار سے بہت جاندار اور نمایندہ فن پارہ ہے۔ ایک خاص ادا جو قاری کو عجیب انبساط سے ہمکنار کرتی ہے وہ بیغم کی بے لاگ جرأت گفتار ہے۔ بیغم کو یہ شدید احساس تھا کہ انھوں نے یکجہتی اور تصوف کا جو سنگم تلاش کیا ہے وہ ان کے دور کی ہندو اور مسلم دونوں سوسائٹی کے لئے گوارا نہیں، مگر بیغم کردار اور گفتار دونوں میں جرأت کے قائل تھے۔ ان کی زندگی اور شاعری کا یہی بے لاگ اور بے جھجک انداز انھیں اس دور کے عظیم شاعر ناصر علی سے بہت قریب لاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں بیغم وجود الہ پر روشنی ڈالتے ہیں :-

آن کہ حق خوانند او را خاص و عام　　　آنکہ اللہ است نامش در انام

او بود در سایۂ دیوار من　　　او بود یک غنچۂ گلزار من

علم حق در علم صوفی گم شود　　　این سخن کی باور مردم شود

یا بود این آن سخن کان مرد حق　　　بامریدان داد آخر این سبق

من دو سالم از خدای خود کلان　　　از یقین است این، نہ از روی گمان[۳]

---

[۱] ادبیات فارسی میں ہندؤوں کا حصہ، ص ۲۹۵۔ [۲] ایضاً ص ۲۹۸۔ [۳] ایضاً ص ۳۱۱

(ب) غزل گو

اس ذیل میں عہد اورنگزیب کے کم معروف غزل گو شعرا کا ذکر کیا جائے گا۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مزید تحقیق و تفتیش سے عین ممکن ہے اس عہد کے کسی اور شاعر کا دیوان دستیاب ہو جائے جس کا تذکروں میں کوئی ذکر نہیں۔

کاشفی

کالپی وسط ہند کا ایک تاریخی شہر ہے جس کی خاک سے کئی ایک صوفی اور شاعر اٹھے اس عہد میں یہاں ایک مشہور صوفی سید احمد کاشفی تھے جو فارسی اور ہندی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے والد سید محمد خود ایک صاحب دل صوفی اور قطب الاولیاء کے لقب سے ملقب تھے انھوں نے تصوف پر کئی کتابیں لکھیں اور ان کا ہندی دیوان آصفیہ لائبریری (حیدر آباد) میں موجود ہے۔ سید احمد نے اپنے والد اور شیخ محمد الہ آبادی سے تصوف اور دیگر علوم کی تحصیل کی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد ۲۴ سال کی عمر میں خلافت کی مسند پر متمکن ہوئے۔ آپ کے مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ بھی اتنا ہی وسیع تھا۔ اس دور کے مشہور انشا پرداز میر ضیاء اللہ بلگرامی آپ کے بیحد معتقد تھے۔ اور اس شعر میں آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:[1]

کالپی مکہ بلگرام یمن
ای تو احمد، منم اویس قرن[2]

---

[1] ید بیضا ص ۲۴۳۔ آزاد بلگرامی نے سید احمد اور ان کے والد سید محمد کے حالات پر ایک الگ تذکرہ انیس المحققین کے نام سے لکھا ہے جو ذخیرہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں موجود ہے۔ کاشفی پر جناب زیدی جعفر رضا نے برہان (دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۴) میں ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا۔

[2] مآثر الکرام ص ۲۴۰۔

سید احمد کو خواجہ اجمیری سے والہانہ عقیدت تھی، آپ ایک قصیدہ میں دیار جلیب سے اس طرح عشق کا اظہار کرتے ہیں :۔

ای خوشا شہر و سواد اجمیر   کہ برد غم ہمہ یاد اجمیر
شکر، صد شکر پذیرفت مرا   خواجۂ نیک نہاد اجمیر[1]

کہتے ہیں کہ خواجہ کے مزار پر ایک بار آپ سماع فرما رہے تھے، اورنگزیب ان دنوں وہیں اجمیر میں تھا، اس نے کسی کو منع کرنے کے لئے بھیجا، لیکن جو بھی آپ کے پاس پہونچتا خود اس پر ایک وجد کا عالم طاری ہو جاتا، اور آخر شہنشاہ وقت بھی آپ کی کرامت کا قائل ہو گیا۔ آپ کا وصال ۱۹ صفر ۱۰۸۴ھ / ۱۵ مئی ۱۶۷۴ء کو ہوا[2]۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا سید احمد فارسی اور ہندی دونوں زبان میں شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص کاشفی تھا۔ ان کے فارسی دیوان کے مختلف نسخے ملتے ہیں[3]۔ ہندی اشعار بھی اسی میں درج ہیں[4]۔ دیوان کاشفی کا بہترین حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، یوں تو کاشفی نے قصائد اور رباعیاں بھی کہیں۔ لیکن ان کی غزلوں میں وجد و کیف اور سوز و گداز کا عجیب عالم ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی اور احساس و تجربہ کی شدت نے ان کی غزلوں کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔

ایکہ پرسی تو ز من، منزل دلدار کجاست؟   یار ہر سو ست عیان، جان من اغیار کجاست؟
ہر کسی دعوی عرفان کند و لاف زند   آنکہ برخاست ز خود و ز ہمہ پندار، کجاست؟
ہیچ نگشود، درین صومعہ تنگ آمدہ ام   بہر حق راہ نما، خانۂ خمار، کجاست؟

---

[1] دیوان کاشفی بانکی پور نمبر ۳۴۵۴، ورق ۱۹۔

[2] ید بیضا ص ۲۴۳؛ برہان (دہلی) اکتوبر ۱۹۶۴ء؛ سفینۂ ہندی ص ۲۷۷۔

[3] برہان اکتوبر ۱۹۶۴ء۔

[4] علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں ان کے ہندی اشعار ایک علحدہ رسالہ میں ہیں۔ (برہان اکتوبر ۱۹۶۴ء)

آنکہ بیدار بود چشمش و دل خفتہ بسی است — دیدہ آلودہ بہ خواب و دل بیدار کجاست؟

کس بہ دنیا شدہ مشغول، کسی با عقبیٰ — شستہ این ہر دو ز دل، طالب زنار کجاست؟

رو بہ کعبہ ہمہ کس، منکر بتخانہ بسی — وانکہ بر رفت ز غمخانۂ انکار، کجاست؟

آنکہ از جرعہ شد از دست، بسی می بینم — وانکہ خم کردہ تہی، با دل ہشیار، کجاست؟

دل ز اسرار حق آمادہ و خاموش زبان — ذوق اظہار بسی، طاقت اظہار کجاست؟

کاشفی کشف حقائق ہمہ در مستی کرد
در کلامش بنگر شیوۂ اشعار کجاست[1]؟

اس غزل میں جو معنوی ربط و تسلسل اور جو متوازن جذباتی آہنگ ہے، وہ بیحد قابل تعریف ہے۔ دراصل کاشفی کی شاعری حال کی شاعری ہے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ بنیادی طور پر وہ صوفی ہیں شاعر نہیں۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے غزلیہ شاعری کو جو کچھ عطا کیا وہ ہر لحاظ سے وقیع اور پرارزش ہے۔

سخن گرچہ گفتن ندانم، بدانم — ولی بہتر از شاعران زمانم

اگر ہندیم، رشک اہل عراقم — وگر خاکیم، نور نورانیانم

چو برق است طبعم، چو ابر است کلکم — چو دریاست نظمم، چو باد است زبانم

ضعیفم ولی ایستادہ بہ میدان — بگویم کہ من رستم داستانم[2]

کاشفی کی شاعری کسی بیرونی محرک کی احسان مند نہیں۔ عشق کی کلاسیکی داستانیں ان کے دل کو نہیں گرماتیں کیونکہ خود ان پر جو گذرتی ہے وہ مجنون و فرہاد سے کہیں زیادہ دلگداز ہے۔

بامن مگو حکایت مجنون کہ صبح و شام — حیرت زدہ ز قصہ و افسانۂ خودیم[3]

---

[1] دیوان کاشفی ورق ۴۲۔ [2] برہان اکتوبر ۱۹۶۴ء

[3] ایضاً۔

بیخود

ملا جامی بیخود لاہوری تاریخ گوئی میں بڑے ماہر تھے۔ سرخوش نے ان کی چند دلچسپ تاریخیں نقل کی ہیں۔ مثلاً وزیر اعظم اسد خاں کے لڑکے ذوالفقار خاں کی ولادت کی تاریخ انھوں نے اس مصرع سے نکالی:۔

'زبرج اسد رو نمود آفتاب' (۱۰۶۷ھ)

اسی طرح "شرف یار کامگار" سے کامگار خاں کے لڑکے شرف یار کے تولد کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ بیخود نے اپنی انگوٹھی پر یہ سجع کرا رکھا تھا۔

"جامی از جام حمد بیخود شد"

اور سرخوش نے اسی مصرع سے ان کی تاریخ وفات ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ نکالی[۱]۔

بیخود نے ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار چھوڑی۔ ان کی مثنوی جس کا عنوان ان کے مربی نواب نامدار خاں کے نام پر 'حسن نامدار خانی' تھا، غالباً اب موجود نہیں ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس میں حسن و دل کا قصہ منظوم کیا گیا تھا۔ سرخوش نے اس کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں:۔

یکی را سادہ رخ آئینہ آسا	یکی را جوہر از آئینہ پیدا
گلستان یکی بی سنبلستان	یکی را بوستان گرد گلستان[۲]

دیوان بیخود غزلیات پر مشتمل ہے۔ سرخوش کا بیان ہے کہ دیوان میں دلچسپ قصائد اور قطعات بھی ہیں[۳]۔ اور بقول شفیق وہ پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے[۴]۔ موجودہ دیوان[۵] میں صرف

۱؎ کلمات الشعرا ص ۱۱
۲؎ ایضاً ص ۱۲
۳؎ ایضاً
۴؎ گل رعنا ورق ۵۵۔
۵؎ دیوان بیخود، بوہار، نمبر ۴۰۰

غزلیں ہیں۔ اور ترقیمہ میں اسے دیوان بیخودی بتایا گیا ہے۔ بیخود کی غزلوں میں بہت حسین رچاؤ اور تغزل ہے۔ ان کے طرز بیان میں شیرینی اور ان کی زبان میں بڑی پیاری مٹھاس ہے۔ مندرجہ ذیل غزل ملاحظہ فرمائیے :۔

رنگ شفق از لعل می آشام تو پیدا　　خورشید می از آئنہ جام تو پیدا
شام ابد از غالیۂ زلف تو مدہوش　　صبح ازل از عارض گلفام تو پیدا
شہد و شکر و آتش یاقوت و می ناب　　درہم شد و شد لعل می آشام تو پیدا
بیخود نفس صیقل آئینۂ جان شد　　باشد بہ نگین دل او نام تو پیدا[1]

بیخود کی شاعری میں ایک والہانہ ربودگی اور عاشق مزاجی کی لطیف کیفیت ہے۔ ان ہلکے پھلکے اشعار میں فن کا حسن بھی ہے اور جذبہ کا خلوص بھی :۔

آرزو بد نیست بیخود، گر خدا روزی کند　　سیر ماہ و ساغر می، حسن یار نیمرنگ
می شود بیخود چو گوہر خانہ ام لبریز نور　　گر گشاید ماہ من بند قبا در کلبہ ام
سرداد شمع و حاصل عمر دوبارہ یافت　　ای دل بہ خون دل نہ تپیدی، چہ شد ترا؟
ز دہر منت بیہودہ چون کشد بیخود　　کہ گردہ است ز خون جگر تر نم ما[2]

بیخود شاعری میں کس کے شاگرد تھے، معلوم نہیں۔ انھوں نے خود راقم اور تجلی کا ذکر عقیدت سے کیا ہے :۔

بیخود شدم ز مصرع راقم کہ گفتہ است　　'چون شمع می کشم نفس آتشین در آب
در خموشی بیخود استادم تجلی شد کہ گفت　　'سایۂ من سرمۂ آواز پایم گشتہ است'[3]

مگر ان کا شمار اپنے دور کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ سرخوش کا بیان ہے کہ جب میں نے اپنا

---

[1] ایضاً ورق ۵۔　　[2] ایضاً ورق ۶۱، ۶۴، ۳، ۹۔
[3] ایضاً ورق ۱۴، ۱۸۔

تخلص اختیار کیا تو بیخود کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے مجھے دعا دی[1]۔ بہرحال بیخود کی شاعری فنکارانہ بصیرت کی تخلیق ہے۔ ذیل میں بیخود کی ایک غزل درج کی جاتی ہے اس زمین میں اور شعرا بھی طبع آزمائی کرچکے ہیں :-

تا دل زمہر عارض جانانہ پر شدہ است ۔۔۔ چون گوہر از فروغ دلم خانہ پر شدہ است

ہر موج بادہ چشم غزال رمیدہ است ۔۔۔ از گردش نگاہ کہ پیمانہ پر شدہ است؟

شد تنگ ہمچو غنچۂ دل داغ ہر نفس ۔۔۔ حیرانم از خیال کہ کاشانہ پر شدہ است!

ہر جا دلی است بسمل تیغ نگاہ اوست ۔۔۔ سوزیم ہمچو شمع کہ پروانہ پر شدہ است

موی سفید پنبہ مینای زندگی است ۔۔۔ غافل زخود مباش کہ پیمانہ پر شدہ است

بیخود فریب زاہد دل بیخبر مخور
آگاہ شو کہ عاقل و دیوانہ پر شدہ است[2]

لطف اللہ مہندس

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار خصوصی استاد احمد معمار لاہوری کا خاندان ہندسہ اور ہیئت میں ہندوستان میں اپنی نظیر آپ تھا۔ استاد کے تین لڑکے تھے اور تینوں اپنے فن میں یکتا اور بے مثل تھے۔ بڑے لڑکے کا نام عطاء اللہ رشیدی تھا، منجھلے کا لطف اللہ اور چھوٹے کا نور اللہ۔ لطف اللہ مہندس تخلص کرتا تھا۔ اس نے دیوان مہندس کے عنوان سے اپنے شعر مرتب کئے۔ اتفاق سے اس نادر دیوان کا ایک نسخہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو ہاتھ آگیا تھا اور انھوں نے اس خاندان پر ایک جامع مضمون لکھا تھا جو مقالات سلیمان حصہ اول میں شامل ہے[3]۔ یہاں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اسی مقالہ سے ماخوذ ہے۔

---

[1] کلمات الشعرا ص ۱۲۔ [2] دیوان بیخود ورق ۲۳۔

[3] سید سلیمان ندوی: مقالات سلیمان مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے۔ حصہ اول اعظم گڈھ ۱۹۶۶ء ص ۲۹۵ - ۳۵۲ - (باقی اگلے صفحہ پر)

جیسا کہ کہا گیا استاد احمد کے تینوں لڑکے اپنے فن میں لاجواب تھے۔ دیوان مہندس میں ایک مختصر مثنوی خاندانی حالات سے متعلق ہے۔ اس میں عطاء اللہ کے بارے میں یہ اشعار ہیں:-

پس سہ پسر ماند زمرد سنگ — زان سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

نادر عصر خود و مشہور دہر — عالم و علامہ دانای شہر

نثر وی از آب روان پاک تر — نظم خوشش غیرت سلک گہر

عطاء اللہ کی تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے:-

۱۔ بیج گنت

۲۔ خلاصہ راز

۳۔ خزینۃ الاعداد۔

اول الذکر مشہور سنسکرت کتاب کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ فیضی لیلاوتی کے عنوان سے اس کا ترجمہ کرچکا تھا۔ عطاء اللہ کا ترجمہ ۱۰۴۴/۳۵-۱۶۳۴ میں مکمل ہوا۔[1] عہد اورنگزیب میں بیج گنت کا ایک ترجمہ ۱۰۷۵/۶۵-۱۶۶۴ میں برہانپور میں کیا گیا۔[2] خلاصہ راز[3] اور خزینۃ الاعداد[4] دونوں ۱۰۶۷/۵۷-۱۶۵۶ کی تالیف ہیں اور ریاضی، مساحت اور جبر و مقابلہ سے متعلق ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) اس نادر دیوان کا نسخہ دار المصنفین میں نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اپنی کتاب تاج محل (لاہور، ۱۹۳۳ء، ص ۱۵۴) میں لکھا ہے۔ سید صاحب کو یہ نسخہ بنگلور کے کسی صاحب نے بھیجا تھا۔ انھوں نے غالباً انھیں واپس کر دیا۔

[1] نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ نمبر ۶۵ (ریاضی)، کتب خانہ سعیدیہ، حیدرآباد۔

[2] آصفیہ (بحوالہ مقالات سلیمان ص ۳۰۸) [3] برٹش میوزیم

[4] بمبئی یونیورسٹی نمبر ۱۰۷۔

عطاء اللہ بہترین معمار تھا۔ اورنگزیب کی ملکہ رابعۃ الدورانی کا روضہ جو تاج محل کی ہو بہو نقل ہے، اسی کی تعمیر ہے۔

لطف اللہ کے چھوٹے بھائی نور اللہ کے بارے میں مثنوی میں یہ اشعار ملتے ہیں:۔

ثالث آن سہ برادر بہ سال	آمدہ نور اللہ صاحب کمال
ما ہمہ معمار و عمارت گریم	ما ہمہ استاد و سخن پروریم
لیک بود قصر کلامش عجب	زان شدہ معمار ہر او را لقب
نثر وی از نظم گہر بار تر	نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
گنج ہنر آمدہ در مشت او	ہفت قلم راندہ سر انگشت او

نور اللہ کی کسی تصنیف کا علم نہیں، البتہ اس کی خطاطی کا بہترین نمونہ جامع مسجد دہلی کی چاروں محرابوں کے اوپر کا طویل کتبہ ہے۔

منجھلا بھائی لطف اللہ مہندس تھا جس کے دیوان کے طفیل اس عظیم خاندان کے حالات معلوم ہوئے مگر اس کے حالات کا زیادہ علم نہیں۔ اس کے اشعار سے مختصراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام لطف اللہ اور لقب مہندس تھا:۔

گرچہ مہندس لقبم از شہ است	نام من دل شدہ لطف اللہ است

اس نے دیوان میں جگہ جگہ اپنی معماری پر فخر کیا ہے۔ مگر دیوان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے داراشکوہ کا ایک قصر ۱۰۶۰/۱۶۵۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ سفینۂ خوشگو کی مندرجہ ذیل عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کا لال قلعہ بھی اس کی نگرانی میں تعمیر ہوا:۔

"ملا لطف اللہ مہندس لاہوری است کہ قلعہ ارک دار الخلافہ شاہجہان آباد بہ تجویز و صوابدید او بنا یافتہ"[1]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۱۹۱

لطف اللہ غالباً داراشکوہ سے متعلق تھا۔ اس کے دیوان میں داراشکوہ اور اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کی مدح میں دو قصیدے ہیں۔ داراشکوہ کے زوال کے بعد شاعر کو کچھ دنوں تک ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔ دیوان میں ایک غزل ہے جس سے اس شبہہ کو تقویت پہونچتی ہے:۔

شہا گوش بر داد خواہی نداری — بہ حال گدایان نگاہی نداری

رقیبان بہ قتلم نوشتند فتوی — وگرنہ تو ہرگز گناہی نداری

جہان سر بسر خیر خواہ تو باشد — ولی ہمچو من خیر خواہی نداری

مہندس ازان رو نداری وقاری — کہ چون زاہدان خانقاہی نداری

ایک شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطف اللہ کو درس و تدریس سے شغل تھا:۔

عمر در درس بسر بردی و در آخر کار — ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدال

عہد اورنگزیب میں لطف اللہ کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا پتہ چلتا ہے۔ ۹ ربیع الثانی ۱۰۷۰/ دسمبر ۱۶۵۹ کو وہ اپنے عہد کے مشہور معمار خواجہ جادورائے، استاد شیورام رائے اور استاد حامد کے ساتھ شادی آباد مانڈو گیا تھا اور ہوشنگ شاہ کے مقبرہ کے پاس عالمگیر دروازہ پر اپنی آمد کا ایک آہنی کتبہ نقش کرکے لگا دیا تھا۔ بہرحال وہ ۱۰۹۲/ ۸۲-۱۶۸۱ تک حیات رہا جب اس نے اپنی کتاب منتخب لکھی۔

لطف اللہ کے دو لڑکوں کا ذکر ملتا ہے۔ اول امام الدین ریاضی (م ۱۱۴۵/ ۳۳-۱۷۳۲)۔ دوسرا ملا خیر اللہ۔ دونوں بیٹے معقولات میں یکتا تھے۔ انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ اول الذکر نے ۱۱۰۳/ ۹۲-۱۶۹۱ میں بہاء الدین عاملی کی تشریح الافلاک کا ترجمہ تصریح کے نام سے کیا۔ اس کے بعد ۱۱۰۷/ ۹۶-۱۶۹۵ میں معانی و بیان پر ایک رسالہ بیانیہ لکھا۔ جسے زیب النساء نے بہت پسند کیا۔ اس نے دو اور کتابوں یعنی شرح چغمینی اور شرح خلاصۃ الحساب[۱] پر حاشیے لکھے۔

---

[۱] انڈیا آفس نمبر ۷۶۱۔

ملا خیر اللہ نے عہد محمد شاہی میں اپنا نام پیدا کیا۔ محمد شاہ کے دور میں راجہ جے سنگھ نے مختلف شہروں میں جو رصد خانے بنوائے تھے، اس کا نگراں یہی خیر اللہ تھا۔ خیر اللہ نے چند تصانیف یادگار چھوڑیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:۔

۱۔ تقریر التحریر۔ تحریر اقلیدس خواجہ طوسی کا فارسی ترجمہ۔

۲۔ تقریب التحریر۔ مجسطی طوسی کا فارسی ملخص ترجمہ

۳۔ شرح زیج محمد شاہی۔

۴۔ حاشیہ بر بست باب در معرفت اصطرلاب خواجہ طوسی۔

۵۔ شرح زلالی، شرح حافظ، شرح سکندر نامہ۔

۶۔ الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصرفیۃ المحققیہ۔ وحدۃ الوجود پر عربی تصنیف (۱۱۱۸/ ۰۷-۱۷۰۶)

۷۔ السبع الثوابت۔ طب پر عربی تصنیف (۱۱۱۹/ ۰۸-۱۷۰۷)

۸۔ مدخل۔ نجوم پر فارسی منظوم رسالہ (غالباً عہد محمد شاہی)

لطف اللہ مہندس کے دیوان میں چار قصیدے، غزلیں، خاندانی حالات پر مشتمل ایک مثنوی اور چند دیگر قطعات وغیرہ ہیں۔ پہلا قصیدہ نعت میں ہے، دوسرا دارا شکوہ کی مدح میں تیسرا سلیمان شکوہ کی مدح میں اور چوتھا معشوق کا سراپا ہے۔ اس کی غزلیں عام انداز کی ہیں۔ البتہ اس کے مقطعے بہت جاندار ہیں۔ اور عموماً اس نے اپنے تخلص کی مناسبت سے کوئی بات پیدا کی ہے۔ مثلاً

مہندس گرچہ آگہ بود زین پیش فرامش کرد قانون شفا را

باشد ز فلک مہندس آگاہ با آنکہ نشستہ بر زمین است

ہان حرف زمین بگو مہندس تا کی ز فلک کنی حکایت

تا بہ کی شکل زمین خواہی کشید رو مہندس صورت افلاک کش

بعض اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی فسوں کاری نے مہندس کی ساری فضیلت خطرہ میں ڈال دی تھی، کہتا ہے :-

ہمچو لطف اللہ احمد کوس دانش می زدم — چون شدم عاشق، بہ جہل خویش کردم اعتراف

شہا اگرچہ عمارت گری ست پیشہ من
دگرچہ نیست ضمیرم ازین ہنر عاری
کنون کہ ملک دلم شد خراب عشق بتان
تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بہ معماری

بہرحال مہندس کی شاعری میں کہیں ہیئت و ہندسہ کی خشکی نہیں. اس کی حسن پرست طبیعت ہر جگہ اپنی رومانیت کے جلوے دکھاتی ہے. مندرجہ ذیل غزل ملاحظہ فرمائیے :-

یاران ہلال عید برآمد نظر کنید	ماہ صیام رفت، مغان را خبر کنید
یاران دگر بہ کوری مفتی و محتسب	امروز خاک میکدہ کحل بصر کنید
آنکس کہ از برآمدن مہ خبر کند	او را بہ احترام دہن پر شکر کنید
اکنون رسید کوکبۂ عیش و انبساط	ای درد و غم ز مملکت دل سفر کنید
گر در من و نگار مہندس شود حجاب	دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

لطف اللہ مہندس کی کچھ اور تصانیف کا پتہ چلتا ہے .

۱. صور صوفی . یہ مشہور ہیئت داں عبد الرحمن صوفی (م. ۳۷۶/ ۸۷-۹۸۶) کی کتاب صور الکواکب کا فارسی ترجمہ ہے . یہ ترجمہ لطف اللہ نے اپنے والد کے ایما پر ۱۰۵۰/ ۴۱-۱۶۴۰ میں کیا[1] .

۲. رسالہ خواص اعداد . فارسی میں علم حساب پر مختصر رسالہ[2] .

---

[1] خود نوشت نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ .
[2] کتب خانہ سعیدیہ ، حیدر آباد .

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب۔ بہاء الدین عاملی کی عربی تصنیف کی ممزوج فارسی شرح۔ خلاصۃ الحساب کی دوسری شرح عصمت اللہ سہارنپوری نے ۷۷-۱۰۸۷/۱۶۷۶ء میں کی تھی جو چھپ چکی ہے۔

۴۔ آسمان سخن۔ تذکرہ دولت شاہ کی منظوم تلخیص (اس کا ذکر آگے آئے گا)

۵۔ سحر حلال: علم اخلاق پر غیر منقوط رسالہ۔ مصنف کا نام صرف 'ولد احمد معمار' لکھا ہے۔ کیونکہ خود اس کے نام میں نقطہ آتا ہے۔ مقدمہ میں اورنگزیب کی مدح ہے۔ ۱۰۷۲/ ۶۲-۱۶۶۱ اس کا سال تصنیف ہے۔[۱]

۶۔ منتخب۔ بہاء الدین عاملی کی خلاصۃ الحساب کی فارسی تلخیص۔ یہ تلخیص خاندان وزارت کے رکن رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحیی کی فرمائش پر کی گئی۔ اس کا سال تالیف ۱۰۹۲/۸۲-۱۶۸۱ ہے۔ اس کا عنوان تاریخی ہے۔[۲]

شیخ عبدالرشید شمسی

شیخ عبدالرشید ملقب بہ شمس الحق جونپور کے مشہور صوفی عالم تھے۔ انھوں نے اپنے والد شیخ محمد مصطفے سے علم کی تحصیل کی۔ لیکن جلد ہی انھوں نے رسمی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دینیات اور تصوف کا مطالعہ شروع کیا۔ ان کی توجہ کا مرکز خاص طور پر ابن عربی کی تصانیف تھیں جن میں سے بعض کی انھوں نے شرح لکھی یا ترجمہ کیا۔ ان کے علم و زہد کا شہرہ سن کر شاہجہاں نے انھیں دربار میں دعوت دی مگر شیخ صاحب نے انکار کر دیا۔ ان کا انتقال وطن ہی میں ۹ رمضان ۱۰۹۳/ ستمبر ۱۶۸۲ کی صبح کو ہوا۔[۳]

---

[۱] رضا لائبریری رامپور، نمبر ۴۵ (ریاضی)

[۲] بمبئی یونیورسٹی نمبر ۱۸ (ص ۱۷)

[۳] بانکی پور (۱۷۱/۱۷)

[۴] مآثر الکرام ص ۲۰۳؛ مرآت جہاں نما شیخ محمد بقا (علی گڈھ) ورق ۳۶۴ میں تاریخ انتقال ۱۰۷۶/ ۶۶-۱۶۶۵ درج ہے۔

شیخ عبدالرشید کا اصل میدان عربی علم و ادب، تصوف اور ماوراء الطبیعات تھا۔ ان کی مستقل تصانیف میں رشیدیہ، زاد السالکین اور مقصود الطالبین ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کافیہ اور شرح مختصر عضدی پر حاشیے لکھے اور ابن عربی کے بعض مقامات کی تشریح یا ترجمہ کیا۔[1]

شیخ عبدالرشید فارسی میں شعر کہتے تھے اور شمسی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں غزل قصیدہ، قطعہ، مخمس، رباعی، ترجیع بند اور چند مختصر مثنویاں ہیں۔ شمسی کی شاعری کا عام انداز اخلاقی اور صوفیانہ ہے۔ مندرجہ ذیل غزل صنعت قلب کی عمدہ مثال ہے:-

دل بہ تو دادم، بیا، رحم بکن، رو نما	رحم بکن، رو نما، دل بہ تو دادم، بیا
لعل لبت بی بہا، دست ندارم بشیز	دست ندارم بشیز، لعل لبت بی بہا
وصل توام مدعا، جان بدہم در پیت	جان بدہم در پیت، وصل توام مدعا
چند بمانیم ما، بہ کہ درو گم شویم	بہ کہ درو گم شویم، چند بمانیم ما
باش بسان سہا از نظر غیر گم	از نظر غیر گم، باش بسان سہا
درد تو باشد دوا، شمسی بیچارہ را	شمسی بیچارہ را، درد تو باشد دوا[2]

اس غزل کا انداز سیدھا سادا صاف اور بے لاگ ہے۔ شمسی کی عام غزلیہ شاعری کا یہی انداز ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی رباعیاں غزلوں سے زیادہ جاندار اور دلکش ہیں۔ بمثال کے طور پر دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں:-

چون دل داری برو، دل آرام طلب	مہ روی، سمن بوی، گل اندام طلب
جامی کہ برد باغ ارم رشک ازو	چشمی کہ بود ہم می دہم جام طلب

یارب قدحی بدہ کہ سرمست شوم	یک جرعہ ازان نوشم واز دست شوم
در دہ قدحی دگر کہ گردم ہمہ نیست	چون نیست شوم زخود، بہ تو ہست شوم[3]

---

[1] مآثر الکرام (حوالہ بالا)

[2] دیوان شمسی، بانکی پور نمبر ۱۹۰۵، ورق ۳

[3] ایضاً ورق ۷۰، ۸۰۔

Zahoor Ahmad Dar
S/o Gh. Nabi Dar M.A III Semester
R/o R/o Dogripora via Bijbehara
Teh. Distt Pulwama Roll No 823/88
13-6-89

محترم

خدابخش لائبریری میں دیوان محترم کے دو نسخے ہیں[1]۔ اور بقول فہرست نگار یہ دونوں ایک ہی شاعر محترم کے ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ دونوں دیوان دو الگ الگ شاعر کے ہیں جن کا تخلص اتفاق سے ایک تھا۔ مخطوطہ نمبر ۱۹۱۸ کا شاعر محترم شاہجہاں کے دور کا شاعر تھا، جیسا کہ شاہجہاں کی شان میں اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے:۔

خسروی صاحبقران، خاقان ملک شرع دین — دور نبود گر نوازد از کرم درویش را[2]

رفت ایام غم و شادی رسید — کام محنت بادۂ راحت چشید

گفت تجدید شہ عالم پناہ — بندۂ شاہجہان عبدالحمید

می کنم از جان دعا، آمین بگو — بادشاہا! عمر و دولت بر مزید[3]

لیکن محترم نے اورنگزیب کا عہد بھی دیکھا تھا جیسا کہ اس شعر سے واضح ہوتا ہے:۔

ہمیشہ بر سریر سلطنت حق محترم دارد — بہ فضل خود دہد نصرت شہ اورنگزیب را[4]

یہ محترم نقشبندی سلسلہ کا پیرو تھا۔ اس نے جگہ جگہ خواجہ بہاء الدین سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، کہتا ہے:۔

محترم نقش بہاء الدین گرفت — شد فرید عہد را عبد فرید

صفت شاہ نقشبند این بس — کہ شدش بندہ خواجہ احرار[5]

اس نے خلفای راشدین کی منقبت میں ایک ترجیع بند لکھا ہے جس میں بند کا شعر یہ ہے:۔

---

[1] بانکی پور ضمیمہ ا/ نمبر ۱۹۰۰ و ۱۹۰۱ (انگریزی فہرست) لائبریری نمبر ۱۹۱۸ اور ۱۹۱۹ ہے۔

[2] دیوان محترم بانکی پور نمبر ۱۹۱۸ ورق ۹ — [3] ایضاً ورق ۱۱۲

[4] ایضاً ورق ۱۲ — [5] ایضاً ورق ۱۱۲، ۱۵۰۔

سرم خاک رہ ہر چار سرور | ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر[۱]

اس دیوان میں غزلوں کے علاوہ چند قصیدے، قطعے اور مسمط بھی ہیں. شاعر کے فن کا اصل حسن اس کی غزلوں میں ہے. ان نے جگہ جگہ اپنی شاعری کی تحسین و تعریف کی ہے. ایک پوری غزل در مدح خود ہے:

مطلع شعر من ابروی بتان را ماند | کہ زہر گوشہ بخوانندہ سری جنباند
نازکیہای سخن در بر این شاخ گل است | ہم مگر دست خرد بر سر خود بنشاند
رشتہ باریک بباید در اشعار مرا | کہ ز معنی سر موئی گذرد، در ماند
باغبان تازہ کند رسم گل افشانی را | گر ز باغ سخنم شاخ گلی افشاند
چشم دارم کہ روان برخورد از عمر عزیز | ہر کہ او یک غزل محترم از بر خواند[۲]

ہمارا شاعر خواجہ حافظ اور خواجہ خجندی (کمال الدین مسعود خجندی) کا مداح اور پیرو کار تھا[۳]

شد این غزل سرائی در عشق محترم را | از لطف شاہ شیراز و ز خواجہ خجندی[۴]

محترم کی غزلوں میں جو سادگی اور سلاست ہے وہ اس کی فنی مہارت کا بیّن ثبوت ہے:

خوش آنکہ بہ میخانہ غریبانہ نشینیم | چون گنج نہان در دل ویرانہ نشینیم
تقریر نمائیم غم دوری جانان | روزی کہ بہ نزدیکی جانانہ نشینیم
چون جمع بسوزیم سراپا ز غم عشق | یکچند در اندیشۂ پروانہ نشینیم
از خویش گہ نشنیتم بہ ہر حال کہ بودیم | آن بہ کہ کنون از ہمہ بیگانہ نشینیم
پیمان شکنان را نبود عہد درستی | رفتیم کہ در خدمت پیمانہ نشینیم
دیوانہ شود خاصیت صحبت ما بین | یک لحظہ کہ با عاقل و دیوانہ نشینیم[۵]

---

[۱] ایضاً ورق ۲۷۰۔ [۲] ایضاً ورق ۱۱۴

[۳] ایضاً ورق ۲۶۹ . دیوان کمال الدین مسعود خجندی عزیز دولت آبادی نے ۱۳۳۷ (شمسی) میں تہران سے شائع کیا

[۴] ایضاً ورق ۱۹۴۔

اس غزل کی طرح محترم کی بعض دوسری غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں ایک اکائی ہے جو ہم آہنگ جذبات و احساسات کے تسلسل سے وجود میں آتی ہے۔ ذیل کی غزل ملاحظہ فرمائیے:-

باز دل دیوانہ شد، دیوانہ شد	از ہمہ بیگانہ شد، بیگانہ شد
بسکہ خورد از جام وحدت جرعہ ای	مائل پیمانہ شد، پیمانہ شد
در صدف شد ز ابر نیسان قطرہ ای	گوہر یکدانہ شد، یکدانہ شد
قصۂ زاہد کہ میگفت از ریا	نزد ما افسانہ شد، افسانہ شد
گرد شمع عارض مہروی خویش	محترم پروانہ شد، پروانہ شد[1]

دوسرا دیوان جس محترم کا ہے، اس کی شاعری بیجان اور روایاتی سی ہے۔ اگرچہ اس کے یہاں بھی پہلے شاعر کی طرح طویل غزلیں ہیں اور اس نے بھی مقطع میں اپنے تخلص کا التزامًا استعمال کیا ہے۔ اس دیوان میں ۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰ کی ایک تاریخ ہے جو شاعر نے اپنے لڑکے کے تولد پر کہی ہے:-

حق محتشمی بہ محترم داد	تاریخ تولدش از آن شد رمضان[2] ۱۰۹۱

اس دیوان سے نمونہ کی ایک غزل درج کی جاتی ہے:-

رفتہ ام از خود بروں، از بو د خود رم کردہ ام	زین پریشانی دل خود را فراہم کردہ ام
روی جانان دیدہ زان پس دادہ ام جان حزین	من بہ عمر خویش کاری این چنین کم کردہ ام
نیستم فارغ ز فقر و سلطنت در روزگار	بادشاہی ہمچو ابراہیم ادہم کردہ ام
از گلستان خرد آوردہ ام گلدستہ ای	دستبرد محترم بہر مکرم کردہ ام[3]

---

[1] ایضاً ورق ۱۰۲۔

[2] دیوان محترم، بانکی پور نمبر ۱۹۱۹، ورق ۱۳۴۔

[3] ایضاً ورق ۱۰۵۔

سابق اصفہانی

سابق اصفہانی جن کا نام حاجی فریدون بیگ یا آقای فریدون حسین تھا۔ قوم کے ترک اور شاہ سلیمان صفوی کے معاصر تھے۔[۱] روز روشن[۲] کا یہ بیان اشتباہ پر مبنی ہے کہ سابق شاہ اسمٰعیل صفوی کے ہم عصر تھے۔ سابق عہد اورنگزیب میں ہندوستان آئے۔ وہ لاہور میں ۱۱۰۳/۹۳-۱۶۹۲ تک حیات تھے۔[۳]

دیوان سابق کے جو مختلف نسخے ملتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سابق نے اپنے دیوان کے کئی ایڈیشن مرتب کئے۔ ان کا خود نوشت دیوان جو انڈیا آفس لائبریری[۴] میں محفوظ ہے اورنگزیب کے ۲۸ دیں سن جلوس ۹۶-۱۰۹۵/۸۵-۱۶۸۴ کا مرتب ہے۔

اسی طرح ایشیاٹک سوسائٹی[۵] کلکتہ کی لائبریری میں دو نسخے ہیں، جو بالترتیب ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ اور ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ میں ترتیب دیئے گئے۔ مؤخر الذکر نسخہ کے آخر میں یہ عبارت ہے۔

"دیوان مظالم من است این   شرح دل ظالم من است این

این دیوان کہ حاصل عمر و زادۂ طبعم است، در بلدۂ کشمیر... حسب الامر... مرزا عبد العظیم... مرتب گردید"

اس عبارت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بھی سابق کا مرتبہ ہے اور یہ کہ سابق اس

---

۱ نشتر عشق ص ۸۵۸؛ ہمیشہ بہار ورق ۴۲۔   ۲ روز روشن ص ۲۷۷

۳ ایتھے کے نسخہ نمبر ۱۶۲۴ پر شاعر کے ہاتھ کی تحریر اور ۱۱۰۳ کا سن درج ہے۔

۴ ایتھے نمبر ۱۶۲۴

۵ ایشیاٹک ۱/ نمبر ۸۰۱، ۸۰۲۔

وقت کشمیر میں تھے۔

دیوان سابق غزل، قصیدہ، رباعی اور مسمط وغیرہ پر مشتمل ہے۔ سابق کی غزلوں میں شیرینی اور روانی ہے:۔

مردنم دور از تو آسان است | زندگی بی تو سخت دشوار است
سابق از کیفیت آن چشم آگہ نیستم | این قدر دانم کہ از خود بیخبر دارد مرا
عمر رفت و نیامدی بہ سرم | شدنی شد، دگرچہ خواہد شد[۱]

خان آرزو کا بیان ہے کہ سابق کو مرزا صائب کا شاگرد بتایا جاتا ہے[۲] مگر ان کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فائز سے مستفید تھے مگر اس شعر میں وہ صائب کو اس طرح عقیدت پیش کرتے ہیں۔

تا رقم زد کلک صائب، سابق این رنگین غزل | نی بہ ناخن می کند شیرینیٔ شکر مرا[۳]

سابق اس بات کے قائل تھے کہ شاعری ریاض اور فکر کا ثمرہ ہے، شہرت اور نمود عارضی چیزیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ فنکار کو شہرت کا صلہ نہ ملے مگر اس کے فن کی ارزش کا صلہ سے کوئی تعلق نہیں:۔

می توان تا شعر گفتن وصف شعر خود مگو | گر ہنر ور بیزبان باشد، ہنر گویا تر است
طبع عالی جوی سابق، طالع شہرت مخواہ | نیست عیب مصرعہ برجستہ گر مشہور نیست[۴]

سابق نے ہلکی پھلکی اور پیاری غزلیں کہی ہیں۔ انھیں بہت شہرت تو نہیں ملی لیکن ان کے فن کے حسن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مختصر غزل ملاحظہ فرمائیے:۔

۱؎ دیوان سابق، سالار جنگ نمبر ۳۴۹، ورق ۲۵، ۵، ۴

۲؎ مجمع النفائس ورق ۱۸۷   ۳؎ دیوان سابق ورق ۹

۴؎ ایضاً

دوش آن دلبر یگانۂ ما	بہ کنار آمد از میانۂ ما
ما شکست دل از تو می خواہیم	چہ شود بشکنی بہانۂ ما
سابق از نقش پای یار دمید	گل خورشید از آستانۂ ما
عمر طی شد بہ راہ کوی کسی	کہ ندانستہ راہ خانۂ ما[۱]

سابق کے اس دیوان میں صرف بارہ رباعیاں ہیں۔ یہ مشہور رباعی انھیں کی ہے :۔

سلطان سریرلی مع اللہ علی است	در مملکت ہستی ما شاہ علی است
مقصود ز آفرینش کون و مکان	واللہ علی باشد و باللہ علی است[۲]

اس عہد میں سابق تخلص کے دو اور شاعر گذرے ہیں ایک ملا علی نقی سابق جن کا ذکر اوپر ہوا۔ دوسرے مرزا یوسف بیگ جن کا انتقال ۱۰۹۸/ ۸۷-۱۶۸۶ میں ہوا۔ شیر خاں لودی کا بیان ہے کہ مرزا یوسف بیگ سابق نے کبھی کوئی خمریہ شعر نہیں کہا[۳]۔

اعجاز اکبر آبادی

شیخ محمد سعید اعجاز آگرہ میں پیدا ہوئے[۴]۔ انھوں نے اس عہد کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز عزت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[۵]۔ جو مرزا عبدالقادر بیدل اور ایزد بخش رسا کے بھی استاد تھے۔ اعجاز کو اپنے استاد سے بہت عقیدت تھی اور بیشتر اوقات وہ ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ عزت کے انتقال کے وقت بھی اعجاز ان کے پاس موجود تھے[۶]۔ بعد میں اعجاز

---

[۱] ایضاً ورق ۴   [۲] ایضاً ورق ۶۱

[۳] مرآۃ الخیال ص ۲۳۹۔

[۴] مرآۃ الخیال ص ۳۴۰ ؛ سفینۂ خوشگو ص ۳۶ میں ان کا وطن شاہجہاں آباد لکھا ہے۔

[۵] سفینۂ خوشگو ص ۳۶۔   [۶] مآثر عالمگیری ص ۱۶۴۔

نواب مکرم خاں سے منسلک ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۱۷/۰۶-۱۷۰۵ میں ہوا[1]

اعجاز بڑے پایہ کے عالم تھے۔ تصوف اور مذہب میں ان کی اچھی دستگاہ تھی۔ خان آرزو انھیں سید فاضل کہتے ہیں اور ان کی عارفانہ شاعری کی تعریف کرتے ہیں[2]۔ اعجاز نے اگرچہ شہرت عام نہیں پائی مگر اپنے عہد میں ان کا شمار بیدل، ناصر علی اور فطرت جیسے بزرگ شعرا میں ہوتا تھا[3]۔ بوڈلین کتب خانہ میں دیوان اعجاز کا ایک نسخہ موجود ہے جو ۱۰۹۷/۸۶-۱۶۸۵ میں لکھا گیا تھا[4]۔ اس دیوان میں بیشتر غزلیں ہیں۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں دیوان اعجاز کا ایک مختصر انتخاب موجود ہے[5]۔ جس میں صرف ردیف تا تک کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ ان چند اشعار سے اعجاز کی شاعری پر کوئی خاص رائے نہیں ظاہر کی جا سکتی مگر ان اشعار سے شاعر کے مزاج، اور میلان کا کچھ حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ خود اپنی شاعری کے بارے میں اعجاز کا خیال ہے کہ :-

رو بہ ہر کس نکند شاہد معنی اعجاز   صدف ما گہر از دیدۂ بینا چیدہ است

اعجاز گفتگوی تو تحسین ہر ندا است   شادابی سخن ز سخن آفرین طلب[6]

حافظ کی پہلی غزل کے تتبع میں اعجاز کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے :-

مشو صحرا نشین آرزو، بگذر ازین وادی   کہ در ہر گام من چون نقش افتاد است محملہا

یکی در بزم دلسوزی، یکی در محفل زاری   بہ یادش بلبل و پروانہ می سازند محفلہا[7]

اعجاز کی زندگی اور شاعری میں وقار اور عظمت نفس کی بہت اہمیت تھی۔ ان کی غزل میں انداز بیان کی جو تمکنت اور خیالات کی جو عظمت ہے وہ انھیں بیدل اور ناصر علی کے بہت

---

[1] گل رعنا ورق ۳۲۔   [2] مجمع النفائس ورق ۲۵

[3] کلمات الشعرا ص ۶   [4] بوڈلین نمبر ۱۱۴۱

[5] انتخاب دیوان محمد سعید اعجاز (مشمولہ انتخابات نمبر سلیمان $\frac{۶۹۱-۹۲}{۱۶-۱۷}$) آغاز از ورق ۲۸۔

[6] ایضاً ورق ۲۹، ۲۸۔   [7] ایضاً ورق ۲۸۔

قریب کردیتی ہے :-

از کس مکن سوال، بترس از جوابہا | باتشنگی بساز کہ تلخ است آبہا
یک قطرہ آب در گہر کائنات نیست | از رہ مرو برون ز فریب سرابہا
در حشر چون بلند شود آفتاب خود | در سایۂ گناہ گریزد ثوابہا[۱]

یا یہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے :-

گل ہستی بہ تحریک نسیمی رنگ می بازد | مکن چندین ہوا داری حساب زندگانی را
در لباس اہل دنیا خرقۂ عزلت مپوش | بوی پیراہن زگرد کار وان معلوم نیست
اگر از طعنۂ احباب می پرسی، بیا، بنشین | بہ ہر تقدیر باری دیدہ باشی خانۂ خود را[۲]

وحشت تھانیسری

وحشت تھانیسری حجۃ الاسلام امام غزالی کی اولاد سے تھے۔ ان کا نام شیخ عبدالواحد تھا[۳] شاعری میں وہ ناصر علی سرہندی کے شاگرد تھے[۴] وحشت کچھ دنوں بیدل کے ساتھ رہے، اس کے بعد دکن جاکر عالمگیری فوج میں ملازم ہو گئے۔ یہاں ان کا بیشتر قیام اورنگ آباد میں شاہ گلشن (م - ۱۱۴۰/ ۲۸-۱۷۲۷) کے ساتھ رہا اور یہیں گیارھویں صدی ہجری کے آواخر میں ان کا انتقال ہوا۔[۵]

آزاد بلگرامی نے وحشت کی حاضر جوابی کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک رئیس عبیداللہ نے وحشت سے کسی انعام کا وعدہ کیا مگر اسے پورا نہیں کیا۔ اتفاقاً ایک دن

---

۱ ایضاً
۲ ایضاً ورق ۲۸، ۲۹ -
۳ کلمات الشعرا ص ۱۲۴؛ نتائج الافکار ص ۷۴۰
۴ سفینۂ خوشگو ص ۳۲ -
۵ ید بیضا ص ۳۰۷؛ نتائج الافکار ص ۷۴۰ -

وحشت نے اس سے کہا کہ شہر میں بارہ عبیداللہ ہیں۔ رئیس نے پوچھا کیا میں ان میں شامل ہوں؟ وحشت بولے 'شما عبیداللہ زیادہ اید'[1] یعنی آپ تیرھویں ہیں اور تیرہ کا ہندسہ منحوس سمجھا جاتا ہے۔

خوشگو[2] کا بیان ہے کہ وحشت نے ایک دیوان اور مثنوی مرتب کی۔ دیوان وحشت کا ایک نسخہ ایڈنبرا[3] لائبریری میں موجود ہے اس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ ابتدائی شعر یہ ہے:۔

الٰہی شور آشوب قیامت کن فغانم را　　زبان رستخیز روز محشر دہ بیانم را

اس وحشت کا اشتباہ جلال الدین محمد طباطبائی وحشت سے نہیں کرنا چاہیے جو ہندوستان آیا اور جس کا دیوان اس کے بھائی علی الحسینی المکی نے ۱۰۶۶/۵۶-۱۶۵۵ء میں لکھا تھا۔[4] اسی طرح ہمارا شاعر اس وحشت سے بھی مختلف معلوم ہوتا ہے جس کا دیوان ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے اور جس کی تاریخ تدوین غالباً ۱۰۷۶/۶۶-۱۶۶۵ء ہے۔[5]

نصیبی

ابو ابراہیم اللہ یار بن حاجی محمد یار بن حاجی مرزا محمد بلخ کا باشندہ تھا، اس کا تخلص نصیبی اور عشاق تھا۔[6] اس نے عہد اورنگزیب میں غالباً دکن میں قسمت آزمائی کی جیسا کہ اس کی ایک مختصر مثنوی سے معلوم ہوتا ہے جس میں شاعر نے دلی چھوڑ کر دکن جانے پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور اپنی قسمت کا ماتم کیا ہے۔[7] ایک اور قصیدہ میں جس کا عنوان 'در مذمت ملک دکن

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۱۶۸۔　　[2] سفینۂ خوشگو ص ۳۲۔

[3] اڈنبرا نمبر ۱۱۰۔

[4] گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس میں اسلامی مخطوطات کی فہرست مرتبہ ٹی چندر شیکھرن، ج ۲، مدراس ۱۹۵۰، نمبر ۶۲۱

[5] ایشیاٹک ۱/ نمبر ۸۹۶۔ نیز ملاحظہ ہو اشپرانگر ص ۵۸۵۔

[6] دیوان نصیبی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۴، ورق ۱۱۔　　[7] ایضاً ورق ۱۰۸

مدح برہان الدین ولی قدس سرہ' ہے، نصیبی کہتا ہے :۔

فتادہ ام بہ غم و غصہ در کنار دکھن ۔ کہ کس مباد گرفتار در دیار دکھن
سخن بہ وصف تو ختم است این قدر گویم ۔ مخالف آمدہ با طبع من برار دکھن[1]

بعض دوسرے اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح ہو چکی تھی :۔

بہ تقدیر الٰہی شاہ عادل ۔ بہ عزم ملک دکھن کرد منزل
نوید فتح و نصرت گاہ شاہی ۔ رسیدہ ہم بہ ماہ و ہم بہ ماہی[2]

دیوان نصیبی صرف قصائد اور ایک منثور مقدمہ پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی غزل نہیں ہے مقدمہ میں شاعر پہلے تو حسب عادت اپنے ہم عصر شعرا کا رونا روتا ہے اور شیخ آذری کا یہ قطعہ نقل کرتا ہے :۔

اگرچہ شاعران از روی اشعار ۔ زیک جام اند در بزم سخن مست
ولی با بادۂ بزم حریفان ۔ فریب چشم ساقی نیز پیوست[3]

پھر فن شاعری کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے نصیبی کہتا ہے :۔

"خود را از آن طائفہ (شعرا) نمی داند اما خود را از منتسبان و غاشیہ کشان ایشان می پندارد"[4]

شاعر نے بقول خود "روزگار شباب و ایام اکتساب بہ جہالت و گمراہی بسر بردہ"[5] اس لئے اس دیوان کی ترتیب سے مقصد "نہ اظہار فضل خویش است و نہ توقع تحسین و احسان از سلطان و

---

[1] ایضاً ورق ۱۰۷ ۔ ۱۰۶ ۔ [2] ایضاً ورق ۱۹
[3] ایضاً ورق ۷ ۔ [4] ایضاً ورق ۱۱
[5] ایضاً ورق ۲۱ ۔

درویش است ولیکن نظر بہ مضمون این بیت بیش است:

یلوح الخط فی القرطاس دہراً وکاتبہ رمیم فی التراب[1]

دیباچہ میں شاعر نے اٹھارہ صفحات شہنشاہ وقت اورنگزیب کی مدح کے لئے وقف کے ہیں۔ بعد میں نصیبی نے ان تمام مدحیہ قصائد کو الگ ایک کتابی شکل میں مرتب کر دیا اور اس کا نام اوصاف نامہ[2] رکھا۔ اسی طرح اس نے شہزادہ اعظم کی شان میں جو قصیدے کہے تھے انھیں اعظم نامہ کے عنوان سے مرتب کیا[3]

دیوان نصیبی صرف قصائد پر مشتمل ہے۔ یہ قصائد حمد، نعت، منقبت وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ایک قصیدہ امام ابوحنیفہ کی شان میں ہے[4] ایک خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور ایک خواجہ احرار کی منقبت میں ہے[5] شیخ برہان الدین کی مدح کا اوپر ذکر ہو چکا۔ یہ قصیدے تمام متقدمین اساتذہ کے تتبع میں کہے گئے ہیں اور عنوان میں ان کا ذکر کر دیا گیا۔ چنانچہ ان اساتذہ میں ہمیں انوری، اثیر اخسیکتی، کمال اسمٰعیل، فرید الدین عطار، خاقانی، ابوالفرج رونی، سیف الدین اسفرنگی، خواجہ عصمت اللہ بخاری، سلمان ساوجی، سنائی، مسعود سعد سلمان، رشید وطواط، ابوالمفاخر رازی، عرفی، رضی نیشاپوری، ظہیر فاریابی، حسن غزنوی، بدر چاچی، مجد ہمگر، سعدی، مجیر بیلقانی، امیر خسرو، ازرقی، عراقی، امیدی، عنصری، بعید سردی، غضائری رازی، پور بہای جامی کے اسماء گرامی نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیبی کا اصل فن تقلید و تتبع ہے، مگر اس سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس نے بالاستیعاب کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا اور اس کی روایات

---

[1] ایضاً ورق ۲۲۔

[2] براؤن کیمبرج ص ۱۷۵؛ براؤن فہرست نمبر ۱۱۴۔

[3] ایضاً، براؤن فہرست نمبر ۱۴۰

[4] دیوان نصیبی ورق ۷۷

[5] ایضاً ورق ۱۰۲، ۱۰۴۔

اپنے فن میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ ایک قصیدہ رودکی کے مشہور قصیدہ کی طرز پر ہے اور اس شعر سے شروع ہوتا ہے :۔

از وصالت بوی جان آید ہمی　　در غمت دل در فغان آید ہمی[1]

جیساکہ کہا گیا نصیبی کا اصل فن یہ ہے کہ اس نے اساتذہ کا کامیاب چربہ اتار لیے۔ عرفی کے تتبع میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں یہ انداز بہت واضح نظر آتا ہے۔

بر چرخ سخن مہر درخشان منیرم　　روشن گر افلاک معانی است ضمیرم
اسکندر نظمم بہ جہانگیری آفاق　　زد سکۂ ترویج بہ امداد ضمیرم
سلطان خرد پرور اقلیم علومم　　در مشورت علم بیان نیست وزیرم
با مردم خندان گل خندان بہارم　　با مردم نادان بہ جفا خنجر و تیرم[2]

ان قصیدوں کا انداز مشکل اور مغلق ہے۔ کہیں کہیں بعض الفاظ کا غلط استعمال بھی نظر آتا ہے لیکن یہ بات واقعی استعجاب کی ہے کہ نصیبی اس عہد کا واحد شاعر ہے جس نے صرف قصیدہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اورنگزیب مدح گوئی بالکل پسند نہیں کرتا۔ آخر میں نصیبی کے ایک قصیدہ سے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو اس نے امیر خسرو کے تتبع میں کہا ہے :۔

نوشیم می از ساغر دل در طرب جان　　جام جم خورشید عطا را نشناسیم
خاک کف پای صنم لالہ عذاریم　　از تیرگی خویش صفا را نشناسیم
با کہنہ گلیمم در میخانہ بسازیم　　آرایش خان و امرا را نشناسیم
کردیم فدای تو دل و دین دو جہان را　　معذور کہ ما راہ سخا را نشناسیم
در پردۂ دل جز رخ دلدار نہ بینیم　　ما عاشقی مہر و وفا را نشناسیم
بی امی گویا نشناسیم رہ حق　　او را نشناسیم خدا را نشناسیم[3]

---

[1] ایضاً ورق ۴۶ ۔　[2] ایضاً ورق ۵۹ ۔　[3] ایضاً ورق ۸۲ ۔

شریف

مرزا شریف بیگ شریف، زبردست خاں (م۔ ۱۱۰۱/ ۹۰۔ ۱۶۸۹) کا متوسل تھا زبردست خاں کے حضور میں ایک اور شاعر شرف الدین شرف تھا۔ شریف اور شرف میں شاعرانہ چشمکیں ہوا کرتی تھیں[1]۔ شریف نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ اس میں مذہبی اور اخلاقی انداز کی غزلیں ہیں۔ چند تاریخی قطعے بھی ہیں جن سے ۹۱ - ۱۰۸۹ ہجر کے سنین برآمد ہوتے ہیں۔

دیوان کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :۔

بکن یارب بہ مفتاح عنایت حل مشکلہا　　بہ دست نست با فتاح مفتاح درِ دلہا[2]

خلیل

مرزا محمد خلیل خراسانی[3] جن کا تخلص صاحب[4] تھا، عہد اورنگزیب کے مشہور عالم تھے۔ وہ پہلے شہزادی زیب النساء کی سرکار میں ملازم ہوئے اور زیب المنشآت کے نام سے شہزادی کی نگارشات مرتب کیں۔ کچھ دنوں تک وہ میر بخشی کے پیشدست بھی رہے۔ بعد میں وہ وقائع نویس کی حیثیت سے پٹنہ بھیج دیئے گئے[5]۔ غالباً یہ بزرگ امید خاں کی نظامت کا زمانہ ہے کیونکہ خلیل کے دیوان میں بزرگ امید خاں سے متعلق تین تہنیتی قطعے ہیں۔ دو قطعے خان مذکور کو ۹۶۔ ۱۰۹۵/ ۸۵۔ ۱۶۸۳ء میں نوبت عطا ہونے پر ہیں۔ ایک قطعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خلیل بزرگ امید خاں سے متعلق تھے :۔

---

[1] مقالات الشعراء ص ۳۴ - ۳۳۔

[2] ریو ۲/ ۶۶۶؛ اشپرنگر ص ۵۶۷

[3] مرآۃ الخیال ص ۲۶۷۔

[4] ریو ۲/ ۸۲۶۔

[5] کلمات الشعراء ص ۳۳؛ ید بیضا ص ۸۸۔

مخلص بیقدر و بی مقدار این درگہ خلیل — آنکہ بود او زبس شان در شمار بندگان
گفت از راہ دعا این مصرع تاریخ گشت — باد بر نواب ما نوبت مبارک جاودان[1]
۱۰۹۵ھ

غالباً یہیں خلیل اور فطرت موسوی کے تعلقات بڑھے۔ فطرت کے انتقال پر خلیل نے جو تاریخ کہی تھی اس کا ایک شعر فطرت کے ذیل میں درج کیا جا چکا ہے۔ شیر خان لودی کے تذکرہ کی تالیف (۱۱۰۲/۹۱-۱۶۹۰) تک خلیل پٹنہ میں مامور تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف چالیس سال کی تھی۔ شیر خاں نے ہمارے مصنف کا ذکر بہت پرجوش انداز میں کیا ہے[2]۔ اس عہد کا دوسرا تذکرہ نگار سرخوش مرزا خلیل کو اپنا دوست بتاتا ہے[3] لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک خلیل گذر چکے تھے۔

خلیل نے اپنی تصانیف میں ایک دیوان اور چند رقعات یادگار چھوڑے۔ انھوں نے زیب المنشآت بھی مرتب کی۔

دیوان خلیل خلیل ایک پاکیزہ شاعر بھی تھے۔ ان کے دیوان میں غزل کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ قطعات، رباعیات، تاریخیں اور اورنگزیب کی شان میں چند مدحیہ قصائد ہیں۔ تاریخوں میں سب سے آخری تاریخ موسوی خاں کے انتقال کی ہے۔ ایک اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیل نے ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ میں دوستوں کے لئے ایک سرای بنوائی تھی[4]:

مہمان سرایی ساخت خلیل از کمال شوق — از بہر انتعاش عزیزان مہربان
چون بود میہمان طلبی مدعای او — تاریخ گشت 'خانہ میہمان مہربان'
۱۱۰۰ھ

---

[1] دیوان خلیل، بوہار نمبر ۴۰۷، ورق ۴۷۔

[2] مرآۃ الخیال ص ۲۶۷ — [3] کلمات الشعرا ص ۳۳

[4] دیوان خلیل، ورق ۴۹۔

معلوم ہوتا ہے کہ خلیل نے کبھی اپنا دیوان مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں :۔

از گفتۂ خود ز شعر نو با بہ کہن — زان جمع نہ کردم من آشفتہ سخن

کاستاد بہ من گفت چو می شستم لوح — رمزی کہ نوشتن است بہر شستن[1]

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان بے ترتیب ہے۔ غزلوں کے بیچ میں متفرق اشعار رباعیاں اور قطعے وغیرہ ہیں۔

خلیل کی غزلوں میں جو غیر معمولی ترنم، آہنگ اور لطافت ہے وہ ہیں چونکاتی بھی ہے اور مسحور بھی کرتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک حسین موسیقی اور لطیف پاکیزگی ہے۔ ان کے جذبات میں جو گھلاوٹ اور زبان میں جو نرم روی ہے، وہ نہ صرف متفرق اشعار تک محدود ہے، بلکہ غزلوں پر غزلیں پڑھتے جائیے، یہی کیف باقی رہتا ہے :۔

بر گرد سرت عمری چون زلف تو گردیدم — از بوی تو می خوردم، از رنگ تو گل چیدم

کردی نگہی سویم، حیران تو گردیدم — ای کاش نمی دیدی، ای کاش نمی دیدم

دل در ہمہ کس بستم، مہر ہمہ ورزیدم — عہد ہمہ بشکستم، آخر چو ترا دیدم

سرتاسر این بازار سودا زدہ گردیدم — شادم کہ بہ ہیچ آخر یکبار نیرزیدم

راحت دنیا شنیدم عیش خوابی بود و بس — رنج او دیدم بہ قدر اضطرابی بود و بس

می شود نادیدہ حیران، شد پشیمان ہر کہ دید — روی دنیا طلعت زیر نقابی بود و بس

ای ندیدہ نور حق در چشم ظاہر بین تو — این جہان روشن ز ماہ و آفتابی بود و بس

الفت جانکاہ یاران را نمی دانم چہ بود — ناخوشی، جوری، عتابی بیحسابی بود و بس

گفتمت دیگر مکرر گرچہ تکراری نداشت — عیش دنیا خواب و خوردی، خورد و خوابی بود و بس[2]

---

[1] ایضاً ورق ۴۴۔

[2] ایضاً ورق ۴۰،۱

ان دونوں غزلوں کا انداز بالکل مختلف ہے۔ پہلی غزل میں جذبہ اور شوق ہے، دوسری میں حسرت اور یاس ہے۔ خلیل کے یہاں عشق ذات اور غم کائنات کی یہ دونوں ادائیں پورے کمال و جمال کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے ایسے حسرت انگیز شعر کہے ہیں :۔

ہمدمان رفتند و مارا درخمار انداختند شیشہ خالی، خم تہی گردید و ساقی بزم چید
بسیار شد این نسخہ زتکرار نوشتن[1] اوراق جہان بیش نبود از دو سہ حرفی

وہیں انھوں نے ایسے ولولہ خیز شعر بھی کہے ہیں :۔

من ہمان مشتاق عطر جانفزا بوی توام نوبہار ار غوطہ ام درآب و رنگ گل دہد
اگر تسبیح تسبیحم، اگر زنار زنارم[2] شکستن نیست در عہدم، گسستن نیست در تارم

یا یہ دو شعر دیکھیے کتنا والہانہ انداز ہے :۔

درخرقہ نمی گنجم، عریان خراباتم من میکش بدنامم، من شیشہ نیم، جامم
برشوکت جم خندد سامان خراباتم[3] بشکستہ سبوی چند با جام سفالین است

زیب النساء

مغل تاریخ میں روایات اور اساطیر کا سب سے منظم جال غالباً اورنگزیب کی بڑی لڑکی زیب النساء (۱۱۱۳ - ۱۰۴۸ / ۱۷۰۲ - ۱۶۳۸) کی شخصیت کے اردگرد بنا گیا ہے۔

زیب النسا بہت پڑھی لکھی اور مہذب خاتون تھی۔ ادب اور دیگر علوم میں اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی سرپرستی میں ایک اکادمی قائم کی تھی جہاں علما اور شعرا کتابوں کی تصنیف و تراجم میں مشغول رہتے تھے۔ ان کتابوں کے عنوان کا پہلا لفظ زیب سے شروع ہوتا تھا، چنانچہ

---

[1] ایضاً ورق ۸۴، ۱۰۔ [2] ایضاً ورق ۳، ۴۔

[3] ایضاً ورق ۶۔

ملا صفی الدین اردبیلی کی زیب التفاسیر اور مرزا خلیل کی زیب المنشآت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ شعرا میں ملا سعید اشرف اور نعمت خاں عالی اس سے متعلق تھے۔ اس نے فتاوای عالمگیری کا فارسی ترجمہ بھی کرانا شروع کیا تھا۔[1]

زیب النساء خود تصنیف و تالیف میں دلچسپی لیتی تھی۔ اس نے ایک مرقع مرتب کیا تھا، جس میں بڑے شاعروں کے منتخب اشعار تھے۔ اس مرقع پر ملا رضائی راشد نے ایک دیباچہ لکھا تھا جو ایک بیاض میں محفوظ ہے۔[2] اس دیباچہ سے زیب النساء کے علم وفضل اور ادب نوازی پر روشنی پڑتی ہے۔ غالباً مغل شہزادیوں میں کسی نے علم و ادب کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی زیب النساء نے۔ شہزادی نے جو بیاض مرتب کی تھی، اور جو اس کی ایک خواص کے ہاتھ سے پانی میں گر کر تباہ ہوگئی تھی اس کا بیان سعید اشرف مازندرانی کے ذیل میں آچکا ہے۔ اس کے خطوط زیب المنشآت کا ذکر آگے آئے گا۔

ہمعصر تاریخوں اور تذکروں نے زیب النساء کی شاعری اور اس کے تخلص مخفی کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن سعید اشرف مازندرانی کے ایک شاگرد چینت رائے نے شہزادی کی وفات پر جو تاریخی قطعہ لکھا تھا، اس سے اس کی شاعری اور تخلص دونوں کا ثبوت ملتا ہے:۔

رخت ہستی بست چون زیب النساء بیگم زدہر	زین [خبر بزم] جہان چون دیدۂ اعمیٰ شدہ
اینکہ تاثیر کلامش در مزاج روزگار	روح بخش و جانفزاتر از دم عیسیٰ شدہ
بود از شیرین کلامی خسرو ملک سخن	تا ز عالم رفت زیب از کشور معنی شدہ
خویش را اندر تخلص گرچہ مخفی می نوشت	در ہنر لیکن زیادہ شہرۂ گیتی شدہ
سال تاریخ وفاتش را چو پرسیدم ز عقل	از رہ حسرت بگفت "آہ از جہان مخفی شدہ"[3]
	۱۱۱۳ ہجری

---

[1] شبلی نعمانی: زیب النساء، لاہور، ص ۷

[2] بیاض بانکی پور، نمبر ۱۰۸۸ (ورق ۵ تا ۷) اس پر معارف، جون ۴۲ء میں تفصیلی مضمون چھپ چکا ہے۔

[3] مفید الانشا مرتبہ چینت رائے۔ بانکی پور نمبر ۲۵۱۲، ورق ۶۰۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زیب النسار کے متعلق افسانہ طرازی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اس کی شخصیت کا سارا حسن چند بے سروپا سستی قسم کی رومانی داستانوں میں چھپ کر رہ گیا۔ عاقل خاں رازی سے اس کی داستان عشق عجیب ڈرامائی انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ ناصر علی کے ساتھ اس کے مکالمے کسی بازار حسن کی یاد دلاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض منچلوں نے اس کے عشق کا رشتہ شیواجی اور درگا داس راٹھور سے جا ملایا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لاہور کے افسانہ طرازوں نے زیب النسار کی سچی سوانح عمری لکھ کر ان تمام اساطیر کو مرتب کر دیا۔ اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں لاہور کے چند زندہ دلوں نے یہ دعویٰ کیا کہ زیب النسار لاہور کے قریب ایک باغ میں دفن ہے جو اس نے اپنی دایہ 'مرمیا بائی' کو دیدیا تھا اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ محکمہ آثار قدیمہ اسے فوراً اپنی تحویل میں لے لے[۱] حالانکہ یہ معلوم ہے کہ زیب النسار کا انتقال دہلی میں ہوا تھا اور اسے تیس ہزاری (موجودہ عدالت) کے قریب دفن کیا گیا تھا۔

دیوان مخفی زیب النسار کی طرف دیوان مخفی کا انتساب بھی اسی افسانہ طرازی کی ایک کڑی ہے۔ اس نے اپنے اشعار کو دیوان کی شکل میں مرتب کیا تھا، یا نہیں، اس کا حوالہ کسی تاریخ یا تذکرہ سے نہیں ملتا۔ آزاد بلگرامی نے البتہ یہ دو شعر اس کی طرف منسوب کیے ہیں:-

بشکند دستی کہ خم در گردن یاری نشد — کور بہ چشمی کہ لذت گیر دیداری نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقی جا گرفت — غنچۂ باغ دل ما زیب دستاری نشد[۲]

خان آرزو نے عاقل خاں رازی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ اس نے زیب النسار کی مشہور غزل کا جواب کہا تھا۔ بیگم کی غزل کا مطلع ہے:-

گرچہ من لیلیٰ اساسم، دل چو مجنوں بینواست — سر بہ صحرا می زدم لیکن حیا زنجیر پاست[۳]

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۵۲ء

[۲] ید بیضا ص ۱۱۰؛ مخزن الغرائب ورق ۱۵۶

[۳] مجمع النفائس ورق ۱۶۸۔

مطبوعہ دیوان میں یہ غزل ہے اور اس کا یہ مقطع بھی درج ہے۔

دخترِ شاہم ولیکن رو بہ فقر آوردہ ام　　زیب و زینت را ازیں نام من زیب النسا است

لیکن مرتب دیوان نے یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ شعر دوسرے مخطوطوں میں نہیں ملتا اور غالباً بعد کا اضافہ ہے[1]

زیب النساء اور دیوان مخفی کے شاعر میں ایک بات مشترک ہے یعنی دونوں کو قید و محن کی زندگی گذارنی پڑی۔ اکبر کی بغاوت کے بعد زیب النساء قلعہ سلیم گڈھ میں قید کی گئی تھی[2]۔ لیکن دیوان کے بالاستیعاب مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان مخفی کا شاعر زیب النساء نہیں غالباً کوئی اور ہے۔

یہ شاعر خراسان کا رہنے والا تھا، جہاں سے قسمت آزمانے ہندوستان آیا[3]۔ یہ شاہجہاں کا عہد حکومت تھا۔ شاعر نے بادشاہ وقت کی تعریف میں کئی ایک قصیدے کہے ہیں۔ لیکن نامعلوم حالات کی بناپر اسے قید میں ڈال دیا گیا جس کی طرف دیوان میں متعدد اشارے ملتے ہیں اس حالت میں شاعر نے بادشاہ وقت سے گذارش کی کہ وہ حج کے لئے جانا چاہتا ہے، اسے آزاد کیا جائے، اور ساتھ ہی شاہ خراسان یعنی امام علی رضا کی خدمت میں بھی التجا کرتا رہا:-

ازگدایان تو ام شاہ خراسان مددی !　　کہ چو مرغان حرم در حرمت جا گیرم[4]

ہندوستان میں اس کی قسمت کا ستارہ جیسے جیسے گردش میں آتا گیا، شاعر کی یہ خواہش بڑھتی رہی، کبھی وہ یہ عہد کرتا کہ کابل اور ری چلا جاؤں اور کبھی اس کی یہ خواہش ہوتی کہ ہندوستان کے علاوہ کہیں بھی اور جا بسوں:-

---

[1] دیوان مخفی مرتبہ عبدالباری آسی، نولکشور، ۱۹۲۹ء، ص ۲۳۔

[2] مآثر عالمگیری ص ۲۰۴　　[3] دیوان مخفی ص ۱۸۰۔

[4] ایضاً ص ۱۳۳۔

دانشد چون غنچۂ دل در بہارستان ہند — رفت مرغ روح مخفی گوشۂ کابل گرفت

نشۂ راحت ببخشد فی المثل گر ملک ہند — ثانی اثنین ہوای بوستان ری شود

دیدہ ام ظلم و ستم چندانکہ از ظلمات ہند — می روم کز بہر خود جای دگر پیدا کنم[1]

ہمارا شاعر ہندوستان میں بھی ادھر ادھر گھومتا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ بنگال واحد جگہ ہے جہاں آسودگی میسر ہو سکتی ہے:۔

جستجو کردم بسی مخفی چو در گرداب ہند — نسخۂ آسودگی جایی بجز بنگالہ نیست[2]

شاعر کے لئے ایک دکھ کی بات یہ بھی تھی کہ وہ اپنے لڑکے سے جدا تھا اور بیٹے کی جدائی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ کہتا ہے:۔

مخفی وہمین بر دل تو بار فراق است — ہر جا پدری ہست، فراق پسری ہست

شام یعقوب ہجران ونیا مد بوی پیراہن — پسر را نیست آن مہری کہ در خاطر پدر دارد[3]

اب سوال یہ ہے کہ دیوان مخفی کا مصنف کون ہے۔ نورجہاں اور سلیمہ سلطان بھی مخفی تخلص کرتی تھیں[4] لیکن شاہجہان کی مدح سے انھیں کیا تعلق۔ علاوہ ازیں رشت کا ایک شاعر مخفی تھا جو امام قلی خاں حاکم فارس کا متوسل تھا[5]۔ اور اس اعتبار سے شاہجہاں کا معاصر تھا۔ ممکن ہے مخفی اپنے مربی کے قتل (۱۶۲۹ء) کے بعد ہندوستان آگیا ہو۔ لیکن کسی ٹھوس شہادت کی عدم موجودگی میں ایسا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ایضاً ص ۶۷، ۷۷، ۱۴۹۔

[2] ایضاً ص ۴۸۔

[3] ایضاً ص ۵۳، ۹۲۔

[4] تذکرۂ حسینی ص ۵۲۴؛ صبح گلشن ص ۳۹۴۔

[5] مخزن الغرائب ورق ۸۰۰۔

خاکسار

شکر اللہ خاں خاکسار شعر دوست اور شاعر نواز امیر تھے. ناصر علی اور بیدل کے ضمن میں ان کی شعر دوستی اور شاعر نوازی کا ذکر ہوا. عاقل خاں رازی کی دامادی اور صحبت نے ان کے ذوق شعر و تصوف کو اور جلا بخشی[1] انھیں کے کہنے پر خاکسار نے مثنوی رومی کی شرح لکھی. جو اس عہد میں مثنوی پر لکھی ہوئی شرحوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے[2]. شکر اللہ خاں پہلے سرہند کے فوجدار ہوئے. ١٠٩٢/٨٢-١٦٨١ میں وہ اس خدمت سے سبکدوش کر دیئے گئے. اسی سال انھیں شاہجہان آباد کا فوجدار مقرر کیا گیا. دو سال بعد انھیں سکندر آباد کی فوجداری ملی. ١٠٩٨/٨٧-١٦٨٦ میں انھیں نواحی جہان آباد کی فوجداری عطا ہوئی خوشگو کا بیان ہے کہ شکر اللہ خاں کا انتقال ١١١٢/١٧٠١-١٧٠٠ میں ہوا[3]. خاکسار کا ایک غیر مرتب مجموعہ شعر بانکی پور لائبریری میں موجود ہے. دیوان میں بیشتر حصہ غزلیات کا ہے. تین مختصر مثنویاں ہیں جن کے بارے میں مخزن الغرائب کے مؤلف کا خیال ہے:

"دو سہ مثنوی بی مزہ نیز دارد"[4]

تینتیس رباعیاں اور چند تاریخی قطعے ہیں.

خاکسار ایک جامع شخصیت کے مالک تھے. ان کا ذوق تصوف بہت رچا ہوا تھا

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ١٧.

[2] شرح مثنوی. شکر اللہ خاں خاکسار (علی گڈھ، سلیمان) ورق ٢.

[3] سفینۂ خوشگو ص ١٧؛ مآثر عالمگیری ص ٢٠٩، ٢١٤، ٢٢٣، ٣٠٣ وغیرہ. ید بیضا ص ٨٨ میں ١١٠٨ھ ان کا سن وفات دیا ہے.

[4] مخزن الغرائب ورق ١٢٦.

جیسا کہ ان کی شرح مثنوی سے معلوم ہوتا ہے۔ نقد ادب کا ان میں غیر معمولی ملکہ تھا۔ ناصر علی کی شاعری کے بارے میں ان کا ایک خط اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ یہاں دوسرا خط پیش کیا جاتا ہے یہ اور بھی اہم ہے۔ اس میں خاکسار نے حسن معنی اور خوبی شعر کے باہمی رشتہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، کہتے ہیں:۔

"فرق در حسن معنی و خوبی سخن کردن بسیار مشکل است و باز خوبی سخن را بر حسن معنی ترجیح دادن خیلی قوۂ ممیزہ می خواہد۔ حسن معنی از خوبی سخن است و خوبی سخن از حسن معنی۔ خوبی سخن کہ عبارت از عبارات شیرین و الفاظ رنگین و استعارات نمکین و اشارۂ خوش آئین باشد، این ہمہ از حسن معنی است۔ زیرا کہ بہ ضبط کلام و تناسب الفاظ استعارہ و اشارہ بہ اعتبار معنی می باشد نہ بہ اعتبار لفظ محض۔ قصہ از این عبارت این خواہد بود کہ مطالب اعلیٰ اگر بہ الفاظ نامناسب بیان شود لطفی ندارد۔ پس درین صورت در ظہور این معنی نقصان شد کہ چنانچہ شاید بہ اظہار نرسد...... اگر معنی عالی بہ الفاظ زبون بہ معرض بیان آید او را حسن معنی نمی توان گفت چہ حسن خاصہ صورت است و صورت معنی، الفاظ است۔ ہرگاہ لفظ زبون باشد، اطلاق حسن بر او چہ طور درست آید؟ ہمین قسم اگر الفاظ خوب بر مطلب سہل مشتمل گردد، خوبی سخن نتوان نام کرد[1]"

اس طویل اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ خاکسار کے نزدیک اعلیٰ شاعری بہترین خیال اور بہترین الفاظ کے حسین ترین امتزاج کا نام ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ شعرا الفاظ اور صنائع بدائع کے چکر میں بری طرح الجھے ہوئے تھے، ایسے ناقدانہ خیالات یقیناً خاکسار کی دقت نظر اور وسعت فکر کے شاہد ہیں۔

خود خاکسار کی شاعری صاف، شستہ اور تکلفات سے بری ہے۔ ان کا انداز نرم اور

---

[1] صحائف شرائف ورق ۹۳۔

رواں ہے اور ان کے یہاں فکر وفن کا حسین امتزاج ہے۔ ذیل میں دو غزل مثال کے طور پر درج کی جاتی ہے۔

بہار رفت و خیالت جنون فزاست ہنوز | کمال عشق ندانیم تا کجاست ہنوز
دل رمیدہ گر از بزم قدس غافل نیست | چنین فریفتۂ آب و گل چراست ہنوز؟
ہزار بار دلم را شکست و داد بہ باد | دل شکستہ بآن زلف آشناست ہنوز
اگرچہ ما و تو چون رنگ گل ہم آغوشیم | ہوس بہ بوی گلت ہمرہ صباست ہنوز[1]

ہر کہ چون مجنون ز وصل یار غافل ماند، ماند
بیخبر از جلوہ محو گرد محمل ماند، ماند

ہر کہ در اندیشۂ معشوق از خود رفت، رفت
وآنکہ با خود دست در گردن حمائل ماند، ماند

ہر کہ چون شبنم دماغ ناز بالا برد، برد
وآنکہ چون گلبن ز حیرت پای در گل ماند، ماند

ہر کہ از بزم محبت جام وصلت خورد، خورد
وآنکہ از بیگانگی بیرون محفل ماند، ماند

چون صدف زین بحر ہر کس وصل گوہر یافت، یافت
وآنکہ چون ماہی ز حسرت خار در دل ماند، ماند

ہر کہ چون غواص سر در قعر دریا برد، برد
وآنکہ ہمچون بوالہوس حیران ساحل ماند، ماند

---

[1] دیوان خاکسار، بانکی پور، نمبر ۲۹۶۸، ورق ۳۷۔

ازوصالش ہر کہ گلہای تمنا چید، چید

وز فراقش آنکہ چون من خار در دل ماند، ماند[1]

اس غزل میں جو رنگ اور آہنگ ہے وہ خاکسار کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے :۔

ازین خوشتر دعائی نیست در کشکول درویشان   ہمیشہ در کنارت با ای جان! جان جانانت[2]

محمد ہاشم تسلیم

محمد ہاشم تسلیم شیرازی اواسط عہد اورنگزیب میں ہندوستان آئے[3] اور غالباً دکن میں رہے جیسا کہ اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے :۔

شوق بابل تارود از خاطر خوبان ہند   در دکن وا کردہ ام رنگین دکان ساحری[4]

ان کا نام ہاشم اور تسلیم تخلص تھا :۔

بیا تسلیم ہاشم نام مدہوش   بہ خود واماندہ واز خود فراموش[5]

مگر انھوں نے بعض جگہ ہاشم تخلص بھی استعمال کیا ہے :۔

سخنی چند ترجمان دارد   گفتن ہاشم از شنیدن ما

از دوست بگو ہرچہ بگوئی، نہ ز دشمن   ہاشم بہ خدا شکوہ بیگانہ ندارد[6]

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تسلیم کی قسمت کا ستارہ نہیں چمکا اور وہ ایران واپس

---

[1] ایضاً ورق ۲۷   [2] ایضاً ورق ۱۳

[3] ریاض الشعرا ورق ۷۳؛ مجمع النفائس ورق ۹۰۔   [4] دیوان تسلیم، بانکی پور نمبر ۵۵۰، ورق ۳

[5] ایضاً ورق ۹۵   [6] ایضاً ورق ۲۹، ۳۵

جانا چاہتے تھے،

زوضع ہند دلگیرم، بہ رنگ غنچہ دلتنگم بہ ایران افگنم تسلیم، رنگ بزم صحبت را[1]

اس سلسلہ میں تسلیم نے ایک شعر ایسا کہا ہے جو واقعی حیرتناک ہے۔ تسلیم کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آرزوؤں کی دنیا اسی طرح اجاڑ ڈالی جس طرح اورنگزیب نے ہندوستان کو۔

کردہ ام شہر و دیار آرزو ویران چو ہند در خرابی طالعم کمتر ز عالمگیر نیست[2]

غالباً اس عہد میں اپنی نوعیت کا یہ واحد شعر ہے۔

تسلیم کی بددلی کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی شاعری کا کوئی سچا قدردان نہیں تھا۔ اگر انھیں کسی سے قدردانی کی توقع تھی تو وہ نواب مخلص خاں تھے:۔

بہ فریادِ سخن تسلیم، مخلص خان رسد روزی شکایت چون کنم از طبع معنی آفرین خود[3]

وہ چاہتے تھے کہ کاش یہاں بھی کوئی صائب ہوتا تو ان کے فن کی داد دیتا:۔

نیست تسلیم از سخن سنجان کسی معنی شناس صائبی باید کہ داند قدر اشعار مرا[4]

ایک جگہ ظہوری کو یاد کرتے ہیں:۔

در یادِ ظہوری بود این زمزمہ تسلیم پیشم بنشین، تا بشمارم نفسی چند[5]

دیوان تسلیم میں ۹ قصیدے، ۲۵۵ چھوٹی بڑی غزلیں، ۲۰ رباعیاں، چند قطعے اور ۳۰۰ شعر پر مشتمل ایک مثنوی ہے۔ ایک تاریخی قطعہ فتح جنجی (۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷) سے متعلق ہے۔ دوسرا اعظم شاہ نے کوئی سرائے بنوائی تھی، اس کی تاریخ ہے:۔

نوشت سال بنایش مہندس تقدیر مقام امن داماں است و مامن عالم[6]
۱۱۰۹ ہجر

---

[1] ایضاً ورق ۲۷ [2] ایضاً ورق ۳۳
[3] ایضاً ورق ۴۸ [4] ایضاً ورق ۳۰
[5] ایضاً ورق ۴۱ [6] ایضاً ورق ۲۳

قصائد، حمد، نعت اور اہل بیت کی منقبت ہیں۔ یہاں تسلیم عرفی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اور موخر الذکر کے خیالات اور انداز بیان دونوں کا چربہ اڑانے کی کوشش کرتے ہیں :۔

اصلم از رضوان در دو حور غم بیجا مجو — حیدر و زہراست بیشک آدم و حوای من[۱]
می کنم لابہ بہ مدح خویش انشا یکدو بیت — خود ستایی گرچہ مذموم است از دانشوری
شوق بابل تار دو از خاطر خوبان ہند — در دکن وا کردہ ام رنگین دکان ساحری[۲]

تسلیم کی غزل ان کے قصیدہ سے برتر اور جاذب ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں ایک لطیف ترنم اور آہنگ ہے جو خیالات کی نرمی اور زبان کی شیرینی سے پیدا ہوتا ہے۔ الفاظ کی تکرار، محاورہ کا برمحل استعمال اور تشبیہہ و استعارہ کی ندرت ان کی شاعری میں ایک کھو جانے والی فضا پیدا کرتی ہے۔ میر کا مصرع 'دریا دریا روتا ہوں اور صحرا صحرا وحشت ہے' اپنی مثال آپ ہے۔ مگر تسلیم کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے :۔

تا رمیدن نشود رام تو صحرا صحرا — می رود خون ز دل خون شدہ دریا دریا
آن شرابی کہ دو عالم شدہ از بویش مست — چیدہ بر طاق دلم چشم تو مینا مینا
ای کہ از دور ہمی راہ من و خود می پرسی — از دلم تا بہ دل سخت تو صحرا صحرا
ہست بیگانگیم را بہ تو نسبت محکم — بیمروت چہ روی از ہمہ تنہا تنہا؟[۳]

اس غزل میں ایک دھیمی دھیمی لہر ہے جو اس کے تغزل کو ابھارتی ہے اور اس کے کیف کو دیرپا بناتی ہے۔ یہی انداز اس غزل کا بھی ہے :۔

خبر ما نگرفتن ز تو بیجاست، بیا — دل تنگم بہ خدا، جای تماشاست، بیا

۱۔ ایضاً ورق ۱۹ — ۲۔ ایضاً ورق ۳

۳۔ ایضاً ورق ۳۰۔

دامن افشان مرد، از سینۂ تنگم چون آہ — خانۂ آئنہ ام دامن صحرا است، بیا

ہمہ جرمیم، اگر تو ہمہ نازی و ستم — شکوہ ات گر ہمہ بر جاست کہ بیجاست بیا

نالہ ہمراہ و جنون پیشتر و عشق بہ قلب — باز تسلیم غمت بر سر غوغاست، بیا[1]

چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

چو تسلیم تو تسلیم تو گردیدہ است یک عالم — بہ قربان سرت گردم، چہ پیچی بر سر دلہا؟

نہ ای آگہ ز حال دل، چہ دانی — شکست دل، شکست قیشہ کیست؟

آخر بہ ماز شیشۂ دلہا چہا رسید؟ — ہر جا دلی شکست، شکستی بہ ما رسید[2]

دیوان تسلیم کی پہلی غزل ہی اتنی پر کیف اور مترنم ہے کہ قاری جھوم جاتا ہے اور یہ واقعی تسلیم کا کمال ہے کہ پورے دیوان میں یہ کیفیت باقی رہتی ہے :-

ای مطلع مہر تو موزونی دیوانہا — دیباچۂ حسن تو رنگینی عنوانہا

مدہوش بہ خود حیران، بیہوش ز خود غافل — از جوش میت دلہا، وز بوی خوشت جانہا

انگندہ عجب شوری، در ہر بن مو عشقت — بشکستہ بہ زخم دل، لعل تو نمکدانہا

نی تیغ ترا رنگی، نی زخم ترا بوئی — آئینۂ عہد تو، حیرانی قربانہا

بی بدرقہ ات جائی، کی راہ توان بردن — سرمایہ گمراہی بی لطف تو ایمانہا[3]

تسلیم نے ایک عشقیہ مثنوی بھی لکھی ہے جو خود شاعر کی داستان حیات پر مشتمل ہے۔ مثنوی میں تقریباً ۳۰۰ شعر ہیں اور اس کے ابتدائی حصے ناصر علی اور غنیمت کی یاد دلاتے ہیں۔ خان آرزو کا خیال صحیح ہے کہ تسلیم کے بعض اشعار ناصر علی کے رنگ میں ہیں اور بعض جلال اسیر کے[4]

الٰہی رنگ سودائی بہ سر ریز — نمک بر زخم پنہان جگر ریز

---

[1] ایضاً ورق ۲۸

[2] ایضاً ورق ۲۷، ۳۴، ۴۱

[3] ایضاً ورق ۲۵

[4] مجمع النفائس ورق ۹۰

تجلی زار برقم کن گلم را	برومند از شرر کن حاصلم را
گریبان چاک کن عریانیم را	قبا کن جامۂ حیرانیم را
جنون ہمخوابہ گردان بسترم را	سمندر خیز کن خاکسترم را
بہارم نو گل خمیازہ گردان	شرابم خون زخم تازہ گردان
تمنا را شہید بینوا کن	نفس را گرد باد کربلا کن
رفو را با گریبانم میامیز	چو خون از خم من بخیہ فرو ریز
کہن زخم جنون کن نوبہارم	بہ جام بیخودی بشکن خمارم[1]

علوی

محمد طاہر حسینی کاشان کا رہنے والا تھا اور شاعری میں علوی تخلص کرتا تھا۔ وہ شاہ حسین صفوی کا ہمعصر تھا۔ ایران میں اس کی شاعری خاصی مقبول تھی۔ بعد میں علوی ہندوستان آگیا اور کشمیر میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں اس کا انتقال ہوا[2]۔ خان آرزو کا خیال ہے کہ علوی کاشانی اور علوی ہندی دو الگ الگ شاعر ہیں، مؤخر الذکر جلال اسیر کے رنگ میں شعر کہتا تھا[3]۔ مگر غالباً یہ خان آرزو کا اشتباہ ہے۔

علوی نے ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا جو ۳ ربیع الاول ۱۱۱۰/ ۸ ستمبر ۱۶۹۸ (تاریخ تحریر) سے پہلے مرتب ہو چکا تھا[4]۔ اس دیوان میں ۲۴ قصیدے، غزلیں، رباعیاں، ترجیع بند، ترکیب بند اور ایک مثنوی ہے۔ اشپرانگر نے ایک مثنوی حداد و حلاج بھی علوی کی طرف منسوب کی ہے[5]۔

---

[1] ایضاً ورق ۹۲

[2] ہمیشہ بہار ورق ۶۶؛ نشتر عشق ص ۱۱۸۹۔

[3] مجمع النفائس ورق ۳۲۳

[4] دیوان علوی، بانکی پور نمبر ۵۹۲، ترقیمہ

[5] اشپرانگر ص ۳۲۸

دیوان علوی کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں شاعر اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے :-

قارون اقبال اوج سفلی | طاہر الحسینی المشتہر بہ علوی
در عالم نیستی بہ ہستی مغرور | مہتاب گتان شب تجلی دیجور
با پستی منزلت بہ علوی مشہور | بر عکس نہند نام زنگی کافور[1]

پھر شاعر مختلف اساتذہ کی پیروی کا ذکر کرتے ہوئے شاعری کی افضلیت ثابت کرتا ہے :-

عرش و شرع و شعر از ہم خواستند | ہر دو عالم زین سہ حرف آراستند[2]

علوی کے قصیدے عموماً طویل اور تھکا دینے والے ہیں۔ اور بیشتر اساتذہ قدیم کی زمینوں میں لکھے گئے ہیں۔ عرفی کا انداز یہاں بھی نمایاں ہے۔ یہ فخریہ دیکھئے :-

نور ہستی کی فتادی بر شبستان عدم | گر نتابیدی بر امکان آفتاب رای من[3]

البتہ چھوٹی بحر کے قصیدے صاف اور رواں ہیں :-

وصف خط و خال می نویسم | معراج خیال می نویسم
خونین دلم از نگاہ جانسوز | رنگ رخ آل می نویسم
مستقبل و ماضی نگہ را | در حیرت حال می نویسم
پستی بہ بلندیم رقم زد | اوج اقبال می نویسم
حسان قصیدہ می نگارم | بل سحر حلال می نویسم[4]

ایک اور قصیدہ کا انداز بالکل منفرد ہے اور اس اعتبار سے بھی عجیب ہے کہ اس میں قافیہ کا التزام ایک دوسرے اعتبار سے کیا گیا ہے :-

---

[1] دیوان علوی، ورق ۶۔
[2] ایضاً ورق ۷۔
[3] ایضاً ورق ۹۰
[4] ایضاً ورق ۲۹۔

خانہ یکی ، وطن یکی ، یار یکی ، سخن یکی — شمع یکی ، لگن یکی ، یار یکی ، سخن یکی
آدم اگر ملک یکی ، خالق نہ فلک یکی — نقد یکی ، محک یکی ، یار یکی ، سخن یکی
لذت جان وتن یکی ، تاب وتوان من یکی — ماہ وکتان من یکی ، یار یکی ، سخن یکی
کیف یکی وکم یکی ، لوح یکی ، قلم یکی — روح یکی ودم یکی ، یار یکی ، سخن یکی
سوز وگداز من یکی ، عجز ونیاز من یکی — بندہ نواز من یکی ، یار یکی ، سخن یکی
علوی بینوا یکی ، خاک رہ فنا یکی — ورد اگر دعا یکی ، یار یکی ، سخن یکی[1]

اس میں پہلے مصرع کے دونوں ٹکڑے اور آخری مصرع کا پہلا ٹکڑا اہم قافیہ ہیں۔ یہی انداز ایک غزل کا بھی ہے جس کا مطلع ہے :-

از جوش عطا وز نوش سخا ، فریاد رسا دریاب مرا
جامی برسان از طور لقا ، فریاد رسا دریاب مرا[2]

علوی کی غزلیہ شاعری عام روایتی انداز کی ہے۔ غالباً اس کی زود گوئی اور بسیار نویسی نے اس کی شاعری کو گہرائی اور گیرائی سے محروم رکھا۔ ذیل میں ایک غزل مثال کے طور پر درج کی جاتی ہے :-

شبنم نگہی از لب خاموشی جاوید — با مہر رخی گفت بہ سرگوشی جاوید
چون نیستی بیخبر از جلوہ ہستی — از یاد تو رفتیم فراموشی جاوید
برخاک نشستیم بہ نومیدی شبنم — کامی نگرفتیم زمدہوشی جاوید
از بخت سیہ فرق نشد روز من از شب — چون زلف نشستم بہ سیہ پوشی جاوید
از عہد ازل غاشیہ بردوش اطاعت — بستم کمر جان بہ وفاکوشی جاوید[3]

---

[1] ایضاً ورق ۶۴
[2] ایضاً ورق ۸۱
[3] ایضاً ورق ۱۹۴

علوی کی رباعیوں میں غزل سے زیادہ کیف و کشش ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے:۔

انسان چو حباب اگرچہ شاخی دارد — در بحر وجود آشیانی دارد

از راز نفخت فیہ غافل شدہ است — بیچارہ بخود گمان جانی دارد[1]

سکندر سروری

سکندر سروری ایک صوفی منش شاعر تھا اور قادریہ سلسلہ میں بیعت تھا۔ اسے شیخ عبدالقادر جیلانی سے بہت عقیدت تھی جس کا اظہار شاعر نے مختلف رباعیوں میں کیا ہے۔ سروری نے ۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲ء میں اپنا دیوان مرتب کیا۔ جس پر مشہور مؤرخ محمد ساقی مستعد خاں نے دیباچہ لکھا ہے۔ مستعد خاں شاعر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

'نی نہ ماننا بتبسم آموز غنچۂ سخن، چہرہ افروز شاہد این فن، ناشناس نمکدہ دوری سکندر سروری'

قطعہ تاریخ یہ ہے:۔

بحمد اللہ کہ دیوان سروری — شدہ گلزار از گلہای اسرار

رقم زد خامہ ام سال بہارش — 'بہین گلدستۂ گلہای اسرار'

سروری کی غزلیں زیادہ تر صوفیانہ اور اخلاقی انداز کی ہیں۔ ۱۱۱۴ھ ایک غزل اورنگزیب کی مدح میں ہے۔ غزل کے علاوہ سروری نے رباعی اور قطعے بھی کہے ہیں۔ کئی ایک تاریخی قطعے ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ ۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲ء برآمد ہوتی ہے۔ دیوان کے آخر میں ایک قصیدہ ہے جس کا عنوان عمان المعانی ہے[2]۔

---

[1] ایضاً ورق ۲۹۵۔

[2] ریو (ضمیمہ) ص ۲۱۱۔

حیرت

میرزا عنایت اللہ الحارثی الجغتائی، الانصاری اورنگزیب کے ملازمین اور شاہ عالم کے متوسلوں میں تھا۔ اس کا خطاب قسور خان تھا، جو اسے شاہ عالم نے عطا کیا تھا۔

فرمود اسمم عنایت اللہ پیرم پس گرد امیر شاہ عالمگیرم
شاہ عالم خطاب قسور خان داد حیرت بد بدخدا اگر جاگیرم[1]

مرزا کا تخلص حیرت تھا، اور غالباً بخارا وطن تھا۔

بیرون ز وطن کلفتم افزود وگرنہ از دور صفا بود بخارا وطنم را[2]

مندرجہ ذیل رباعی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیرت کا وطن توران تھا:۔

گو ہند سخنوری بود در ایران فیض حق را بہ یک مکان خاص مدان
حجت طلبی اگر درین دعوی کذب بنگر کہ منم زخاک پاک توران[3]

دیگر تورانیوں کی طرح حیرت بھی نقشبندی مشرب اور خواجہ احرار کا معتقد تھا۔

ہزار شکر شدم نقشبندی المشرب باین بدارد دم و ہم باین شوم محشور[4]

حیرت کا دیوان شاہ عالم کی تخت نشینی (۱۷۰۷ء) کے بعد فخر الدین احمد نے مرتب کیا، اور اس پر ایک مقدمہ لکھا۔ مقدمہ میں مرتب نے شاعر کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے:

"کلام بلاغت نظام ... نور بحر علم و معرفت المتخلص بہ تخلص حیرت، خان عالی شان المسمی بہ میرزا عنایت اللہ الحارثی، الجغتائی، الانصاری، المخاطب بہ خطاب قسور خان سلمہ اللہ تعالیٰ .... مغز خیالات اہل زمان ... است[5]۔"

---

[1] دیوان حیرت، بانکی پور، ۵۵۹ (فہرست انگریزی ج ۳ میں اس کا نمبر ۳۹۰ ہے) ورق ۱۸۱۔

[2] ایضاً ورق ۴۴ [3] ایضاً ورق ۱۸۰۔

[4] ایضاً ورق ۸ [5] ایضاً ورق ۳۔

اس کے بعد مرتب کہتا ہے کہ عرصہ سے میری یہ خواہش تھی کہ دیوان حیرت ترتیب دوں اس کا مسودہ شہزادہ معظم کے پاس تھا۔ تخت نشینی کی جنگ کے بعد جب شہزادہ نے اس مسودہ کے بارے میں استفسار کیا تو کہیں اس کا پتہ نہیں ملا۔ آخر کار بہت تلاش و جستجو سے میں نے یہ دیوان مرتب کیا۔[1]

دیوان حیرت قصائد، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ قصائد کی تعداد گیارہ ہے اور تقریباً سبھی حمد، نعت اور منقبت میں ہیں۔ عرفی کے مشہور قصیدوں کی زمین میں حیرت نے بھی قصیدے لکھے ہیں اور ان اشعار میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے:-

ای سخن رس! بہ تو دارم دو سہ حرفی اکنون	از رہ بندگی خویش، نہ از راہ جدل
بود در عصر خود استاد سخن گر عرفی	من بہ طور خودم امروز درین شیوہ مثل
زانکہ نبود سخنم مدح ملوک و امرا	نیست ہم فخر خود و شکوہ گردون دغل
ہست یکسر ہمہ در نعت رسول اکرم	عاشق امت و معشوق خدا عزوجل[2]

حیرت کا سرمایۂ حیات یہی عشق رسول تھا۔ حسب نسب اور جاہ و منصب کی اس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی۔ ایک دوسرے قصیدہ میں شاعر نے بہت حسین انداز میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے:-

بہ عشق می رسد اصلم، نسب نمی دانم	نہ رومیم، نہ عراقی و نہ خمراسانی
نیم اکابر دہلی، نیم جنت پنجاب	نہ پیرزادۂ سرہندی و نہ ملتانی
غریب کشور عشقم، مقیم خانۂ درد	غذای من غم و باشد لباس عریانی
امام بلبلم و پیشوای پروانہ	گلم ز داغ بود، مشعلم ز حیرانی[3]

---

1. ایضاً
2. ایضاً ورق ۱۳
3. ایضاً ورق ۲۶۔

اس قصیدہ میں حیرت نے کسی میاں منور کی مدح کی ہے :۔

سخن صریح بگویم کہ چیست نام اورا　　　　کہ کردہ نقش نگینم اسیر حیرانی

میان منور صاحب کہ از فروغ رخش　　　　گرفت منصب پروانہ انسی وجانی[1]

ایک اور قصیدہ میں نوکری کی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اعتماد الدولہ کی مدح کی گئی ہے:۔

شکر گو حق را درین عصر اعتماد الدولہ است　　　　کز قدوم او بہ سر دارم ہوای نوکری[2]

حیرت اوسط درجے کا شاعر تھا۔ اس کی غزلیں سادہ اور سہل ہیں۔ اور بڑی حد تک تکلف یا آورد سے بری ہیں۔ شاعر نے بعض مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں اور ان میں حالات وحادثات پر تنقید کی ہے۔ ایسی ہی ایک غزل یہاں درج کی جاتی ہے:۔

مردان عصر زرخ تہمتن شکستہ اند　　　　تیغ بہادری بہ سر زن شکستہ اند

پروای باغبانی بلبل نمی کنند　　　　رندان کہ بارہا در گلشن شکستہ اند

رعنای آفت است کہ از شعلہ شمع را　　　　در بزم دادہ افسر و گردن شکستہ اند

بگذر ز اہل عصر کہ دلہای دوستان　　　　این قوم در خوشامد دشمن شکستہ اند

حیرت زبیدلم شدہ حالی است مصرعی

دارم دلی کہ پیشتر از من شکستہ اند[3]

حیرت کی غزلوں کا عام موضوع حسن وعشق نہیں بلکہ حیات وکائنات ہے، فقر وفنا،

---

[1] ایضاً ورق ۲۷

[2] ایضاً ورق ۲۹۔ نواب محمد امین خان اعتماد الدولہ (م ۲۹ ربیع الاول ۱۱۳۳/۲۷ جنوری ۱۷۲۱ء) نظام الملک کا بھتیجا اور سید برادران کے زوال کے بعد محمد شاہ کا وزیر اعظم تھا (اوریئنٹل بایوگرافکل ڈکشنری، بیل، ص ۱۸۴)

[3] ایضاً ورق ۱۰۰۔

تسلیم و رضا، بندگی اور سپردگی جیسے موضوع پر شاعر نے زیادہ توجہ دی ہے اور اس سلسلہ میں بعض پیارے شعر کہے ہیں۔ مثلاً

زعالم رفتن یاران بدان ماند کہ در مجلس	زانبوہی بہ ہر کس جای گرد د تنگ، برخیزد[۱]

یا یہ پوری غزل ملاحظہ فرمائیے:۔

رنگ ہستی بہ فنا باختہ، می باید رفت	خویش را از نظر انداختہ، می باید رفت
ہمہ خیر است بہ دیوان کرم، طاعت چیست؟	بہتر آن ست کہ ناساختہ، می باید رفت
نتوان رفت رہ کعبہ بہ این بار گران	دل پر آرزو انداختہ، می باید رفت
سفر ملک عدم نیست بہ سامان، حیرت	بہ خدا، کار خود انداختہ، می باید رفت[۲]

سالم کشمیری

حاجی محمد اسلم سالم کشمیری پنڈت تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ محسن فانی کے ایما پر انھوں نے اسلام قبول کیا۔ فن شعر میں بھی انھوں نے فانی سے استفادہ کیا۔[۳] بڑے ہونے پر سالم شہزادہ اعظم کی ملازمت میں آگئے اور اس کے ساتھ گجرات گئے جہاں ان کی ملاقات بیدل، شہرت اور راسخ سے ہوئی تھی۔[۴] دوران ملازمت میں سالم حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ خان آرزو نے سالم کی اس رباعی سے یہ قیاس کیا ہے کہ سالم ابھی مدینہ ہی میں تھے کہ حج کا زمانہ گذر گیا اور انھوں نے یہ سعادت دوسرے سال حاصل کی۔

عید فطر است و بروی پیغمبر	شیئاً للّٰہ گفتیم بس باور
این عید و مدینہ بخت من، طالع من	ان شاء اللّٰہ کہ و عید دگر

---

[۱] ایضاً ورق ۸۷ [۲] ایضاً ورق ۶۷

[۳] سفینۂ خوشگو ص ۳۸۔ بقول ید بیضا (ص ۱۲۵) فانی نے سالم کو اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔

[۴] گل رعنا ورق ۱۲۵۔

لیکن آزاد بلگرامی کا کہنا ہے کہ ان اشعار سے فوت رنج ثابت نہیں ہوتا۔[1]

سالم تقریباً پوری زندگی شہزادہ اعظم سے متعلق رہے۔ انھوں نے متعدد قصیدوں، رباعیوں اور قطعوں میں شہزادہ کی پرجوش مدح کی ہے۔ اورنگزیب کے ۲۶ویں سن جلوس (۱۶۸۲ء) میں شہزادہ اعظم پر ایک ہاتھی نے حملہ کر دیا تھا، مگر باپ کی طرح وہ بچ گیا۔ اس موقع پر دربار میں خوشی میں ایک زبردست تقریب منائی گئی جس میں سالم نے ایک تہنیتی مثنوی پیش کی۔ اس مثنوی کے ۵۶ شعر مآثر عالمگیری میں نقل کیے گئے ہیں۔[2] ربیع الاول ۱۱۰۵/ دسمبر ۱۶۹۳ء میں اعظم ایک طویل بیماری سے شفایاب ہوا تو سالم نے یہ تاریخ کہی:۔

شفای شه دعای بادشه بود[3]

اورنگزیب کی وفات کے بعد اعظم اور معظم میں تخت نشینی کی جو جنگ ہوئی، اس سے سالم بہت مایوس ہوئے اور جب ان کا مربی شہید ہوا تو وہ ملازمت سے استعفی دیکر وطن کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں انھوں نے دہلی میں قیام کیا اور اپنے قدیم دوست بیدل سے ملاقات کی۔[4] خوش قسمتی سے نئے بادشاہ نے انھیں کشمیر کا وقائع نگار مقرر کیا۔ غالباً یہ ان کے لیے آخری زندگی کا سہارا تھا۔ سالم کشمیر پہونچے اور اسی سال ۱۱۱۹/ ۱۷۰۸-۱۷۰۷ راہی ملک عدم ہوئے۔[5]

سالم کا شمار اپنے عصر کے استاد اور پختہ گو شعرا میں ہوتا تھا۔ اگرچہ انھیں غنی اور رجوپا

---

[1] مجمع النفائس، ورق ۱۹۰، گل رعنا (حوالہ بالا)

[2] مآثر عالمگیری ص ۲۳۱۔ [3] ایضاً ص ۳۶۱

[4] سفینۂ خوشگو ص ۳۸

[5] ایضاً، گل رعنا ورق ۱۲۵، ڈاکٹر ریو نے (۳/ ۱۱۷۵ دب) اور ان کے تتبع میں ایتھے نے (بوڈلین نمبر ۱۲۶) سالم کی تاریخ وفات ۱۱۳۰/ ۱۸-۱۷۱۷ دی ہے۔

کی طرح شہرت نصیب نہیں ہوئی اور ان کا دیوان آج تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری میں غنی کی گہرائی، بینش کی رومانیت اور فانی کا سوز و گداز ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے سب سے بڑے معاصر بیدل ان کے بیحد قدردان تھے اور بڑے شوق سے ان کا دیوان پڑھتے تھے[1] خان آرزو کہتے ہیں:

"مثل او از کشمیر چہ کہ از جای دیگر ہم بسیار کم برخاستہ"[2]

خوشگو[3] کا بیان ہے کہ دیوان سالم میں تقریباً دس ہزار اشعار ہیں لیکن سب کے سب استادانہ ہیں۔

بانکی پور لائبریری[4] میں دیوان سالم کا جو نسخہ موجود ہے اس میں کم و بیش آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ اس میں غزلیات، قصائد، قطعات، ترکیب بند اور مثنویاں ہیں۔ قصائد حمد و نعت کے علاوہ عالمگیر اور اعظم شاہ کی مدح میں بھی قصیدے ہیں۔ بعض تاریخی قطعات ہیں۔ ایک مختصر مثنوی عیدگاہ کشمیر کی تعریف میں ہے۔ دوسری مثنوی لاہور کے ایک نوجوان کی عشقیہ داستان پر منحصر ہے جو ایک پری کے دام عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس مثنوی کا عنوان 'گنج معانی' اور اس کا سال تالیف ۱۰۸۲/ ۷۲-۱۶۷۱ ہے۔ جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے:

بجو تاریخ این 'گنج معانی' ز دلچہ نسخہ درد نہانی[5]
۱۰۸۲ ہجری

بوڈلین لائبریری کے مخطوطہ میں ایک اور مثنوی شہزادہ اعظم کی مدح میں ہے اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

---

۱ سفینۂ خوشگو ص ۳۸
۲ مجمع النفائس ورق ۱۹۰
۳ سفینۂ خوشگو ص ۳۹۔
۴ دیوان اسلم سالم کشمیری، بانکی پور نمبر ۵۶۴ (فہرست انگریزی ج ۳ میں نمبر ۳۸۰ ہے)
۵ ایضاً ورق ۲۹۲۔

شہان آئینہ فیض اله اند قدر فرمان و قدرت دستگاه اند[1]

سالم کی شاعری دراصل غزل کی شاعری ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز، کیف و سرمستی اور والہیت ہے۔ سستی رومانیت اور بے فائدہ خیال بندی سے ان کی شاعری کا دامن پاک ہے۔ انھوں نے صائب، کلیم اور فغانی کے انداز میں غزلیں کہی ہیں مگر ان کا رنگ سب سے منفرد اور دلچسپ ہے:

بزم قدس است که حیرت می ناب است اینجا از ازل تا به ابد عالم آب است اینجا
خاک خمخانه عجب مشرب فیضی دارد چشمهٔ خضر به دامان سراب است اینجا
چه قدر فرصت گلگشت به باغ دہر است؟ عمر چون سایهٔ گل پا به رکاب است اینجا
سالم! ای تشنه لب بادهٔ راحت ہشدار آتشی ہست دران تشنه که آب است اینجا[2]

سالم کی دوسری غزل جو یہاں درج کی جارہی ہے، عاشقانہ ہے۔ کشمیر کے شعرا نے عموماً جمالیاتی شاعری میں بڑے دلچسپ رنگ بھرے ہیں، مگر ایسی بیشتر غزلیں معشوق کا سراپا بن کر رہ گئی ہیں اور تغزل پر محاکات غالب آگئی ہے۔ سالم کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے اس میں تغزل اور محاکات کا حسین امتزاج ہے:

خوش بناز ای بوی گل رفتار می آیی، بیا مست می آیی، بیا، ہشیار می آیی، بیا
نقش پایت جاده را امشب چراغان کرده است از کجا ای شعلهٔ دیدار! می آیی؟ بیا
چون سحر از ذوق می بالد به خود نظاره ام مرحبا ای دولت بیدار! می آیی، بیا
می چکد از می به یادت نشه چون اشک از کباب می گدازد ساغر سرشار! می آیی، بیا
از تو شد ای فیض معنی! بزم سالم نوبهار چون تجلی از در و دیوار، می آیی، بیا[3]

---

[1] بوڈلین نمبر ۱۱۶۷

[2] ایضاً ورق ۴۔

[3] دیوان اسلم سالم، ورق ۹

سالم کی تیسری غزل جو نمونہ کے طور پر پیش کی جا رہی ہے، سیدھے سادے عاشقانہ جذبات کی ترجمان اور بے لوث احساسات کی آئینہ دار ہے۔ اس غزل میں بھی ایک مربوط تسلسل اور جامع کیف ہے جس سے غزل کا توازن اور آہنگ دوبالا ہو رہا ہے :-

اگر نور بصر می داشتم، ہای!	بہشتی در نظر می داشتم ہای!
بہ دامن می شمردم چین زلفت	اگر عمر این قدر می داشتم، ہای!
چو شب ہا دیدمت در خواب تا صبح	ز بستر ماہ بر می داشتم، ہای!
چہ می شد گر بہ یاد کج کلاہی	گل شوری بہ سر می داشتم، ہای!
خوشا آن شبہا کہ چون مہتاب سالم	نگاہی در سفر می داشتم، ہای![1]

سالم کے پورے دیوان میں حسین اور لطیف اشعار بکھرے ہیں جو اُن کے فن اور ادب کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہیں۔ یہاں بہت زیادہ اقتباسات نہیں پیش کئے جا سکتے، مزید چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

ما سبک سیران غبار خاطر کس نیستیم	می نشیند گرد ما چون سایہ بر دامان ما
ساقی مرو کہ باز شکستیم توبہ را	ما ہم خیال شوخی احباب داشتیم
مثال سایہ نیفتاد در کفم چیزی	بہ جست وجوی تو دستی بر آفتاب زدم[2]

سالم کے شاگردوں میں فیضان اور آزاد کے نام ملتے ہیں۔[3] اول الذکر دہلی کا باشندہ اور موسیقی و خطاطی کا ماہر تھا اس کا انتقال ۱۱۲۴/۱۷۱۵ میں ہوا۔ مؤخر الذکر کا نام محمد مقیم تھا وہ سید امیر خاں کا مصاحب تھا۔ اس کی وفات ۱۱۵۰/۳۸-۱۷۳۷ میں ہوئی۔[4] کشمیر میں سالم تخلص کا ایک اور شاعر تھا جسے اشپرنگر نے اس سالم سے خلط ملط کر دیا ہے۔ اس کا نام لطف اللہ

---

[1] ایضاً ورق ۲۳۳
[2] ایضاً ورق ۳، ۱۹۵
[3] نتائج الافکار ۳۴۴
[4] سفینۂ خوشگو ص ۲۱۸۔

تھا۔ وہ کربلا جاتے ہوئے ایران میں رکا اور وہاں کے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔ ۱۰۸۹/ ۷۹-۱۶۷۸ء میں اس کا انتقال ہوا[1]

خاشع

خاشع کا کلیات بوہار لائبریری (کلکتہ) میں محفوظ ہے۔ اس شاعر کے بارے میں تذکروں سے کوئی اطلاع بہم نہیں پہونچتی۔ کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد اورنگزیب میں ایران سے ہندوستان آیا:۔

'دل ماخوش کہ بہ ہند آمدہ ایم از ایران[2]

اور غالباً اس کا وطن اصفہان تھا:۔

صاحبا! باک نیست خاشع را زین ہمہ دور از اصفہان باشد[3]

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خاشع کب ہندوستان آیا۔ لیکن اس کے کلیات میں جو تاریخی قطعات ہیں ان میں اولین تاریخ ۱۰۹۲/۱۶۸۱ء کی ہے جو کسی محمود خاں کے مکان کی تاریخ ہے[4] اس لئے ممکن ہے کہ اسی کے لگ بھگ خاشع ہندوستان آیا ہو۔ لیکن افسوس کہ اس کی قسمت کا ستارہ یہاں نہیں چمکا۔ تقریباً ہر قصیدہ کے آخر میں شاعر نے اپنی زبوں حالی اور ہندوستان آنے کا رونا رویا ہے۔

نشاندہ بخت بہ روز خودم دران کشور   کہ آفتاب ندارد تفاوت از شب تاب
زجور غربت اگر زندہ ام سبب این است   کہ بردہ جان ز خیال وطن دل بیتاب

---

[1] تذکرہ نصرآبادی ص ۴۵۰۔

[2] کلیات خاشع، بوہار نمبر ۴۰۸، ورق ۷۔

[3] ایضاً ورق ۴۳۔

[4] ایضاً ورق ۶۶۔

فلک بہ غربت ہندم ازآن فگند خاشع　　　　که واژگونی بخت مرا شود یاور[1]

بڑھاپے اور بیماری نے شاعر کو اور دل خستہ بنا دیا تھا :-

باوجود علیلی و پیری　　　　که تن خستہ ناتوان باشد

در طلسم مغاک غربت ہند　　　　چون مرا فرصت بیان باشد؟[2]

حالانکہ شاعر کو شاہی قرب حاصل تھا :-

نوید شاہی و قرب حضور و ناکامی　　　　دگر کراست بہ جز چرخ درمیان تقصیر؟[3]

اور اپنے عہد کے بہت سے امرا سے اس کے تعلقات تھے۔ ان میں سے اکثر کی خدمت میں اس نے کسی نہ کسی تقریب پر تہنیتی قطعے پیش کیے۔ ان امرا میں موسوی خاں فطرت عبداللطیف خاں موسوی، طاہر خاں، محسن خاں، بزرگ امید خاں، مرزا صفی الدین، قاضی محمد صالح اور حاجی عبداللہ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موسوی خاں فطرت اور عبداللطیف خاں دونوں کی وفات پر شاعر نے تاریخیں کہیں جس سے اس کے تعلق قلب کا اندازہ ہوتا ہے۔ کئی قطعوں میں اورنگزیب کی مدح اور اس کی فتوحات کا ذکر ہے۔ شاہ عالم کے جلوس کی تاریخ اور اس کی تخت نشینی پر تہنیتی قصیدے بھی ہیں جن میں شاعر کہتا ہے :-

منادی است ز عشرت بہ ہر طرف امروز　　　　که دور دور بہادر شہ معظم شد

فزود رتبہ ہر کس ز لطف احسانت　　　　مگر مراتب داعی که بیشتر کم شد[4]

لیکن ان تمام تعلقات کے باوجود خاشع خوش نہیں تھا۔ اس نے نہ صرف ہندوستان کو کوسنا شروع کیا بلکہ اسے یہ افسوس بھی تھا کہ اس ملک میں شاعری اور قدردانی کی کساد بازاری ہے اور اس کے فن کی داد دینے والا کوئی نہیں :-

---

[1] ایضاً ورق ۳۷، ۳۹　　　　[2] ایضاً ورق ۴۳

[3] ایضاً ورق ۱۰　　　　[4] ایضاً ورق ۴۵

قتادہ است چنان از نسق نظام سخن | کہ بر زبان قلم نیست نام از دفتر
خصوص شعر کزین پیش پیش اہل تمیز | چو وحی بود ز الہام رتبہ اش بہتر
کنون اگر ہمہ سحر است شعر و گر اعجاز | کہ نیستش بہ جز انکار حاصل دیگر
فلک بہ غربت ہندم از آن فگند خاشع | کہ واژگونی بخت مرا شود یاور[1]

کلیات خاشع قصائد، قطعات اور غزلیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ بعض قصائد کے اقتباسات اوپر درج کیے گئے، جن سے خاشع کے رنگ کا اندازہ ہوتا ہے۔ عرفی اس کا محبوب قصیدہ گو معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعض بعض جگہ صاف اس کا چربہ اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاشع کی غزلیں عام اور روایتی انداز کی ہیں۔ کہیں کہیں کوئی شعلہ لپک جاتا ہے ورنہ خاشع کا عام انداز سپاٹ اور بے رنگ ہے۔ ایک غزل مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے :-

شوق کو شوق؟ کہ مستانہ شود گریۂ ما | لجۂ کشتی پیمانہ شود گریۂ ما
بہ خیال رخ او شمع صفت می سوزیم | چہ عجب گر ہمہ پروانہ شود گریۂ ما
دارد از شور بہ سر جوش و خروشش عجبی | می رود آہ کہ دیوانہ شود گریۂ ما
شہ اقلیم جنونیم، عجب نیست اگر | بانی کشور ویرانہ شود گریۂ ما
شدہ نزدیک کہ از جوش تمنای وصال | بحر آن گوہر یکدانہ شود گریۂ ما

گشتہ فرسودہ بسی خانۂ دنیا خاشع
مصلحت نیست کہ مستانہ شود گریۂ ما[2]

یہ دو شعر بھی ملاحظہ فرمائیے :-

بہ قدر یاری توفیق ہر کس کار می سازد | یکی مرہم، یکی نشتر درین بازار می سازد
ز گردشہای چرخ بی سر و بن حیرتی دارم | کہ از یک رشتہ گہ تسبیح، گہ زنار می سازد[3]

---

[1] ایضاً ورق ۳۸ ۔ [2] ایضاً ورق ۹۴ ۔ [3] ایضاً ورق ۱۵۹ ۔

گرامی

میر عبدالرحمٰن وزارت خاں خوافی، عہد اورنگزیب میں مالوہ اور بیجاپور کے دیوان تھے۔ ان کے والد میرک معین الدین امانت خاں عالمگیری (م۔ ۱۰۹۵/۸۴-۱۶۸۳) خود ایک ممتاز امیر تھے[1] شاہنواز خاں مؤلف مآثر الامرا سے بھی ان کی قرابت داری تھی[2]۔ آخر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور ۱۱۲۴/۱۳-۱۷۱۲ میں ان کا انتقال ہوگیا[3]۔

وزارت خاں خوافی گرامی[4] تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۱۰۵/۹۴-۱۶۹۳ میں اپنا دیوان مرتب کیا[5] جو تقریباً چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں قصائد، غزلیات، رباعیات وغیرہ ہیں۔ گرامی نے حافظ کی کئی غزلوں پر تضمین کی ہے۔ تضمین کا فن بہت نازک ہے۔ اس میں صناعی اور سخن فہمی دونوں درکار ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ گرامی کی تضمینیں کامیاب ہیں۔ مثلاً:

آمد نسیم از سحر عید و شام رفت	بلبل! نوای تازہ کہ صیاد و دام رفت
از ما و شیخ رسم سلام و پیام رفت	ساقی بیار بادہ کہ ماہ صیام رفت

درده قدح کہ موسم ناموس و نام رفت

---

[1] مآثر الامرا ۱/ ۲۵۸؛ تذکرۂ بینظیر ص ۱۳۳۔

[2] بہارستان سخن ورق ۲۳۰؛ شاہنواز خاں وزارت خاں کے بھائی کاظم خاں کے پوتے تھے (تذکرۂ بینظیر ص ۱۳۴)

[3] نتائج الافکار ص ۶۰۶۔

[4] ایتھے (نمبر ۱۶۲۵) اور اوانوف (ایشیاٹک ۱/ نمبر ۸۰۴) اسے کرامی (کاف سے) پڑھتے ہیں۔ مآثر الامرا (مطبوعہ ۱/ ۲۶۷) اور شمع انجمن (ص ۴۰۸) وغیرہ میں گرامی (کاف فارسی سے) لکھا ہے۔ ایتھے نے اس تخلص کے آٹھ شعرا گنائے ہیں۔ لیکن یہ دیوان عبدالرحمٰن گرامی کا ہے۔ بانکی پور (۱۶۳/۳) میں حسن بیگ شاملو کرامی کے دیوان کا ذکر ہے۔

[5] ایشیاٹک ۱/ نمبر ۸۰۴۔

دل ما در شکن زلف بتان خواہد بود — رونق کارگہ شیشہ گران خواہد بود
این ندانیم کہ انجام چسان خواہد بود — تا زمیخانہ دمی نام و نشان خواہد بود
سرِ ما خاک رہ پیر مغان خواہد بود[1]

گرامی کی رباعیاں بھی دامن دل کھینچتی ہیں۔ ان رباعیوں میں ہمارے شاعر نے ذات و کائنات کے پیچیدہ مسائل اتنے خوبصورت اور مختصر الفاظ میں سمو دیے ہیں کہ ہمیں اس کی قدرت فن کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ ذیل میں دو رباعی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے :۔

امروز بہ رنگ دیگر ستی، جانا! — گویا زمی شبانہ مستی، جانا!
چون عشق در آئینہ بہ خود می بازی — این نیست طریق بت پرستی، جانا!

از گردش چرخ مشنو افسانۂ چند — خوش باش، بزن ساغر و پیمانۂ چند
دنیا بہ چہ ماند و خریدارش چہ؟ — ویرانہ دران نشستہ دیوانۂ چند[2]

گرامی کی غزلیں صاف، شستہ اور شیریں ہیں۔ ایک غزل شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں ہے اور مخصوص تلازمہ کے ساتھ لکھی گئی ہے :۔

الٰہی خیر گردانی، بہ حق شاہ جیلانی — الٰہی خیر گردانی[3]

بعض دوسری غزلوں میں شاعر نے ان اساتذہ کا ذکر کیا ہے جن کی غزلوں پر اس نے غزلیں کہی ہیں۔ ان میں رفعت، سامی اور اس کے استاد کا ذکر ہے۔ گرامی نے استاد کا نام نہیں بتایا ہے بلکہ اس طرح ان کے مطلع پر تضمین کی ہے :۔

گرامی! مصرع استاد را تضمین کنم لیکن — پس از مقطع بخوانم، گرچہ شان ابتدا دارد

---

[1] دیوان گرامی، ایشیاٹک سوسائٹی ۴۰۲، ورق ۵۱۱، ۵۱۳۔

[2] ایضاً ورق ۵۱۶، ۵۲۰۔ [3] ایضاً ورق ۴۹۷۔

دل بیتاب عاشق کی خیال مدعا دارد ؟ چہ آرامیدن از نعلی کہ آتش زیر پا دارد[۵]؟

ایک اور غزل کے مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ غزل فی الدیہہ کہی تھی :۔

گرچہ گرامی بدیہہ گفت بہ بزمت این غزل تازہ انتخاب ندارد[۶]

گرامی کی غزلیہ شاعری پر خمریاتی رنگ غالب ہے۔ غالباً یہ حافظ سے تاثر کا نتیجہ ہے۔

امروز خویشتن را بہ میخانہ بردہ ایم عمریست تا پناہ بہ این خانہ بردہ ایم

شراب خوردن و بر روی لالہ غلطیدن ز من شنو تو کہ این است دولت جاوید

ای خوشا عمر سبک روحی کہ ہر شب تا سحر چون لب دلدار نگذارد لب پیمانہ را[۳]

مگر حافظ کی طرح انھیں بھی یہ احساس ہے کہ پیری اور می نوشی کا تال میل نہیں :۔

ہنگام پیری از می گلگون کنارہ گیر کشتی بہ موج ریگ روان چو کند کسی[۴]؟

ان اشعار میں جو شیرینی اور گھلاوٹ ہے وہ گرامی کی غزل کی جان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیدھے سادے فطری جذبات کو شاعر نے قند و نبات میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ ایک غزل بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہے :۔

بہار آمد، جوانی میتوان کرد چو مستان زندگانی میتوان کرد

شبی کان شاہ مستان بر سر آید بہ پایش جانفشانی میتوان کرد

ازین رخسارہ گلگونی کہ داری چہ رد ہا زعفرانی میتوان کرد

دلی داریم نذر میگساران قبول ارمغانی میتوان کرد

ستمگارا! گرامی بندۂ تست نگاہ مہربانی میتوان کرد[۵]

۱؎ ایضاً ورق ۲۲۴ ۲؎ ایضاً ورق ۲۱۶

۳؎ ایضاً ورق ۲۲۶، ۳۶۸، ۲ ۴؎ ایضاً ورق ۴۹۹

۵؎ ایضاً ورق ۳۱۹ -

جعفر زٹلی

میر جعفر نارنولی جو عام طور پر جعفر زٹل یا زٹلی کے نام سے مشہور ہے، اس عہد کا دوسرا نعمت خان عالی ہے۔ جس کی ہجویہ اور طنزیہ شاعری سے شاید ہی کوئی امیر یا رئیس محفوظ رہا ہو۔ جعفر کے آبا و اجداد ہمایوں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ دربار سے انھیں جاگیر ملی۔ مگر خود جعفر کے والد سید عباس تجارت کرتے تھے۔ ان کی بے وقت موت کے بعد جعفر اور اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اس کے چچا سید سرور نے کی[1]۔

جعفر زٹلی شہزادہ کام بخش کی سرکار میں ملازم تھا۔ اور غالباً یہیں اسے بیشتر امرا سے ملنے کا موقع ملا۔ شہزادہ اعظم کے پاس بھی اسے عزت حاصل تھی[2]۔ اورنگزیب کے انتقال اور کام بخش کی شہادت کے بعد جعفر کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ شاید اس نے گوشہ گیری اختیار کرلی۔ مگر اس کی زبان کی تیزی ابھی کند نہیں ہوئی تھی۔ جب فرخ سیر تخت نشین ہوا تو جعفر نے عجیب مضحکہ خیز سکہ کہا:-

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر | بادشاہ دانہ کش، فرخ سیر

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی گردن اڑا دی گئی۔ قتل کے وقت اس کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ یہ واقعہ ۱۱۲۵/۱۷۱۳ میں پیش آیا[3]۔

جعفر زٹلی اصلاً ہجو نویس، فحش نگار اور ہزل کا استاد تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں شاعری کا غیر معمولی ملکہ تھا اور اس کی قوت مشاہدہ بیحد تیز اور دور رس تھی، لیکن ابتذال اور پھکڑپن

---

[1] مجموعۂ نغز ص ۱۶۷؛ اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۹۔

[2] ایضاً

[3] تذکرۂ شورش (مشمولہ دو تذکرے) مرتبہ ڈاکٹر کلیم الدین احمد، پٹنہ ص ۱۶۱۔

نے اسے اس عزت اور عظمت سے محروم رکھا جو نعمت خاں عالی کے حصہ میں آئی۔ تاریخ ادب میں اس کا مقام ابتذال نویسی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اول تو وہ دو لسانی شاعری (فارسی اردو) کے بانیوں میں تھا اور دوسرے یہ کہ اس کی تخلیقات اس دور کے زوال پذیر معاشرہ کی سچی اور بے لاگ ترجمان ہیں۔

جعفر زٹلی کا کلیات عجیب وغریب تخلیقات کا ملغوبہ ہے۔ اس میں انتہائی فحش اشعار بھی ہیں اور تند وترش ہجویں بھی۔ سنجیدہ غزلیں بھی ہیں اور پرسوز مرثیے بھی۔ طنز ومزاح کے لطیف نشتر بھی ہیں اور ابتذال اور پھکڑپن کی بھونڈی مثالیں بھی۔ یہ اشعار صاف اردو، شستہ فارسی یا مخلوط زبان میں ہیں۔ فارسی نثر کے کچھ شہپارے بھی ہیں۔ جن میں اخبارات دربار معلیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ اخبارات انتہائی فحش اور بھدے ہیں اور ہر واقعہ کی رپورٹ ایک ہندی مثال پر ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح عبید زاکانی کے انداز کا ایک النامہ ہے جس کے چند نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں:۔

الخدا : خوان یغما

الپادشاہ : کاہل زمان

الکوتوال : نمونۂ ملک الموت

الطبیب : پیک اجل

الفلاکت : نتیجۂ کدخدائی

الاصیل : زنی کہ از دست انداختن غوغا کند۔

الروپیہ : قاضی الحاجات

المفلس : کان تصوف[۱]

ان چند معانی سے جعفر کے معاشرہ پر جو چھوٹ پڑتی ہے، وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ کہتے ہیں کہ جعفر زٹلی جب کسی کی مدح کرتا تو ساتھ ہی ہجو بھی لکھ لیتا اور اگر اس کی مراد نہیں

[۱] کلیات جعفر زٹلی۔ مطبع محمدی، دہلی، ۱۲۸۹ھ، ص ۳۳-۳۱۔

برآتی تو فوراً وہ ہجو منتشر کر دیتا[1]. مگر کلیات میں ہجویات کی اتنی زیادتی نہیں ہے. جن لوگوں کی ہجویں ہیں ان میں شہزادہ کام بخش، مرزا خدایار بیگ، مادھوداس چوکی نویس، ذوالفقار بیگ خانجہان بہادر اور کوتوال دہلی کے نام نظر آتے ہیں. البتہ شہنشاہ وقت اورنگزیب کے لیے جعفر کے دل میں بہت عقیدت تھی، ایک مثنوی میں جس کا عنوان زٹل نامہ ہے. شاعر اورنگزیب کے استقلال اور عزم کی تعریف کرتے ہوئے، اس کے چاروں بیٹوں پر الزام دھرتا ہے. اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے حریفوں کو ان الفاظ میں یاد کرتا ہے:۔

وگرنہ چہ یارا حسن شاہ را | کہ گرداند امر شہنشاہ را
سکندر چہ باشد کہ سر بر کشد؟ | لباس کیومرث در بر کشد
چہ خشخش کہ با زہرہ و مشتری | بہ نخوت زند دعوی ہمسری
چہ بیجاپور است و چہ کرناٹک است؟ | چہ آن گولکنڈہ کہ یک پھاٹک است[2]

اورنگزیب کی وفات پر بھی جعفر نے جو مرثیہ لکھا ہے، وہ سوز وگداز سے بھرپور ہے. شاعر اس درد انگیز احساس کا بار بار ذکر کرتا ہے کہ اورنگزیب نے مغل سلطنت کو جتنا عظیم اور وسیع بنایا، اسے سنبھالنے کی صلاحیت اس کے کسی لڑکے میں نہیں:۔

بہ صورت خضر و در سیرت ملک بود | بہ عظمت خاک پایش بر فلک بود
دریغا! عدل و دین بی او دو نیم است | عروس سلطنت بی او سقیم است
دریغا! رونق باغ جہان رفت | دریغا! آبروی مرد خان رفت[3]

جعفر زٹلی کی نقش نگاری یا طنز نویسی دراصل سماجی تنقیدات کی مختلف شکلیں ہیں یہ کہنا بیجا ہوگا کہ اس کے قہقہے محض تفنن طبع کے لیے تھے. جہاں کہیں ان قہقہوں کی لے مدھم

---

[1] میر تقی میر: نکات الشعرا مرتبہ حبیب الرحمن خاں شروانی، بدایوں، ص ۱۳۱.
[2] کلیات، ص ۸۲.
[3] ایضاً ص ۸۶.

ہوئی ہے وہاں طنز کے ساتھ ساتھ حسرت اور کرب کا احساس بھی صاف نظر آتا ہے۔ جعفر بذات خود ادب اور علم کا پرستار تھا، وہ شرافت، نجابت اور دوسری سماجی قدروں کا دل سے قدر داں تھا مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ سماج میں اعلیٰ اور ادنیٰ سب کا معیار اتنا گر چکا تھا کہ تیز و تند مذاق کے سوا اور کوئی چیز حرکت نہیں پیدا کرتی تھی:

لباس و زیور شیران شغال کردہ بہ بر	مہ جمال دلیران بہ خاک شد مستور
نماند عزت علم و ادب، نہ پیر و پدر	نہ قدر زمزم و کوثر نہ قرب سرمہ طور
مرا عجب ز تقاضای وقت می آید	کہ ہرزہ گوی عزیز و مظفر و منصور
بہ حیرتم بہ کہ گویم؟ کجا روم؟ چہ کنم؟	کز اختلاف زمانہ پرید عقل و شعور[1]

عمر کے ارتقا اور معاشرہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ جعفر کے قہقہے دھیمے پڑتے گئے۔ ابتذال کی جگہ طنز اور مزاح کی جگہ حسرت نے لے لی۔ وہ دنیاوی عیش و آرام کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی بے قدری پر غور کرنے لگا۔ اس نے جوانی کی موت اور حواس خمسہ کی بیوفائی پر دو دلدوز نظمیں لکھی ہیں۔ دونوں نظمیں مخلوط فارسی اور اردو میں ہیں اور تاثر اور سوز و گداز سے بھرپور ہیں۔ دوسری نظم کا عنوان طوطی نامہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نظم صوفیوں کی محفلوں میں پڑھی جاتی تھی اور غالباً اسی بنا پر بعض تذکرہ نگاروں نے جعفر کو صوفی شاعر مانا ہے[2]۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ اس کا مصنف وہی جعفر زٹلی ہے جس کے ابتذال کے سامنے بڑے بڑے شیر مردوں کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ یہ نظم دولسانی شاعری کی بہترین مثال ہے:

دریغ ای طوطی روحانی من!	کہ گہ در پنجرۂ جسمانی من
نگفتی یک نفس با شاہ وحدت	نماندی یک نفس در راہ وحدت
زبان بر ہزل گویہا گشادی	دریغ! اوقات خود ضائع نمودی

---

[1] ایضاً ص ۴۴

[2] روز روشن ص ۱۴۵

به آب ودانه مشغولی، دریغا!	به رنگین خانه مشغولی، دریغا!
به این الحان نه آب ودانه ماند	نه این خانه، نه صاحب خانه ماند
پیاری لال سے ہیا نہ جوڑا	ہوا وحرص سے مکھڑا نہ موڑا
سجن سے آج رنگ رلیاں منالے	رنگیلی سیج پر کلیاں بچھالے
وگرنہ کیا بھروسہ اس پون کا	یکایک آن پہونچا دن گون کا
اندھیری گور میں دیا نہ باتی	اگاڑو چل گئے ساتھی سنگھاتی

ہے تیری دور منزل وقت تھوڑا
نہ توشہ راہ کا اور لنگ گھوڑا[1]

وحدت

شیخ احمد سرہندی اور ان کے خاندان نے ہندوستان میں علم ومعرفت کی جو روشنی پھیلائی اس نے مغل معاشرہ پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ اورنگزیب اس خاندان سے بہت متاثر تھا۔ وہ خود شیخ محمد معصوم سرہندی کا مرید اور ان کے جانشین شیخ سیف الدین کا معتقد تھا۔ سرہند دراصل علم ومعرفت کا گہوارہ بن گیا تھا، اور اس عہد میں ناصر علی اور راسخ نے اس شہر کی ادبی عظمت میں بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ اسی خاندان کے ایک فرد شیخ عبدالاحد وحدت تھے جو عام طور پر میاں (شاہ) گل کہلاتے تھے۔ وحدت شیخ احمد سرہندی کے پوتے اور شیخ محمد سعید کے لڑکے تھے۔[2] انھوں نے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور حرمین کی زیارت کے دوران عجم اور عرب کے علما سے استفادہ کیا۔[3] اس عہد کے مشہور صوفی شاہ عبدالرحیم سے بھی

---

[1] کلیات ص ۷۹

[2] مرآۃ العالم، ورق ۶۲۴؛ نتائج الافکار ص ۴۴۷ میں ان کا نام عبدالواحد لکھا ہے۔

[3] ہمیشہ بہار ورق ۱۰۲۔

ان کے قریبی تعلقات تھے۔ انھوں نے شاہ عبدالرحیم کے نام جو خطوط لکھے تھے، وہ مؤخرالذکر کے مجموعۂ مکاتیب انفاس رحیمیہ میں درج ہیں۔ وحدت دہلی میں فیروز شاہ کوٹلہ میں رہتے تھے، اور یہیں ۱۱۲۶/۱۷۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا[1]۔

وحدت اصلاً صوفی عالم تھے، مگر فارسی شاعری سے انھیں دلی شغف تھا۔ ان کے دیوان میں فارسی قصائد، غزلیات، رباعیات، قطعات کے علاوہ چند ہندی اشعار بھی ہیں، مثلاً

بنتی میری سن سکھی، پہ سورج ہوں چھانو	جو دکھلا دے موہ مکھ، ٹھری ٹھری ہوں جانو[2]
سونا دیہ، سکند دیہ، مانک مکتا دیہ	توں ہیر ابن رانجھا، مت دیہ، مت لیہ

ریو نے ان کی ایک مذہبی نظم کا ذکر کیا ہے[3]۔

وحدت کے قطعات خاندان کے بزرگوں مثلاً شیخ معصوم، خواجہ نقشبند اور وحدت کے والد شیخ محمد سعید کی وفات پر ہیں۔ ایک بالکل مہمل قطعہ ہے مگر اس کے پرشکوہ الفاظ بادی النظر میں چونکا دیتے ہیں:

چشمۂ پشم شام و بوم طلا	قینقاع دو خواجہ، تخم صبا
غنچۂ جلترنگ، شیرین باف	فتنۂ درخواب، ہر دو جنس معاف
نکمۂ نخل بند اصطرلاب	بال پروین انتخاب رباب
بانگ گلفام نازنین رہگیر	شب نشینان غورۂ زنجیر
نیست یک لفظ زین میان مہمل	بہ خدای کریم عز و جل[4]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۶۹۔

[2] دیوان وحدت، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۳۸، ورق ۲۵۸۔

[3] ریو ۳/۱۰۵۸۔

[4] دیوان وحدت ورق ۲۵۸۔

وحدت کی غزلوں میں تصوف اور مجاز کی لطیف چاشنی ہے۔ ان کے یہاں خسرو کی شیرینی عراقی کا گداز اور جامی کا والہانہ پن ہے۔ انھوں نے عموماً رواں اور سبک بحروں کا انتخاب کیا ہے اور ایسے ردیف قافیہ کا التزام کیا ہے جس سے شعر کی نغگی دوبالا ہو جاتی ہے اور انھیں گا کر یا گنگنا کر پڑھنے میں ایک عجیب لطف ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل غزل کی موسیقی اور آہنگ ملاحظہ فرمائیے:۔

تالخت دل بہ دیدۂ گریان فروختیم	سررا بہ پای دپای بہ دامان فروختیم
دل از جہان گرفتہ بہ کنجی خزیدہ ایم	خوش یوسفی خریدہ، بہ زندان فروختیم
پیرانہ سر بہ زلف جوانی شدیم اسیر	صبح وطن بہ شام غریبان فروختیم
باشد کہ گرد ناقۂ لیلیٰ بہ ما رسد	مجنون خویش را بہ بیابان فروختیم
دست طلب بہ دامن مطلب نمی رسد	ماپاشکستہ سر بہ گریبان فروختیم
بخت سیاہ در نظرش جلوہ دادہ ایم	ما سرمہ را بہ چشم غزالان فروختیم
آمد غم نگار، دل و دین ما ربود	ما خانہ با متاع بہ مہمان فروختیم
وحدت کجا وخانہ کجا، عافیت کجا؟	ما این ہمہ بہ کوہ و بیابان فروختیم[1]

وحدت نے چند نعتیہ قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان قصائد میں بھی وہی ترنم اور ہم آہنگی ہے جو ان کی غزلوں کا سرمایۂ امتیاز ہے۔ شاعر دراصل عشق محمدی میں دیوانہ ہے اور جس والہانہ انداز میں وہ نعت کہتا ہے اس سے اس کی روحانی سرمستی اور تعلق خاطر کی پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ یہ نعتیہ قصیدہ غزل کی تمام رعنائیوں سے ہمکنار ہے:۔

طوبیٰ چہ بود؟ قامت رعنای محمد	کوثر چہ بود؟ لعل شکرخای محمد
رضوان کہ بود؟ یک چمن آرای محمد	جبریل یکی بادیہ پیمای محمد
پروین چہ بود؟ نقش کف پای محمد	خورشید نشان ید بیضای محمد

---

[1] ایضاً ورق ۲۰۴۔

والشمس بہ واللیل ہم آغوش درآمد | یعنی رخ خوب و خط زیبای محمد
این ابجد ہستی ہمہ در لوح عدم بود | تا نقش نزد خاتم والای محمد
اشعار مرا رتبہ دوبالا شدہ امروز | تا داد نشان از قد بالای محمد[1]

یا اس قصیدہ کا تغزل ملاحظہ فرمائیے:-

ای بہ آئین دلربا بیہا | غارت زہد و پارسائیہا
شبنم ما بہ وقت گل نرسید | آب شد دل ز نارسائیہا[2]

منصف

فاضل[3] خان منصف سمرقند کے سید تھے۔ ان کا نام خواجہ بابا تھا۔ اپنے وطن میں وہ صدر ریاست کے عہدہ پر فائز تھے اور سبحان قلی خاں حاکم توران کے دربار میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بعد میں منصف ہندوستان آ گئے۔ اورنگزیب نے انھیں داروغہ داغ کا عہدہ عنایت کیا مگر دو سال کے بعد انھوں نے اس ملازمت سے استعفی دیدیا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد منصف حج کے لیے چلے گئے اور وہاں کئی سال قیام کرنے کے بعد جب

---

[1] ایضاً ورق ۷ [2] ایضاً ورق ۱۵

[3] عہد اورنگزیب میں فاضل خاں کا خطاب تین اور اشخاص کو ملا تھا۔ ملا محمد فاضل خاں جن کا ذکر پہلے ہوا، دوسرے ملا علاء الملک تونی (م ۲۷، ذی قعدہ ۱۰۷۳/۲۳ جون ۱۶۶۳) اور تیسرے ان کے بھتیجے برہان الدین فاضل خاں آخر الذکر کشمیر کے صوبیدار تھے اور ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰ میں انتقال کیا (مآثر عالمگیری ص ۴۷؛ مآثر الامرا ۳/۳۴) صبح گلشن (ص ۴۵۷) اور فہرست کتب خانہ حبیب گنج (نمبر ۴۷/۵۶۹۴) میں برہان الدین اور منصف کو خلط ملط کر دیا ہے۔

[4] مردم دیدہ ص ۹۲۔

ہندوستان لوٹے تو فرخ سیر حکمراں تھا۔ نواب اعتماد الدولہ نے انھیں کوئی عہدہ دینا چاہا لیکن منصف نے قبول نہیں کیا۔ وہ لاہور آ کر نواب عبد الصمد خاں سیف الدولہ سے متعلق ہو گئے اور یہیں ۱۱۲۸/۱۶-۱۷۱۵ء میں انھوں نے وفات پائی[1]۔

منصف کا شمار اس دور کے معزز علما اور شعرا میں ہوتا تھا۔ اپنے ہمعصر دانشوروں میں وہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے[2]۔ ان کے دیوان میں قصیدے، غزلیں، رباعیاں اور چند قطعے ہیں۔ بعض تاریخیں بھی ہیں۔ آخری تاریخ ۱۱۲۷/۱۷۱۵ عبد الصمد خاں کی سکھوں پر فتح سے متعلق ہے :-

پس از ہزار و صد و بست و ہفت از ہجری   شناختم کہ چنین بود عید قربانی[3]

منصف کی شاعری عام اور سادہ ہے۔ مندرجہ ذیل غزل میں جو غالباً شاعر کی آخری عمر کی ہے۔ ایک عجیب تاثر اور حسرت ہے اور انشاء اللہ خاں انشا کی مشہور غزل کی یاد دلاتی ہے :-

گل پیرہنان لالہ عذاران ہمہ رفتند   چون بلبل ازین باغ ہزاران ہمہ رفتند

افسوس کہ چون نقش قدم در رہ مقصود   از پای نشستیم و سواران ہمہ رفتند

منصف چہ نویسیم کہ از صفحۂ ایام   جادو رقمان، سحر نگاران ہمہ رفتند[4]

☆

---

[1] صبح گلشن ۴۵۷؛ ریو (۳/۱۰۹۱) نے ۶ رمضان ۱۱۲۸ لکھا ہے۔ مطبوعہ مردم دیدہ (ص ۹۳) میں ۱۱۲۰ھ درج ہے۔

[2] مردم دیدہ ص ۹۲۔   [3] دیوان منصف (حبیب گنج، علی گڈھ) ورق ۴۔

[4] ایضاً

ایجاد

میر محمد احسن ایجاد سید نور الدین مبارک غزنوی کی اولاد میں تھے[1]۔ جو شمس الدین التمش کے عہد میں شیخ الاسلام تھے اور جن کا مزار دہلی میں حوض شمسی کے پاس ہے[2]۔ بعد میں ایجاد کے آبا دہلی سے سامانہ ہجرت کر گئے۔ ایجاد وہیں پیدا ہوئے اور تعلیم حاصل کی[3]۔ مگر عموماً وہ سرہندی کہلاتے ہیں۔ ایجاد نے پہلے پہل نوازش خاں رومی کی مصاحبت اختیار کی۔ میر محمد حسین ناجی بھی اسی امیر سے متعلق تھے۔ ایک شعر میں ایجاد اپنے مربی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

به ملک بی نیازی می کند ایجاد ما شاہی — که از فیض نوازش خان بود تاج و کمر ما را[4]

بعد میں ایجاد بھی شہزادہ اعظم کی فوج میں آ گئے اور بیدل راسخ وغیرہ کے ساتھ گجرات میں مقیم رہے۔ شہزادہ کی ملازمت سے علٰحدہ ہونے کے بعد وہ خیر اندیش خاں کنبو فوجدار اٹاوہ سے متوسل ہو گئے تھے[5]۔

ایجاد کی ترقی کا زمانہ اورنگزیب کی وفات کے بعد آیا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں وہ نظام الملک کے وکیل کی حیثیت سے شہزادہ عظیم الشان کے دربار میں رہتے تھے اور انھیں سہ صدی منصب حاصل تھا[6]۔ فرخ سیر نے انھیں درباری مؤرخ کا عہدہ دیا، اور معنی یاب خاں کا لقب عطا کیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ شاہی تاریخ فرخ سیر نامہ مرتب

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۹۶۔

[2] شیخ عبد الحق دہلوی، اخبار الاخیار (اردو ترجمہ۔ لطیف ملک) لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۶۳۔

[3] سفینۂ خوشگو ص ۹۷۔

[4] دیوان ایجاد، نیشنل میوزیم نئی دہلی، نمبر ۲۹۵۶، ورق ۵

[5] سفینۂ خوشگو ص ۹۷؛ خزانہ عامرہ ص ۲۸۔ اسٹوری (۱/۶۰۴) کا یہ بیان صحیح نہیں کہ ایجاد اٹاوہ کے فوجدار تھے۔

[6] سفینۂ خوشگو ص ۹۷؛ تذکرہ بینظیر (ص ۲۰) میں ان کا منصب شش صدی ہے۔ اسٹوری (حوالہ بالا) نے سہ ہزاری لکھا ہے۔

کریں[1]۔ ایجاد جو کچھ لکھتے تھے، ہر ہفتہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور اس کی منظوری کے بعد کتاب میں شامل کرتے تھے۔ انھیں ایک ہزار روپیہ مع خلعت ملتا تھا[2]۔

ایجاد نے ۱۱۳۳/۲۱-۱۷۲۰ء میں وفات پائی[3]۔

ایجاد کا شمار اپنے عہد کے مشہور ادیبوں میں ہوتا تھا۔ شاہی مؤرخ ہونے کے بعد ان کی حیثیت اور بھی بلند ہو گئی اور بیشتر امرا سے ان کے قریبی تعلقات ہو گئے۔ قطب الملک سید عبداللہ خاں نے فرخ سیر کے اعزاز میں ۱۱۲۶/۱۷۱۴ء میں ایک جشن کا اہتمام کیا تو ایجاد نے ایک تہنیتی قطعہ پیش کیا۔ جس کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

آفتاب جہان دولت و جاہ | کہ ازو آسمان بود بہ حساب
داد ترتیب بزم مہتابی | از برای خدیو قدس جناب
خواند ایجاد بہر تاریخش | "مجلس ماہتاب عالمتاب"[4]
۱۱۲۶ ہجری

ایجاد کی تصانیف میں ایک دیوان اور فرخ سیر نامہ ہے۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ میں ان کی طرف ایک اور کتاب منسوب ہے جس کا نام فتوحات آصفی یا شاہنامہ دکن ہے[5]۔ یہ کتاب آصف جاہ کی فتوحات پر مشتمل ہے اور اس میں بہت بعد کے واقعات مثلاً نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کا تاراج وغیرہ شامل ہیں۔ دراصل یہ کتاب بیدل کے شاگرد ابوالفیض معنی کی تصنیف ہے[6]۔ جو شاہ آباد کے رہنے والے تھے اور دہلی میں گلال باڑی میں رہتے تھے[7]۔

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۹۷؛ ہمیشہ بہار ورق ۵۔ [2] خزانۂ عامرہ ص ۲۸۔

[3] ید بیضا ص ۳۱؛ مجمع النفائس ۳۳۔ اشپرنگر (ص ۱۴۹) نے دیوان منتخب ایجاد کی بنا پر یہی تاریخ لکھی ہے، مگر خوشگو نے (ص ۹۸) ۱۱۳۲/۲۰-۱۷۱۹ لکھا ہے۔ اور ہمیشہ بہار (ورق ۵) نے 'اوائل جلوس محمد شاہ'۔

[4] سفینۂ خوشگو ص ۹۷۔ [5] فہرست آصفیہ ۹۶/۳، نمبر ۱۴۹۳۔

[6] شاہنامہ دکن (فتوحات آصفی)، آصفیہ نمبر ۱۴۹۳، ص ۳۹۷، ۳۹۸

[7] مخزن الغرائب ورق ۴۲۱۔ ید بیضا ص ۲۸۰۔

خوشگو کا بیان ہے کہ ایجاد نے ایک ضخیم دیوان مرتب کیا تھا جو تمام اصناف سخن پر مشتمل تھا[1]۔
موجودہ دیوان میں صرف غزلیات ہیں اور شروع میں ایک نثری دیباچہ ہے جو شاعر نے خود لکھا ہے۔
ایجاد شاعری میں ناصر علی سرہندی کے شاگرد تھے، اگرچہ انھوں نے بیدل سے بھی استفادہ کیا اور
یہ تخلص بیدل کا عطا کردہ ہے[2]۔ اول الذکر کے لیئے ان کے دل میں خاص عقیدت تھی:۔

برہمن می پرستد، شیخ می جوید دل ما را   علی تا قبلۂ ایجاد شد در صورت و معنی

که دارد زیر گردون میر سامانی که من دارم؟   مرا سرمایۂ ایجاد معنیها علی باشد[3]

ناصر علی کے تتبع کا یہ اثر ہے کہ ایجاد کی غزلوں میں بھی وہی گہرائی اور گیرائی ہے جو ناصر علی
کا طرۂ امتیاز ہے۔

ناصر علی اور بیدل کے علاوہ بھی متعدد شعرا تھے جن کے طرز سے ایجاد متاثر تھے اور جن کی
غزلوں پر انھوں نے غزلیں کہیں۔ ان میں فطرت موسوی، سالم، صائب، شاکر، تسلیم، شوکت اہم
ہیں، مگر ان مختلف اثرات کے باوجود ایجاد کا اپنا رنگ تھا، جو سب سے متاثر ہوتے
ہوئے بھی منفرد تھا۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

این کتان را بافتند از تار و پود ماهتاب   شعر ایجاد از نزاکت جمله معنی گشته است

ندیدند اہل سامانه مگر ایجاد تنها را[4]   سخن پرداز رنگین طرز غرا شاعری درخور

سرہند کے لوگ ان کی غزلوں کے منتظر رہتے تھے۔ وہ خود لے کر جاتے یا کسی کے ہاتھ
بھیجا کرتے:۔

گوش یاران ہر نفس بر نغمہ ساز من است   سوی سهرند این غزل ایجاد می باید فرست

خداوندا نگردد بازسدّ راه تاخیرم[5]   عنان گردانی ایجاد یکسر سوی سهرند است

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۹۸۔   [2] نشتر عشق ص ۱۷۳۔

[3] دیوان ایجاد، ورق ۳، ۶۲۔   [4] ایضاً ورق ۱۴، ۲

[5] ایضاً ورق ۲۲، ۶۹۔

اورنگزیب کی جنگ پسندی پر ایجاد کا طنز ملاحظہ فرمائیے :-

نہ نسق گردید دنیا و نہ عقبی شد نظام   بی سبب دارد بہ ہر جا شاہ عالمگیر جنگ [1]

فرخ سیر نامہ عہد فرخ سیر کی تاریخ ہے اور اس عہد کی درباری تاریخوں کی طرح انتہائی مرصع نثر میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں فرخ سیر کی ولادت سے لیکر تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں دربار کے واقعات اور معاملات کا ذکر ہے [2]۔

---

[1] ایضاً ورق ۵۸

[2] ریو ۱/۳/۲۷، خزانۂ عامرہ (ص ۲۸) نے تاریخ کو شاہنامہ لکھا ہے۔ اور غالباً اسی بنا پر سفینۂ ہندی (ص ۱۳) نے اسے منظوم تاریخ بتایا ہے۔ ممکن ہے یہ شاہنامۂ دکن (مذکورہ بالا) کا اشتباہ ہو۔

(ج) متفرق شعرا

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ عہد اورنگزیب میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے لیکن انھوں نے یا تو کوئی تصنیف نہیں کی یا ان کی تصنیف وقت کے ہاتھوں ضائع ہو گئی۔ تلاش و تحقیق سے ممکن ہے بعض ایسے دواوین بھی مل جائیں جن کے مصنفین کا سرے سے تذکروں میں ذکر نہیں۔ بہر حال ان شعرا کی شاعرانہ صلاحیت کا تجزیہ مشکل ہے، اس لئے ذیل میں صرف ان کی فہرست دی جارہی ہے۔ جن شعرا کا ضمنی ذکر اوپر ہو چکا ہے، یہاں ان کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے۔

ابو نصرت خاں[1]

احمد۔ میر احمد بخاری[2]

احمدی۔ میر سید لطف اللہ[3]

احسنی بن میر ابو الفتح پٹیالوی (م۔ ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹) مصنف دلبر و شیدا و شاہ و ماہ[4]

اختر یزدی[5]

اسیر لاہوری (م۔ ۱۰۸۶/۷۶-۱۶۷۵)[6]

آشفتہ کنبو سنبھلی[7]

اظہر۔ میر اظہر خاں بخاری[8]

افسر۔ مرزا محمد علی اصفہانی۔ اورنگزیب نے انھیں معظم خاں کا خطاب دیا تھا[9]

---

[1] مقالات الشعرا ص ۴۳

[2] ایضاً ص ۴۳

[3] سفینۂ بیخبر ص ۴

[4] صبح گلشن ص ۱۷

[5] سفینۂ بیخبر ص ۸

[6] روز روشن ص ۴۵

[7] ایضاً ص ۹

[8] ایضاً ص ۵۴

[9] صبح گلشن ص ۲۸، سفینۂ خوشگو (ص ۲۱۴) میں ہے کہ افسر عہد فرخ سیر میں ہندوستان آیا۔

الفا ۔ محمد صادق[1]

امانی ۔ ملا عبداللہ[2]

انسان ۔ شیخ غلام مصطفیٰ مرادآبادی[3]

ایما ۔ بندگی حسن بلگرامی (م ۔ ۱۱۱۹/ ۰۸ ۔ ۱۷۰۷)[4]

باقر[5]

بہادر ۔ میر بہادر الدین بن اصالت خاں دہلوی[6]

بیان ۔ آقا مہدی ۔ ابوطالب کلیم کا بھتیجا (وفات اواخر ۱۱ویں صدی ہجری)[7]

بی تکلف ۔ لالہ سدانند لکھنوی (م ۔ ۱۱۲۹/ ۱۷ ۔ ۱۷۱۶)[8]

بیدل ۔ عنایت اللہ خاں سہارن پوری بن شیخ محبت علی[9]

بیرنگ ۔ مرزا محمدی بیگ[10]

بیضا ۔ مرزا ابوتراب مصاحب ذوالفقار خاں[11]

ترکمان ۔ مرزا عجم قلی شیرازی[12]

---

[1] کلمات الشعرا ص ۸

[2] سفینۂ بیخبر ص ۱۱

[3] گل رعنا ورق ۳۳

[4] ید بیضا ص ۳۵

[5] مجمع النفائس ورق ۸۴

[6] روز روشن ص ۱۰۳

[7] صبح گلشن ص ۱۷

[8] سفینۂ خوشگو ص ۹۱ ۔

[9] روز روشن ص ۱۱۵

[10] سفینۂ خوشگو ص ۵۵

[11] سفینۂ بیخبر ص ۶۰

[12] کلمات الشعرا ص ۶۹ ۔

تعظیم (تعظیما) قمی [1]

جودت ۔ مرزا محمد ایوب بدخشانی (م ۔ ۱۱۲۵/۱۷۱۳) [2]

حجاب ۔ مرزا اسمعیل [3]
حقیقی ۔ مرزا محمد بیگ [4]
حیران ۔ شیخ محمود ۔ معلم زیب النساء [5]

خلیل ۔ محمد ابراہیم اصالت خاں بن سید مظفر حیدر آبادی [6]

ذوالقدر ۔ مرزا محمد محسن (م ۔ ۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲) [7]

ساکت ۔ مرزا محمد امین تبریزی [8] ۔
سعد قریشی ۔ شیخ محمد سعید قریشی ملتانی (م ۔ رمضان ۱۰۸۷/ نومبر ۱۶۸۶) [9]
سوزی ۔ میر جمیل [10] ۔

---

[1] روز روشن ص ۷۵۲ ۔
[2] شمع انجمن ص ۱۱۲ ۔
[3] سفینۂ بیخبر ص ۹۰
[4] مرآۃ الخیال ص ۲۲۲ ۔
[5] ید بیضا ص ۷۹
[6] کلمات الشعرا ص ۳۲ ۔
[7] ریاض الافکار ورق ۲۸
[8] ریاض الشعرا (بحوالہ ایشیاٹک ۲/ص ۵۵)
[9] مرآۃ الخیال ص ۱۸۴
[10] ایضاً ص ۲۷۸

سیادت ۔ میر جلال الدین[1]۔

سید ۔ علی خان مخاطب بہ جواہر رقم[2]۔

صابر ۔ مرزا[3]۔

صاحب ۔ حکیم محمد کاظم (م ۔ ۱۰۷۹/ ۶۹ ۔ ۱۶۶۸)[4]

صادق تونی سرکانی[5]۔

صامت سوداگر[6]۔

صحبت اصفہانی[7]۔

صہبائی ۔ سید عبدالباقی[8]۔

طالع ۔ مرزا نظام الدین دہلوی، برادر قطب الدین مائل[9]۔

طاہر ۔ محمد طاہر التفات خاں (م ۔ ۱۱۲۹/ ۱۷ ۔ ۱۷۱۶)[10]

عابد ۔ شیخ محمد انصاری[11]۔

---

[1] کلمات الشعرا ص ۴۹ ۔

[2] ریاض الشعرا ورق ۱۸۷ ۔

[3] ید بیضا ص ۱۵۴ ۔

[4] کلمات الشعرا ص ۶۷ ۔

[5] ید بیضا ص ۱۵۴

[6] کلمات الشعرا ص ۶۸ ۔

[7] روز روشن ص ۳۸۷

[8] صبح گلشن ص ۲۵۷ ۔

[9] کلمات الشعرا ص ۷۱

[10] ایضاً ص ۲۱

[11] مرآۃ الخیال ص ۳۱۳ ۔

عبرت احمد دہلی (م. ۱۱۲۵)[1]

عرفان. خواجہ عبداللہ بن خواجہ مکی[2]

عزیز. ملا عزیز اللہ بن ملا مبارک عظیم آبادی. عزیز زیب النساء کے اتالیق تھے[3]

عظیما. دیوان بیوتات لاہور[4]

غنی. شیخ عبدالغنی ٹھٹھوی[5]

فارغا. محمد بیگ بدخشانی. ملا شاہ بدخشی کا بھتیجا[6]

فائق. میر احمد لاہوری، برادر جلال الدین سیادت[7]

فکرت. میر غیاث الدین بن میر صدر الدین[8]

قافلان بیگ سپاہی[9]

قدیم. محمد یوسف. مرزا مائل کا عزیز[10]

کامل. مرزا احمد بیگ خاں اصفہانی (م. ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱)[11]

---

[1] نتائج الافکار ص ۴۹۰

[2] کلمات الشعرا ص ۸۱

[3] صبح گلشن ص ۲۸۴

[4] کلمات الشعرا ص ۷۸

[5] مقالات الشعرا ص ۴۷۵

[6] روز روشن ص ۵۰۰

[7] ید بیضا ص ۲۲۳

[8] کلمات الشعرا ص ۸۷

[9] ایضاً ص ۴۶

[10] ایضاً ص ۹۴

[11] مرآۃ العالم ورق ۶۸۵

مشرب۔ حکیم عبدالرزاق اصفہانی (م۔ ۱۱۲۷/ ۱۷۱۵)[1]

نجابت۔ میر برادر سیادت[2]
ندیم کشمیری[3]
نشا۔ محمد تقی بیگ[4]

وحدت۔ حکیم عبداللہ[5]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۸۱
[2] ید بیضا ص ۲۹۸
[3] سفینۂ بیخبر ص ۳۴۲
[4] کلمات الشعرا ص ۱۱۴
[5] مرآۃ الخیال ص ۳۴۸۔

ش

Haji ... Rasool

باب ۶

عہد اورنگزیب کی فارسی نثر کا عمومی جائزہ

عہد اورنگزیب کی نثری تخلیقات مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے اہم ہیں۔ اس عہد میں تقریباً تمام اہم موضوع پر معیاری کتابیں لکھی گئیں جو تاریخ ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ یہ عہد خاص طور پر مکاتیب اور انشا کے لئے ممتاز ہے۔ اورنگزیب نے خود مکتوب نگاری کی ایک صحت مند روایت قائم کی جس کا تتبع اس کے ہم عصر دانشوروں نے کیا۔ یہ مکاتیب سادہ بھی ہیں اور مرصع بھی لیکن مؤخر الذکر طرز ہی زیادہ مقبول تھا۔ بیدل، میر عبدالجلیل بلگرامی، نعمت خاں عالی اور خلیفہ شاہ محمد وغیرہ مرصع نگاری کے پیشواؤں میں تھے، لیکن خود اورنگزیب کے آخری عہد کے خطوط اور شاہ عبدالرحیم دہلوی وغیرہ کے مکاتیب سلیس اور فطری انداز تحریر کے بہترین نمونے ہیں۔ انشا میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس فن پر متعدد مثالی کتابیں بھی تصنیف کی گئیں۔

انشا اور مکاتیب کے بعد تصوف اور اخلاقیات کی کتابوں کا درجہ ہے۔ پہلے یہ عرض کیا

جا چکا ہے کہ اس عہد کی شاعری میں تصوف کا رجحان غالب تھا۔ بیشتر فنکار کسی نہ کسی طرح عملی تصوف سے وابستہ تھے۔ عاقل خاں رازی اور ارادت خاں واضح جیسے امرا نے تصوف پر جو تخلیقات پیش کی ہیں ان سے بڑی حد تک اس عصر کی سماجی اور اخلاقی تصویر ابھرتی ہے۔ مشائخ اور صوفیا کے تذکروں کا شمار بھی اسی ضمن میں کرنا چاہیئے۔

اورنگزیب نے اپنی حکومت کے دسویں سال (۱۶۶۸ء) میں سرکاری تاریخ عالمگیر نامہ کی تدوین بند کرادی۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے ذاتی مدح اچھی نہیں لگتی۔ اس فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ نویسی تقریباً بند ہو گئی۔ ان دس سالوں میں کئی اہم تاریخیں لکھی جا چکی تھیں۔ مثال کے طور پر تاریخ شاہ شجاعی اور فتحیہ عبریہ مشرقی ہندوستان کے سیاسی حالات کے لیے معتبر ماٰخذ ہیں۔ واقعات عالمگیری اوائل عہد اورنگزیب پر مستند کتاب ہے۔ اس وقت تک مرأۃ العالم اور اس کی متوازی روایت مرأۃ جہاں نما بھی تصنیف ہو چکی تھیں۔ اگرچہ یہ عام تاریخیں ہیں لیکن ان میں تاریخ کے لیے بھی بہت کچھ مواد ہے۔ بختاور خاں جس کی طرف مرأۃ العالم منسوب کی جاتی ہے، دو اور تاریخوں کا مصنف ہے۔ اول چہار آئینہ شاہجہاں کے لڑکوں میں جنگ تخت نشینی پر اور دوسری تاریخ الفی کی تلخیص ہے۔ اس عہد میں مستند تاریخوں کی تلخیص اور اختصار کا چلن بھی خاصا تھا۔ محمد براری امی نے خود اپنی ہی مفصل تاریخ کا اختصار مجمل مفصل کے نام سے کیا۔ عبدالشکور نے محمد یوسف کی منتخب التواریخ کو اور رائے بندرابن نے ۱۱۰۶/ ۹۵-۱۶۹۴ میں بعض اضافوں کے ساتھ تاریخ فرشتہ کو ملخص کیا۔

اورنگزیب کے عہد کی سب سے نازک اور اہم مہم محاصرۂ گولکنڈہ ہے۔ فوج کی بددلی قدرتی مصائب اور گروہ بندی نے اس مہم کو اور ابتر کر دیا تھا۔ مگر اورنگزیب کے عزم کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی تھی، اس مہم کے دوران کتنے ہی افسران معزول ہوئے، شاہ عالم گرفتار ہوا اور اس کا تمام عملہ برخاست کر دیا گیا۔ یہ تمام باتیں انتہائی حسین و ظریف انداز میں نعمت خاں عالی نے وقائع میں قلمبند کی ہیں۔ طنز و مزاح کی وجہ سے اگرچہ وقائع میں نیم افسانوی رنگ آ گیا ہے مگر اس

کی تاریخی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس عہد کے آخر میں تاریخ کی دو اہم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ پہلی ایسر داس ناگر کی فتوحات عالمگیری ہے اور دوسری بھیم سین کایستھ کی نسخۂ دلکشا۔ اول الذکر اورنگزیب کے ۳۴ ویں سن جلوس تک کی تاریخ ہے۔ نسخۂ دلکشا میں ۱۰۶۸-۱۱۲۰/۱۶۵۷-۱۷۰۹ کے دوران دکن میں ہونے والی لڑائیوں کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف اورنگزیب کی وفات کے کچھ بعد کی ہے۔ یہی حال مآثر عالمگیری کا ہے جو مکمل عہد اورنگزیب کی واحد ہمعصر تاریخ ہے۔ اس کا مؤلف محمد ساقی مستعد خاں، بختاور خاں کا نوکر تھا۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس عصر میں تاریخ نویسی کی روایت مدھم ضرور پڑ گئی تھی لیکن بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان مورخین کے علاوہ بعض شعرا بھی حالات عصر کو نظم کرنا چاہتے تھے ایک گمنام شاعر حقیری نے مشرقی ہندوستان کے واقعات کو اورنگ نامہ میں نظم کیا جو بڑی حد تک تاریخ کی مستند تالیف بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان تاریخی تصانیف کے ذیل میں سفرنامے اور سوانح عمریاں بھی آجاتی ہیں۔ میر عبدالجلیل کا سفرنامہ انشای جلیل اور بیدل کی خودنوشت سوانح چہار عنصر میں بہت کچھ تاریخی مواد موجود ہے۔

اس عصر کے نثر نگاروں میں بھی ہندوستانی موضوع اور علوم سے دلچسپی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی کی کہانیاں فارسی میں لکھی گئیں۔ عشقیہ داستانوں میں مادھو داس گجراتی نے میکا و منوہر کا قصہ لکھا۔ ہمت خاں نے کامروپ اور کام لتا کی داستان مرتب کی۔ جس کی منظوم روایت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ چندر من بیدل نے نظم اور نثر دونوں میں راماین لکھی۔ روپ نراین کھتری نے ناسکیت کی کہانیوں کا ترجمہ کر کے اسے اورنگزیب کے نام معنون کیا۔ موسیقی پر دو اہم تصانیف یعنی پارجاتک اور مانکتوہل کے فارسی ترجمے ہوئے۔ پہلا ترجمہ ملا روشن ضمیر نے کیا اور دوسرا ناصر علی کے مربی مرزا فقیر اللہ سیف خاں نے۔ دونوں اورنگزیب کے ممتاز امرا میں سے تھے۔ ہندو مذہب پر ایک اہم سنسکرت کتاب متاکشرہے۔ اس کا فارسی ترجمہ لعل بہاری

سکینہ بھوجپوری نے کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم کتاب تحفۃ الہند ہے جو ہندوستانی علوم و فنون کی ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا ہے اور غالباً پہلی کتاب ہے جس میں ہندی فارسی لغت بھی موجود ہے۔ تحفۃ الہند کا مصنف مرزا خاں ہے۔

مذہبیات، صرف و نحو، اور دیگر فنون میں بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر وہ ادبی اعتبار سے اتنی اہم نہیں ہیں۔

اس عہد میں قدیم اساتذہ کے دواوین پر شرح لکھنے کا رواج بھی خاصا تھا۔ پٹنہ کے ملا سعد کا نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے جنھوں نے بیشتر اساتذہ کی تخلیقات کی فرہنگیں تیار کیں۔ لغت پر جو کتابیں تالیف ہوئیں ان میں اشہر اللغات اور فرہنگ قطبی اہم ہیں۔ بچوں کے لئے جو نصاب مرتب ہوئے ان میں روپ نرائن کا نصاب قابل ذکر ہے۔

طنز و مزاح کے اعتبار سے اس دور کی نثر بہت ممتاز ہے۔ نعمت خاں عالی کی وقائع اور دیگر تخلیقات اور جعفر زٹلی کا روزنامچہ طنز و مزاح کی بہترین مثالیں ہیں۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں ابتذال کی زیادتی ہے۔ خود وقائع میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں پھر بھی وہ شروع سے فارسی کے نصاب میں داخل ہے۔

باب ۷

مکاتیب و انشا

مکاتیب اورنگزیب اورنگزیب صرف اس عہد کا سیاسی حکمراں نہیں تھا بلکہ وہ مکتوب نگاری کا بھی شہنشاہ تھا۔ مسلمان حکمرانوں میں غالباً وہ واحد بادشاہ ہے جس نے اپنے خطوط، فرامین اور شقہ جات کا بہترین سرمایہ چھوڑا ہے۔ اورنگزیب خود خط لکھنے کا شوقین تھا اور شاہی خاندان کے افراد کو وہ اپنے ہاتھ سے خط لکھتا تھا۔ ایک بار شاہجہان نے یہ شکایت کی کہ اورنگزیب نے اسے اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھا تو اورنگزیب نے یہ توضیح پیش کی :-

"عرضداشت کہ سابق از نظر مبارک گذشتہ، خط این فدوی است۔ چون در آن ایام نر انگشت دست راست این مرید آزاد داشت، خوب نوشتہ شدہ، اگرچہ خانہ زاد اعلحضرت (یعنی محمد سلطان) نیز بہ مقتضای سن و سال بدنمی نویسد، چگونہ راضی خواہد شد کہ عرضداشت بہ خط خانہ زادہا دیگر نوشتہ شود؟" [1]

---

[1] رقعات عالمگیر مرتبہ نجیب اشرف ندوی، اعظم گڈھ۔ ص ۱۷۱۔

دوسروں کے نام خطوط اس کے منشی لکھا کرتے تھے، لیکن مضمون خود اورنگزیب بولتا تھا۔ اور جب خط مکمل ہو جاتا تو اس کی منظوری کے بعد روانہ کیا جاتا تھا۔ ایسے خطوط حسب الامر یا حسب الحکم کہلاتے تھے۔ یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ اورنگزیب نے خطاطی کی مشق کی تھی اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی متعدد چیزیں آج بھی محفوظ ہیں[1] اس طرح اس کے خود نوشتہ خطوط صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے شہپارے ہوتے تھے۔

اورنگزیب کے مکاتیب کے جو مجموعے پائے جاتے ہیں، انھیں مختلف قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف : ابتدائی مجموعے جو اس کے منشیوں نے مرتب کئے۔ ان میں مندرجہ ذیل مجموعے شامل ہیں۔

۱۔ آداب عالمگیری ۔ ابوالفتح قابل خاں

۲۔ کلمات طیبات ۔ عنایت اللہ خاں

۳۔ احکام عالمگیری ۔ "

ب: ایسے مجموعے جو اول الذکر کتابوں پر مبنی ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں :۔

۱۔ رقائم کرائم ۔ اشرف خاں

۲۔ دستور العمل آگہی۔

۳۔ رمز و اشارہ ہای عالمگیری

ج : ایسے مجموعے جو اول الذکر مجموعوں سے کچھ مختلف ہیں۔ ایسے دو مجموعے ملتے ہیں :۔

۱۔ کلمات طیبات

۲۔ کلمات اورنگزیب۔

د۔ خطوط اور فرامین پر لکھے گئے احکام۔ یہ حمید الدین کی احکام عالمگیری میں پائے جاتے ہیں

---

[1] فنون لطیفہ بعہد اورنگزیب ص ۷۶، ۷۷۔

۵ : منتشر خطوط و فرامین

آداب عالمگیری آداب عالمگیری ان خطوط اور نوشتہ جات کا مجموعہ ہے جو اورنگزیب کی طرف سے اس کے منشی ابو الفتح قابل خاں نے لکھے تھے۔ یہ خطوط ۱۱۱۵/۰۴-۱۷۰۳ میں محمد صادق بٹالوی نے اپنے لڑکے محمد زماں کے لئے مدون کئے۔[۱] محمد صادق شہزادہ اکبر کا منشی تھا اس کا انتقال یکم محرم ۱۱۲۹/۱۶ دسمبر ۱۷۱۶ کو ہوا۔[۲]

محمد شفیع ابو الفتح قابل خاں ٹھٹھہ کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے عہد کا ممتاز عالم تھا۔ قانع کا بیان ہے کہ قابل خاں پہلے بندر لاری میں کلرک تھا۔ یہ بندرگاہ شہزادہ اورنگزیب کی جاگیر میں تھی۔ ایک بار اورنگزیب ملتان گیا تو قابل خاں نے اسے ایک عرضداشت پیش کی۔ اورنگزیب اس عرضداشت کی طرز انشا سے بہت متاثر ہوا اور اس نے قابل خاں کو اپنا منشی بنالیا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے قابل خاں کو میر منشی کا عہدہ عنایت کیا اور اسے قابل خاں کا خطاب عطا کیا۔[۳] اس نے چودہ سال سے لے کر چالیس سال کی عمر تک اورنگزیب کی خدمت کی۔[۴] شوال ۱۰۶۹/جون ۱۶۵۹ میں قابل خاں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا۔ اس کے لئے پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔[۵] اس نے لاہور میں عزلت کی زندگی گذارنی شروع کی۔ ۱۰۷۲/۶۲-۱۶۶۱ میں اسے لاہور سے دہلی طلب کیا گیا اور یہاں اسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔[۶]

---

[۱] آداب عالمگیری، (انجمن ترقی اردو، علی گڈھ۔ مخطوطہ) ص ۵۔ نجیب اشرف (مقدمۂ رقعات عالمگیر اعظم گڈھ ص ۴۳) اور ایلیٹ (۲۰۶/۷) نے صادق کا وطن انبالہ لکھا ہے۔

[۲] ریو ۳۹۹/۱۔ [۳] مقالات الشعرا ص ۴۳

[۴] اسٹڈیز ان اورنگزیبس رین (انگریزی) جدوناتھ سرکار (کلکتہ، ۱۹۳۳ء) ص ۲۹۰۔

[۵] مآثر عالمگیری ص ۲۶۔

[۶] عالمگیر نامہ ص ۷۵۱۔

آداب عالمگیری کے علاوہ قابل خاں نے دستور دانش اور قصہ کامروپ بھی تصنیف کیا۔ مؤخر الذکر تصنیف نثر میں تھی اور قانع ٹھٹھوی نے اسے منظوم کیا تھا[1]

آداب عالمگیری کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں اورنگزیب کے ۵۳۶ مکاتیب ہیں جو سب کے سب اس کی تخت نشینی سے پہلے لکھے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں شاہجہاں کے لڑکوں کی جنگ تخت نشینی کا بیان ہے۔ تیسرے حصہ میں شہزادہ اکبر کے ۱۴۶ خطوط ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں حصے محمد صادق کے لکھے ہوئے ہیں۔

اورنگزیب کے یہ مکاتیب اس کے عہد شہزادگی کے بہترین ماخذ ہیں۔ اگرچہ ان میں اولین واقعہ اورنگزیب کی نظامت ملتان سے متعلق ہے جو اسے صفر ۱۰۵۸/ مارچ ۱۶۴۷ء میں تفویض ہوئی۔ اس وقت تک اورنگزیب کی عمر کے تیس سال گذر چکے تھے[2] اکبر کے خطوط اس کی بغاوت سے ایک مہینہ پہلے یعنی ذی قعدہ ۱۰۹۱/ دسمبر ۱۶۸۰ء تک کے واقعات پر مشتمل ہیں[3]۔ آداب میں بعض خطوط شہزادہ محمد سلطان کے بھی ہیں۔ اور اورنگزیب کے بعض وہ مکاتیب بھی ہیں جو اس نے شاہجہاں کو اس کے ایام اسیری میں لکھے تھے۔ بہرحال یہ مکاتیب شاہجہاں، شاہی خاندان کے دیگر افراد اور اس عہد کے تمام معزز امرا وغیرہ کے نام لکھے گئے ہیں۔

آداب عالمگیری سے ملتے جلتے دو اور مجموعوں کی دریافت ہوئی ہے جس میں اورنگزیب کے عہد شہزادگی کے خطوط ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ جس کی دریافت کا سہرا جناب ابو عمر یافعی کے سر ہے، مندرجہ ذیل نو مقالات پر مشتمل ہے :۔

۱۔ اورنگزیب کی عرضداشت، شاہجہاں کی خدمت میں

۲۔ اورنگزیب کے مکاتیب، بیگم صاحب (جہاں آرا) کے نام۔

---

[1] مقالات الشعرا ص ۴۳، ۵۷۳۔

[2] مقدمہ رقعات عالمگیری ص ۹۲۔

[3] مآثر عالمگیری ص ۱۹۷۔

۳۔ اورنگزیب کے احکام، امرا کے نام۔

۴۔ شہزادہ محمد سلطان کے احکام، امرا کے نام۔

۵۔ قابل خاں کی عرضداشتیں، اورنگزیب کی خدمت میں۔

۶۔ ,, ,, محمد سلطان کی خدمت میں۔

۷۔ اورنگزیب کی طرف سے قابل خاں کے نوشتہ مکاتیب

۸۔ القاب وآداب وغیرہ۔

۹۔ شہزادہ مراد کے حکم سے لکھا گیا معاہدہ نامہ۔[1]

دوسرے مجموعہ میں مکاتیب کا آغاز نظامت ملتان کے وسط (۱۰۶۰/۱۶۵۰) سے ہوتا ہے۔ اس میں بعض ایسے مکاتیب بھی ہیں جو رقعات عالمگیری یا دستور العمل آگہی میں نہیں ملتے۔ اس مجموعہ کے مرتب کا بیان ہے کہ اورنگزیب اپنی مخصوص بیاض آداب عالمگیر شاہی یا تحفۃ السلاطین میں ضروری یادداشت نوٹ کرتا تھا اور مجھے اتفاق سے وہ بیاض مل گئی جس کی مدد سے میں نے یہ مجموعہ مرتب کیا۔[2]

رقائم کرائم رقائم کرائم اورنگزیب کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو اس نے امیر خاں کو لکھے تھے اور جس کو سید اشرف خاں میر محمد الحسینی نے ۱۱۳۱/۱۹-۱۷۱۸ کے بعد مرتب کیا۔ سید اشرف خاں، امیر خاں سندھی (م۔ ۱۱۳۱/۱۹-۱۷۱۸) کا لڑکا تھا اور چونکہ اس کے باپ کا نام عبد الکریم تھا، اس نے اس مجموعہ کا نام رقائم کرائم رکھا۔[3] یہ دراصل مختصر شقہ جات ہیں جنھیں بعد میں مفصل مکاتیب کی شکل دی جاتی تھی۔ کتاب کے شروع میں مرتب کا مختصر دیباچہ ہے۔ لیکن

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۴۰

[2] ایضاً ص ۴۱۔ یہ مجموعہ کتب خانہ اصلاح، دیسنہ میں تھا۔ اب بانکی پور لائبریری میں ہے۔

[3] رقائم کرائم، ہارڈنگ لائبریری دہلی، نمبر ۲۰۷، ورق ۱۔

اس مجموعہ میں بھی امیر خاں کے علاوہ دوسروں کے نام خطوط ہیں. غالباً اس کا سب سے مفصل مجموعہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے جس میں ۱۷۲ رقعے ہیں اور تقریباً سب امیر خاں کے نام ہیں[۱].

کلمات طیبات اور احکام عالمگیری اورنگزیب.

کلمات طیبات واحکام عالمگیری کے ان مکاتیب کے مجموعے ہیں جو اس کے معتمد سکریٹری عنایت اللہ خاں نے مرتب کیے. کلمات کی تدوین ۱۱۳۱/۱۹-۱۷۱۸ میں ہوئی[۲]. اور احکام کی اس کے کچھ بعد. مرزا عنایت اللہ شکر اللہ خاں خاکسار کا لڑکا تھا. اس کی پیدائش کشمیر میں ۱۰۶۲/۵۳-۱۶۵۲ میں ہوئی. اس کی ماں حافظہ مریم نے زیب النساء کو قرآن پڑھایا تھا.

عنایت اللہ بھی شاہی ملازمت میں داخل ہوا. ۱۰۹۹/۸۸-۱۶۸۷ میں اسے شہزادی زیب النساء[۳] کا خانساماں مقرر کیا گیا. ۱۱۰۳/۹۲-۱۶۹۱ میں اسے دیوان تن کا عہدہ دیا گیا اور دس سال بعد اسے دیوان خالصہ بھی بنا دیا گیا. اس سے قبل ۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷ میں وہ سلطنت کے صدر الصدور کی نیابت کر چکا تھا. اورنگزیب عنایت اللہ خاں کو بہت مانتا تھا. ایک بار وزیر اعظم اسد خاں عنایت اللہ سے کسی بات پر لڑ پڑا. جب معاملہ اورنگزیب تک پہونچا تو اورنگزیب نے اسد خاں کو حکم دیا کہ وہ عنایت اللہ خاں سے معافی مانگے[۴].

اورنگزیب کی وفات کے بعد بھی عنایت اللہ خاں کا جاہ و دبدبہ باقی رہا. بہادر شاہ کے عہد میں وہ خانساماں رہا اور فرخ سیر نے اسے کشمیر کی گورنری کے ساتھ ساتھ دیوان تن و خالصہ کا عہدہ عنایت کیا. وہ ہفت ہزاری منصب پر فائز تھا اور نظام الملک کی غیبت میں وزیر اعظم کی

---

[۱] بوڈلین ۳/نمبر ۲۴۶۵.

[۲] کلمات طیبات، سالار جنگ نمبر ۲۳۲، ورق ۳.

[۳] مآثر عالمگیری (ص ۳۱۴) میں زیب النساء ہے: مآثر الامراء (۸۲۹/۲) میں سرکار بیگم ہے جو عموماً زیب النساء کے لئے استعمال ہوتا تھا.

[۴] مآثر عالمگیری ص ۴۷۵.

جگہ کام کرتا رہا۔ عنایت اللہ خاں کی وفات ۷ ربیع الاول ۱۱۳۸ھ[1]/ نومبر ۱۷۲۵ء کو ہوئی۔

عنایت اللہ خاں اپنے علم و فضل اور ریاست و نجابت کی بنا پر بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اورنگزیب اس کے طرز تحریر کا شیدائی تھا۔ ان مکاتیب کی تدوین کے علاوہ مآثر عالمگیری کی تالیف بھی اسی کی سرپرستی میں ہوئی ہے[2]۔

کلمات طیبات ان رقعات پر مشتمل ہے جو اورنگزیب نے وقتاً فوقتاً اپنے سکریٹری کو لکھے تھے۔ ان رقعات پر اورنگزیب کے دستخط ہوتے تھے اور انھیں مفصل خطوط کی شکل دی گئی تھی[3]۔ کلمات میں ۶۷۶ رقعات ہیں۔ ان رقعات کے مکتوب الیہم میں شہزادہ معظم، اعظم، کام بخش، معزالدین، بیدار بخت، عظیم الدین، شائستہ خاں، غازی الدین فیروز جنگ، ذوالفقار خاں، مرزا صدرالدین صفوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

احکام عالمگیری ان احکام پر مشتمل ہے جو اورنگزیب نے عنایت اللہ خاں کی معرفت بھیجے تھے۔ ان پر اورنگزیب کا دستخط نہیں تھا بلکہ سکریٹری خود ہی مفصل خط لکھ کر پیش کرتا تھا[4]۔ یہی وجہ ہے کہ کلمات میں عربی الفاظ کی بہتات ہے اور اس کا طرز جامع و مانع ہے، مگر احکام کا انداز سادہ ہے۔ احکام کے مکتوب الیہم کی فہرست طویل ہے اور اس میں عہد اورنگزیب کے تقریباً سبھی شہزادوں اور اہم امرا کے نام نظر آتے ہیں۔

کلمات اور احکام سے ملتے جلتے بعض اور مجموعے ملتے ہیں جن میں بعض نئے مکاتیب ہیں۔ مثلاً رضا لائبریری رام پور میں احکام عالمگیری کا جو نسخہ ہے، وہ عام احکام سے مختلف ہے۔ اسی طرح

---

[1] مآثر الامرا (۲/۸۳۱) میں تاریخ وفات ۱۱۳۹ھ ہے۔

[2] مآثر الامرا ۲/۸۲۹؛ مآثر عالمگیری ص ۶۸۔

[3] مآثر الامرا ۲/۸۳۱۔

[4] ایضاً

ایک مجموعہ کلمات اورنگزیب ہے جس میں کلمات طیبات کا دیباچہ اور ۱۵۳ رقعات ہیں، مگران میں بعض رقعے بالکل نئے ہیں[1]۔ ایک اور مجموعہ کلمات طیبات کے نام سے ہے مگر وہ ان دونوں سے مختلف ہے[2]۔

احکام عالمگیری اورنگزیب کے ایک امیر حمید الدین خاں بہادر عالمگیری نے اس کے احکام کو احکام عالمگیری کے نام سے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ اول الذکر سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ہر خط یا فرمان کا پس منظر درج ہے اور بادشاہ کا جواب یا حکم واوین میں ہے۔ ان احکام کا مرتب اورنگزیب کا مشہور سپہ سالار حمید الدین تھا۔ وہ غیر معمولی جرأت کا آدمی تھا۔ اس کی غیر معمولی شجاعت اور ہمت کی بنا پر اسے عام پر نیمچہ عالمگیری کہا جاتا تھا۔ عنایت اللہ خاں کی طرح وہ بھی اورنگزیب کا بہت معتمد تھا اور مختلف عہدوں پر فائز رہا مثلاً داروغہ فیل خانہ، غسل خانہ اور آختہ بیگی بہادر شاہ اول کے عہد میں اسے بہادر عالمگیری کا خطاب اور میر توزک کا عہدہ عنایت ہوا۔ جہاندار شاہ کے دور میں اسے ذوالفقار خاں نے گرفتار کر لیا تھا۔ فرخ سیر کی تخت نشینی سے پہلے وہ قید سے رہا کر دیا گیا مگر اسے کوئی سرکاری عہدہ نہیں ملا آخر کار وہ لاہور میں عزلت کی زندگی گذارنے لگا اور یہیں محمد شاہ کے عہد میں اس کا انتقال ہوا[3]۔

احکام عالمگیری میں بہتر[2] احکام ہیں۔ ان احکام کی صداقت پر آنکھ میچ کر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان میں سے بعض ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں۔ یہ احکام اورنگزیب کے پورے عہد پر بسیط ہیں اور ان میں سے بعض اس کے عہد شہزادگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

دستور العمل آگہی دستور العمل آگہی بھی اورنگزیب کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جسے اول الذکر مجموعوں کی مدد سے راجہ ایابل کی فرمائش پر اس کے ایک درباری نے

---

[1] اسٹڈیز ان اورنگزیب، ص ۹۶ - ۲۹۵۔ [2] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۰۶۔

[3] مآثر الامرا ۱/ ۶۰۵۔

۴۴/۱۱۵۶-۴۳-۱۷۴۳ میں مرتب کیا. راجہ ایامل دربار میں وکیل تھا اور بعد میں جیپور کا وزیر اعظم ہوگیا تھا. دستور العمل کے مرتب کا کہنا ہے کہ اگرچہ مکاتیب اورنگزیب کے مختلف مجموعے ملتے ہیں لیکن نہ تو ان میں حمد و نعت ہے اور نہ وہ مکمل ہیں. اس لیے "راجہ صاحب کے ایما پر حمد و نعت کے ساتھ یہ مکمل مجموعہ تیار کیا گیا[۱]" اس میں اورنگزیب کے ۲۱۳ رقعات ہیں.

رمز و اشارہ ہای عالمگیری

اسی انداز کا ایک دوسرا مجموعہ رمز و اشارہ ہای عالمگیری ہے. اس کی ترتیب بھی راجہ ایامل کے ایک منشی سدھ مل[۲] نے ۱۱۵۷/۴۵-۱۷۴۴ میں کی. مجموعہ کا نام اور تاریخ کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے:

نام رقعات خاص و ہم تاریخش   شد "رمز و اشارہ ہای عالمگیری"

اس مجموعہ میں شاہجہاں کے نام کوئی خط نہیں ہے[۳]

رقعات عالمگیر

رقعات عالمگیر کے نام سے جو مختلف مجموعے ملتے ہیں وہ سب یکساں نہیں ہیں. بعض بعض نسخوں میں اختلاف ہے. مثلاً انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۳۷۰۹ بوڈلین نمبر ۲۵۲ سے مختلف ہے. یہ سب اولین مجموعوں سے مرتب کئے گئے ہیں. عام طور پر جو مطبوعہ نسخہ ملتا ہے وہ کلمات طیبات پر مبنی ہے.

مذکورہ بالا مجموعوں کے علاوہ رقعات کے جو دیگر مجموعے ملتے ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- عالمگیر نامہ کے مؤلف منشی محمد کاظم نے ایک مجموعہ خاص الانشا یا انشای خاص الخاص کے نام سے مرتب کیا تھا[۴]

---

[۱] دستور العمل آگہی (مخطوطہ دہلی یونیورسٹی لائبریری) ورق ۱، ریو ۴۰۲/۱.

[۲] براؤن کیمبرج (ص ۱۷۶) اس کا نام بدھ مل ہے.

[۳] ریو ۴۰۱/۱.

[۴] یہ مخطوطہ پروفیسر سید مسعود حسین رضوی (لکھنؤ) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے.

۲۔ محمد صلاح جعفری نے اپنے دوست لالہ سیوک رام کی فرمائش پر ایک مجموعہ مرتب کیا۔[1]

۳۔ وصیات عالمگیر۔ اورنگزیب کی وصیات پر مشتمل ہے۔[2]

۴۔ اشارات عالمگیری۔ اورنگزیب کے مختصر فرامین کا مجموعہ ہے۔[3]

موجودہ دور میں اورنگزیب کے رقعات کے دو مجموعے مرتب ہوئے۔ پہلا وقائع عالمگیر مولفہ نبی احمد سندیلوی[4] جو تقریباً احکام عالمگیری حمید الدین خاں پر مبنی ہے۔ دوسرا مجموعہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کا مرتبہ ہے۔ دراصل ندوی صاحب اورنگزیب کے تمام خطوط مرتب کرنا چاہتے تھے، مگر موجودہ جلد صرف ان خطوط پر مشتمل ہے جو اورنگزیب نے عہد شہزادگی میں شاہی خاندان کے افراد کو لکھے تھے۔ اس میں خطوط کے جوابات بھی درج ہیں۔ ندوی صاحب نے مقدمہ کے طور پر ایک علیحدہ مفصل جلد لکھی ہے جو اورنگزیب کے عہد شہزادگی کی سب سے مستند تاریخ کہی جاسکتی ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سارے مجموعے ہیں جن میں اکا دکا اورنگزیب کے مکاتیب ملتے ہیں ان کی اجمالی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

۱۔ مخطوطہ نمبر ۴۷۶ (ذخیرۂ پیرس) اس میں جے سنگھ کے نام گیارہ خطوط ہیں۔

۲۔ مخطوطہ ذخیرہ جدو ناتھ سرکار۔ اس میں جے سنگھ کے نام دو خط ہیں۔

۳۔ جے پور آرکایوز میں چند مخطوطے ہیں جن میں جے سنگھ اور دوسروں کے نام مکاتیب ہیں۔

۴۔ مرآۃ احمدی:۔ اورنگزیب کے فرامین اور احکام اس میں شامل ہیں۔

۵۔ خطوط شیواجی:۔ اس میں شیواجی اور شہزادہ اکبر کے نام خطوط ہیں۔

۶۔ ظہیر الانشا۔

---

[1] مخطوطہ ہارڈنگ، لائبریری، دہلی نمبر ۲۰۹

[2] کتب خانہ ناصریہ کھجوا (لکھنو) مخطوطہ نمبر ۶۸

[3] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۰۶۔

[4] مطبوعہ علی گڈھ ۱۹۳۰ء

۷۔ فیاض القوانین :۔ اس میں اورنگزیب کے گیارہ خط ہیں۔ دو خط عربی میں ہیں۔ ایک سید محمد قنوجی کے نام ہے اور دوسرا زیب النساء کے نام۔

۸۔ انشای فارسی :۔ اس میں اورنگزیب اور شاہجہاں (معزولی کے بعد) اور اورنگزیب اور باغی شہزادہ اکبر کی خط وکتابت درج ہے۔

۹۔ تاریخ صادق خاں :۔ جنگ تخت نشینی پر روانگی کے بعد اورنگزیب اور شاہجہاں میں جو خط وکتابت ہوئی وہ اس میں شامل ہے۔

۱۰۔ مخطوطات نمبر ۳۸۱/۲۵۷ (ذخیرہ ولیم ارون یا ایشیاٹک سوسائٹی)

۱۱۔ گلدستہ (سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۲۷۳) :۔ اس میں اورنگزیب، شاہجہاں اور قطب الملک کے خطوط شامل ہیں[1]

ان مجموعوں کے علاوہ اورنگزیب کے متفرق فرامین اور خطوط عوامی اور ذاتی کتب خانوں میں موجود ہیں اور مزید تحقیق وتلاش سے نیا مواد مل سکتا ہے۔

مکاتیب اورنگزیب ہندوستان کے فارسی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ہندوستان اور ایران کے حکمرانوں میں اورنگزیب واحد بادشاہ ہے جس نے خطوط کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ قلم اور تلوار دونوں کا دھنی تھا۔ اور اگرچہ وہ حکومت کے ایک ایک معاملہ کی نگرانی بذات خود کرتا تھا، اگر خط لکھنے کے لئے وہ کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتا تھا اور اس عدیم الفرصتی کے باوجود اس کی تحریر کا جادو کم نہیں ہے۔

اورنگزیب کے مکاتیب تاریخ عصر کے لئے بہترین ماخذ ہیں۔ اگرچہ یہ افسوس کی بات ہے کہ یہ خطوط اس کی حکومت کے ابتدائی اور آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں اور بیچ کا بیالیس سال کا عرصہ (۱۶۶۰ — ۱۷۰۲ء) یونہی خالی چلا جاتا ہے۔ اس طویل عرصہ میں اس نے جو مکاتیب

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۰۷۔

لکھے، ان کی تدوین کسی نے نہیں کی، ہاں ایک آدھ خطوط ادھر ادھر مل جاتے ہیں۔

ان مکاتیب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگزیب کی تحریر میں بتدریج ارتقا ہوا۔ جو خطوط عہد شہزادگی میں یا تخت نشینی کے فوراً بعد لکھے گئے ہیں، وہ عموماً طویل اور بیحد مفصل ہیں، ان کی عبارت پر شکوہ اور پر تکلف ہے۔ ان میں وہی روایتی انداز کے القاب و آداب اور قدیم انداز کی تمہید اور خاتمہ ہیں۔ لیکن بعد کے خطوط مختصر، جامع اور دو ٹوک ہیں، ان کی عبارت پر مغز، بلیغ اور ایجاز سے بھرپور ہے۔ ان خطوط میں مختصر جملے، بامحاورہ عبارت اور منطقی انداز ہے۔ ان میں ضرب الامثال کا سادو رس اور یقینی تاثر ہے۔

مکاتیب اورنگزیب کی شگفتگی کی ایک وجہ بہترین فارسی اشعار کی حسین پیوندکاری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگزیب قدیم اساتذہ کے کلام کا شیدائی تھا۔ اور کلاسیکی ادب میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ ہمعصر شعرا میں وہ بیدل، ملاشاہ بدخشی اور فانی کشمیری کا گرویدہ تھا۔[1] ایک بار خبر ملی کہ شہزادہ اعظم بہت بیباک شہسواری کرتا ہے، اورنگزیب نے بیدل کا یہ شعر لکھ کر بھیجا:

آہستہ خرام بلکہ مخرام　　　زیر قدمت ہزار جان است[2]

ایک بار یہ اطلاع ملی کہ شہزادہ بیدار بخت نے اپنی بیگم کو تلخ ترش کہہ دیا ہے۔ بادشاہ نے نوجوان پوتے کو حافظ کے ان اشعار میں نصیحت کی:

صبحدم مرغ چمن با گل نو خاستہ گفت　　　ناز کم کن کہ درین باغ بسی چون تو شگفت

گل بخندید کہ از راست نرنجم لیکن　　　ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نگفت[3]

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اورنگزیب کے خطوط میں کہاوت کا سا جادو ہے۔ اس نے فارسی انشا میں ایجاز نویسی کی جو مثال قائم کی، اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ اس کے مختصر، مدلل اور بلیغ

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۱۱۵　　　[2] رقعات عالمگیر، نولکشور، ۱۹۱۰ء، ص ۷

[3] معارف، مئی ۱۹۳۷ء۔

جملوں میں اتنا تاثر اور کیف ہے کہ پڑھنے والا جھوم اٹھتا ہے۔ ان خطوط میں اس کا فن پورے کمال و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے محاوروں اور کہاوتوں کا سہارا لیا ہے لیکن اس کا بہت بڑا سہارا قرآن کی آیتیں بھی ہیں۔ کہیں کہیں اس نے صرف ایک آیت میں پورا دفتر سمو دیا ہے۔ دارا نے گرفتاری کے بعد جب اورنگزیب سے معافی مانگی تو اس نے اس کی عرضداشت کی پشت پر یہ آیت لکھ کر لوٹا دی:۔

اَلآنَ وَقَدْ عَصَیْتَ وَکُنْتَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ [1]

اسی طرح یہ جملے ملاحظہ فرمائیے جن کی بلاغت ایجاز و جامعیت میں ہے:۔

'آن قدر شور مباش کہ از دہن برانداز ند و آن قدر شیرین مباش کہ فرو برند' [2]

'بخورید دنیا را پیش از آن کہ شما را بخورد'! [3]

'از حکیمی پرسیدند' 'دوای مرض غرض چیست'؟ گفت 'بی غرضی'۔ [4]

مکاتیب اورنگزیب کی ایک بڑی خوبی حفظ مراتب کا حسن ہے۔ اورنگزیب کے مکتوب الیہم کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس میں شاہجہاں، شاہی خاندان کے افراد، امرا، رؤسا، صوفیہ اور مطلق حکمراں شامل تھے۔ ان میں کوئی باپ تھا، کوئی بھائی، کوئی بہن، ان میں اس کے اپنے بیٹے بھی تھے اور بیٹیاں بھی، پوتے اور پوتیاں بھی، وزیر اعظم بھی اور معمولی عہدہ دار بھی، شاعر اور عالم بھی تھے اور صوفی اور مرشد بھی۔ ان سب لوگوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت الگ الگ تھی، اور سب کے مراتب کا وہ پورا پورا پاس کرتا تھا۔ اور اسی مناسبت سے القاب و آداب اختیار کرتا تھا۔

---

[1] رقعات عالمگیر، نجیب اشرف، ص ۲۲۶۔

[2] وقائع عالمگیر مرتبہ نبی احمد سندیلوی، ص ۱۹

[3] دستور العمل آگہی (دہلی یونیورسٹی) ورق ۵۹

[4] رقعات عالمگیر، نولکشور، ۱۹۱۰ء، ص ۱۴۔

مثلاً شاہجہاں کی خدمت میں وہ اس طرح عرضداشت پیش کرتا ہے :-

"مرید عقیدت کیش زمین خدمت بہ لب ادب بوسیدہ، و مراسم ارادت و عقیدت بجا آوردہ، بہ مسامع جاہ و جلال می رساند" [1]

جہاں آرا اور مراد کو اس طرح لکھتا ہے :-

"مخلص بی اشتباہ بعد ادای مراسم اخلاص و نیازمندی معروض دارد" [2]

"برادر عزیز بہ جان برابر، کامگار نامدار عالی مقدار من" [3]

شہزادہ اکبر کو اس طرح خطاب کرتا ہے :-

"فرزند ارجمند، درۃ التاج فرخی و فیروزمندی و دل پسندی، شہزادۂ جہانیان بہ غایت الطاف شہنشاہی و اعطاف بادشاہی مخصوص گشتہ بداند" [4]

ایک عالم خواجہ عبد الغفار کے لئے یہ القاب استعمال کئے :-

"سیادت مرتبت، نجابت و شرافت منزلت، خلاصہ خاندان ہدایت و کرامت، نتیجۃ الابرار، خواجہ عبد الغفار بر جادہ خدا پرستی و حق جوئی مستقیم بودہ، بہ عافیت باشند" [5]

یہ انداز تخاطب ابتدائی دور کا ہے۔ بعد کے خطوط میں القاب و آداب سمٹ کر ایک دو لفظ میں رہ گئے۔ اب وہ معظم اور اعظم کو بالترتیب 'مہین پور خلافت' اور 'فرزند عالیجاہ' سے خطاب کرتا ہے۔ معز الدین اور بیدار بخت کو "فرزندزادہ عزیز" لکھتا ہے۔ باغی اکبر کو اکبر ابتر کہتا ہے۔ وزیر اعظم اسد خاں کو عمدۃ الملک مدار المہام کے لقب سے اور غازی الدین فیروز جنگ کو

---

[1] رقعات عالمگیر، نجیب اشرف، ص ۱۳۔

[2] ایضاً ص ۲۲۷۔

[3] ایضاً ص ۲۶۲۔

[4] مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۵۸

[5] ایضاً ص ۶۱۔

صرف خان فیروز جنگ کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

خطوط کی رسید بھیجتے وقت بھی وہ مکتوب الیہ کے مرتبہ اور منصب کا پورا پورا خیال کرتا تھا، ابتدائی دور کے پر تکلف خطوط میں وہ اسی روایتی اور مصنوعی انداز میں خط ملنے کا اعتراف کرتا تھا۔ مثلاً شاہجہاں کو لکھتا ہے :-

"فرمان عالی شان سعادت عنوان باسرپیچ زمرد و مروارید کہ مصحوب یساول سرکار اعلیٰ اشرف صدور یافتہ بود، روز یک شنبہ ہشتم ربیع الاول پرتو ورود بخشید۔ تارک مباہات و افتخار این مرید را بہ اوج فلک الافلاک رسانید۔ تسلیم و آداب بجا آوردہ، از عنایت بیغایت بادشاہانہ سرفراز و سربلند گردید"۔ [1]

جہاں آرا نے میوہ بھیجا تھا اس کا شکریہ اس طرح ادا کرتا ہے :-

"از عنایت میوہ خوش گشتہ، تسلیمات بجا آوردہ"۔

مہربانیت را شماری نیست   زندگانیت را شمار مباد [2]

جیسے جیسے اورنگزیب اور شاہجہاں کے تعلقات خراب ہوتے گئے، شاہجہاں کے نام اس کے خطوط میں تلخی اور تندی بڑھتی گئی۔ دارا کے ایما پر جب کبھی شاہجہاں اورنگزیب کو معمولی معمولی باتوں پر ٹوکتا تو اورنگزیب انتہائی عاجزانہ انداز میں صفائی پیش کرتا، ان خطوط میں اس کا کرب صاف نمایاں ہے، مگر اس نے کبھی حفظ مراتب کا دامن نہیں چھوڑا اور نہ کسی گستاخی کی جرأت کی کیونکہ شاہجہاں بہرحال شہنشاہ وقت تھا۔

شاہجہاں کی مہلک بیماری کے زمانے تک اورنگزیب کے خطوط کا ایک خاص انداز ہے ان کا آغاز و اختتام تمام آداب اور تکلفات کا حامل ہے اور تقریباً ہر عریضہ کے آخر میں یہ دعا ہے کہ

---

[1] رقعات عالمگیر، نجیب اشرف، ص ۶۵

[2] ایضاً ص ۲۳۳۔

شاہجہاں کی عمر دراز ہو اور اس کا سایہ تا دیر قائم رہے۔ لیکن جنگ تخت نشینی کی مہم پر روانہ ہونے کے بعد اورنگزیب کا انداز تخاطب بدلنے لگا۔ اب اس کا خط اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

'عرضداشت کمترین فرزندان محمد اورنگزیب'

اور ایسے جملوں پر ختم ہوتا ہے :۔ 'زیادہ عرض گستاخی است' یا 'زیادہ ازین دراز نفسی وکوتاہ اندیشی است'۔ [1]

شاہجہاں کی اسیری کے بعد باپ اور بیٹے کی مکاتبت کا انداز بالکل بدل گیا۔ دونوں طرف سے طعن وطنز کے تیر چلنے لگے۔ ایک بار شاہجہاں نے یہ تلخ خط لکھا :۔

'سبحان اللہ! دیروز صاحب نہ لک سوار بودم وامروز بہ یک۔ کوزۂ آب محتاج

آفرین بر ہنود در ہر باب — مردہ را می دہند دائم آب
ای پسر تو عجب مسلمانی — زندہ جانم بہ آب نرسانی

ای فرزند کامگار! براقبال دنیای غدار مباش وخاک غفلت وتکبر بر سر عقل مباش کہ دنیای فانی تنگنای ظلمانی است دبہ یاد حق بودن وبر خلق شفقت نمودن دولت جاودانی'

اورنگزیب نے خط کی پشت پر یہ جملہ لکھ کر لوٹا دیا :۔

'کردۂ خویش پیش آید، زیادہ حد ادب' [2]

شہزادگی کے دوران جب کبھی اورنگزیب پر کوئی شاہی عتاب ہوتا تو وہ جہاں آرا کی طرف رجوع کرتا اور اس سے اپنے دل کا درد بیان کرتا۔ اگر کبھی شہزادی کی طرف سے جواب میں تاخیر ہوتی تو اورنگزیب نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتا۔ وہ بہن سے محبت آمیز گلہ کرتا اور اس کے محبت بھرے خط کا انتظار کرتا۔ ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"مارا چو روزگار فراموش کردہ ای — آیا شکایت از تو کنم یا روزگار

---

[1] ایضاً ص ۱۹۸، ۲۰۶ — [2] ایضاً ص ۳۰۶

'خیراندیش حقیقی مراسم اخلاص و اختصاص بجاآوردہ، بہ عرض می رساند مدتی شد

کہ از گلزار ہمیشہ بہار نسیم التفات نوزیدہ، و از گلشن عطوفت بوئی بہ مشام جان

آرزومند نرسیدہ'! [۱]

بیٹوں اور پوتوں کو خط لکھتے وقت جہاں اورنگزیب اپنی شفقت اور محبت کا اظہار کرتا وہیں ان کی معمولی معمولی خامیوں پر بھی وہ کڑی نظر رکھتا تھا۔ انھیں دارا کے غیر دانشمندانہ اقدام کی مثال دے کر متنبہ کرتا اور کبھی شاہجہانی امرا کے نمونے پیش کرکے ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتا۔ شہزادہ اعظم میں تکبر، سرکشی اور لاپرائی تھی۔ ایک بار اس نے عرضی گذرانی کہ سید لعل کی جاگیر اسے دیدی جائے۔ اورنگزیب نے یہ جواب دیا:۔

'در نوکری آن بابا با سید لعل مساوی، و در سیادت طرف ثانی بہ ہزار مرحلہ

زیادہ، الحمدللہ کہ بہ طور اعلحضرت اولاد را مسلط ننمودہ ایم کہ ندامت کشیم'! [۲]

کسی اور غلطی پر اسے اس طرح ڈانٹا گیا:۔

'فرزند ناعاقبت بین، پوچ نشین، بی تمکین'، [۳]

یہ اورنگزیب کی بدقسمتی تھی کہ اس کے پانچ بیٹوں میں سے تین اس کے عتاب کا شکار ہوئے محمد سلطان نے قید میں جان دی۔ اکبر نے پردیس میں دم توڑا اور معظم تھوڑے عرصہ تک گرفتار رہا مؤخر الذکر کی گرفتاری کے بعد اورنگزیب کبھی اس سے صاف دل نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ شہزادہ کو اس کی مشکوک وفاداری پر طنز کرتا تھا۔ ایک بار اسے معلوم ہوا کہ معظم نے ہاتھیوں کی لڑائی کا اہتمام کیا تو اورنگزیب نے یہ خط لکھا:۔

'جنگ فیل مخصوص بادشاہان است، بہ این آرزوہای لاطائل بی حاصل بادشاہی

---

[۱] ایضاً ص ۲۴۷ [۲] وقائع عالمگیر ص ۳۴

[۳] ایضاً ص ۳۷۔

زود نخواہد رسید، ہرگاہ وقت آید و در نصیب باشد خواہد شد، آدمی را چیزی کہ خراب کند طلب بیش از قسمت و بیش از وقت است، ما را چرا متغیر و خود را مکدر باید ساخت"[1]

بیٹوں کی نااہلی غالباً اورنگزیب کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھی، اس نے جس عظیم سلطنت کی عمارت کھڑی کی تھی، اس کے وارث بہت چھوٹے اور بونے تھے۔ ادھر اورنگزیب کی زندگی کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اسے یہ خیال بھی رہ رہ کر ڈستا تھا کہ تخت طاؤس تک پہونچنے کے لئے اس نے اپنے باپ کو قید اور بھائیوں کو قتل کیا ہے، آنے والی موت کی پرچھائیں اور گذری ہوئی زندگی کا تاریک سایہ اسے کس طرح مضطرب رکھتا تھا، اس کا نمونہ اس درد بھرے خط میں ملاحظہ فرمائیے:-

"سلام علیکم و علی من لدیکم - پیری رسید و ضعف قوی شد، قوت از اعضا رفت، یگانہ آمدم، بیگانہ می روم، خبر از خود ندارم کہ کیستم و چہ کارہ ام، عمر عزیز مفت رفت۔۔۔۔۔ حیات پایدار نیست و از نقش رفتہ نشانی پدیدار نی، و از استقبال توقع مفقود۔ تپ مفارقت کرد و چرم و پوست تنہا گذاشت۔۔۔ ہیچ با خود نیاوردم و ثمرۂ گناہان ہمراہ می برم۔۔۔ ہرچند نظر بر الطاف و رحمت و امید قوی است، اما نظر بر اعمال و افعال تفکر نمی گذارد، چون از خود گذشتم، دیگری کجا ماند؟ الوداع، الوداع، الوداع"[2]

خاص الانشا خاص الانشا معین الدین جامعی کی نگارشات کا مجموعہ ہے اور ۱۲۳ خطوط اور دیگر منثورات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی تدوین جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے، ۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳ء میں ہوئی۔ اس مجموعہ کے بیشتر خطوط اس عہد کی اہم شخصیتوں کو لکھے گئے ہیں جن میں داراشکوہ، محسن فانی، میر جملہ، عابد خاں اور صدر الصدور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایک خط میں شاہجہاں کی صحت یابی (۱۰۶۷/ ۵۷-۱۶۵۶) کی تہنیت ہے[3] اور اورنگزیب کی تخت نشینی سے متعلق پانچ

---

[1] ایضاً ص ۲۱۔

[2] دستور العمل، ورق ۴۸۔

[3] خاص الانشا (علی گڈھ) ورق ۱۷۔

خط ہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک پر تکلف مقدمہ ہے جس میں مصنف حمد و نعت کے بعد خلفای راشدین کی منقبت کرتا ہے۔ کتاب کے دوران میں جامعی نے بہت سے اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں۔[1]

انشای حدیقی انشای حدیقی مثالی خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط رشتہ داروں، دوستوں اور عام عہدہ داروں کو لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کا مصنف حدیقی ہے جس کے بارے میں کوئی خاص اطلاع نہیں۔ ایک خط میں ۱۰۷۷/ ۶۷-۱۶۶۶ کی تاریخ ہے۔ ترقیمہ میں بھی یہی تاریخ ہے۔ غالباً یہی کتاب کی تاریخ تصنیف بھی ہے۔[2]

انشای خلیفہ جامع القوانین جو عام طور پر انشای خلیفہ کے نام سے مشہور ہے، فن انشا کی معروف کتاب ہے اسے خلیفہ شاہ محمد نے اپنے دوستوں کی فرمائش پر ۱۰۸۵/ ۷۵-۱۶۷۴ میں مرتب کیا۔ کتاب کی تاریخ اس شعر میں ہے:-

درسلک نثر چون درناسفتہ سفتہ شد　　مجموعۂ فضائل تاریخ گفتہ شد[3]
(مجموعۂ فضائل = ۱۰۸۵ ہجری)

خلیفہ شاہ محمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قنوج کے باشندہ تھے[4] مگر جامع القوانین کے دیباچہ اور مختلف خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ شاہ محمد قنوج کے رہنے والے نہیں تھے بلکہ وہاں اپنی تعلیم کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ سید مظفر ابن انوپ نگر کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کی کچھ اراضی رسول آباد میں تھی، اور ان کے قنوج آجانے کے بعد ان کے گھروالوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، کیونکہ ان کے سوا گھر کی دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہیں تھا چنانچہ انھوں نے امین سے درخواست کی کہ ان کا لگان معاف کر دیا جائے۔[5]

---

[1] نیز ملاحظہ ہو ایتھے نمبر ۲۰۹۵؛ بوڈلین نمبر ۱۴۰۳۔　　[2] ریو ۲/ ۵۳۰

[3] انشای خلیفہ، نولکشور، اکتوبر ۱۸۷۷ء، ص ۳۔　　[4] ایتھے نمبر ۲۰۹۶؛ ایشیاٹک ۱/ نمبر ۳۷۵

[5] انشای خلیفہ ص ۴۲، ۱۱۱؛ ریاض الافکار ورق ۳۴۔

خلیفہ عموماً اپنے آپ کو "خلیفہ طالب علم" لکھتے ہیں، انھوں نے تحصیل علم کے لئے مختلف مقامات کی زیارت کی اور متعدد اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ سید کرم اللہ کے نام ایک خط میں خلیفہ اپنے قیام کے انتظام کے لئے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔[۱] انھوں نے کچھ دن بلگرام میں بھی میر اسمعیل بلگرامی کے پاس قیام کیا اور سید عبد الغفور اور سید خیر اللہ سے علم کی تحصیل کی، جیسا کہ ان کے نام لکھے گئے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔[۲] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خلیفہ کی عمر خاصی پختہ تھی۔ طلبہ ان سے تعلیم کے معاملہ میں مشورہ کرتے تھے۔[۳] نواب ارشد خاں (م۔ ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰) نے انھیں کسی عہدہ کی پیشکش بھی کی تھی، مگر انھوں نے تعلیم کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔[۴]

انشای خلیفہ کے شروع میں ایک مرصع دیباچہ ہے جس میں مصنف نے ان حالات کا ذکر کیا ہے جن میں اس کتاب کی تصنیف عمل میں آئی۔ پوری کتاب چار باب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ذاتی خطوط ہیں، دوسرے میں رقعات ہیں۔ تیسرے میں تہنیت اور تعزیت کے مکاتیب ہیں اور چوتھے میں القاب و آداب پر بحث کی گئی ہے۔

خلیفہ کے مکتوب الیہم کی فہرست خاصی طویل اور متنوع ہے۔ اس میں طلبہ بھی شامل ہیں اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار بھی۔ علما بھی ہیں اور عام لوگ بھی۔ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ ان کے ہندو دوستوں میں ہر رائے، گردھر داس اور فتح چند کے نام نظر آتے ہیں۔[۵] اور یہی وجہ ہے کہ جہاں بعض مکاتیب بالکل رسمی اور پر تکلف ہیں وہیں عاشقانہ اور بے تکلف خطوط بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً میاں شہاب الدین کے نام ایک خط کا آغاز ملاحظہ فرمائیے:-

---

[۱] ایضاً ص ۱۵۔
[۲] ایضاً ص ۵، ۹؛ مآثر الکرام ص ۲۳۰، ۲۴۳۔
[۳] ایضاً ص ۷۔
[۴] ایضاً ص ۲۱۔
[۵] ایضاً۔

"تا وسمۂ مشکبار غالیہ مویان نازنین تسکین، بخشای خونین جگران سپہر وصفحۂ رخسار مہوشان زہرہ جبین رشک افزای مہر است، بہار جمال طراوت گلشن آمال دامانی ونضارت حدیقۂ عیش وکامرانی گلگونۂ عارض خوبی، خال چہرۂ محبوبی، سویدا دیدۂ وداد، سرمۂ چشم اتحاد، مقبول ایزد جہان آفرین، میان شہاب الدین رنگ افروز گل ونالہ آموز بلبل باد[1]"

خطوط عام طور پر طویل اور مفصل ہیں۔ لیکن رقعات مختصر اور جامع ہیں البتہ تکلف اور تصنع دونوں میں ہے۔ عموماً خطوط کا آغاز کسی موزوں شعر سے ہوتا ہے۔ رقعات میں خصوصاً صنائع بدائع کا بکثرت استعمال ہے۔ خلیفہ خاص طور پر صنعت قلب کے شیدائی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مثالیں دیکھیے :۔

'صبح نفسان معنی رس ومعنی شناسان صبح نفس،

لازمۂ عبودیت کیشان عقیدت اندیش وطریقۂ عقیدت اندیشان عبودیت کیش'[2]

مندرجہ ذیل رقعہ نثر اور نظم دونوں میں پڑھا جا سکتا ہے :۔

"برضمیر منیر مہر نظیر، آن خردمند صاحب تدبیر، معدن لطف ومخزن اشفاق، منبع الجود مجمع الاخلاق، رونق فضل وزیب، دولت وجاہ، دانش آگاہ شیخ نور اللہ"[3]

دیگر اہم رقعات میں ایک صنعت واسع الشفتین میں ہے۔ دوسرا صنعت غیر منقوط میں۔ ایسا ایک رقعہ سید عبد الجلیل (غالباً سید عبد الجلیل بلگرامی) کے نام ہے۔ مگر ان تمام صنائع کے باوجود خلیفہ کی انشا میں ایک جاذبیت، سلاست اور شیرینی ہے۔ انھوں نے ہلکے پھلکے جملوں میں بڑی پیاری پیاری باتیں کہہ دی ہیں :۔

'سخن درست منزل دراست، ہر کہ دریافت، دریافت'

---

[1] ایضاً ص ۶۔ [2] ایضاً ص ۴

[3] ایضاً ص ۲۰۔

'درین جیثیت کہ از طرفی باری واز کس غباری بر سر و خاطر نبست، از کسب علوم محروم ماندن و در بطالت وضلالت گذرانیدن، بنای عشرت کندیدن وزہرابۂ عسرت چشیدن است'[1]

کتاب کے تیسرے باب میں نمونہ کے طور پر تعزیت اور تہنیت کے رقعات دیئے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں بادشاہ، بیگمات، امرا، اساتذہ، علما، شعرا، قاضی اور عزیزوں کے خطاب کے لئے مناسب القاب درج ہیں۔ یہ تمام القاب پرانے انداز کے ہیں اور انتہائی پر تکلف اور پرشکوہ ہیں۔ خاتمہ میں مصنف نے فن انشا کی مختلف نزاکتوں پر بحث کی ہے، مثلاً فرمان اور نشان یا عام خطوط کی رسید کی اطلاع کیسے دی جاتی ہے۔ مکتوب الیہم کے خط کا حوالہ کن الفاظ میں دیا جاتا ہے۔ خط و کتابت میں کیا مناسب اور برمحل استعارے استعمال کئے جاتے ہیں اور اپنے مسائل کا ذکر کس طرح کیا جاتا ہے۔

جامع القوانین (یا انشای خلیفہ) انشا کی معیاری کتاب مانی جاتی تھی اور فارسی کے نصاب میں داخل تھی۔ ریاض الافکار کے مؤلف کا بیان ہے کہ مشکل سے کوئی ایسا مدرسہ ملے گا جہاں سفید ریش ملّا اس کتاب کو مزہ لے لے کر نہ پڑھاتے ہوں[2]

نگارنامہ نگارنامہ عہد اورنگزیب کے خطوط، فرامین، اسناد اور سرکاری دستاویزات کا مجموعہ ہے، اس کا مرتب منشی لعل چند ملتانی ہے جو عام طور پر منشی ملک زادہ کے نام سے معروف ہے۔[3] منشی پہلے قاضی محمد منیر کی ملازمت میں تھا۔ جب ۱۰۸۱/۷۱-۱۶۷۰ میں لشکر خاں کا انتقال ہوا تو وہ شاہی منشی کی حیثیت سے شہزادہ معظم کی سرکار میں ملازم ہو گیا۔ شہزادہ کی مہم کابل (شعبان ۱۰۸۶/ اکتوبر ۱۶۷۵) میں منشی بھی شریک تھا لیکن دشوار گذار راستہ اور خراب موسم کی بنا پر

---

[1] ایضاً ص ۲۱ [2] ریاض الافکار ورق ۳۵۔

[3] نگارنامہ، نولکشور، ۱۸۸۲ء، ص ۱۴: خلاصۃ المکاتیب (سجان رائے) نیشنل میوزیم، نمبر ۱-۳۲۶، ورق ۱۵۔

اسے پشاور سے واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ اب اسے دکن کے دیوان رحمت خاں کا منشی مقرر کیا گیا۔ ملک زادہ اپنے آقا کے ساتھ ایک سال اورنگ آباد میں مقیم رہا جب رحمت خاں نے اپنے عہدہ سے استعفی دیا اور اس کی جگہ مرزا بشارت خاں کو مقرر کیا گیا تو منشی نئے دیوان سے متعلق ہو گیا۔ لیکن بشارت خاں کو جلد ہی دہلی طلب کر لیا گیا۔ منشی اس وقت تک ستر سال کا ہو چکا تھا اس لئے اسے اورنگ آباد میں قیام کی اجازت دیدی گئی۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کے استفادہ کے لئے نگارنامہ کی تالیف شروع کی۔ اس کام میں اس کے لڑکے صورت سنگھ عرف میگھراج نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ کتاب کی تکمیل شعبان رمضان ۲۷ ویں سن جلوس (۱۰۹۴/ اگست۔ ستمبر ۱۶۸۳) میں ہوئی۔[۱] منشی کی ایک اور تالیف کارنامہ ہے جو ۱۰۸۹/۷۹-۱۶۷۸ میں مرتب ہوئی۔ "بستانچہ ہمیشہ بہار" اس کی تاریخ ہے۔[۲]

نگارنامہ کا ابتدائی حصہ بہت اہم ہے۔ اس میں مؤلف انشا پر بحث کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ اس فن کا تفصیلی ذکر اپنی پہلی تصنیف کارنامۂ منشی میں کر چکا ہے۔ پھر اس نے فارسی نثر کی مختصر تاریخ بیان کی ہے جو سعدی اور طوسی سے شروع ہوتی ہے۔ منشی سے کچھ پہلے جن لوگوں نے فن انشا میں کمال حاصل کیا ان میں داراشکوہ کا میر منشی قاضی محمد افضل، شیخ عبدالرحیم خیرآبادی، ملا مینا اور پنڈی داس قابل ذکر ہیں۔ ملک زادہ کا خیال ہے کہ شہزادہ مراد کے منشی شیخ ہبۃ اللہ کا مرتبہ ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہے۔ چندر بھان برہمن عالم نہیں تھا مگر اس کی انشا عمدہ تھی۔ اس فن کے اساتذہ میں دو اور شخص ہیں ایک شیخ عبدالصمد جونپوری جو جعفر خاں سے متعلق تھا اور دوسرا شیخ طالع یار عرف اودے راج جو مرزا راجہ جے سنگھ کا منشی تھا۔

مؤلف کے ہمعصر انشا پردازوں میں ملا ابوالفتح قابل خاں، مرزا محمد کاظم اور ملا مخدوم ٹھٹھوی اہم ہیں۔ شہزادوں سے متعلق جو منشی ہیں ان میں صرف ملا عبدالخالق قابل ذکر ہے۔ ملک زادہ کہتا

---

[۱] نگارنامہ ص ۹-۶، ۲۱۰

[۲] سالار جنگ نمبر ۳۳۱۸۔

ہے کہ اچھے منشی کی ہر جگہ ضرورت ہے مگر کہیں نہیں ملتا۔[1]

نگارنامہ میں جو خطوط اور فرامین ہیں، وہ فن انشا سے زیادہ تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔ مثلاً پہلی بار اس سے اورنگزیب کی جزیہ پالیسی پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اس دور کے زرعی نظام، ٹیکس اور ملازمت وغیرہ کے متعلق بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بہت سے خطوط کے شروع میں مکتوب الیہ کا نام حذف کر دینے سے ان معلومات کی اہمیت کچھ کم ہو گئی ہے۔

نگارنامہ دو دفتر میں منقسم ہے۔ پہلا دفتر منشی کے نگارشات پر مشتمل ہے۔ لیکن دوسرے دفتر میں دوسروں کی نگارشات ہیں۔[2]

انشای عبد العلی یہ ناظر الممالک سلطانی حاجی عبد العلی تبریزی کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط حاجی عبد العلی نے عبد اللہ قطب شاہ (۸۳-۱۰۳۵/۷۳-۱۶۲۵) ابو الحسن تانا شاہ (۹۸-۱۰۸۳/۸۷-۱۶۷۳) اور ان کے دربار کے دیگر امرا کے لیے لکھے تھے۔ اس مجموعہ کا کوئی مخصوص نام نہیں نظر آتا اور نہ اس کے شروع میں کوئی دیباچہ ہے۔ خطوط کی تفصیل درج ہے۔

عبد اللہ قطب شاہ کے خطوط بنام شاہجہاں، دارا شکوہ، اورنگزیب، شجاع، عادل شاہ بیجاپوری، افراد خاندان شاہی و امرای دربار۔

مرزا نظام الدین احمد، حکیم الملک، میر جملہ اور دیگر امرا کے خطوط۔

حاجی عبد العلی تبریزی کے خطوط امرا اور دیگر اشخاص کے نام۔

ابو الحسن قطب شاہ کے خطوط اورنگزیب کے نام۔ مؤخر الذکر کا ایک فرمان اور متفرق خطوط۔[3]

---

[1] نگارنامہ ص ۴۰۵۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون 'نگارنامہ'۔ برہان۔ دہلی، فروری ۱۹۶۹ء۔

[3] ریو ۱/۳۹۸۔

انشای عبدالرسول عبدالرسول کے منشآت کا ایک مجموعہ انشای (رقعات) عبدالرسول کے نام سے محفوظ ہے اس عہد میں ایک عبدالرسول بوستاں اور گلستان کا شارح گذرا ہے ممکن ہے یہ دونوں ایک ہی شخص ہوں۔ موخرالذکر جس کا پورا نام عبدالرسول بن عبداللہ بن طاہر بن حسن القرشی الہاشمی ہے۔ شیخ نوراللہ احراری شارح مثنوی معنوی کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے برادر بزرگ شیخ عبداللہ اور دیگر احباب کی فرمائش پر ۱۰۷۳/۶۳-۱۶۶۲ میں بوستان کی شرح لکھی[1] یہ شرح بہت مقبول ہوئی تو اس نے گلستان کی تفصیلی فرہنگ بھی تیار کی[2]۔ ان دونوں شرحوں کی تصنیف میں اس نے لغت کی معیاری کتابوں سے استفادہ کیا۔ عبدالرسول نے جن لغات کا ذکر کیا ہے ان میں صراح، مؤید الفضلا، لسان الشعرا، شرفنامہ، تحفۃ السعادت، تحفۂ شاہی، کشف اللغات، مہذب الاسما، زفان گویا، فرہنگ جہانگیری وغیرہ کا نام ملتا ہے۔

انشای عبدالرسول میں خطوط نویسی کے مختلف اصول، موزوں اور مناسب الفاظ اور محاورے، مرادفات اور نمونے کے خطوط درج ہیں۔ ان خطوط میں مختلف تاریخیں مثلاً ۱۰۶۹/ ۵۹-۱۶۵۸، ۱۰۸۸/۷۸-۱۶۷۷، ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ اور ۱۰۹۹/۸۸-۱۶۸۷ ملتی ہیں[3] ایک اور مجموعہ مجمع الافکار میں بھی مرزا عبدالرسول کے خطوط اورنگزیب کے نام درج ہیں[4] لیکن اس کی شخصیت کا تعین مشکل ہے۔

رقعات خلیل خلیل کی شاعری کا ذکر اوپر ہوا۔ انھوں نے رقعات خلیل کے نام سے اپنے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ برٹش میوزیم میں بھی ان کے خطوط کا ایک

---

[1] عبدالرسول: شرح بوستان، علی گڈھ، ورق ۲۔

[2] عبدالرسول: شرح گلستان، علی گڈھ، ورق ۲-۱

[3] بوڈلین نمبر ۱۳۹۶۔

[4] مجمع الافکار، بانکی پور نمبر ۸۶۰، ورق ۱۸۲۔

مجموعہ ہے[1]۔ جس میں زیب النساء، شہزادہ اعظم اور ملا مخدوم فاضل خاں کے نام خطوط ہیں۔
چونکہ ملا مخدوم کو مذکورہ خطاب ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ میں ملا[2]۔ اس لئے خیال ہے کہ ان میں سے بعض خطوط اس تاریخ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں رقعات خلیل کا جو مجموعہ[3] ہے۔ وہ ۲۷۰ چھوٹے بڑے خطوط پر مشتمل ہے۔ ہر خط کے شروع میں مکتوب الیہ کا نام نہیں درج ہے لیکن جن کے نام درج ہیں، ان میں بزرگ امید خاں، نواب ہمت خاں، اسد خاں وزیر اعظم، اور نواب سیف خاں کے نام اہم ہیں۔ ان خطوط سے خلیل کی روزمرہ زندگی کی چھوٹی بڑی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً انھیں پالتو جانوروں اور چڑیوں سے لگاؤ تھا۔ وہ بلی کو عزیز رکھتے تھے اور حب الھرۃ من الایمان کے قائل تھے[4]۔ ان کے دوست احباب انھیں اکثر شکار پر لے جایا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں میں ناتوانی کے باعث دراج اور مرغابی کے شکار پر جانے سے معذور ہوں[5]۔ غالباً ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور وہ اپنے دوستوں سے دوا اور مقویات کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ ایک خط میں یاقوتی جواہر دار کا شکریہ اور دوسرے میں رُب بہ اور شربت سیب کی فرمائش ہے[6]۔ خلیل نے اس وقت تک عینک بھی لگانی شروع کر دی تھی نواب سیف خاں کو عینک کا شکریہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ جوانی میں یہ رباعی سنی تھی:

پیرم ز عصا و عینکم ناچار است	ہر سال مرا تا سفی بر بار است
نی دیدہ بہ جای خویش ماندہ است نہ پای	پایم ور دست و دیدہ در دستار است

بوڑھے اس شعر کی تعریف کرتے تھے، مگر میں سخن فہمی کے باوجود اس سے محظوظ نہیں ہوتا تھا
"درین ایام کہ ایام شباب بہ اوقات شیب مبدل گردیدہ، بہ غور آن شعر رسیدم

---

[1] ریو ۲/۸۲۶۔
[2] مآثر عالمگیری ص ۲۵۱
[3] رقعات خلیل، علی گڈھ، نمبر ج ف ۵۱۵
[4] ایضاً ورق ۱۸
[5] ایضاً ورق ۱۹
[6] ایضاً ورق ۱۰، ۱۹

ومعنی آن معمارا فہمیدم :[1]

رقعات خلیل میں بعض دلچسپ انشائیے ہیں. مثلاً ایک انشائیہ 'از زبان عاشق فیضیاب بہ معشوق او نوشتہ'[2] اور دوسرا 'از زبان عاشق بہ معشوق باغبان' ہے[3]. ایک انشائیہ کسی تنباکو فروش کی فرمائش پر تنباکو کی تعریف میں لکھا گیا تھا.[4] ان تمام نگارشات میں ایک لطیف طنز اور مزاح ہے، اور یہ خلیل کی نثر کی بہت بڑی خوبی ہے. ایک دوست نے ان سے فوراً جواب مانگا تھا، اسے لکھتے ہیں :-

'ای ہمقدم باد صرصر و ہمپا بانسیم سحر! آنچنان نامہ را بہ این دست پاچگی سرسری نتوان نگاشتن. آخر نہ این جواب نامۂ چون من ہیچمدان است کہ بی تامل آن راتوان نوشتن. عجلتا بہ عذر درباید م داد. باری بہ ہزار داد و فریاد آن قدر عجلتی کہ قلم را ..... زیر قلمتراش تیز می باشد، یافتم و ہرچہ باداباد گویا ہمت بستم و چون قلم از جا جستم و پارۂ کاغذی بہ دست آوردم و این چند بیت جواب کتابت منظوم را کہ نثری است بہ صورت نظم ... عجالۃً گفتم و نوشتم و تسلیم کردم '![5]

بعض خطوط میں خلیل نے تاریخ نویسی کا نرالا انداز نکالا ہے. مثلاً ایک صاحب نے دو باز بھیجے ہیں. انھیں شکریہ میں لکھتے ہیں :-

"لفظ باز در عدد دہ است و لفظ دو ہم در حساب دہ '[6]

گویا آپ نے مجھے دو نہیں بلکہ دس باز بھیجے.

یا بزرگ امید خان نے فرنی بھیجی تو لکھتے ہیں عدد فرنی با قمر مطابق است '[7]

---

[1] ایضاً ورق ۳۲ [2] ایضاً ورق ۱۳

[3] ایضاً ورق ۱۵ [4] ایضاً ورق ۳

[5] ایضاً ورق ۵ [6] ایضاً ورق ۲

[7] ایضاً ورق ۲.

ایک صاحب عبداللہ کے کہنے پر خلیل نے مناجات خواجہ عبداللہ انصاری لکھی تو اس میں یہ نکتہ پیدا کیا :-

'اسم عبداللہ در حساب ہمعدد زندگانی است ' [1]

مرزا خلیل بسیار نویسی کے عادی تھے۔ ان کے احباب انھیں اس پر ٹوکتے تھے۔ ایسے ہی ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

'اوراق بسیاری را چون روزنامۂ اعمال خود سیاہ کردم، پس از آنکہ وارسیدم خجل گردیدم و انفعال کشیدم !' [2]

اسی خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خلیل نسلاً ترک تھے اور ان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی :- [3]

ترک ہندوستان خط و سواد — کیستم من درین خراب آباد

خلیل کی نگارشات نے بہت جلد اہم درجہ حاصل کر لیا۔ اس کا شمار فارسی انشا کی بنیادی کتابوں میں ہوتا تھا۔ رنچھوڑ داس نے اپنی دقائق الانشا میں اسے اپنا بنیادی ماخذ بتایا ہے۔ [4]

زیب المنشآت

خلیل نے جو زیب المنشآت مرتب کی تھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ انجمن ترقی اردو علی گڈھ کے کتب خانہ میں ایک انتہائی کرم خوردہ نسخہ ہے جس کا نام زیب المعانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی ترتیب صحیح نہیں کیونکہ فوراً رقعات شروع ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد ایک دیباچہ سا آتا ہے جس میں مرتب یہ کہتا ہے کہ

---

[1] ایضاً ورق ۱

[2] ایضاً ورق ۳۰

[3] ایضاً۔ اس سے مخزن الغرائب (ورق ۱۲۴) کے اس بیان کی تغلیط ہوتی ہے کہ خلیل اپنے والد کے ہمراہ خراسان سے آئے تھے۔

[4] ایڈنبرا نمبر ۱۱۵۔

اس دور میں قدردانی کا فقدان ہے مگر

"بہ یمن اقبال سخن تدبیری و فیض آشکار جوہر شناسی ... ام الفضائل زیب النسار بیگم سلمہا

جگر گوشۂ شاہ عالم پناہ — جہان خرد، اہلِ دل قبلہ گاہ

بہ علم و بہ فضل و بہ جود و کرم — بہ اخلاق نیکو بہ عالم علم

... وتسمیہ این مجموعہ را بہ لفظ زیب المعانی لائق دید"۔[1]

اسی طرح ترقیمہ میں اسے "نسخہ معروف باسم رقعات زیب النسار" کہا گیا ہے۔

چونکہ ان خطوط میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہم کا نام نہیں درج ہے، اس لئے اشخاص کا تعین بہت مشکل ہے۔ البتہ ابتدا کے خطوط سے معلوم ہے کہ یہ بادشاہ وقت کی خدمت میں لکھے گئے ہیں ایک خط کے شروع میں مکتوب نگار نے اپنے آپ کو "مخلصۂ عقیدت آئین" کہا ہے۔[2] چند خطوط والدہ کے نام اور بعض شہزادہ والا تبار کے نام ہیں۔ ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط شاہی خاندان کی کسی خاتون کی طرف سے لکھے گئے ہیں، اور وہ خاتون غالباً زیب النسار ہے، جس کا ذکر دیباچہ میں کیا گیا ہے مگر مؤلف نے صراحتاً یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ شہزادی کے خطوط ہیں۔

ایک اور تصنیف مرزانامہ مخلوط نظم و نثر میں ہے۔ اور شرفا کے آداب پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تصنیف جمادی الثانی ۱۰۷۰/ فروری ۱۶۶۰ ہے اور اس کے مصنف کا نام مرزا محمد خلیل وقائع نگار بنگالہ کہا گیا ہے۔[3] لیکن اگر خلیل کی عمر کے بارے میں شیر خاں کا بیان تسلیم کیا جائے تو اس وقت خلیل صرف چھ سات سال کے بچے تھے، اور یہ ان کی تصنیف نہیں قرار دی جا سکتی۔

اسی طرح ایک تاریخ ہے جس میں اورنگزیب کی وفات سے لے کر عہد فرخ سیر تک کے

---

[1] زیب المعانی، مخطوطہ انجمن ترقی اردو، علی گڈھ، ورق ۱۱-۱۰۔

[2] ایضاً ورق ۲۷۔

[3] ایشیاٹک ۱/ نمبر ۹۲۶۔

حالات مذکور ہیں۔ اس کا مؤلف خواجہ محمد خلیل ہے۔ وہ سید برادران کا حامی اور ان واقعات کا
عینی شاہد تھا، لیکن لفظ خواجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور خلیل تھا[1]

انشای دستور الہی

میر ضیاء اللہ بلگرام کے مشہور عالم تھے تصوف میں وہ سید احمد بن سید محمد
کالپوی کے مرید تھے۔ مرشد کی تعریف میں ان کا یہ مشہور شعر اوپر درج کیا جا
چکا ہے:۔

کالپی مکہ، بلگرام یمن ای تو احمد، منم اویس قرن

انھوں نے ۲۵ رشعبان ۱۱۰۴ھ/ ۲۰ر اپریل ۱۶۹۳ء کو وفات پائی[2]

میر ضیاء اللہ بلگرامی کے مکاتیب ان کی وفات کے بعد دو جلدوں میں مرتب کیے گئے اور
ان کے لڑکوں کی خواہش پر اس دور کے مشہور عالم میر عبد الجلیل بلگرامی نے اس پر دیباچہ لکھا[3] اور
اس کا نام انشای دستور الہی رکھا[4] اس مجموعہ میں میر ضیاء اللہ کے ۱۵۳ خطوط اور رقعات ہیں۔ مکتوب
الیہم کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے احباب، کرم فرما اور متعلقین کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔
زیادہ تر خطوط ان کے عزیزوں، رشتہ داروں کے نام ہیں۔ اور عام باتوں پر مشتمل ہیں۔ بعض خطوط مشہور
امرا مثلاً ہمت خاں اور خیر اندیش خاں وغیرہ کے نام ہیں۔

ریاض الوداد

ریاض الوداد[5] ایزد بخش رسا کے مکاتیب اور منشآت کا مجموعہ ہے۔ رسا آگرہ
کے رہنے والے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب آصف خاں جعفر کے واسطہ سے

---

[1] بوہار نمبر ۷۹ ؛ اسٹوری ۱/ ۶۰۴ ۔ [2] سرو آزاد ص ۲۵۰ ؛ مآثر الکرام ص ۲۴۰

[3] ید بیضا ص ۱۵۶ ، انشای ضیاء اللہ بلگرامی (علی گڈھ) ورق ۲ ، ۲۳ ،

[4] فہرست مخطوطات جواہر میوزیم، اٹاوہ مرتبہ ابرار حسین فاروقی، اٹاوہ، ۱۹۵۹ء، ص ۲۰۵۔ علی گڈھ مخطوطہ
میں اس کا عنوان انشای ضیاء اللہ بلگرامی ہے۔

[5] خوشگو (سفینہ ص ۴۵) نے اس کا عنوان ریاض السواد دیا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق تک پہونچتا ہے۔[1] کہتے ہیں کہ رسا جب شیخ عبدالعزیز عزت کے تلامذہ میں شامل ہوئے تو انھوں نے تسنن اختیار کیا اور اس میں اتنا غلو کیا کہ اپنا تخلص سنی رکھ لیا۔ بعد میں بیدل نے یہ تجویز کی کہ ان کے نکلتے ہوئے قد کی مناسبت سے رسا تخلص زیادہ موزوں ہے۔[2]

رسا اورنگزیب کی طرف سے آگرہ کے دیوان بیوتات اور داروغہ خزانہ تھے۔[3] وہ کچھ دنوں تک قائم مقام گورنر آگرہ بھی رہے۔[4] ایک خط مورخہ ۵ رجب ۱۰۹۶/۲۸ مئی ۱۶۸۵ میں رسا اورنگزیب کو لکھتے ہیں کہ میں تیس سال سے بحیثیت داروغہ شاہی خدمت کر رہا ہوں اور اس عرصہ میں میں نے شاہی خزانہ میں دو کروڑ سے کم روپیہ نہیں جمع کیا ہے۔[5]

رسا کو اپنے وطن اکبرآباد سے بہت محبت تھی۔ ایک بار وہ کچھ دن دہلی میں رہے۔ جب واپس وطن پہونچے تو مرزا کامگار کو ایک خط لکھا اور وطن سے اپنی بے پناہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر لکھا:۔

ومن مذهبی حب الدیار و اهلها　　　وللناس فیما یعشقون مذاهب[6]

پھر بھی انھیں وطن چھوڑ کر جانا ہی پڑتا تھا۔ آفریدیوں کی بغاوت فرو کرنے کے سلسلہ میں جب اورنگزیب ۱۰۸۶/۷۶-۱۶۷۵ میں حسن ابدال گیا تو رسا اس کے ساتھ تھے وہ وہاں کم از کم رجب ۱۰۸۸/ستمبر ۱۶۷۷ تک مقیم رہے کیونکہ انھوں نے حسن ابدال سے ناصر علی سرہندی کو جو خط لکھا ہے، اس پر یہی تاریخ درج ہے[7] اسی طرح وہ دکن بھی گئے۔ وہ غالباً حیدرآباد اور بیجاپور کی

---

۱ ریاض الوداد (علی گڑھ) ورق ۲۲، ۳

۲ ید بیضا ص ۱۰۵؛ سفینۂ خوشگو ص ۴۵، گل رعنا ورق ۱۱۱۔

۳ ید بیضا ص ۱۰۵۔　　۴ گل رعنا ورق ۱۱۱۔

۵ ریاض الوداد ورق ۲　　۶ ایضاً ورق ۲۲

۷ ایضاً ورق ۲۸، ۲۹۔

کی مہموں میں موجود تھے[۱] ان کے مکاتیب میں فتح بیجاپور کی ایک تاریخ ہے[۲]

اورنگزیب کی وفات کے بعد رسا کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا جب شہزادہ محمد عظیم نے آگرہ پر قبضہ کیا تو اسے بتایا گیا کہ رسا محمد اعظم کے حامیوں میں ہیں۔ حالانکہ رسا نے شہزادہ کی تعریف میں خطوط لکھے تھے[۳] چنانچہ شہزادے نے انھیں اپنے حضور میں طلب کیا اور اتنا ذلیل کیا کہ رسا نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹/۰۸-۱۷۰۷ کا ہے۔ مرزا حاتم نے یہ تاریخ کہی :-

"رسا رفتہ از جہان بجنان"[۴]

رسا نہ صرف ایک باکمال نثر نگار تھے بلکہ ایک عمدہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے دیوان کی ترتیب دی تھی، جس کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے[۵] اور قصائد، غزلیات اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ بیدل ان کی شاعری کے مداح تھے[۶] لیکن رسا کی شہرت زیادہ تر ان کے مکاتیب کے مجموعہ ریاض الوداد کی وجہ سے ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲۱ مکاتیب اور چند منشورات پر مشتمل ہے۔ ان میں بیشتر خطوط پر تاریخ درج ہے، اور بعض میں جگہ کا نام بھی لکھا ہے۔ بانکی پور والے نسخہ میں ۱۱۰۶-۱۰۸۴/۹۴-۱۶۷۴ کی تاریخیں ملتی ہیں[۷] لیکن برٹش میوزیم کے نسخہ میں ۱۱۰۳/۹۲-۱۶۹۱ تک کی تاریخ ہے[۸] ان مکاتیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسا کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کے مکتوب الیہم میں اورنگزیب اور شہزادہ عظیم کے نام بھی نظر آتے ہیں اور اس عہد کے مشہور امرا نامدار خاں، بختاور خاں، لشکر خاں وغیرہ کے بھی۔ ہمعصر علما اور ادیبوں میں شیخ

---

۱ ایضاً ورق ۳۵

۲ ایضاً ورق ۵۵

۳ ایضاً ورق ۳

۴ سفینۂ خوشگو ص ۴۵

۵ دیوان رسا، ایتھے نمبر ۱۶۵۹۔

۶ کلیات بیدل، نولکشور، ص ۹۰۔

۷ بانکی پور ۹/۱۰۱

۸ ریو ۳/۹۸۶۔

عبدالعزیز عزت، ناصر علی سرہندی، مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا خلیل کے نام خطوط ہیں۔

مکاتیب رسا کا عام انداز مرصع اور پر تکلف ہے۔ ان میں عربی اور فارسی کی کثرت ہے یہاں مثال کے طور پر ایک خط کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

"این دوستی نامہ ایست از مشتاق ترین دوستان ایزد بخش رسا کہ ہمیشہ آرزومند دیدار و پیوستہ طالب اخبار صحت آثار ذات ستودہ صفات مجموعۂ نکوئی، و قابۂ خوشخوئی، انسان کامل، عزیزی مشفقی، شیخ محمد فاضل سلمہ اللہ مشحون بہ جواہر دعا موزون بہ نکات خلت وولا کہ فردا یگان بی بضاعت جنسی بہ از آن ندارند کہ بہ ارمغان بزرگان فرستند و تحفۂ نیکوتر از آن نیابند کہ بہ ہدیہ عزیزان ارسال دارند۔"[1]

مکاتیب کے علاوہ ریاض الوداد میں مندرجہ ذیل منثورات بھی شامل ہیں:-

۱۔ رسالہ خیر الکلام در ضبط عقائد اہل اسلام: یہ علم کلام پر ایک رسالہ ہے اور اورنگزیب کے نام معنون ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۹۰/۸۰-۱۶۷۹ ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے:-

زہجرت ہزار و نود بود سال | کہ کردیم تحریر این نامہ را
خرد کرد نامش چو خیر الکلام | خدایا بدہ نفع ہر عامہ را[2]

رسا یہ رسالہ اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے بہت مضطرب تھے۔ اور مختلف امرا کو اس سلسلہ میں خط لکھتے رہتے تھے۔[3]

۲۔ حق الیقین۔ رسا نے شیخ عبدالعزیز عزت کے انتقال کے بعد ان کا رسالہ کشف غطا مرتب کیا اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کر اس کا نام حق الیقین رکھا۔[4]

---

[1] ریاض الوداد ورق ۲۸۔
[2] ایضاً ورق ۱۴۱۔
[3] ایضاً ورق ۱۳، ۱۷۔
[4] ایضاً ورق ۱۴۱۔

۳. دیباچۂ رسالہ رمی الرمی : جیسا کہ نام سے ظاہر یہ تیر اندازی پر ایک رسالہ کا دیباچہ ہے۔ رسانے لشکر خاں کے توسط سے یہ رسالہ شہزادہ شاہ عالم کے حضور میں پیش کیا تھا[1]

۴. ترجمہ فارسی المنقذ من الضلال فی بدایۃ الاحوال للغزالی[2]

۵. کتیبۂ مسجد۔

۶. کتیبۂ مدرسہ زاویۂ عزیزیہ۔ "مقام فضلا" (۱۰۹۲ھ) سے تاریخ نکالی ہے[3]

۷. در بیان قلم (تصنیف ۲۸ رجب ۱۰۹۱/۱۴ اگست ۱۶۸۰)[4]

۸. مناظرہ سیف و قلم (تصنیف ۱۰۹۲/۱۶۸۱)

۹. تعریف باغ بادشاہ بیگم در شاہجہان آباد۔

۱۰. تعریف خوان حضرت شیخ عبدالعزیز۔

۱۱. تعریف خان دوستان نوازش خان

۱۲. خیالی پلاؤ۔

۱۳. مناجات بہ درگاہ حق جل و علیٰ

۱۴. تاریخ فتح قلعۂ بیجاپور۔

مفید الانشا مفید الانشا ان مکاتیب پر مشتمل ہے جو میگھراج[5] نے بہار کے گورنر علی قلی خان اور کامگار خاں کی طرف سے شاہی دربار اور دوسرے امرا کو لکھے تھے۔ یہ خطوط میگھراج کے لڑکے چنپت رائے آشنا نے رنگپور میں ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰ میں مرتب کئے۔ ترتیب

---

[1] ایضاً ورق ۴۳، ۱۴ [2] ایضاً ورق ۴۳

[3] ایضاً ورق ۴۴۔ کلیات بیدل (کابل)، ۲/ ۷۰ میں بھی یہی تاریخ ہے۔

[4] ایضاً ورق ۴۶ و مابعد۔ [5] بوڈلین فہرست (نمبر ۱۳۹۹) میں لیکھراج ہے مگر بانکی پور نمبر ۲۵۱۲ میں صاف میگھراج لکھا ہے۔ (مفید الانشا، بانکی پور ورق ۲)

کے بعد چنیت رائے نے یہ نسخہ ملا سعید اشرف مازندرانی کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کیا۔ اشرف کے تعلقات میگھراج سے بہت اچھے تھے۔ ملا اشرف نے شروع سے آخر تک اس مجموعہ کو دیکھا اور جہاں مناسب سمجھا، اصلاح کی۔ چنیت رائے کے الفاظ یہ ہیں :۔

"از آنجا این کوچه گرد عالم بی استعدادی مسمی به چنیت رای آشنا که همیشه جویای فقرات رنگین و استعارات مغلقه متین بوده، از نارسایی طبع ره به جایی نمی برد و دشت نورد بطالت می شد . . . لهذا اکثر اوقات به مطالعۂ منشآت هانی وشسته مطالب ومقدمات روزگار مثل انشای خانه زاد خان و دیگر منشیان فصاحت شعار صرف می نمود. درین ایام . . . به مطالعۂ منشآت متفرقه قبله گاهی ابوی میگهراج که از طرف امرای رفیع الشان مثل کامگار خان و علی قلی خان به درگاه خواقین پناه و شهزاده ها و امرا و منصب داران تحریر یافته، مستفید گشته ؛ چون غیر از مطالب مالی و ملکی خالی از شعر و شاعری به نظر نیامد در تدوین آن پرداخت وبعد از ترتیب آن از نظر کیمیا اثر مولنا اخوند محمد سعید اشرف المازندرانی گذرانید و به شرف استحسان اختصاص یافت و از راه مهربانی که جناب مولنا نسبت به حال ابوی مصروف دارند، تمام نسخه را از فاتحه تا خاتمه به نظر اصلاح در آوردند فرمودند که در اصل کار منشی گری همین است . . . پس هر که به نوشتن ساده دیرکار که برای منشی گری روزگار به کار آید، خواهشی داشته باشد، می باید که این منشآت را که موسوم به مفید الانشا است، به مطالعه در آید

در خطۂ رنگپور معمور	کانست نشاط بخش جانها
تدوین مسودات کردم	آنگه به بیاض بردم آن را
تاریخ تمامیش خرد گفت	گردید زہی متین انشا[۱]
	۱۱۱۲ ھ

---

[۱] مفید الانشا ورق ۳-۲ .

ان مکاتیب میں بہار کی انتظامی، مالی، اقتصادی اور سیاسی حالت پر مفید معلومات موجود ہیں۔ عہد اورنگزیب کے آغاز میں بہار بڑی افراتفری کا مرکز تھا۔ قلعۂ بہار (غالباً پٹنہ کا قلعہ) باغیوں کے قبضہ میں تھا۔ انھوں نے خود اپنا سکہ چلانا شروع کر دیا تھا۔ علی قلی خاں نے بڑی مشکل سے عالمگیری سکہ رائج کیا۔ اسی زمانہ میں کہیں سے آنحضور صلعم کا نقش قدم ہاتھ آگیا جو دربار روانہ کیا گیا جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے:۔

"قبل ازین مقدمۂ شکستن سکہ مروجہ زمینداران این سرکار و ترویج سکۂ مروجہ عالمگیری و تدبیر گرفتن قلعۂ بہار . . . . وارسال نقش قدم حضرت رسالت پناہی داستند عالی پنجاہ و پنج لک دام بہ موجب سند درگاہی، کہ مشروحاً بہ خدمت شریف نوشتہ شد۔"[1]

ایک خط "بہ جہت مرزا خلیل سوانح نگار سرکار بہار نوشتہ شد"[2] کا عنوان ہے۔ دوسرا خط زیب النساء کی تاریخ وفات کا قطعہ ہے جو ملا سعید اشرف کی فرمائش پر لکھا گیا اور جو زیب النساء کے ذیل میں درج کیا گیا۔ غالباً یہ اولین ثبوت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء مخفی تخلص کرتی تھی۔

مفید الانشا انشا اور تاریخ دونوں لحاظ سے دلچسپ اور مفید ہے۔

خلاصۃ المکاتیب

خلاصۃ المکاتیب مختلف قسم کے مکاتیب کا مجموعہ ہے اور فن انشا میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس مجموعہ کے مصنف نے صراحتاً اپنا نام نہیں بتایا ہے مگر کتاب میں متعدد ایسے شواہد ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مصنف سجان رائے بھنڈاری ہے جس کی مشہور تاریخ خلاصۃ التواریخ کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خلاصۃ التواریخ میں بھی اس نے اپنا نام نہیں بتایا ہے بلکہ یہ کہتا ہے

"از عنفوان ظہور شعور بہ ملازمت ناظمان امور مملکت و مال و صاحبان کارگاہ دولت و

---

[1] ایضاً ورق ۱۳

[2] ایضاً ورق ۴۳

اقبال پیشہ خطوط نویسی کہ عبارت از منشی گری باشد، بسر بردہ : [1]

خلاصۃ المکاتیب میں مصنف کہتا ہے کہ میری زندگی صاحبان دولت و اقبال و ناظمان ملک و مال[2] کی ملازمت میں بسر ہوئی۔ اس کے علاوہ دونوں کتابوں میں بہت سارے مشترک محاورے اور ترکیبیں ملتی ہیں جن سے بجا طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلاصۃ المکاتیب اور خلاصۃ التواریخ دونوں کا مصنف ایک ہے۔

مصنف کہتا ہے کہ اس کا لڑکا رائے سنگھ عرصہ سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ اس کے لئے انشا کی ایک کتاب مرتب کی جائے مگر مصنف کو موقعہ نہیں ملتا تھا۔ آخر کار اس کے دوست امان اللہ ساکن سوہدرہ (پنجاب) نے بھی اس سے ایسی تصنیف کے لئے فرمائش کی۔ اس دوران مصنف ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسے فرصت ملی اور اس نے ۱۱۱۰/۹۹-۱۶۹۸ میں یہ کتاب ترتیب دی[3]

خلاصۃ المکاتیب کافی دلچسپ اور پر از معلومات ہے۔ اس میں چھوٹی موٹی چیزوں کے بارے میں قابل قدر اطلاعات ہیں۔ مثلاً مصنف یہ بتاتا ہے کہ پنجاب، دیپالپور اور ٹھٹھ اچھے قلم کے لئے مشہور ہیں مگر عمدہ ترین قلم بصرہ سے درآمد کئے جاتے ہیں[4] سیالکوٹ کاغذ کے لئے معروف ہے اور دنیا بھر میں یہاں سے کاغذ سپلائی کیا جاتا ہے[5] اس کے بعد سبحان رائے منشی کے لئے ایک جامع نصاب پیش کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ ایک منشی کی تعلیم سعدی کی تصانیف سے شروع ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد انشائے یوسفی اور انشائے ابوالفضل کا مطالعہ ضروری ہے۔ بعد ازاں

---

[1] سبحان رائے : خلاصۃ التواریخ، مرتبہ ظفر احسن، دہلی، ۱۹۱۸ء، ص ۶

[2] خلاصۃ المکاتیب، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، نمبر ۳۲۶۱، ورق ۳

[3] ایضاً ورق ۴۔

[4] ایضاً ورق ۱۱۔

[5] ایضا ورق ۱۲۔

قدیم شعرا مثلاً نظامی، خسرو، صائب وغیرہ کا کلام پڑھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ حساب اور خوشخطی پر خاص توجہ دینی چاہیئے۔ حساب کے لئے فیضی کی لیلاوتی عمدہ کتاب ہے [۱]

مکاتیب کے علاوہ خلاصۃ المکاتیب میں ہندوستانی موسم، ہندو تہوار، منشیات اور آداب منشی گری پر بھی دلچسپ انشائیے ہیں۔

سجان رائے کی طرف ایک اور کتاب خلاصۃ الانشا بھی منسوب کی جاتی ہے جو ہندوستانی اور ایرانی انشا پردازوں کی نگارشات کا انتخاب ہے۔ خلاصۃ الانشا کا مصنف بھی اپنا نام نہیں بتاتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ اس کے دادا امیر آنند، رائے بھاڑامل اور امیر خاں کی ملازمت میں تھے۔ اس کتاب کی تالیف عہد اورنگزیب کے ۳۶ ویں سال (۹۴-۱۶۹۳ء) میں ہوئی [۲]

منشیوں کے استفادہ کے لئے سجان رائے نے فن سیاق میں بھی ایک دلچسپ کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کا نام خلاصۃ السیاق ہے۔ مصنف نے حسب دستور یہاں بھی اپنا نام نہیں بتایا ہے مگر لفظ خلاصہ کا وجود اور اس کا بیان کہ میری زندگی "بہ ملازمت ناظمان ملک و مال و در صحبت نویسندگان فرخندہ خصال بسر بردہ [۳]" یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا مصنف بھی خلاصۃ التواریخ اور خلاصۃ المکاتیب کی تصنیف کرنے والا ہے۔

خلاصۃ السیاق کی تصنیف صفر ۱۱۱۵/جون ۱۷۰۳ میں ہوئی [۴] اس کتاب کا دیباچہ

۱۔ ایضاً ورق ۱۷-۱۴۔

۲۔ ریو ۳/۱۰۱۷؛ اسٹوری ۱/۵۴۵۔ نیشنل میوزیم میں خلاصۃ المکاتیب کا ایک اور مخطوطہ (نمبر ۳۲۵۸) ہے مگر وہ موجودہ خلاصۃ المکاتیب سے کافی مختلف ہے۔ اس کے آخر میں مرتب کہتا ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنی زندگی کی یادداشت کے طور پر مرتب کی ہے۔ ترقیمہ میں مؤلف کا نام سجان سنگھ سیالکوٹی لکھا ہے اور سال کتابت یکم جلوس شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء) ہے۔

۳۔ خلاصۃ السیاق (علی گڈھ، سلیمان)، ورق ۲

۴۔ ایضاً۔ نیز ریو ۲/۷۹۹۔

بہت اہم ہے۔ اس سے ہندوستان میں دفترداری کے نظام پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ ہندوستان میں قدیم سے دفتری کام ہندی (ہندوی) میں ہوتا تھا۔ جب یہاں مسلم حکومت قائم ہوئی تو مسلم وزرا اور امرا نے خط ہندی سے ناآشنا ہونے کے باوجود دفتر کا قدیم نظام باقی رکھا۔ دفتر کا تمام ریکارڈ پوتھی میں لکھا جاتا تھا اور ہندوستانی لوگ دفتر میں ملازم رکھے جاتے تھے جو محاسبات دیوانی، معاملات سلطانی، ضبط مزروعات اور نقد حاصلات کا ریکارڈ ہندی میں رکھتے تھے۔ ایران سے سیاق کے ماہر ہندوستان آچکے تھے مگر:۔

"ہر چند نویسندہ ہای فارسی نویس از ولایت ایران و توران آمدہ در سرکار سلاطین و خواقین نوکری می شدند، و بہ کار و خدمت قیام می ورزیدند، دفتر فارسی رواج نمی یافت۔"[۱]

اس طرح مسلم حکومت کے آغاز سے لے کر اکبر کے عہد تک دفتر یعنی حساب کتاب کا کام ہندی میں ہوتا رہا۔ اکبر کے دور میں فن سیاق کو فارسی میں منتقل کرنے کی باضابطہ کوشش کی گئی۔ فیضی نے لیلاوتی کا ترجمہ کیا۔ اس کے ہمعصر بدل خاں مشہدی، خواجہ شاہ منصور شیرازی، خواجہ عطا بیگ رومی اور خواجہ نظام الدین احمد بخشی وغیرہ نے سیاق میں مہارت حاصل کی۔ آخر کار راجہ ٹوڈرمل نے ۲۷ سن جلوس اکبری مطابق ۹۹۱/۱۵۸۳ میں 'دفاتر ہندی را برہم زدہ دفاتر فارسی مقرر کرد'[۲] مصنف اس کے بعد کہتا ہے:۔

"در بدایت حال کہ دفتر فارسی مقرر گشت و نویسندہ ہا اکثر ایرانی بودند لیکن بہ ہمہ دفاتر نمی توانستند رسید، بعضی اہل قلم ہند از صحبت آنہا درین فن واقف شدند .....
اکثری از ہنود این کسب آموختہ ماہر شدند، خصوصاً قوم کایستھ کہ در ہند نویسندۂ قدیم ہمان قوم است، ازین علم زیادہ تلاش کردند۔ تا حال در اکثر بلاد ہندوستان قوم کایستھ درین فن بیشتر شہرت دارند مگر در حدود ولایت پنجاب و ملتان قوم کھتری وغیر ذلک

---

[۱] ایضاً ورق ۳۔ [۲] ایضاً

نویسندہ ہا ہستند. از انجا کہ درایران نویسندہ را خواجہ گویند بہ ہمین سبب ....
نویسندگان ہنود را نیز خواجہ گویند "۔[۱]

اس کے بعد سجان رائے منشیوں کی بے قدری کا رونا روتا ہے اور کہتا ہے کہ اگرچہ اب نویسندوں کی بھرمار ہے " و نویسندہ از ہر کوچہ دخانہ پیدامی گردد" مگر ماہر آدمی کی اب بھی ضرورت ہے۔ میں خود اس فن میں کامل دستگاہ نہیں رکھتا بلکہ میں نے اس فن کے ماہرین کی صحبت سے استفادہ کر کے یہ قوانین مرتب کئے ہیں۔[۲]

کارنامۂ واقعہ کارنامۂ واقعہ شاہی فرامین، مکاتیب اور مرصع منشورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بہت ساری تاریخیں، مرثیے اور دیگر منظومات بھی ہیں۔ کتاب کے مصنف کا نام چیتمل منشی ہے جو غالباً ہندو کے نام سے مشہور تھا۔ مصنف کے خود نوشت نسخہ پر ۲۴ رشعبان ۱۱۱۶/۱۱ر دسمبر ۱۷۰۴ کی تاریخ درج ہے۔ جو ممکن ہے اس کا سال تصنیف ہو۔[۳] سالار جنگ میں اس کی ایک مثنوی گل وبلبل ہے جس کا تاریخی نام نسخۂ شوق (۱۱۲۱/۱۰-۱۷۰۹) ہے۔[۴]

انشای فیض بخش انشائے فیض بخش یا نسخۂ فیض بخش[۵] فن انشا کے طلبہ کے لئے ایک مفید کتاب ہے جس میں مختلف قسم کے خطوط اور رقعات درج ہیں۔ کتاب کا مصنف شیر علی معروف بہ شیر حملہ ہے جو قصور (مغربی پاکستان) کا باشندہ اور حاجی محمد یوسف نقشبندی کا مرید تھا۔ کتاب کی ترتیب اورنگزیب کی حکومت کے آخری سال یعنی ۱۱۱۸/۰۷-۱۷۰۶ میں ہوئی۔[۶]

---

[۱] ایضاً ورق ۴
[۲] ایضاً
[۳] ایتھے نمبر ۲۱۱۰
[۴] سالار جنگ نمبر ۲۷۶۱/۸۲۰
[۵] ایڈنبرا نمبر ۳۳۵
[۶] ایتھے نمبر ۲۱۱۱

ذخیرۂ جواہر ذخیرۂ جواہر بنگال سے متعلق عرائض اور خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط شاہنواز حسینی کے لکھے ہیں جو شہزادہ عظیم گورنر بنگال کے دیوان سید عزت خاں کا منشی تھا۔ شاہنواز نے یہ خطوط اپنے بھائی محمد حیات کی درخواست پر مرتب کیے تھے۔ مصنف کی عبارت یہ ہے :-

"شاہنواز حسینی از سخنوران عصر و دقیقہ سنجان دہر التماس می دارد کہ چون این عاصی درزمان اورنگزیب مدت ممتدی بہ سلک ملازمان سید عزت خان در ایام دیوانی خالصہ والای صوبۂ بنگالہ بہ انضمام شاہزادہ محمد عظیم صوبہ دار صوبہ مذکور شرف انسلاک داشتہ و بہ خدمت خطوط نویسی قیام میداشت۔ سید محمد حیات برادر حقیقی مستدعی گردید کہ قدری از مسودات عرائض و خطوط کہ این عاصی بہ قید قلم می آورد و بہ شرف تحسین مشرف می گشت، فراہم آوردہ، کتابی ترتیب دادہ شود۔" [1]

چنانچہ بھائی کی فرمائش پر مصنف نے بادشاہ، شہزادے اور امرا کی خدمت میں بھیجے گئے خطوط کو ذخیرۂ جواہر کی شکل میں مرتب کیا۔

ذخیرۂ جواہر سے بنگال اور اڑیسہ کی مالی اور سماجی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اور اس حیثیت سے اس کتاب کی افادیت مسلم ہے۔

گلدستۂ سخن گلدستۂ سخن مل رائے شوقی کی منظوم اور منثور نگارشات کا مجموعہ ہے، جو اس کے لڑکے جوت پرکاش نے ۱۳۳۲/۲۰-۱۹ء میں مرتب کیا۔ جوت پرکاش کا بیان ہے کہ میرے والد مل رائے بیکنٹھ باشی نواب حفظ اللہ خاں کی سرکار میں دیوان تھے۔ نواب کے انتقال کے بعد بہت سے لوگوں نے انھیں نوکری کی پیشکش کی مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ پہلے وہ شوقی تخلص کرتے تھے، مگر بعد میں نام اور تخلص دونوں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ شوقی کی وفات

---

[1] ذخیرۂ جواہر، بوہار نمبر ۲۷۳، ورق ۱۔

۱۱۱۹/ ۰۸-۱۷۰۷ میں ہوئی۔ جیسا کہ اس تاریخی قطعہ سے معلوم ہوتا ہے:۔

سالک فیض چون ز دار فنا   سوی ملک بقا کمر بستہ

از درودش بہ منزل مقصود   گفت ہاتف "بخلد پیوستہ"[1]
۱۱۱۹ ہجری

مرتب نے گلدستۂ سخن کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ نظم کا ہے اور دوسرا نثر کا۔ اول الذکر حصہ میں قصائد، قطعات، غزلیات اور رباعیات ہیں۔ دوسرے میں عرائض و خطوط ہیں اور تین ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ عرائض بہ خوانین

۲۔ مکاتبات بہ ارباب دول

۳۔ رقعات بہ عزیزان۔

اس کے بعد ایک ضمیمہ ہے سفر کشمیر سے متعلق جس میں کشمیر کے دشوار گذار راستہ کا ذکر ہے۔[2]

گلدستۂ سخن کا حصہ نظم شعری اعتبار سے کوئی خاص نہیں ہے۔ شوقی کی غزلیں عام اور روایتی انداز کی ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

بر تو جانان! جان فدا خواہیم کرد   با تو دل را آشنا خواہیم کرد

عندلیب بی سر و سامان بیا!   با تو امشب نالہ ہا خواہیم کرد

ناوک آن ترک شہر آشوب را   در درون سینہ جا خواہیم کرد

شوقی از ناکامی ہجران منال   کام وصلت را روا خواہیم کرد[3]

شوقی کی رباعیوں میں البتہ ایک خاص انداز ہے۔ ہر رباعی کسی عہدہ دار مثلاً قانون گو، قاضی، دیوان، کوتوال وغیرہ کو مخاطب کرکے کہی گئی ہے، ان کا انداز عموماً عبرت انگیز اور ناصحانہ ہے۔

---

[1] گلدستۂ سخن مرتبہ جوت پرکاش، بانکی پور، نمبر ۸۵۹، ورق ۵-۳۔

[2] ایضاً ورق ۴   [3] ایضاً ورق ۷۹۔

قانونگویا! بہ پاس قانون قدیم عمرت بہ موازنہ گذشت د تقسیم

کارت شدہ در شمار چاہان جاری از چاہ اجل نداری اندیشہ و بیم

دیوان! بہ جراند جہان فانی بی ثبت دوام عمر تا کی مانی؟

سررشتۂ عمر فرو فردی شد و رفت فارغ نشدی ز رشتۂ دیوانی [1]

شوقی کے قصائد اور قطعات مدحیہ، تہنیتی یا موضوعاتی ہیں۔ شاہجہاں کی مدح میں تین قصیدے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً شوقی عہد شاہجہاں سے سرکاری ملازمت میں تھا ایک اور قصیدہ میں شاہجہاں کی معزولی، اس کے چاروں بیٹوں کی جنگ آرائی اور اورنگزیب کی تخت نشینی کا ذکر ہے [2] اورنگزیب اور شاہجہاں کے علاوہ شوقی نے جن امرا کی مدح یا تہنیت میں قصیدہ یا قطعہ کہا ہے، ان میں حفظ اللہ خاں، ابراہیم خاں، مرزا سیف الدین خاں، امانت خاں، عنایت خاں، لطف اللہ خاں، اسد خاں، مرزا عسکری دیوان، جعفر خاں وزیر اعظم، میر عبدالوہاب دیوان پنجاب، محمد امین بہادر، نواب مکرم خاں گورنر پنجاب اہم ہیں۔

شوقی نے بعض نظمیں بھی کہی ہیں جو موضوعاتی ہیں اور جن سے پنجاب کے سیاسی حالات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اسی ذیل وہ منظوم خطوط بھی آجاتے ہیں جو اس نے مختلف عہدہ داروں یا دوستوں کو کسی خاص مقصد کے لیے لکھے ہیں۔ مثلاً پہلے قصیدہ میں جس کا عنوان فتح الباب ہے شوقی نے انوری کے انداز میں پنجاب کا شہر آشوب لکھا ہے:۔

گر بہ اردوی معلی روی ای باد سحر! نامۂ صوبۂ پنجاب بر خاقان بر

نامہ ای کز رقمش دود دل آید بیرون نامہ ای کز شکنش جوش زند خون جگر [3]

یہ خانجہاں بہادر کا دور تھا، چاروں طرف تباہی پھیلی ہوئی تھی مستقل لڑائیوں نے سارے

---

[1] ایضاً ورق ۱۲۱، ۱۲۲ [2] ایضاً ورق ۵۷

[3] ایضاً ورق ۵

صوبہ کو ویران کر ڈالا تھا:۔

خوشہ ای نیست بہ جز خوشۂ پروین سالم　　مزرعی نیست بہ جز مزرع گردون اخضر

ای شہنشاہ خبرگیری عالم بر تست　　عالمی گشتہ خراب، از طرف ماست خبر[۱]

ایک اور قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خزانہ میں روپیہ کی کمی ہونے سے لوگوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی اور بڑی پریشانی کا عالم تھا۔ شوقی کہتا ہے:۔

زبسکہ بر پر عنقا نوشتہ اند برات　　نماندہ است نشانی ز زر بہ غیر از نام[۲]

ایک قطعہ محمد باقر امین جزیہ کے نام اس مضمون کا ہے کہ عوام دو تین سال سے بیحد پریشان ہیں اس لئے شیخ عبدالرحیم کارداں کو یہ حکم بھیج دیا جائے کہ جزیہ نہ وصولا جائے[۳]۔ ایک اور قطعہ میں یہ دلچسپ حکایت لکھی ہے کہ لاہور کے ایک نوجوان کی خواہش وصل نہیں پوری ہوتی تھی۔ اس کے ایک دوست نے کہا کہ ابلیس کو نذر دو تو خواہش پوری ہو جائے گی مگر اسے ابلیس کہاں ملے، رات کو وہ سویا تو خواب میں ابلیس نے آن کر کہا کہ میری نذر قانونگو کے گھر دے آؤ[۴]۔

بعض خطوط سے پنجاب کی صورت حال واضح ہوتی ہے۔ مثلاً وزیر اعظم کے نام ایک عرضداشت میں لکھتا ہے کہ پنجاب کی کشتی بھنور میں ہے۔ کسی عمدہ حاکم کے بغیر اس کا بچنا ممکن نہیں ہے[۵]۔

گلدستۂ سخن سے بعض دلچسپ باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً وزیر اعظم کو فرہنگ جہانگیری درکار تھی شوقی لکھتا ہے:۔

"دیگر ملتمس آنکہ فرہنگ جہانگیری بعد تلاش بسیاری بہ شرط برداشتن نقل از جایی بہ

۱۔ ایضاً

۲۔ ایضاً ورق ۶۹

۳۔ ایضاً ورق ۸۳

۴۔ ایضاً ورق ۱۰۴

۵۔ ایضاً ورق ۱۲۷۔

دست آمد، لیکن از ہراس کاتبان غلط نویس کہ نورسان گلزار سخن وتازہ رویان لالہ زار معانی

را لگد کوب خامہ ٔ چوبی قدم می سازند، وہم ازینکہ اقلاً در عرض یکسال صورت تتمیم می پذیرفت،

از نقل آن تاملی می نمودند۔ درین ولا نسخہ معتبر در کمال صحت وجمال تذہیب از عزیزی

بمسر آمد۔ داعیہ آن داشت کہ عجالتہً ۔۔ بہ خدمت عالی مرسول دارد۔ اما از ملاحظہ ہوای

برسات بدون اذن در ارسال آن جسارت ننمود" [1]

اسی طرح پنجاب میں عمدہ الچہ (ایک قسم کا ریشمی کپڑا) تیار ہوتا تھا۔ شوقی کپڑا تیار کر اکے دربار

میں یا امرا کی خدمت میں بھیجتا تھا۔ ایک خط میں لکھتا ہے :۔

"در تہیہ دو طرح الچہ بہ موجبی کہ امر عالی بشدہ بود، سوت باریک از بجوارہ طلبیدہ،

تمام تار و پود از سوت وخطوط الوان جہت بقای رنگ از ابریشم مرتب ساختہ، بہ شستن

دادہ، انشاء اللہ عنقریب مرسول می دارد" [2]

ایک اور خط میں الچہ کا دام لکھتا ہے :۔

"دو تھان الچہ بہ قیمت نود و دو روپیہ مطابق تفصیل فرد علیحدہ ۔۔ مرسول داشتہ" [3]

غالباً شوقی مشرف کارخانجات تھا[4] جس کی وجہ سے اس کی یہ ذمہ داریاں تھیں۔ ایک

قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس عہدہ سے استعفی دیدیا تھا، اور عنایت خاں دیوان خالصہ

سے کسی اور ملازمت کا خواہش مند تھا[5] شوقی کی ملازمت کے سلسلے میں ایک اور بحران آیا تھا۔ جس کا

ذکر بار بار اس کے خطوط اور قطعات میں ملتا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ شوقی کو نظام الدین خاں کوتوال نے

معزول کر دیا۔ یہ معزولی غالباً ۴ر محرم سن ۱۷ جلوس (۱۰ر اپریل ۱۶۷۴ء) کو وقوع میں آئی[6]۔ نواب

---

[1] ایضاً ورق ۱۲۶

[2] ایضاً ورق ۱۵۲

[3] ایضاً ورق ۱۶۱

[4] ایضاً ورق ۶۹

[5] ایضاً ورق ۷۰

[6] ایضاً ورق ۱۶۳

قیام الدین خان ناظم پنجاب کے نام شوقی کے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ کوتوال کو روز سلام کرنے نہیں جاتا تھا:۔

پس از ملاحظہ غیر از سلام ہر روزہ　　　　به حال خویش گناہی نیافتم ای شاہ[1]

لیکن امانت خاں کے نام دوسرے عریضہ سے ہوتا ہے کہ مفسدوں نے کوتوال کے کان بھرے تھے کہ:۔

"فلانی ہندو است و مسلمین باو سلام می کنند"

چنانچہ شوقی کو ہٹا کر دیندار نامی نومسلم کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا۔ اس واقعہ کا شوقی کے متعلقین پر بہت اثر ہوا۔ عنایت خاں اور قاضی اکبر نے سفارشی خطوط لکھے لیکن

'بہ مقتضای وقت مصلحت ندید کہ بہ تجدید محرک این امر شود۔ از برای آنکہ

درین وقت ہندو را با مسلمانی افتادن کمال بیخردی است'[2]

اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوقی کو اس بے سبب معزولی کا بہت دکھ تھا۔ آخر کار وہ نظام الدین کی حرکتوں سے تنگ آ کر اپنے دوست محمد اسحاق کے پاس جالندھر چلا گیا[3]

جوت پرکاش مرتب گلدستہ سخن کے علاوہ شوقی کا ایک اور لڑکا دلیپ رای تھا جو مرزا محمد سعید دیوان کا منشی تھا۔ لیکن دلیپ رای کے مرثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی حیات ہی میں اس کا قابل لڑکا گذر گیا[4]

بوڈلین لائبریری میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ ہے جس میں لالہ مل رائے کے ابیات مکتوبیہ درج ہیں[5] ممکن ہے وہ یہی مل رائے شوقی ہو۔

---

[1] ایضاً ورق ۷۲۔
[2] ایضاً ورق ۱۵۴
[3] ایضاً ورق ۱۵۷
[4] ایضاً ورق ۵۵
[5] بوڈلین نمبر ۱۲۱۴۔

انفاس رحیمیہ انفاس رحیمیہ شاہ عبدالرحیم دہلوی کے مکتوبات اور ملفوظات کا مجموعہ ہے جو اُن کے لڑکے شاہ اہل اللہ نے مرتب کیا[1]۔ شاہ عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے والد ہیں۔ وہ اپنے وقت کے مشہور عالم اور صوفی تھے، ہندوستان میں حدیث کی باقاعدہ درس وتدریس کا سلسلہ آپ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی ولادت دہلی میں ۱۰۵۴/ ۴۵-۱۶۴۴ء میں ہوئی اور یہیں آپ کا انتقال چہارشنبہ، ۱۲ر صفر ۱۱۳۱/ جنوری ۱۷۱۹ء کو ہوا[2]۔ ان کے والد کا نام وجیہہ الدین تھا اور وہ اورنگزیب کی فوج میں ملازم تھے[3]۔ شاہ عبدالرحیم نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی ابوالرضا سے حاصل کی۔ اس کے بعد اورنگزیب کے استاد میر زاہد ہروی (م۔ ۱۱۱۱/ ۱۷۰۰-۱۶۹۹) اور خواجہ خرد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا[4]۔ تصوف کا ذوق والد سے ملا تھا۔ چنانچہ پہلے سید عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی وفات کے بعد خواجہ ابوالقاسم (م۔ ۱۰۸۴/ ۷۴-۱۶۷۳) کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے[5]۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد شاہ عبدالرحیم نے قرآن وحدیث کی تدریس کا کام شروع کیا[6]۔ تعلیم سے انھیں خاص شغف تھا۔ وہ بڑی ژرف نگاہی سے کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے طلبہ کو قوم کی اخلاقی اور روحانی قیادت کے لئے تیار کرتے تھے۔ جب طالب علم شریعت اور طریقت کی تعلیم مکمل کرکے شاہ صاحب سے اجازت لیتا تو آپ اسے یہ سند عطا کرتے:۔

"فمن صحبہ فکانہ صحبنی ویدہ کیدی۔ فمن بایعہ فکانہ بایعنی" [7]

---

[1] انفاس رحیمیہ، مطبع احمدی، دہلی، ص ۲

[2] شاہ ولی اللہ: انفاس العارفین، دہلی، ۱۳۱۵ھ، ص ۸۵

[3] معارف، نومبر ۱۹۴۷ء۔

[4] انفاس العارفین، ص ۱۵۔

[5] ایضاً ص ۱۴، ۲۰۔

[6] معارف نومبر ۱۹۴۷ء

[7] انفاس رحیمیہ ص ۲۴۔

شاہ عبدالرحیم کچھ دنوں کے بعد اپنے ہم سبق ملا حامد کی کوشش سے فتاوی عالمگیری کے مرتبین میں شامل کر لئے گئے۔ مگر اورنگزیب ان سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور وہ اس کام سے سبکدوش کر دیئے گئے۔[۱] چنانچہ انھوں نے پھر ارشاد و ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ ان کے مریدوں اور شاگردوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی ان کے ایما پر شاہ صاحب اکبرآباد، سونی پت اور رہتک وغیرہ تشریف لے گئے۔[۲] دینیات اور معرفت میں جب ان کا شہرہ چاروں طرف پھیلا تو اورنگزیب نے آپ کو دربار میں مدعو کیا مگر اب کی بار آپ نے یہ ٹکا سا جواب لکھ بھیجا:-

"بئس الفقیر علی باب الامیر۔ حق تعالی میفرماید کہ ما متاع الدنیا الاقلیل، و از آن اقل قلیل بہ شما رسیدہ۔ پس بالفرض از آن چیزی بہ من خواہید داد، جزو لایتجزا اش خواہد بود۔ پس برای جزو لایتجزی چہ مناسب کہ نام خود را از دیوان حق تعالی برکشم کہ در کتب مشائخ مکتوب است کہ اگر نام کسی در دیوان باشد، از دیوان الہی برمی آرندش۔"[۳]

ایک بار شہزادہ عظیم نے آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے جواب دیا:-

"ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و نیاتکم۔ بہ امثال این امور فریفتہ نمی شوم۔"[۴]

شاہ عبدالرحیم بنیادی طور پر صوفی اور عالم دین تھے لیکن شعر و ادب سے وہ بے تعلق نہیں تھے۔ انھوں نے فارسی اور ہندی میں اپنی شاعری کے کچھ نمونے چھوڑے ہیں۔ مثلاً

گر تو راہ حق بخواہی ای پسر! — خاطر کس را مرنجان الحذر!
در طریقت رکن اعظم رحمت است — این چنین فرمودہ آن خیر البشر

۱؎ انفاس العارفین ص ۲۴ ۲؎ ایضاً ص ۱۴، ۲۹، ۴۷

۳؎ ایضاً ص ۲۴؛ انفاس العارفین ص ۶۸۔

۴؎ انفاس العارفین ص ۶۸۔

ایکہ نعمتہای تو از حد فزون   شکر نعمتہای تو از حد برون

عجز از شکر تو باشد شکر ما   گر بود فضل تو مارا رہنمون[1]

یہ ہندی شعر بھی ان کی طرف منسوب ہے :-

رحیم پیاسوں یوں ملی، جوں بوند سمندر ماتھ   جب جیو نہ تھا تب پیو تھا، اب جیو ہے پیو ناتھ[2]

وہ ہندی شاعری کے دلدادہ تھے اور اپنے خطوط میں ہندی شعر درج کیا کرتے تھے[3]

انفاس رحیمیہ کے علاوہ شاہ عبدالرحیم نے شیخ تاج سنبھلی کے عربی رسالہ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے اپنے استاد میر زاہد کی معیت میں کئی عربی کتابوں پر حواشی لکھے[4]۔ اس کے علاوہ تصوف پر انھوں نے ارشاد رحیمیہ لکھی جس کا بیان آگے آئے گا۔ انفاس میں دیباچہ اور خاتمہ کے علاوہ شاہ عبدالرحیم کے بیس خطوط ہیں۔ دیباچہ تصوف اور اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ اور خاتمہ شاہ صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو شیخ محمد عبدالحق نے جمع کئے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم کے خطوط صاف شستہ اور رواں دواں اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا انداز بیان بیحد جاذب اور دلکش ہے۔ چونکہ ان میں سے بیشتر خطوط مریدوں کو لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں تصوف اور معرفت کے رموز انتہائی آسان اور عام فہم انداز میں بیان کئے گئے ہیں شیخ احمد سرہندی اور شیخ محمد معصوم نے خطوط کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ مگر ان دونوں کا انداز تہہ در تہہ اور پیچیدہ ہے۔ لیکن اس کے برخلاف شاہ عبدالرحیم کا انداز بالکل خواجہ عبداللہ انصاری کا سا ہے، سادہ، دلکش اور مؤثر۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"فکر در کاری کن کہ بجز حق کسی را بندہ نشوی دکاری کن کہ فردا شرمندہ نشوی، دنیا سہل است، غافل بودن از حق مطلق جہل۔ امروز کہ در دست چوگان است اگوی در میدان

---

[1] ایضاً ص ۸۲   [2] ایضاً ص ۸۱

[3] انفاس رحیمیہ ص ۲۰، ۳۰   [4] معارف، دسمبر ۱۹۴۷ء

است تیز بیای که وقت مجرای رحمٰن است والّا فردانه گوی در میدان یابی و نه در دست چوگان. دنیا فانی است، با حق مشغول بودن سعادت دو جہانی"۔[1]

صوفیہ کے اقوال، فلاسفہ کے دلائل اور قرآن و حدیث کے ہتھیاروں سے ان خطوط کی تاثیر اور تحریک دوچند ہو گئی ہے۔ ان کے مختصر جملے، سادہ استعارے اور پر معنی کنایے انھیں "قل و دل" کا بہترین نمونہ بناتے ہیں۔ مثلاً یہ خط دیکھیے جس میں تصوف کی اساسیات کا بیان ہے۔

"الوقت سیف قاطع. پس لاچار سعی تمام در حصول آگاہی دوام باید کرد که سعادت در عبادت است و شقاوت در فراغت. التصوف کله جد، لا یختلط فیہ ہزل. ہر چہ از حق باز دارد، از خود باز دارد. ما شغلک عن الحق فہو صنمک و دنیاک"۔[2]

ہندوستان میں تصوف کے نام پر جو بے راہ روی اختیار کی گئی، اس کے خلاف پہلا نعرہ شیخ احمد سرہندی نے بلند کیا اور شریعت اور طریقت میں ایک متوازن ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شاہ عبدالرحیم مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ عبدالاحد میاں گل کے دوست تھے، اس طرح وہ بھی اس خانوادہ اور سلسلہ سے متاثر تھے۔ اگرچہ وہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے اور "اللہ اللہ و لیس فی وجودی سوی اللہ" کہتے تھے۔ مگر ان کے تصوف میں کہیں سے کوئی جھول نہیں تھی۔ شاہ عبدالرحیم کے نزدیک تصوف دل و دماغ اور روح کی ایک صحت مند تربیت کا نام ہے۔ اس کے لیے "دل کا گداز اور روح کا اضطراب ضروری ہے۔ ریاضت اور نظم کے ساتھ ساتھ جب تک دل سے محبت کے سوتے نہ پھوٹیں، عشق حقیقی کا آب حیات میسر نہیں ہوتا۔ فرماتے ہیں:۔

"ای برادر کار عاشق سوز دوام و ساز تمام است و شیوۂ معشوق کرشمہ و ناز است و طریقۂ عاشق ہمہ عجز و نیاز"۔[4]

---

[1] انفاس رحیمیہ ص ۲۰
[2] ایضاً ص ۱۶
[3] ایضاً
[4] ایضاً ص ۱۶

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا اس دور کے خطوط الگ الگ دو خانوں میں تقسیم ہیں. ایک طرف اورنگزیب اور شاہ عبدالرحیم کے مکاتیب ہیں جو اپنی جامعیت، ایجاز اور پرمغزی کی بنا پر سہل ممتنع کہے جا سکتے ہیں. اور دوسری طرف بیدل وغیرہ کا انداز ہے، پیچیدہ، مغلق، مرصع اور تہہ در تہہ. موخرالذکر انداز ہی عام تھا. مگر آج اس کی وقعت صرف تاریخی ہے. لیکن شاہ صاحب کے خطوط آج بھی ضرب الامثال کی طرح نوک زبان ہیں :-

فیض حق ناگاہ رسد فاما بر دل آگاہ رسد،

"ہرچہ کنند بہ الفت کنند، نہ بہ کلفت" [1]

رقعات بیدل عہد اورنگزیب کے عظیم شاعر بیدل نے مکاتیب کا اچھا خاصا مجموعہ یادگار چھوڑا ہے. مطبوعہ مجموعہ[2] میں ۲۸۴ خطوط اور رقعات ہیں. ان خطوط سے بیدل کے کردار اور ذاتی حالات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے. ان سے بیدل کے عزائم اور ناکامیاں، ان کی نیازمندی اور بے نیازی، ان کا فقر اور دنیا طلبی، امراء سے ان کے تعلقات اور قناعت پسندی ان کا تصوف اور درباداری بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے. ان خطوط کی روشنی میں بیدل کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ان کے سوانح نگاروں کے بنائے ہوئے خاکے سے مختلف بھی ہے اور متضاد بھی. یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بیدل شہزادہ اعظم کی سرکار میں پہونچنے کی کتنی کوشش کرتے ہیں لیکن جب انھیں اپنا مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا تو وہ ایک حسین بہانہ کی آڑ لیکر استعفا دیدیتے ہیں. شہزادہ کے نام ان کا یہ خط قابل غور ہے :-

"دور از قدم سجدہ طرازان حضور بہ درد نارسائی می نالد و فریادرسی ندارد دمدتی است جدا از رکاب سعادت پیمایان موکب اقبال در غبار گمنامی فرورفتہ و از ہیچ جا سر بر

---

[1] ایضاً ص ۲۳، ۱۷

[2] رقعات بیدل، نولکشور، مارچ ۱۸۸۵ء

نمی آرد. نگون بخت سری کہ محروم خاکبوس آن درگاہ است، ہرگز حلاوت گریبان نشناختہ "۔[1]

اعظم اور معظم کی جنگ میں بیدل نے موخرالذکر کی حمایت کی۔ ایک خط میں وہ بیدار بخت اور اعظم پر نامناسب حملہ کرتے ہیں[2]۔ معظم کی تخت نشینی پر انھوں نے عاقل خاں کی معرفت یہ شعر نذر کئے :۔

"بہ عرض این دو بیت فقیر نیز دعاگوی بادشاہ دین پناہ است :۔

جلوس معدلت انوار بادشاہ زمان	بہ این مربع اسرار دادہ اند نشان
شیوون رافت یزدان، جلال قدرت شان	ہمان خلیفۂ رحمٰن، معظم دو جہان[3]،

بیدل بظاہر صوفی اور عزلت نشین تھے۔ لیکن اس عہد کے بیشتر امرا سے ان کے قریبی تعلقات تھے چنانچہ ان پر کسی نے الزام لگایا کہ وہ امرا پرست ہیں۔ بیدل نے ایک خط میں جو تقریباً فحش ہے، اس شخص کو تنبیہ کی ہے کہ وہ ایسی حرکتوں سے باز آئے ورنہ " بیدل عبدالقادر است"[4]۔ جن امرا سے بیدل کی خط و کتابت تھی ان میں شکر اللہ خاں اور ان کے تینوں لڑکے قریب ترین تھے[5]۔ شکراللہ خاں خود بیدل پر بہت مہربان تھے۔ انھوں نے ہی ان کے لئے مکان کا انتظام کیا تھا، بیدل ان کے احسان کے نیچے دبے تھے، اور وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں کسی نظم یا تہنیت کا ہدیہ بھیجتے رہتے تھے۔ خاندانی قربت اس حد تک تھی کہ خان مذکور اپنے خاندانی معاملات میں بھی بیدل سے مشورہ

---

[1] رقعات بیدل، ص ۱۸۔ [2] ایضاً ص ۱۲۶۔

[3] ایضاً ص ۱۱۹ [4] ایضاً ص ۹۰

[5] شکر اللہ خان کے تین لڑکے تھے۔ لطف اللہ، عنایت اللہ اور کرم اللہ۔ اول کو والد کا خطاب یعنی شکراللہ خاں ملا۔ دوسرا اورنگزیب کے خطوط کا مرتب ہے۔ تیسرے کو عاقل خاں خطاب ملا۔ وہ اچھا شاعر تھا اور عاشق تخلص کرتا تھا۔ (سرو آزاد ص ۱۴۹؛ سفینۂ خوشگو ص ۵۷)

کرتے تھے اور ان کی رائے پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں انھوں نے شکر اللہ خاں کی لڑکی کی شادی سے متعلق کچھ رائے دی ہے[1] شکر اللہ خاں کے تینوں لڑکوں سے بھی اسی انداز کا رابطہ تھا۔ بیدل انھیں برابر خط لکھتے رہتے تھے۔ ایک خط میں وہ تینوں سے اپنے مساویانہ تعلق خاطر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :۔

"اگرچہ از تجدیدانیم، پرستش ثالث ثلثہ ایمانی است، وہر چند از وحدتیانیم شہود مراتب اسماء عرفانی"[2]

دیگر امرا میں عاقل خاں رازی، روح اللہ خاں، فضائل خاں، مرزا منعم بیگ، سید برادران اور نظام الملک کے نام نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ کسی شاعر یا ادیب کی امداد کے لئے بھی ان امرا کو خط لکھتے تھے، چنانچہ ایک خط میں وہ میر عاشق ہمت اور دوسرے میں میر احسن ایجاد کی سفارش کرتے ہیں۔[3]

بیدل کے مکتوب الیہم میں مشہور ہمعصر شعرا اور ادیبوں کے نام نہیں نظر آتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ناصر علی اور میر خوش وغیرہ سے ان کی معاصرانہ چشمک تھی۔ شیخ عبدالعزیز عزت، ایزد بخش رسا اور رفیع خاں باذل کے نام البتہ چند خطوط ہیں۔

بیدل کے مکاتیب مرصع نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی مشکل پسند طبیعت خط و کتابت میں بھی تکلفات اور آرائش کے پردے ہٹانا گوارا نہیں کرتی تھی۔ بعض رقعات محض نمونہ کے لئے بھی صنعت میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں کسی واقعہ یا حادثہ پر خط لکھا گیا ہے، وہاں الفاظ پر جذبات غالب ہیں۔ مثلاً تعزیت کے خطوط میں عجیب سوز و گداز اور تاثر ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :۔

"در ہر چہ ماموریم، معذوریم ودر آنچہ می کوشیم، مجبوریم۔ تا نفس باقی است نمی دانیم جہا خواہد کشید وتا دیدہ باز است حیرانیم کہ چہ باید دید؟ تسلیم اضطراری است و

---

[1] رقعات بیدل ص ۲۷ [2] ایضاً ص ۸۰

[3] ایضاً ص ۶۱، ۱۳۱ -

رضا بی اختیاری[1] :

نکات بیدل

مکاتیب کے علاوہ بیدل کی دو اور نثری تصانیف ہیں یعنی نکات بیدل اور چہار عنصر۔ اول الذکر مختصر رسالہ ہے اور ایک طرح سے بیدل کے فکر و فلسفہ کا نچوڑ ہے۔ ہر نکتہ کے بعد تشریح و تمثیل کے طور پر دو غزلیں اور ایک قطعہ درج ہے۔ کہیں کہیں ایک رباعی بھی ہے۔ اس طرح اس رسالہ میں منثور حصہ صرف ایک چوتھائی کے برابر ہے۔

نکات کی تاریخ تصنیف سے متعلق کتاب میں کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ البتہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اس کے ایک مخطوط کا سال کتابت ۱۰۹۱/ ۸۱-۱۶۸۰ ہے[2]۔ جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نکات اس سال یا اس سے قبل تصنیف ہو چکی تھی۔ اس تاریخ کی تعیین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکات میں مندرج غزلیں اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں۔

نکات بیدل اسم با مسمی ہے۔ یعنی ہر نکتہ بنیادی طور پر مختصر مبہم اور پیچیدہ ہے۔ ان میں دقیق فلسفہ اور امور الطبیعات سے لے کر عام پند و نصائح کا ذکر ہے۔ لیکن بیدل کی قوت اختراع ہر جگہ کارفرما ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نثر سے زیادہ نکات کی غزلیں زیادہ رسیلی اور پرآہنگ ہیں اور بیدل نے مخصوص اوزان سے اشعار کا ترنم اور ابھارا ہے۔ مثلاً یہ دو شعر دیکھئے :-

بہ ہر کجا ناز سر برآرد، نیاز ہم پای کم ندارد	تو و خرامی و صد تغافل، من و نگاہی و صد تمنا
تمام شوقیم لیک غافل کہ دل بہ راہ کہ می خرامد؟	جگر بہ داغ کہ می نشیند؟ نفس بہ آہ کہ می خرامد؟[3]

چہار عنصر

بیدل کی دوسری تصنیف چہار عنصر ایک طرح سے ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ کتاب کے آخر میں جو قطعہ تاریخ ہے اس سے بانکی پور کے فہرست نگار نے ۱۱۱۶/ ۱۷۰۵-۱۷۰۴ کا سن استخراج کیا ہے[4]۔ قطعہ یہ ہے :-

---

[1] ایضاً ص ۷۸

[2] آصفیہ ۱/ ۱۳۶

[3] نکات بیدل (مشمولہ کلیات بیدل، نولکشور، دسمبر ۱۸۷۵، ص ۲۰)

[4] بانکی پور ۹/ ۱۰۱ -

دو تاریخ از حساب آورد بیروں | کہ دخل شبہہ خون گشت و خطا رفت
نخست افسونی از اعجاز پرداخت | کہ از افراد ہر عنصر فنا رفت
دوم در اجتماع چار عنصر | نحوست بود خون زنگ از صفا رفت[۱]

لیکن بیدل ایک جگہ کہتے ہیں: ۔

"از آں ہنگام تا حال کہ نفس شماری عمر مقارن سال چہل و یکم است"[۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بیدل اکتالیسویں سال میں تھے۔ یعنی چہار عنصر کی تصنیف ۱۰۹۴/۱۶۸۳ کے لگ بھگ ہوئی۔ ممکن ہے کہ یہ آغاز تصنیف کا سال ہو اور اول الذکر تکمیل کا۔

چہار عنصر، چار عنصر (ابواب) پر منقسم ہے۔ شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ یہ ایک طرح سے بیدل کی خود نوشت سوانح عمری ہے مگر انھوں نے اس میں تاریخی ترتیب یا واقعاتی تسلسل کا بہت خیال نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے حقائق کے بیچ میں مافوق فطری تصوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کی اس طرح پیوند کاری ہے کہ کتاب کی تاریخی اہمیت پس منظر میں جا پڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بیدل اپنی زندگی کے سیدھے سادھے واقعات بیان کرنے کے بجائے اس بات کے کوشاں تھے کہ اپنے آپ کو ایک مافوق فطری انسان بنا کر پیش کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی طرف منسوب کر کے جو واقعات قلم بند کیے ہیں وہ جادو کی دنیا کے قصے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن وہ اس گلی سے گذر رہے تھے جہاں ان کی ملازمہ رہتی تھی۔ اتفاقاً انھیں اس کے گھر سے رونے دھونے کی آواز سنائی دی۔ بیدل اندر گئے تو معلوم ہوا کہ ملازمہ کا انتقال ہو گیا ہے اس خبر سے انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ انھوں نے جنون کے عالم میں مرحومہ کے سینہ پر دو ہتڑ مارا۔ بیدل کا ہاتھ

---

[۱] چہار عنصر (مشمولہ کلیات بیدل، نولکشور، ص ۵۸۸)

[۲] کلیات بیدل، ص ۳۰۱۔

پڑتے ہی 'مرحومہ' کود کر آنگن میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو ۳۵ سال ہو گئے اور آج تک وہ 'مرحومہ' صحیح سلامت بقید حیات ہے[۱]۔

بیدل کے بارے میں جو متضاد بیانات ہیں ان کا تجزیہ کرنے میں چہار عنصر سے بہت مدد ملتی ہے۔ نیز اس سے بیدل کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات فراہم ہوتی ہیں جن کو ان کے تذکرہ نگاروں نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً ان کا خاندان، ان کے ابتدائی حالات، ان کی سیاحی اور صوفیوں سے ملاقات وغیرہ۔ یہ عین ممکن ہے کہ بیدل نے بہت سی باتوں پر پردہ پوشی کی ہو۔

چہار عنصر کا طرز انتہائی مرصع اور پر تکلف ہے۔ فلسفہ اور ماورائیات کی آمیزش نے بعض مقامات کو بالکل گنجلک اور ناقابل فہم بنا دیا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ چہار عنصر میں جو تاریخی اور ذاتی معلومات ہیں وہ بیدل کے بیشتر سوانح نگاروں کی نظر سے مخفی رہے۔ چہار عنصر میں کہیں جگہ جگہ اشعار کی پیوندکاری ہے اور پوری کتاب میں تقریباً اٹھارہ ہزار شعر ہیں[۲]۔ جو سب کے سب بیدل کے ہیں۔

ہندوستان کی فارسی نثر میں چہار عنصر کا اپنا منفرد مقام ہے۔ لوگوں نے یقیناً اس کے تتبع کی کوشش کی ہوگی مگر ایسے پر پیچ جادہ کا طے کرنا کتنوں کے بس کی بات تھی۔ اتفاق سے بیدل ہی کے ایک شاگرد لالہ شیورام داس حیا (م۔ ۱۱۴۴/۳۲-۱۷۳۱) نے چہار عنصر کے طرز پر گلگشت بہار ارم لکھی تھی[۳]۔ مگر اس کا پتہ نہیں چلتا۔

قصہ حسن و دل قصہ حسن و دل فارسی اور دکنی کا مشہور قصہ ہے جسے سب سے پہلے فارسی نثر و نظم میں یحییٰ سیبک فتاحی نیشاپوری نے لکھا تھا۔ فتاحی مرزا شاہرخ کے عہد میں تھا۔ اس کی وفات ۸۵۲/۴۹-۱۴۴۸ء میں ہوئی۔ کم و بیش دو سو سال کے بعد دکن میں اس قصہ کا بہت چلن ہوا۔ سب سے پہلے سب رس کے نام سے ملا وجہی نے ۱۰۴۵/۳۶-۱۶۳۵ء میں اسے دکنی نثر میں لکھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے نام معنون کیا۔ پھر دکنی شعرا

---

[۱] ایضاً ص ۴۰۵
[۲] گل رعنا ورق ۵۶
[۳] سفینۂ خوشگو ص ۱۸۳۔

نے اس قصہ کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر مندرجہ ذیل تصانیف ہوئیں۔

۱. گلشن حسن و دل (مصنفہ ۱۰۸۶/۷۶-۱۶۷۵)۔ شاہ میراں اللہ مجرمی بیجاپوری

۲. وصال العاشقین (۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷) شاہ حسین ذوقی۔

۳. مثنوی سب رس۔ سید محمد ولی اللہ قادری حیدرآبادی (مرقومہ ۱۱۸۰/۶۷-۱۷۶۶)

۴. حسن و دل۔ نامعلوم (غالباً ۱۲ ویں صدی ہجری کے اواخر میں)

۵. حسن و دل۔ خواجہ خیرالدین خواجہ (۱۲۶۴/۱۸۴۸)[۱]

عہد اورنگزیب سے کچھ پہلے محمد داؤد ایلچی نے یہ قصہ فارسی نظم میں لکھا۔ داؤد کے خود نوشت نسخہ پر ۲۶ رشعبان ۱۰۵۴/ ۲۸ اکتوبر ۱۶۴۴ کی تاریخ درج ہے اور غالباً اس کا واحد نسخہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے[۲]۔ اس کے بعد ملا جامی بیخود نے حسن نامدار خانی کے عنوان سے ۱۰۷۵/ ۶۵-۱۶۶۴ میں یہ قصہ منظوم کیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مگر اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

عہد اورنگزیب کے ایک غیر معروف ادیب خواجہ محمد نے جنھیں کتاب کے آخر میں خواجہ محمد بیدل کہا گیا ہے، انتہائی پر تکلف نثر میں حسن و دل کا قصہ لکھا۔ غالباً فتاحی کے بعد یہ دوسری منثور روایت ہے۔ کتاب کی تصنیف ۱۰۹۵/۱۶۸۴ میں ہوئی "داغ دل بند" اس کی تاریخ ہے[۳]۔

انشای جلیل علامہ عبدالجلیل بلگرامی نے انشای جلیل[۴] کے عنوان سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ اس میں میر کے دوسرے سفر دکن ۱۱۱۱/ ۱۷۰۰-۱۶۹۹ کے کچھ حالات رقم ہیں[۵]۔

---

[۱] سب رس مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، کراچی ۱۹۵۲ء (مقدمہ) [۲] فہرست مخطوطات بمبئی یونیورسٹی مرتبہ شیخ عبدالقادر سرفراز، بمبئی، ۱۹۳۵، ص ۱۴۵۔ [۳] ایضے نمبر ۲۱۰۶۔

[۴] یہ عنوان مطبوعہ ایڈیشن (لکھنؤ ۱۲۸۹/۱۸۵۳) میں ہے۔ جو سید امیر حیدر بلگرامی کی شرح کلمات الجلیل کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ فارسی بلگرام (ص ۱۳) میں میر عبدالجلیل کی ایک تصنیف انشای وقائع ستارا گڈھ بتائی گئی ہے جو غالباً یہی تصنیف ہے۔

[۵] انشای جلیل ص ۲۔

یہ سفرنامہ تاریخی اور ادبی دونوں لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے میر عبدالجلیل کی ابتدائی زندگی، شاہی دربار اور دکن میں قیام پذیر اورنگزیب کی فوج کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ میر عبدالجلیل ۱۱۱۱/۰۰-۱۶۹۹ء میں محمد رضا کے ساتھ بلگرام سے دکن کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ اسلام پوری پہونچے جہاں اورنگزیب کا مرکزی کیمپ تھا۔ مرزا محمد علی کے ذریعہ ان کا تعارف مخلص خاں بخشی سے ہوا۔ مخلص خاں نے کہا اگر ملازمت چاہتے ہو تو دربار میں آجاؤ۔ میر ۲۸ محرم کو شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے دربار کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔

اورنگزیب تخت پر جلوہ افروز تھا۔ اس کے بائیں اسد خاں وزیر اعظم اور اس کے سامنے بہرہ مند خاں کھڑے تھے۔ دیگر حاضرین میں صف شکن خاں میر توزک، روح اللہ خاں میر ساماں، تربیت خاں میر آتش، خدا بندہ خاں بیوتات، اور سیف الدین خاں قور بیگی وغیرہ حاضر تھے۔ ان کے پیچھے ترتیب سے قورچی، احدی، گرز بردار، بان بردار، سرخ پوش اور حبشی کھڑے تھے۔ پہلے بہرہ مند خاں اور پھر مخلص خاں نے بادشاہ کے حضور میں درخواستیں گذرانیں۔ پھر ارشد خاں نے دیوانی کی رپورٹ پیش کی۔ مرزا یار علی بیگ داروغہ ڈاک نے زبردست خاں کی عرضی پیش کی۔ اس کے بعد منعم خاں داروغہ عدالت نے لوگوں کے استغاثے پیش کیے۔ دربار ختم ہوا تو میر کو یہ حکم ملا کہ دیوانی میں حاضر ہوں۔ مگر دیوانی میں حاضری ٹیڑھی کھیر تھی۔ وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور چوبدار بری طرح ان کی خاطر کر رہے تھے۔ خود میر پر اتنی مار پڑی کہ ان کا جسم برہانپور کا ڈوریہ بن گیا۔ آخر کار چوبدار کو رشوت دیکر میر اندر پہونچے تو خوش قسمتی کی منزل سامنے تھی۔ لیکن میر کو اتنے علم و فضل کے باوجود صرف چار بیسی کا منصب ملا۔ اس ناقدری پر میر کا دل بیٹھ گیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے لیکن انھیں اس حدیث سے تسلی ملی:[۱]

"اِنَّ اللہَ وسّع ارزاق الحمقاء لیعتبر بہ العقلاء"

(اللہ نے احمقوں کی روزی اس لیے وسیع کی ہے کہ عقل منداس سے عبرت پکڑیں)

---

[۱] انشای جلیل ص ۱۳، ۲۔

۵ رجمادی الاول کو بادشاہ نے اسلام پوری سے کوچ کیا۔ اس سے قبل میر اپنا ایک رسالہ اورنگزیب کی خدمت میں پیش کر چکے تھے۔ جب بسنت گڈھ فتح ہوا تو میر نے عربی اور فارسی میں متعدد تاریخیں کہہ کر مخلص خاں کے توسط سے بادشاہ کے حضور میں پیش کیں۔ اورنگزیب نے خوش ہو کر میر کا منصب یکصدی کر دیا۔[1]

۱۴ رجمادی الثانی کو مغل فوجیں ستارا کی طرف بڑھیں اور ۱۳ رذی قعدہ کو مرہٹوں کا یہ ناقابل تسخیر قلعہ مغلوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۲۴ رذی قعدہ کو اب پرلی کی طرف روانگی ہوئی اور محرم ۱۱۱۲/ ۲۱/ جون ۱۷۰۰ کو وہاں مغلوں کی فتح کا پرچم لہرایا۔[2] چونکہ برسات شروع ہو چکی تھی اس لیے شاہی فوج کچھ دنوں کے لیے بھوشن گڈھ میں قیام پذیر ہو گئی۔ وہاں سے خواص پور میں پڑاؤ پڑا لیکن یہاں ایک رات[3] اچانک خطرناک سیلاب آیا اور ہزاروں مغل فوجی موت کی نذر ہو گئے۔[4] اس واقعہ پر انشای جلیل کا اختتام ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں ۱۱۱۱/ ۱۷۰۰-۱۶۹۹ کے آغاز سے لے کر ربیع الثانی ۱۱۱۲/ ستمبر ۱۷۰۰ تک کے واقعات درج ہیں۔

انشائے جلیل کا انداز بیحد مرصع اور مقفی ہے۔ اس میں عربی آیات اور محاورات کی بھرمار ہے۔ اس حیثیت سے وہ بڑی حد تک وقائع   نعمت خاں عالی سے قریب ہے۔ مگر اس میں وقائع کی طنز نگاری نہیں ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اس کا ایک مختصر اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

"بر یک گروہ از بنگاہ برای نماز چاشتگاہ در صحرایی کہ قاعاً صفصفا بیان اوست ، مسجدی از خیمۂ بہار پیرا بہ موودای المسجد اسس علی التقوی بر پا شد. بادشاہ آفاق بہ ملوق

---

[1] ایضاً ص ۱۸-۱۷۔ بسنت گڈھ اتوار ۱۲ رجمادی الثانی ۱۱۱۱/ ۲۵ رنومبر ۱۶۹۹ کو فتح ہوا۔ (مآثر عالمگیری ص ۴۱۱)

[2] مآثر عالمگیری (ص ۴۲۵، ۴۲۷) میں کوچ کی تاریخ ۱۴ ذی قعدہ اور فتح کی ۳ رمحرم درج ہے۔

[3] یہ سیلاب ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۱۲/ یکم اکتوبر ۱۷۰۰ کی رات کو آیا۔ (مآثر عالمگیری ص ۴۳۱)

[4] انشای جلیل ص ۳۴-۱۸۔

اقم الصلوٰۃ لذکری نماز اشراق خوانده، اوراق مسافت راه به مقتضای کطی السجل للکتب طی نموده، داخل دولت خانه ظفر آگین شدند۔"[1]

مکاتیب جلیل

انشائی جلیل کا انداز جتنا ہی آراستہ پیراستہ ہے، میر کے خطوط اتنے ہی صاف اور سادہ ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے اپنے لڑکے سید محمد کے نام لکھے تھے[2]۔ اور مؤخر الذکر نے انھیں وار اپنے بھتیجے کے لیے مرتب کیے۔[3] یہ خطوط میر عبد الجلیل کے قیام بھکر سے شروع ہوتے ہیں اور فرخ سیر کی تخت نشینی کے کچھ پہلے سے لے کر ۱۱۳۲/۲۰-۱۷۱۹ء[4] تک کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ ان خطوط میں میر کی زندگی کے نئے نئے رخ ملتے ہیں۔ وہ کتابوں کے رسیا تھے[5]۔ اپنے بیٹے سے وہ نئی نئی کتابوں کی نقل منگایا کرتے تھے[6]۔ اور تحصیل علم کا شوق دلاتے رہتے تھے۔ جب فرخ سیر نے انھیں سابق عہدہ پر بحال کیا اور خلعت و بالا بند عطا کیا تو خوش ہو کر لڑکے کو لکھتے ہیں:

"این همه که می بینند به سعی خود و شوق مطالعۂ کتاب بهم رسانده ایم، مطالعۂ کتاب بسیار نافع است۔ هرگز کتاب از خود جدا نباید کرد۔"[7]

میر عبد الجلیل کو اپنے اکلوتے بیٹے سید محمد سے بے پناہ محبت تھی۔ سید محمد نئی نئی چیزوں کی فرمائش کرتے رہتے تھے اور میر کسی نہ کسی طرح ان کا دل رکھتے تھے۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو سرمہ اور کمان بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں عینک نہیں ملتی، جیسے ہی ملے گی، روانہ کروں گا۔[8] سید محمد کی شادی پر میر کافی مقروض ہو گئے تھے۔ ایک خط میں بیٹے کو لکھتے ہیں کہ تم نے اچھا کیا کہ گھنشیام تیواری

---

[1] ایضاً ص ۱۵۔ [2] مآثر الکرام ص ۲۶۷۔

[3] ادرینٹل میسلینی، کلکتہ، ج ۱، ۱۷۹۸ء، ص ۱۳۵۔ اس رسالہ میں میر کے خطوط (متن اور انگریزی ترجمہ) شائع ہوئے تھے۔

[4] ایضاً ص ۲۸۴۔ [5] ایضاً ۱۴۲۔

[6] ایضاً۔ [7] ایضاً ص ۲۵۰۔

[8] ایضاً ص ۱۳۶۔

کا قرضہ ادا کر دیا کیونکہ سود برابر بڑھتا جا رہا تھا، باقی تین سو بھی جلد ہی ادا کر دیا جائے گا [1]

ایک بار بیٹے نے لکھا کہ میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ میر نے جواب دیا:۔

"از کسل جسمانی خود نوشتہ بودند کہ اکثر علیل می باشند، بنا بران ارادۂ سفر این طرف دارند۔ برخوردارا! خود می دانید کہ در بساط ما ہمین شما اید۔ کسی کہ یک پسر داشتہ باشد، بہ اختیار خود جدائی پسر را قبول ندارد۔ تمام آرزوی ما ہمین است کہ شما را ببینیم۔ اما اسباب دواعی مختلفہ نمی گذارند کہ شما را بطلبیم" [2]

یہ اسباب دواعی تھے آمدنی کی قلت۔ جس کا ذکر دوسرے خطوط میں ملتا ہے۔ ایک تو مشکل سے روپیہ ملتا تھا، اس پر سے ہنڈی کا بھیجنا بڑا مشکل تھا، کیونکہ بھکر سے ہنڈی ملتان بھیجی جاتی تھی وہاں سے لاہور، لاہور سے آگرہ اور آگرہ سے قنوج پہونچتی تھی [3]۔ پریشانی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ میر کے پاس اس وقت کوئی جاگیر نہیں تھی۔ وہ صاحبزادہ کو کفایت شعاری کی تلقین کرتے رہتے تھے لکھتے ہیں:۔

"جاگیر نداریم۔ خدانخواستہ اگر از انجا برخیزیم، از ہمان روز بی روزگاریم۔ چرا کہ مدار نوکری بر جاگیر است۔ نوکری بی جاگیر گویا نوکر نیست" [4]

آخر کار میر کو جو خطرہ تھا وہی ہوا۔ ان کی ایک رباعی پر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے انھیں معزول کر دیا گیا میر پریشان دلی پہونچے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "۱۰ رجب سن ۳ جلوس فرخ شاہی (جولائی ۱۷۱۵ء) کو چار ماہ کے عرصہ میں بھکر سے شاہجہان آباد پہونچا۔ بیکاری موجب تشویش ہے۔ دلی کی گرانی تم نے بھی سنی ہوگی، برسات کے بعد تم کو بلاؤں گا" [5]

---

[1] ایضاً ص ۱۶۴

[2] ایضاً ص ۱۵۰

[3] ایضاً ص ۱۵۶

[4] ایضاً ص ۱۵۸

[5] ایضاً ص ۱۶۴، ۱۶۵

نئی حکومت کا عجیب حال تھا۔ میر ایک عرصہ کے بعد دہلی آئے تھے۔ اب یہاں کا نقشہ ہی اور تھا۔ لکھتے ہیں :۔

" در سلطنت نو ہیچ یک از امرای عہد عالمگیر بہ عرصہ نیست و ہیچ کس ازین امرای نو مارا نمی شناسد و فضل و کمال کسی را نمی پرسد و قواعد قدیمہ سلطنت ہمہ برخوردہ و کارہای خلایق بند "[۱]

اس زبردست پریشانی میں میر کے دوستوں نے ان کی مدد کی۔ ان کے ایک آشنا شیخ محمدی خاں نے انھیں ادونی اور کرنول مضاف بیجاپور کی سوانح نگاری دلادی۔ مگر میر اس طرف جانے کو تیار نہیں تھے۔[۲] آخر کار نواب دلیر دل خاں کے توسط سے وہ امیر الامرا حسین قلی خاں کے حضور میں پہونچے۔ ایک دن امیر الامرا کو میر نے اوپر والی رباعی سنائی۔ امیر الامرا نے اسے پسند کی۔ اسی دن قطب الملک عبداللہ خاں بھی وہاں آئے۔ میر نے انھیں بھی رباعی سنائی۔ قطب الملک نے بھی تعریف کی۔ آخر کار سید برادران نے وہ رباعی فرخ سیر بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے بھی تحسین کی۔ سید برادران نے عرض کیا کہ میر اسی رباعی کی بنا پر اپنی خدمت سے معزول کیے گئے ہیں۔ چنانچہ فرخ سیر نے میر کو ان کے سابق عہدہ پر بحال کر دیا۔[۳] ۱۴ ربیع الاول سن ۵ جلوس فرخ سیر (مارچ ۱۷۱۶ء) کو انھیں جاگیر کی اسناد ملیں۔ اسی دن انھیں فرخ سیر نے خلعت اور بالا بند عطا کیا۔ اب میر کی قسمت چمکی تھی۔[۴] اتفاقاً اورنگزیب نے اپنی وفات سے قبل میر کے منصب میں پچاس کا اضافہ کیا تھا لیکن اس کی وفات کے بعد اس پر کوئی عمل نہیں ہو سکا تھا۔ میر نے بڑی تلاش کے بعد وہ کاغذ حاصل کر لیا۔ لکھتے ہیں :۔

" فرد اضافہ پنجاہی کہ بہ خط حضرت خلد مکان عالمگیر غفر اللہ لہ در دفتر بود، بہ تلاش

---

[۱] ایضاً ص ۱۷۰

[۲] ایضاً ص ۲۱۶

[۳] ایضاً ص ۲۱۸

[۴] ایضاً ص ۲۲۲ ، ۲۲۴ ۔

تمام بجنس بہ دست نفیر آمدہ ۔ درسعی ہستم کہ فرد مذکور را منظور ساختہ سیاہہ بجائی بگیرم[۴]

میر کا اضافہ منظور ہوگیا[۵] ساتھ ہی پرگنہ ملانوہ سرکار لکھنؤ میں انھیں دو لاکھ دام کی جاگیر بھی

عطا ہوئی[۶]۔ اب انھیں ایک گونہ سکون ہوا۔ امیر الامرا کی رفاقت نے غالباً ان کے لیے اور آسانیاں

فراہم کیں۔ لیکن اس پورے عرصہ میں انھیں جس ذہنی کرب سے گذرنا پڑا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے:

"برخوردارا! کارہای دربار ہیچ در اختیار نیست۔ کار یک روز بہ یک ماہ می کشد و

عالمی سرگردان می گردد۔ بدون جاگیر برخاستن از ینجا دشوار است"[۷]

اوپر میر عبد الجلیل کی ہندی دوستی کا ذکر آیا ہے۔ میر نے خود بھی ہندی میں شعر کہے۔ انھوں نے

بلگرام کے ایک ہندی شاعر دواکر مصر کو امیر الامرا کے یہاں ملازمت دلوا دی تھی۔ ایک خط میں

سید محمد کو لکھتے ہیں:

"تقریب دواکر مصر مدتی است کہ کردہ ام۔ فرمودند بطلبید۔ دو بار پیش ازین برای آمدن

دواکر نوشتہ ام۔ شاید آن خطوط نرسیدہ اند۔ اگر مشار الیہ بیاید بہتر است"[۸]

امیر الامرا ہندی شاعری کے شوقین تھے۔ وہ ہندی شعرا کا کلام دیوناگری رسم الخط میں منگواتے

تھے اور پڑھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ میر اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ ہربنس مصر، دواکر اور رگھپتی

کے لڑکوں سے ان کی جتنی کویتائیں مل سکیں ہندی میں لکھوا کر بھیجو کیونکہ فارسی رسم الخط میں لکھنے سے

تحریف ہو جاتی ہے۔[۹]

حسن و عشق

نعمت خاں عالی جس کی شاعری کا ذکر اوپر ہوا دراصل نثر کا بادشاہ تھا۔ اس کی

شاہکار نثری تصانیف یعنی وقائع اور جنگ نامہ وغیرہ کا ذکر آگے تاریخ کے ذیل

---

[۴] ایضاً ص ۲۱۰ ۔ [۵] ایضاً ص ۲۲۸ ۔

[۶] ایضاً ص ۲۶۸ ۔ [۷] ایضاً ص ۲۳۴ ۔

[۸] ایضاً ص ۲۷۶ [۹] ایضاً ص ۲۶۶ ۔

میں کیا جائے گا یہاں اس کی دیگر منثورات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان منثورات میں ادبی حیثیت سے حسن و عشق مقدم ہے جو حسن و دل کی طرح حسن اور عشق کی فرضی داستان پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تاریخ تصنیف سے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مصنف کا طنز نگار قلم یہاں بھی پورے عروج پر ہے۔ فرضی روایت کے پردہ میں دراصل اس نے اپنے معاشرہ پر بڑے گہرے وار کئے ہیں۔ اگرچہ حسن و عشق کے پر تکلف انداز بیان نے طنز کی تیزی ذرا کم کردی ہے۔ پھر بھی اس کا تاثر بھرپور ہے۔ عشق کی برات میں راجہ حسرت سنگھ آہ، جان نثار خاں اخلاص، سید محب اللہ محبت، پہلوان دلاور جرأت اور خواجہ آشوب بیقراری جیسے حضرات شامل تھے۔ لیکن شادی کی جگہ اور بھی شرفا جمع تھے۔ ان شرفا میں حکیم حاذق لاعلاجی، میر جنگی مازندرانی، خواجہ محیل کشمیری اور شیخ دغاباز دکنی خاص اہم تھے

حسن و عشق اپنے مضمون کی رنگینی اور انداز بیان کی لطافت کے سبب بہت جلد مقبول ہوگئی۔ بیشتر بیاضوں میں اس کا انتخاب یا حوالہ ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے باقاعدہ نصاب میں شامل کر لیا گیا تھا کیونکہ امام بخش صہبائی نے ۱۲۵۰/۳۵-۱۸۳۴ء میں اس کی شرح لکھی۔[1]

منثورات

عالی کی دیگر منثورات میں ان کے خطوط بڑے مزیدار ہیں۔ ان میں دو عرضداشتیں اورنگزیب کے حضور میں ہیں۔ ایک شیواجی کی موت (۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰ء) پر ہے اور دوسری فتح جنجی (۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷ء) کی تاریخ ہے۔[2] باقی خطوط عموماً مزاحیہ اور ظریفانہ ہیں۔ ایک دلچسپ خط مرزا مبارک اللہ ارادت خاں واضح کے نام ہے۔ واضح نے قسم کھائی تھی کہ اگر میرے منصب میں اضافہ نہیں ہوا تو میں استعفا دیدوں گا۔ جب قسم پوری نہیں ہوئی اور واضح استعفا کے لئے بھی آمادہ نہیں نظر آئے تو عالی نے انھیں کفارہ کا یہ نرالا طریقہ بتایا۔

"بالجملہ دیوان آن ملا ذکہ بہ خط مصنف است و اعتبار دارد، اگر بہ نیم روپیہ کسی بخرد

---

[1] کلیات صہبائی، نظامی مطبع، کانپور، ص ۹۹، نیز ریو ۲/۷۰۳

[2] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۸۴۔

غنیمت است۔ بہ وجوہ کفارہ کفایت می کند وازدارو غہ بازار ہم خاطر بندہ جمع است

کہ شلتاق نمی کند چہ مال وزدیدہ نیست؛ زیراکہ شعر فہم است"[1]

اسی طرح ہمت خاں نے عالی کو ہاتھی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ایک سال گذر گیا اور ہاتھی نہ ملا۔ ادھر ہمت خاں کی فوج عالی کی جاگیر کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑی تھی اور فصل خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ عالی انھیں لکھتے ہیں:-

"مکرر برزبان الہام بیان آمد کہ فیل بخشیدم۔ مدت یک سال است کہ درانتظار ایفای وعدہ نواب مستطاب بادشاہ منزلت بہ بساط شطرنج خیال درفیلبند حیرت ماندہ وازکجروی فرزین طالع چندانکہ اسپ می دواند، شاہد مقصود رخ نمی نماید......

بہر حال بالفعل التماس اینست کہ چون عسکر فیروزی اثر آن والا جناب درحوالی جاگیر فقیر جاگیر شدہ، تاکید فرمایند کہ آسیبی بآن جاگیر نرسد"۔[2]

ایک اور دلچسپ خط نادرالزمان مصور کی خدمت میں لکھا گیا ہے کہ میں ایک غضب کی حسینہ پر عاشق ہوں مگر اس کا دیدار میسر نہیں ہوتا اس لئے:-

"اگر شبیہہ بی شبیہہ سراپا ناز بہ دستیاری کلک اعجاز پرداز طراز شود، ہر آئینہ انیس شب ہجران ومونس روز حرمان خواہد بود"۔[3]

غالباً ایسے ہی کسی موقع پر عالی نے یہ حسین شعر کہا تھا:-

بیخودی فرصت تصویر بہ نقاشش نداد　　　جان کشید از تن وجانان نکشید است ہنوز[4]

ایک اور خط میں سخت گرمی کی شکایت کرتے ہوئے اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔ اگر تھوڑا سا شورہ بھیج دو تو کمال کرم ہو گا۔[5] دو اور خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالی سیر وتفریح کے شیدائی

---

[1] ایضاً ورق ۹۳۔

[2] ایضاً ورق ۸۷

[3] ایضاً ورق ۸۲۔

[4] دیوان عالی، نیشنل میوزیم، ورق ۶۰

[5] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۸۲۔

تھے. ایک خط میں وہ اپنے ایک دوست کو میر و وزیر کی بازی دیکھنے کے لئے دعوت دیتے ہیں[۱]
اور دوسرے میں لکھتے ہیں کہ چودھویں کی چاندنی ہے. دوستوں نے دریا کی سیر کا پروگرام بنایا ہے
تم بھی آجاؤ تو کیا اچھا ہو[۲]

عالی کا دماغ بڑا اخلاق اور زرخیز تھا. وہ کسی صنف میں دبتے نہیں تھے. مگر ایک خط
سے جو غالباً بڑھاپے میں لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اب طرحی غزلوں میں ان کا ذہن کام نہیں کرتا تھا.

"چون تکلیف گفتن این زمینها به خاکسار فرموده اند، نہال مصراعی چند در ہر گل زمین
نشانده، به ثمر تحسین رسیده باد. اما چه توان گفت که از ضعف دماغ قوت فکر آن قدر
کاهیده که از صفحه دسطر جز پوست و استخوانی نمانده. ہرگاه به زور طبع برداشت اہر نکتہ
به جای خود افتاد"[۳]

ان خطوط میں عالی کی شرارت اور ظرافت پوری طرح جلوہ گر ہے. البتہ بعض مکاتیب بالکل
فحش ہیں. مثلاً وہ خط جو "اخوند صاحب پیر بہ حرص جوان" کو لکھا گیا ہے یا دوسرا خط جو قاضی مصطفے
کی سفارش میں ہے[۴]

انڈیا آفس کے کلیات (نمبر ۱۶۵۹) میں خطوط کی تعداد ۱۴ ہے. مطبوعہ نسخہ میں کم لیکن
بعض نئے خط ہیں.

ان مکاتیب کے علاوہ عالی نے اپنے وطن شیراز کی تعریف میں ایک انشا لکھی ہے. یہ
انشا حافظ کی مشہور غزل کی تشریح سی ہے. جس کا مطلع ہے:

خوشا شیراز و وضع بی مثالش   خداوندا نگه دار از زوالش[۵]

---

۱. ایضاً ورق ۷۳   ۲. ایضاً ورق ۸۱.
۳. ایضاً ورق ۸۰   ۴. رقعات و مضحکات، نولکشور ۱۲۶۱ھ ص ۱۹، ۲۷.
۵. کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۷۳.

ایک انشا عدو کے معمہ سے متعلق ہے[1] ایک اور مرصع نثر میں ہے۔ علاوہ ازیں ایک دیباچہ بیاض بھی ہے[2]

ان منثورات میں ایک بہت دلچسپ چیز مناظرۂ اطبا ہے۔ نعمت خاں عالی خود حکیم تھے اور اس طبقہ کی کوتاہیوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اس مضمون میں طبیبوں کی جہالت اور حماقت کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔ ایک مریض جاں بلب پڑا ہے۔ چند طبیب اس کے علاج کی غرض سے آتے ہیں اور مریض کو دیکھ کر اپنی رائے دیتے ہیں:۔

"یکی بشرۂ بیمار دیدہ گفت "رنگش بہ بلغم حصی می ماند. ظاہراً گچ خوردہ است".
دیگری نبض ملاحظہ نمودہ فرمود "نبضش ذنب الفارہ است مگر گربہ این خانہ مردہ است"...
یکی گفت "زکامش را الخلخہ مشک عنزر است" دیگری فرمود کہ "لقوہ اش محتاج بہ غرغرہ کافور است"[3]

اس مباحثہ پر ایک سن رسیدہ طبیب کو غصہ آیا، وہ بولے:۔

"ای جاہل! با این ہمہ دلیری ترا کی رسد کہ خوردہ بر حرف گیری. من مرد کہنہ سالم. عمری درین کار بسر بردہ و ریش در دیدن بول و براز سفید کردہ"[4]

چنانچہ اس طویل تجربہ کی چند تحقیقات بھی وہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً "از پیاز ماہی گرم است، بی ماست نباید خورد۔ خربزہ دیرہضم است، بغیر عسل نباید تناول کرد"[5]

یہ ماجرا دیکھ کر ایک تیسرا طبیب جو دعا وغیرہ کا قائل تھا، بولا:۔

"ای عزیزان! امروز خود این مریض غذا نخوردہ است، دوا چگونہ توان داد. بہ دعای

---

[1] ایضاً ورق ۸۵
[2] ریو ۲۶۹/۱؛ ایتھے نمبر ۱۶۶۲۔
[3] کلیات عالی (مخطوطہ) ورق ۸۸
[4] ایضاً
[5] ایضاً
[6] ایضاً

خیر اکتفا کنید۔[1]

مناظرہ اطبا میں بھرپور طنز کے باوجود نعمت خاں عالی کو تسلی نہیں ہوئی اور انھوں نے باعدہ ایک مختصر رسالہ ہجو حکما کے عنوان سے لکھا[2]۔ یوں بھی انھوں نے ہجو میں کسے بخشا تھا۔ ایک دوسرا رسالہ راحت القلوب[3] لکھ کر معاصرین کی دل کھول کر ہجو کی اور اس طرح اپنے دل کو ٹھنڈک پہونچائی۔

مضحکات

عالی نے مضحکات کے عنوان سے کچھ لطائف بھی جمع کیے تھے۔ یہ لطائف رقعات عالی کے ساتھ چھپ چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مجموعہ کے بیشتر لطیفے انتہائی فحش اور غیر مہذب ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کا اقتباس پیش کیا جا سکے مگر ان لطائف میں عالی کا فن اپنے کمال پر ہے۔ انھوں نے مختلف علوم وفنون مثلاً فقہ، طب ہیئت، نجوم اور منطق وغیرہ کی مخصوص اصطلاحوں کو جو نیا موڑ دیا ہے، وہ ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔

---

[1] ایضاً ورق ۸۹۔

[2] ریو ۱/ ۲۶۸۔

[3] ایضاً ۲/ ۶۹۶۔

باب ۸

داستان اور قصے

(الف) ہندوستانی قصے

بدایع العقول | بدائع العقول مشہور سنسکرت داستان ویتال پنچوین گاتھا کی فارسی روایت ہے جو عام طور پر بیتال پچیسی کے نام سے مشہور ہے۔ بیتال پچیسی ان پچیس کہانیوں کا مجموعہ ہے جو راجہ وکرماجیت کو ایک دیو کے متعلق سنائی گئی تھیں۔ بدائع العقول کے مترجم کا نام معلوم نہیں۔ البتہ اس کی تالیف عہد اورنگزیب میں ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ میں ہوئی[1]

چندر من بیدل نے بھی راجہ وکرم کی حکایات لکھی تھیں جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ایک نسخہ افسانۂ تولد شدن راجا بکرماجیت کے نام سے ہے جس میں راجہ وکرم کے معجزانہ کمالات کا ذکر ہے[2]

---

[1] براؤن فہرست (ضمیمہ) نمبر ۱۵۸۔

[2] ایشیاٹک۔ کرزن نمبر ۱۲۱۔

رسالۂ سریری (سنگھاسن بتیسی) بیتال پچیسی کی طرح سنگھاسن بتیسی بھی مشہور بتیس کہانیوں کا مجموعہ ہے عہد اورنگزیب میں اسے دو اشخاص نے سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا۔ پہلے مترجم کا نام معلوم نہیں۔ البتہ اس کا سن تکمیل ۱۰۸۴ھ/ ۱۶۷۳-۷۴ء ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے:۔

گفت زتاریخ او عقل بہ ناچار چار ہست "فغ" آراستہ لی بہ مزیدی چار[1]

۱۰۸۰ + ۴ = ۱۰۸۴ء

کتاب کا نام رسالہ سریری رکھا گیا کیونکہ اس میں تخت سے متعلق حکایات کا ذکر ہے:۔

"چون این کتاب محاکی مقال لعبتان سریر است، ناگزیر بہ اسم سریری نامیدہ"[2]

مصنف شروع میں اورنگزیب اور اس کے عدل و انصاف کی مدح کرتا ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے عرصہ سے اپنے استاد کے ایما پر اس داستان کو فارسی میں منتقل کرنا چاہتا تھا، مگر متعدد حالات کی وجہ سے بات ٹلتی رہی یہاں تک کہ دوستوں کی فرمائش نے مجھے اس کام کی تکمیل پر مجبور کر دیا:۔

"احقر العباد ... در پیشگاہ فضلا باآنکہ در فن انشا چون چشم اعمی غیر از نامی ندارد و خود را کمترین تلامیذ اساتیذ می شمارد و بہ موجب ایمای تربیت انتمای استاذ معظم آموزگار مکرم، پیر منشیان، قدوۂ متکلمان کہ نامش ہم از منقبت او پیداست و وضعش بی منت خامہ ہویدا، رضوان اللہ علیہ، از دیر باز مرکوز خاطر داشت کہ داستان باستان رای بکرماجیت ... مترجم فارسی گرداند۔ لیکن از کوتہی امکان و درازی عنان عبور بدان مسلک نمی توانست نمود"[3]

رسالہ سریری کی نثر مرصع اور پر تکلف ہے۔

---

[1] رسالہ سریری (سنگھاسن بتیسی)، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۰۲، ورق ۳

[2] ایضاً [3] ایضاً ورق ۲-۱۔

کشن بلاس سنگھاسن بتیسی کی دوسری فارسی روایت کشن چند (یا کشن داس) واسدیو بن ٹلوک چند تنبولی نے کشن بلاس کے عنوان سے مرتب کی۔ مصنف لاہور کا باشندہ اور امیر الامرا نواب جار اللہ کا متوسل تھا۔ مگر کشن چند کے عہد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر ریو[1] کا خیال ہے کہ کشن چند نے اپنی کتاب عہد اورنگزیب میں مرتب کی کیونکہ اس نے ابن ہرکرن کی فارسی سنگھاسن بتیسی کا ذکر کیا ہے جو ۶۲-۱۰۶۱/۵۲-۱۶۵۰ میں مکمل ہوئی۔ مگر ڈاکٹر ایتھے[2] کا کہنا ہے کہ کشن چند نے عہد جہانگیر میں اپنی تصنیف کی۔ برٹش میوزیم کا نسخہ انڈیا آفس کے نسخہ کے مقابلہ میں خاصا جدید ہے اور اس میں بہت اضافے کئے گئے ہیں اس لیے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

سنگھاسن بتیسی کو سب سے پہلے غالباً عہد اکبر میں فارسی میں منتقل کیا گیا۔ یہ کام ملا عبدالقادر بدایونی نے ۹۸۲/۷۵-۱۵۷۴ میں ایک برہمن کی مدد سے انجام دیا اور اس کا نام خرد افزا رکھا[3]۔ اسی عہد میں چتر بھج بن مہر چند کایستھ سونی پتی نے شاہنامہ کے عنوان سے یہ داستان فارسی میں لکھی[4]۔ خلاصۃ التواریخ سبحان رائے میں ایک روایت گل افشاں کا ذکر ہے[5] اس کے علاوہ جن لوگوں کی روایتوں کا پتہ چلا ہے وہ درج ذیل ہے۔

۱. از چند بن مادھو رام

۲. بھاڑا مل بن راج مل (تصنیف ۱۰۱۹/۱۱-۱۶۱۰) (بوہار نمبر ۲۴۶)

۳. بشب رائے بن ہرکرن[6] (۶۲-۱۰۶۱/۵۲-۱۶۵۱)

۴. سید عماد علی و شیو سہائے کایستھ ساکن گلاوٹھی (ضلع بلند شہر)۔ یہ ترجمہ ایڈورڈ ابلایو بیلے (E. E. Bayley) کے لئے مرتب کیا گیا تھا[7]۔

---

[1] ریو ۲/۷۶۳

[2] ایتھے نمبر ۱۹۸۹۔

[3] بحوالہ ایتھے نمبر ۱۹۸۸ء

[4] بحوالہ بوڈلین نمبر ۱۳۲۶

[5] خلاصۃ التواریخ، ص ۶

[6] بحوالہ ایتھے نمبر ۱۹۸۸۔

[7] ریو ۳/۱۰۰۶

۵۔ کیمبرج کتب خانہ کا ایک مخطوطہ جو برٹش میوزیم کے مخطوطہ سے مختلف ہے۔[1]

۶۔ ایڈنبرا کتب خانہ کا ایک مخطوطہ۔[2]

قصہ کامروپ

قصہ کامروپ وکام لتا کی منظوم روایت دستور ہمت کا ذکر اوپر ہوا۔ نثر میں جو قصہ ملتا ہے اس کے مصنف کا نام نہیں معلوم ہے۔ ڈاکٹر ریو کا یہ خیال ہے کہ یہ منثور قصہ محمد کاظم کریم نے لکھا تھا، جو فکر عراقی کا لڑکا تھا اور دکن آکر عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے متعلق ہوگیا تھا۔[3] خلاصۃ الکلام کے مؤلف کا بیان ہے کہ محمد کاظم کریم عہد عالمگیر میں ہندوستان آیا اور نعمت خان عالی سے توسل پیدا کیا۔[4] یہ بیان صراحتاً غلط ہے کیونکہ کریم کے کلیات میں شاہجہاں کی مدح میں کئی ایک قطعات ہیں۔ یہ کلیات کریم کی حیات میں مرتب ہوا تھا کیونکہ اس کے نام کے ساتھ سلمہ اللہ اور حفظہ اللہ کے دعائیہ کلمات ہیں۔[5] کلیات میں غزل، قصائد، قطعات اور رباعیات کے علاوہ رواق شوق کے نام سے ایک رسالہ اور چند رقعات ہیں۔ ان میں سے ایک مکتوب شیخ محمد خاتون کے نام ہے جس میں کریم نے لکھا ہے کہ میں دکن میں شیعہ حکومت سے امید لے کر آیا تھا مگر دربار میں میری کوئی رسائی نہیں اور لوگ مجھ پر سرقہ کا الزام لگاتے ہیں۔[6] غالباً اسی پریشانی کے عالم میں اس نے یہ رباعیاں لکھی تھیں:-

رفتیم بہ سوی ہند بی نام و نشان — غافل ز عناد دہر و ابنای زمان

بردیم ندانستہ ز کم بختیہا — خرما سوی بصرہ، زیرہ سوی کرمان

---

۱ کیمبرج فہرست ص ۳۶۸۔ ۲ ایڈنبرا نمبر ۳۲۹۔

۳ ریو ۲/ ۷۶۴

۴ نواب علی ابراہیم خاں: خلاصۃ الکلام (حبیب گنج، علی گڈھ) ورق ۱۹۱۔ مؤلف کا کہنا ہے کہ میں نے کریم کی دس مثنویاں دیکھی ہیں اور ان میں سے پانچ کا انتخاب دیا ہے۔

۵ کلیات کریم (محمد کاظم) بانکی پور نمبر ۲۸۹۵، ورق ۱۳/ ۲۲۴۔

۶ ایضاً ورق ۲۱۹۔

ای مملکت ناطقہ را صاحب جاہ — زنہار مبر بہ کشور ہند پناہ

ازچاہ طبیعت ارتوانی، بدر آ — یوسف نفگندہ است کسی در تہہ چاہ[1]

مگر رفتہ رفتہ وہ حالات کا عادی ہوگیا۔ خلاصۃ الکلام میں اس کی جن پانچ مثنویوں کا انتخاب ہے اس میں سے چوتھی مثنوی میں کہتا ہے :۔

مرا اکنون وطن ہندوستان است — کہ در ہر گوشہ اش سرو روان است

درین کشور تمنا بی نیاز است — کہ بر معشوق از عاشق نیاز است[2]

ایک اور رباعی میں وہ عبداللہ قطب شاہ کے بخشتے ہوئے ہاتھی کا ذکر کرتا ہے :۔

محمود اگر روی کرم کرد سیاہ — ناموس وفاز غزنوی گشت تباہ

بی وعدہ نظم شاہنامہ بہ کریم — فیلی بخشید بادشاہ عبداللہ[3]

بہرحال کلیات یا خلاصۃ الکلام کے انتخابات میں یہ ذکر کہیں نہیں ملتا کہ اس کاظم کریم نے کامروپ اور کام لتا کا قصہ لکھا تھا۔ کتاب کے آغاز میں بھی کوئی مقدمہ نہیں ہے۔ اور نہ داستان کے ضمن میں مصنف کے نام کا کوئی اشارہ ملتا ہے۔

بوڈلین کتب خانہ میں جو مخطوطہ ہے وہ ہمت خاں بن اسلام خاں مشہدی کی طرف منسوب ہے۔ اس کے شروع میں عجب رائے پر سردری نسیم کا ایک دیباچہ ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ایک روز 'امیر روشن ضمیر' کی محفل میں قصہ کامروپ ہمت خاں بن اسلام خاں کا ذکر آیا۔ چونکہ اس کے شروع میں کوئی دیباچہ نہیں تھا اس لئے میں نے اس پر دیباچہ لکھ دیا۔ یہ ۱۱۰۷/۹۶-۱۶۹۵ کا واقعہ ہے جیسا کہ اس تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے ؎

تاریخ نظام او بہ خود گفت — "دیباچہ خجستہ ابد باد"
۱۱۰۷ ہجری

---

[1] ایضاً ورق ۱۷۸، ۱۹۷

[2] خلاصۃ الکلام ورق ۲۰۳

[3] کلیات کریم، ورق ۱۹۷۔

یہ نسخہ ۱۴/شوال ۱۱۰۸/۲۶/اپریل ۱۶۹۷ کا نوشتہ ہے اور اس طرح قصہ کامروپ کا قدیم ترین نسخہ ہے۔[1] دستور ہمت کے شاعر کا بھی کہنا ہے کہ یہ قصہ پہلے اس کے مربی ہمت خان نے نثر میں لکھا تھا اور اسی کے ایما پر میں نے اسے نظم میں منتقل کیا۔[2] قصہ صاف اور رواں نثر میں ہے۔ اس میں شستگی اور سلاست بھی ہے اور بقدر ضرورت تزئین و آرائش بھی۔

کامروپ اور کام لتا کا قصہ خاصا مشہور رہا۔ اسی عہد میں ابوالفتح قابل خاں نے اس کی ایک منثور روایت مرتب کی تھی جو اورنگزیب کے نام معنون ہے۔[3] بعد میں منشی علی رضا نے کیپٹن جان ریچ (John Ritche) کے لئے اسے ہندی سے فارسی میں منتقل کیا۔[4] اور اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فرینکلن نے لندن سے اس کا انگریزی ترجمہ چھاپا۔[5]

قصہ میکا و منوہر

قصہ میکا و منوہر مادھوداس گجراتی کی تصنیف ہے جس میں میکا (یا منکا) اور راجہ منوہر کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ ہے جیسا کہ اس تاریخ سے واضح ہوتا ہے:۔

گلبن طبع عزیزان نوبہاری یافتہ[6]
۱۰۹۸ ہجری

حکایات ناسکیت

روپ نراین کھتری بن ہری رام سیالکوٹی نے اورنگزیب کے ۵۰ ویں سن جلوس (۰۶-۱۷۰۵) میں ناسکیت کی داستان سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی اور اس کا نام مجموعہ حکایات ناسکیت[7] رکھا۔ دراصل روپ نرائن اس کتاب کے

---

[1] بوڈلین نمبر ۱۳۲۶ (مائکروفلم) ورق ۲، ۳، ۱۰۸۔
[2] دستور ہمت، ورق ۹-۸۔
[3] مقالات الشعراء ص ۴۳، ۵۷۳
[4] ریو ۲/۸۰۳
[5] مطبوعہ لندن ۱۷۹۳
[6] ایتھے نمبر ۸۲۴؛ بوڈلین نمبر ۴۷۸
[7] مجموعہ حکایات ناسکیت (انجمن ترقی اردو، علی گڈھ مخطوطہ) ورق ۳۔ ریو (۲/۷۹۶) نے سراج الطریق کے عنوان سے اس کا ذکر کیا ہے۔ ریو کے نسخہ کا آغاز موجودہ مخطوطہ میں ورق ۴ پر ہے۔

ذریعہ شاہی دربار میں جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اورنگزیب کی مدح بڑے جوش وخروش سے کی ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

شاہ عالمگیر غازی بادشاہ دین پناہ　　خسرو ایزد پرست و عادل کسریٰ نشان
خاطر معنی طرازش مطلع انوار قدس　　روح صافی طینتش ہم آستان قدسیان[1]

مصنف کا بیان ہے کہ وہ سمرتی اور پران کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ دوران مطالعہ میں اسے ناسکیت کی داستان نے بہت متاثر کیا چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے فارسی میں منتقل کیا جائے اور اس طرح موجودہ تصنیف وجود میں آئی۔[2]

ناسکیت (جس کا اصل سنسکرت تلفظ نچیکتا ہے) کی کہانی یجروید کے کٹھولی اپنشد میں ملتی ہے۔[3] اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناسکیت کے باپ باج شراوس نے برہمنوں کو کچھ گائیں دان کیں۔ ناسکیت نے باپ سے پوچھا آپ مجھے کس کو دان کریں گے؟ باپ نے غصہ میں کہا جم دوت (ملک الموت) کو۔ چنانچہ ناسکیت اصرار کر کے جم دوت کے پاس روانہ ہوگیا۔ وہاں پہونچا تو جم دوت غائب تھا۔ تین دن اور تین رات ناسکیت بھوکا جم دوت کے گھر رہا۔ جب جم دوت واپس ہوا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ ایک برہمن اس کے گھر میں بھوکا پیاسا مہمان ہے تو وہ خوف زدہ ہوا اور اس نے ناسکیت کی دلجوئی شروع کی۔ ناسکیت نے اس کے سامنے تین آرزوئیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ اسے صحیح سالم اس کے باپ کے پاس پہونچا دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسے جنت تک پہونچنے کا ذریعہ بتایا جائے جہاں جا کر آدمی لازوال ہو جاتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ موت کی حقیقت کیا ہے؟ جم دوت نے پہلی دونوں آرزوؤں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا لیکن تیسری آرزو یعنی موت کی حقیقت بتانے سے انکار کیا۔ مگر جب ناسکیت نے بہت اصرار کیا تو اس نے اسے موت کی حقیقت بتائی۔ اس عرفان

---

[1] مجموعہ حکایات ناسکیت، ورق ۳۔　　[2] ایضاً

[3] ملاحظہ ہو دارا شکوہ: سراکبر (ترجمہ اپنشد) مرتبہ رضا جلالی نائنی، تہران ۱۹۵۷ء ص ۲۱۴۔

کے بعد ناسکیت برہما (خدا) تک پہونچ گیا اور جسمانی موت سے آزاد ہو کر لازوال ہو گیا۔

روپ نرائن دو اور کتابوں کا مصنف ہے۔ اول نصاب جامع اور دوم مخزن العرفان۔ نصاب جامع ابو نصر فراہی کی نصاب الصبیان کے طرز پر منظوم لغت نامہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر لفظ کا اعراب بھی بتایا گیا ہے[1]۔ مخزن العرفان کرشن جی کے مولد برج اور دیگر قریبی مقامات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اسی لئے اس کا دوسرا عنوان ورج مہاتمیا بھی ہے۔ اس کی تصنیف لاہور میں ۱۱۲۹/۱۷۱۷ میں ہوئی[2]۔

اسی عہد کی دو اور تصانیف ہیں۔ جن کے مصنف کا نام روپ نرائن ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ دونوں روپ نرائن ایک ہی ہیں یا الگ الگ۔ ان میں سے ایک کتاب ہے بدائع الجمال[3] اور دوسری شش جہت[4]۔ موخر الذکر اپنے کمال کے اعتبار سے غالباً پوری فارسی نثر میں اپنی مثال آپ ہے۔ شش جہت درحقیقت ایک معمولی داستان ہے جو ایک طویل کاغذ پر خریطہ کی شکل میں لکھی ہے ہر سطر میں پانچ الفاظ پر سرخ لکیر کھنچی ہوئی ہے اور اگر یہ خط کشیدہ الفاظ اوپر سے نیچے ترتیب سے پڑھے جائیں تو پانچ اور نئے قصے بنتے ہیں۔ اس لئے یہ داستان مجموعی طور پر چھ قصوں پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام شش جہت رکھا گیا۔ شش جہت کی تصنیف درحقیقت ایک چیلنج کا جواب ہے جیسے مصنف کے الفاظ میں سنئے:

"محرر این اوراق روپ نرائن احقر الانام ہر چند لیاقت سخن ندارد لیکن پیش سخن فہمان چنان معروض می گرداند کہ روزی بوالفضولی می گفت کہ اختراع صنعتی از زمرۂ ہنود گمان ندارم . . . . . این جماعۃ از استعداد فطری اکثری محروم ماندہ[5]"

---

[1] مضمون ابو یحیی خان: معارف اکتوبر ۱۹۴۷ء

[2] ریو ۲/ ۷۹۵

[3] ریو ۱/ ۶۲۔

[4] ایشیاٹک، کرزن نمبر ۱۵۱

[5] شش جہت، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۱۵۱۔

اس چیلنج کے جواب میں مصنف نے شش جہت تصنیف کی۔ جس کی تعریف میں وہ کہتا ہے :-

بسی مطبوع موزون است این نسخہ کہ من دارم
ہمانا دُرِّ مکنون است این نسخہ کہ من دارم[۱]

کتاب کے آخر میں یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔ جس سے غالباً ۱۱۲۱/۱۰-۱۷۰۹ کا سن بر آمد ہوتا ہے[۲]

این دلکشا صحیفہ کہ ہر صفحہ ای از آن — چون روی یار آمد مطبوع و دلفریب
سال تمام آن بہ تأمل ز روی عقل — مطبوع شش جہت شد بی بای شک و ریب

اس کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ :-

"در خاتمہ الفاظ تاریخ بہ عمل توشیح اگر خاطر متوجہ بود، برمی آید و از الفاظ وسط خاتمہ کہ بہ شنجرف نوشتہ شدہ سال ہجری و جلوس عالمگیری و ماہ ظاہر می شود"[۳]

لیکن افسوس یہ کہ خاتمہ صرف کالی روشنائی سے لکھا ہے۔

---

[۱] ایضاً

[۲] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۱۷۱، ۱۲۴۔

[۳] شش جہت۔

(ب) دیگر قصص وحکایات

شاہنامۂ بختاور خانی

شاہنامۂ بختاور خانیؒ شاہنامۂ فردوسی کی ۴۶ حکایات کا مجموعہ ہے۔ اس کا مصنف بہادر علی بن جعفر الہ وردی خاں بن الہ وردی خاں کلاں ہے۔ مصنف کا باپ عہد اورنگزیب میں متھرا، گورکھپور اور مراد آباد کا فوجدار تھا۔ اس کا انتقال ۱۰۷۹/ ۶۹-۱۶۶۸ ء میں ہوا۔ مآثر الامرا نے جعفر الہ وردی خاں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے صرف ایک لڑکے امان اللہ کا ذکر کیا ہے[۲]۔ بہرحال بہادر علی کا کہنا ہے کہ وہ شاہنامہ کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ ایک دن اسے یہ خیال آیا کہ اس کی حکایات نثر میں لکھی جائیں۔ چنانچہ اس نے یہ کام شروع کر دیا اور ۲۵ سن جلوس اورنگزیب ۹۳-۱۰۹۲ میں اسے مکمل کیا[۳]۔ کتاب کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مصنف بختاور خاں سے متعلق تھا۔

عہد شاہجہاں کے اواخر میں توکل بیگ بن تولک بیگ نے بھی شاہنامہ کی داستانیں اختصار کے ساتھ فارسی نثر میں لکھی تھیں[۴]۔ ممکن ہے اسی کو دیکھ کر بہادر علی کو بھی شاہنامہ لکھنے کا خیال آیا ہو مگر وہ اس نسخہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

انیس احسن

انیس احسن میں شہزادہ قیس، شہزادی گیتی افروز اور عاقل بڑھئی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کا مصنف احسن اللہ ہے۔ اس کی تصنیف شاہجہان آباد میں عہد اورنگزیب میں ہوئی۔ اس کا سن تصنیف غالباً ۱۰۹۲/ ۱۶۸۱ ہے۔ جیسا کہ اس تاریخ سے

---

[۱] ریو ۳/ ۱۰۳۷۔

[۲] مآثر الامرا ۱/ ۲۲۹۔

[۳] فہرست مخطوطات بمبئی یونیورسٹی ص ۱۱۲

[۴] ریو ۱/ ۵۳۹۔

ظاہر ہوتا ہے :

با انیس احسن و خوش، قلب را از دست دہ[1]

مظہر الاعجاز

مظہر الاعجاز مذہبی حکایات اور داستانوں کا مجموعہ ہے جس کا مصنف مہدی متخلص بہ واصف ہے۔ یہ حکایات ائمہ اثنا عشرہ کے معجزات و کرامات سے متعلق ہیں[2] اور ایک خاص مذہبی نقطہ نظر سے بیان کی گئی ہیں۔ ان میں وہ حکایات بھی شامل ہیں جو قدیم کتابوں میں موجود ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جن کی شہادت خود مصنف نے دی ہے[3] اس ضمن میں ایران، اور جنوبی ہند کے بعض شہروں مثلاً بلخ، اصفہان، احمد نگر اور بیجاپور کی زندگی کا بھی مختصراً ذکر آگیا ہے۔ ان واقعات میں جن سنین کا ذکر آیا ہے ان میں آخری سن ۱۰۹۵/۱۶۸۴ کا ہے۔ جب واصف احمد نگر میں تھا[4] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب اس سال کے لگ بھگ تیار ہوئی۔

مظہر الاعجاز ایک فاتحہ، دو مظہر اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس کا انداز بیان مصنوعی اور پر تکلف ہے۔ بیچ بیچ میں واصف نے اپنی پوری پوری غزل درج کی ہے۔

خلاصۃ النصائح
خلاصۃ الحکایات

خلاصۃ النصائح اور خلاصۃ الحکایات بہادر علی خاں بن الہ داد خاں کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر مجموعہ پہلے کی تکمیل یا ضمیمہ ہے۔ کیونکہ مصنف نے دو الگ الگ عنوان بتائے ہیں۔ خلاصۃ الحکایات میں بہادر علی خاں لکھتا ہے کہ جب میں اورنگزیب کی طرف سے جیسلمیر (ضلع علی گڈھ) میں وصولی پر مامور تھا تو میں نے یہ حکایات لکھی تھیں۔ یہ ۳۴ سن جلوس ۱۱۰۱ - ۱۱۰۰/۹۰-۱۶۸۹ کا واقعہ ہے۔ خلاصۃ الحکایات کے خاتمہ میں ایک قصیدہ ہے جس میں شاعر نے بہادر تخلص استعمال

---

[1] ایضاً ۸۵۶/۲

[2] مظہر الاعجاز ایشیاٹک۔ کرزن نمبر ۸۰۔ ورق ۵۔

[3] ایضاً ورق ۵۵، ۹۱ [4] ایضاً ورق ۱۶۰۔

کیا ہے۔ اور غالباً وہ بھی بہادر علی خاں ہے[1]۔

کشایش نامہ کشایش نامہ ایسی حکایات کا مجموعہ ہے جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان کیسے ہی مصائب میں گرفتار ہو، قدرت اس کی رہائی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ ریو[2] اور ایوانوف[3] مصنف کا نام خواجہ راجکرن بتاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ایتھے[4] کا بیان ہے کہ راجکرن اور باکرن کایستھ اس کے مشترک مصنف ہیں۔ دوسرا نام باکرن نہیں بلکہ جسکرن ہے جو راجکرن کا چھوٹا بھائی تھا اور جس کی نوشتہ ایک کہانی کتاب میں شامل ہے[5]۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے اپنے بارے میں جو اطلاع بہم پہونچائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام راجکرن تھا جس سے قبل لفظ خواجہ بھی استعمال ہوتا تھا۔ وہ دہلی کے قریب چکلہ سکندر پور میں رہتا تھا۔ اس کا باپ بھوانی داس فدائی خانی، نواب صالح خاں کی طرف سے بدایوں کا منتظم تھا۔ کچھ دنوں کے بعد بھوانی داس نے راجکرن کو بھی بدایوں بلا لیا جہاں پہلے سے اس کے دو بھائی رام صاحب اور جسکرن موجود تھے۔ یہ صحبت مشکل سے دو تین مہینے باقی رہی۔ بھوانی داس کی ملازمت جاتی رہی۔ مجبوراً وہ راجکرن کے ساتھ بریلی چلا گیا اور دونوں لڑکے رام صاحب اور جسکرن دہلی چلے گئے۔ یہیں بریلی میں راجکرن نے ۱۱۰۱/۹۰-۱۶۸۹ میں یہ کتاب مکمل کی۔ کتاب کے عنوان اور تاریخ کا ذکر مندرجہ ذیل قطعہ میں ہے:۔

کشایش نامہ را ہر کس کہ خواند	نماید شبہہ را از فہم خود حک
کہ تاریخ تمامش گفت ہاتف	"دہد حقا کشایشہای بی شک"[6]
	۱۱۰۱ ہجر

---

[1] بوڈلین نمبر ۲۵۲۶، ۲۵۲۷۔
[2] ریو ۲/ ۷۶۷
[3] ایشیاٹک ۲/ ۱۱۳
[4] ایتھے نمبر ۸۲۵۔
[5] کشایش نامہ (علی گڈھ مخطوطہ) ورق ۹، و کشایش چہارم
[6] کشایش نامہ ورق ۹۔

ریو اور براؤن[۱] نے بالترتیب ۱۱۰۰/ ۸۹-۱۶۸۸ اور ۱۱۱۰/ ۹۹-۱۶۹۸ کے سن دیئے ہیں۔

کشایش نامہ سات کشایش یا باب میں منقسم ہے۔ آخری کشایش میں راجکرن نے خود اپنے بارے میں ایک قصہ بیان کیا ہے۔ یوں تو پوری کتاب کا انداز انتہائی پر تکلف اور پیچیدہ ہے لیکن چوتھا باب جو جسکرن کا نوشتہ ہے، مزید مطول اور مغلق ہے۔ ان حکایات کا پس منظر ماورائی اور فوق فطری ہے اور اگرچہ بعض کا ماحول ہندوستانی ہے لیکن مصنف کی کرامت پرستی نے کہانیوں کی صداقت بڑی حد تک مشتبہ کر دی ہے۔ بہر حال بیکاری میں اس نے توکل اور رضا و تسلیم کا یہ اخلاقی پہلو نکالا تھا اور اسی نکتہ پر وہ کتاب کا خاتمہ کرتا ہے:۔

"درین کشمکش و کشایش آنچہ بہ ایضاح پیوست، این است کہ ہرچہ ہست تقدیر داحد است. باقی دام بافۂ زاہد است. حیف آن است کہ در امر تقدیر کہ تبدیل پذیر نیست، از بس بیتابی منت کش چرخ ناہنجار و مردم ناہموار شونار۔"[۳]

قصہ لعل پوش

سید ناصر علی نے ۱۱۱۱/ ۰۰-۱۶۹۹ میں لعل پوش بادشاہ اور اس کے لڑکے کا قصہ لکھا ہے۔ یہ قصہ بالکل فوق فطری ہے اور قدیم داستانوں کی طرح اس میں عجیب و غریب واقعات کا ذکر ہے۔ کتاب کا کوئی خاص عنوان نہیں معلوم ہوتا اور نہ اس سے سید ناصر علی کے بارے میں کوئی اطلاع بہم پہونچتی ہے۔ البتہ سن تصنیف کی تاریخ اس شعر میں موجود ہے:۔

لطف نظم اینکہ از سر مصرع ۔۔۔ یافت تاریخ نام نسخہ 'ظہور'[۴]
۱۱۱۱ ہجری

قصہ کے دوران میں مصنف نے بہت سے اشعار درج کئے ہیں جن میں زیب النساء کی طرف منسوب یہ دو شعر بھی نظر آتے ہیں:۔

---

[۱] ریو ۲/ ۷۶۷
[۲] براؤن فہرست (ضمیمہ) نمبر ۱۰۳۸۔
[۳] کشایش نامہ ورق ۱۳۴۔
[۴] قصہ لعل پوش، مخطوط علی گڈھ، ورق ۱۔

بشکند دستی کہ خم در گردن یاری نشد | کور بہ چشمی کہ لذت گیر دیداری نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقی جا گرفت | غنچۂ باغ دل ما زیب دستاری نشد[1]

محرم راز بہرام بن علی مردان بہادر نے محرم راز کے نام سے چند حکایات اور داستانوں کو مرتب کیا۔ مصنف ازبک نسل سے تھا اور اگرچہ اس نے کتاب کا سن تصنیف نہیں دیا ہے مگر اورنگزیب کا ذکر بادشاہ وقت کی حیثیت سے کیا ہے۔ محرم راز میں علی مردان بہادر کی فوجی زندگی کا تفصیلی ذکر ہے۔ وہ اکبر اور جہانگیر کے عہد کا ایک ممتاز امیر تھا۔ دکن کی جنگوں میں اس نے بہادری کے کارنامے دکھائے۔ بوندی (راجستھان) کی فتح کے بعد اکبر نے اسے جاگیر عطا کی۔ ملک عنبر کی لڑائی میں ۱۰۲۱/۱۳-۱۶۱۲ میں وہ مارا گیا[2]۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ بہرام کے والد اور یہ علی مردان دونوں ایک ہی شخص ہیں یا الگ الگ۔ کیونکہ اورنگزیب کی تخت نشینی اور علی مردان کی وفات میں ۴۶-۴۷ سال کا فاصلہ ہے۔

محرم راز میں اخلاقی حکایتیں ہیں۔ جن میں سے بعض ہندوستانی مشائخ سے متعلق ہیں[3]۔

---

[1] ایضاً ورق ۱۷ ر
[2] ماثر الامرا ۲/ ۷۷۳۔
[3] ریو ۲/ ۷۶۷۔

باب ۹

تراجم و موسیقی

(الف) تراجم

متاکشر

متاکشر سنسکرت میں ہندو مذہب کے احکام و نواہی کی مستند کتاب ہے۔ اس عنوان کا مطلب ہے مافل و دل۔ یعنی مصنف نے چند الفاظ کے کوزے میں ہندو مذہب کے بے پایاں سمندر کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ متاکشر دراصل تلخیص ہے یاگیہ ولکیہ سمرتی کی۔ چونکہ موخر الذکر کتاب عام فہم انسانی سے بالا تھی اس لئے گسائیں وگیانیشور نے اسے اپنی صوابدید سے مختصر کر کے متاکشر نام رکھا۔ وگیانیشور کلیان (بیدر) کے راجہ وکرمارک کا متوسل تھا۔ جس کا عہد ۱۰۷۶-۱۱۲۷ء ہے۔ لیکن خود متاکشر کی بھی شرحیں لکھی گئیں ہیں اس کی دو شرح سبودھنی اور بالم بھٹی کا پتہ چلتا ہے[1]

---

[1] متاکشر مع وشوار روپا مرتبہ ایس ایس سیٹیلر، مدراس ۱۹۱۲ء (مقدمہ) اس میں سبودھنی اور بالم بھٹی کی شرحیں شامل ہیں۔

دیوہار بالم بھٹی (شرح متاکشر) مرتبہ نتیانند پنت پرتیہ، بنارس ۱۹۱۲ء، (مقدمہ) ص ۳۱-۲۰

عہد اورنگزیب میں لعل بہاری ولد سرائے سکسینہ نے اسے فارسی میں منتقل کیا۔ مترجم قنوج کے مضافات بھوجپور کا باشندہ اور اللہ وردی خاں عالمگیری کا وظیفہ خوار تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ چونکہ اس عہد میں ہندوستانیوں کو فارسی نظم ونثر سے بہت تعلق ہے اس لیے میں نے اس ترجمہ کا فیصلہ کیا۔ مگر کتاب کی سنسکرت خاصی مشکل تھی۔ اس لیے اس نے ۱۰۶۸/۵۸-۱۶۵۷ میں شوبھا شنکر پنڈت ساکن اسلام آباد عرف منجھولی من توابع گورکھپور سے مشکل اشلوکوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا اور باقی خود کیا۔ پوری کتاب تین مقالہ اور مختلف فصل میں منقسم ہے[1] پہلا مقالہ آچار یعنی عبادات پر ہے۔ دوسرا بیوہار یعنی معاملات پر اور تیسرا پرایشچت یعنی کفارہ جات پر۔

رامائن

اوپر چندر من بیدل کی منظوم اور منثور رامائن کا ذکر ہو چکا ہے۔ بیدل سے پہلے گوپال بن سری گوبند نے ۱۰۹۲/۱۶۸۱ میں سمپورن رامائن فارسی نثر میں لکھی۔ گوپال کا کہنا ہے کہ اس سے قبل وہ بھاگوت کا دسواں اسکند فارسی میں لکھ چکا ہے۔ اور اب وہ رامائن مرتب کر رہا ہے مترجم کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"این ذرہ بیمثال گوپال بن سری گوبند کہ پیش ازین دشم اسکند بھاگوت از زبان ... پنڈت جیو شنیدہ، بہ زبان فارسی ترتیب یافت، ادیای ہم رامائن نیز کہ از زبان حقیقت بیان ... رکھی برآمدہ است، از پنڈت مذکور شنیدہ، بہ زبان فارسی مرتب نماید"۔[2]

بدقسمتی سے اس پنڈت کا نام معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہ جگہ کرم خوردہ ہے۔ آخر میں جو کتاب کی تاریخ درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوپال کی عمر اس وقت ۴۲ سال کی تھی۔

زیمن لطف شاہ ملک لاریب   رسیدہ در دلم آوازی از غیب

---

[1] مِتاکشرا (فہرست میں مت اچھرا لکھا ہے)، مخطوطہ علی گڈھ نمبر ۴۵ فارسی، ورق ۳ ، ۲

[2] رامائن ایشیاٹک، کرزن نمبر ۶۸۲، ورق ۲۔

بہ سن چہل و دو عمرت رسیدہ	کس از دستت نکو کاری ندیدہ

"کلام جانفزای رام اوتار"[1]

۱۰۹۲ ھ

(ب) موسیقی

پارجاتک اورنگزیب کا عہد موسیقی کے لئے بدنام ہے۔ لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ موسیقی کی کئی معیاری کتابیں اس دور میں لکھی یا ترجمہ کی گئیں۔ اس سلسلہ میں مقدم الذکر مرزا روشن ضمیر کی پارجاتک ہے۔ مرزا روشن ضمیر اپنے عہد کے مشہور عالم و فاضل تھے۔ عربی، فارسی اور ہندی میں انھیں یکساں قدرت تھی۔ موخرالذکر دونوں زبانوں میں بالترتیب ضمیر اور نیہی کے تخلص سے شعر کہتے تھے۔ اورنگزیب نے ان کی ایک رباعی پر انھیں سات ہزار روپیہ انعام دیا تھا۔[2]

روشن ضمیر نے اپنی حسین انشا کی دو ایک یادگار چھوڑی ہے۔ ایک مناظرہ "چشم و زبان" ہے یہ ایک دلچسپ انشائیہ ہے کہ مجھے بادشاہ کا فرمان ملا تو میں نے جگہ جگہ پڑھ کر سنایا۔ اس پر آنکھ سرخ ہو گئی کہ اگر میں نہ ہوتی تو زبان کیسے پڑھتی۔ اور زبان بولی کہ اگر میں مدد نہ کرتی تو آنکھ کے دیکھنے کا کیا فائدہ تھا۔ اس کے آخر میں اورنگزیب کے جلوس کی منظوم تاریخ ہے۔[3] اس کے علاوہ نواب سعید خاں نے ایک بیاض مرتب کی تھی جس پر روشن ضمیر نے دیباچہ لکھا تھا۔[4]

شیر خاں لودی نے روشن ضمیر کا ذکر احترام سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرزا میرے والد کے دوست تھے اور مجھے اکثر ان کی صحبت میں جانے کا اتفاق ہوا مگر میں اتنا چھوٹا تھا کہ ان کی محفل سے استفادہ نہیں کر سکا۔[5]

۱؎ ایضاً ورق ۱۱۹۔
۲؎ خزانہ عامرہ ص ۲۹۷
۳؎ بیاض بانکی پور نمبر ۱۰۸۸، ورق ۱۲۲۔
۴؎ مجمع الافکار، بانکی پور، نمبر ۸۶۰، ورق ۳۶۔
۵؎ مرآۃ الخیال ص ۱۶۲۔

اورنگزیب نے مرزا روشن ضمیر کو سورت کا بخشی اور وقائع نگار مقرر کیا تھا[1] اور وہیں ۱۰۷۶/۶۶-۱۶۶۵ میں آپ کا انتقال ہوا[2]

پارجاتک سنسکرت میں موسیقی پر اہوبل کی کلاسیکی کتاب ہے[3]۔ چونکہ روشن ضمیر خود علم موسیقی کے استاد تھے، اس لئے ان کا ترجمہ مستند اور معیاری ہے۔ شیر خاں کا بیان ہے کہ روشن ضمیر نے موسیقی پر عربی، فارسی اور ہندی میں اور کتابیں بھی تصنیف کی تھیں[4] مگر ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ فارسی پارجاتک سنسکرت کتاب کا ترجمہ بھی ہے اور تشریح بھی۔ جہاں کہیں روشن ضمیر نے اہوبل سے اختلاف کیا ہے یا مزید توضیح کی ہے وہاں "مترجم گوید" کا ٹکڑا اضافہ کر دیا ہے۔ اسی طرح اصل کتاب کے بعض غیر ضروری قصے چھوڑ دیے ہیں۔

"صاحب پارجاتک درین مقام کتھا کہ عبارت از قصہ است، نقل کردہ، چون بیان او دخلی بہ فن رقص نداشت، ترجمہ آن ننمود"[5]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشن ضمیر کے سامنے اصل پارجاتک اور اس کی شرح دونوں کتابیں تھیں جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:۔

"اگرچہ از توضیح شارح ہم تعین استھان سرہای مذکور مشخص نشد، اما این قدر معلوم گشت کہ چوں ماتن وشارح ہر دو باین عبارت گفتہ اند"[6]

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۱۶۲؛ مجمع النفائس ورق ۲۸۵۔ خان آرزو نے نصر آبادی کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ روشن ضمیر 'صاحب بندر سورت' تھے۔

[2] مرآۃ الخیال ص ۱۶۲۔ ریو نے (۱۰۸۸/۳) بحوالہ مرآت جہان نما تاریخ محمدی روشن ضمیر کی تاریخ وفات ۱۰۸۰/۷۰-۱۶۶۹ درج کی ہے۔

[3] سنسکرت پارجاتک مع ہندی ترجمہ بعنوان سنگیت پارجات ہاتھرس سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

[4] مرآۃ الخیال ص ۱۶۲

[5] پارجاتک، مخطوطہ علی گڑھ، ورق ۹۷۔

[6] ایضاً ورق ۴۳۔

لیکن پھر بھی مترجم کی تسکین جہاں کہیں نہیں ہوئی، اس نے اپنی طرف سے اس نکتہ کو واضح کیا اور اسے تفصیل سے بیان کیا[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روشن ضمیر صرف پارجاتک کے مترجم ہی نہیں بلکہ اس فن پر ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا تھا۔

اصل پارجاتک میں خاتمہ میں نقالی کا بیان ہے۔ لیکن روشن ضمیر نے یہ حصہ ترک کردیا ہے اور اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔

ایک مفید اور دلچسپ بات یہ ہے کہ روشن ضمیر نے کتاب کے شروع میں ہندی کے مخصوص الفاظ کی املا کے لئے چند اصول وضع کئے ہیں۔ مثلاً ہندی کے مختلف نون یا مرکب حروف کی املا کے لیے مخصوص قواعد درج کئے ہیں۔ تقریباً اسی طرح کے قواعد تحفۃ الہند میں بھی نظر آتے ہیں۔

پارجاتک تین ابواب پر منقسم ہے۔ پہلا گیت کانڈ ہے جس میں گانے کے اصول و قواعد ہیں دوسرا وادیہ کانڈ ہے جس میں ساز کی بحث ہے۔ تیسرا کانڈ نرتیہ یعنی رقص سے متعلق ہے۔

راگ درپن

اس عہد میں موسیقی کی دوسری معیاری کتاب راگ درپن لکھی گئی۔ راگ درپن مان کتوہل کا ترجمہ اور تشریح ہے۔ اس کے مترجم اورنگزیب کے امیر فقیر اللہ[2] سیف خاں ہیں۔ اوپر ناصر علی سرہندی کی سرپرستی کے سلسلہ میں فقیر اللہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کا نام سیف الدین محمود اور عرف فقیر اللہ تھا۔ ان کے والد تربیت خاں عہد شاہجہاں کے امیر تھے۔ فقیر اللہ اسی عہد میں شاہی ملازمت میں داخل ہوتے۔ اورنگزیب کی تخت نشینی کے بعد فقیر اللہ نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور مختلف جنگوں میں فتح حاصل کی۔ راگ درپن میں انھوں نے دارد اور گلگت کی فتح کا ذکر کیا ہے[3] ان فتوحات سے خوش ہو کر اورنگزیب نے انھیں سیف خاں کا خطاب عطا کیا۔

---

[1] ایضاً ورق ۴۲ — [2] ایتھے (نمبر ۲۰۱۷) نے فخر اللہ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے

[3] مان سنگھ اور مانکتوہل (ہندی ترجمہ راگ درپن) ہری ہرنواس دویدی، گوالیار، ۱۹۵۴ء ص ۴۹-۴۷۔

سیف خاں دن بدن ترقی کرتے رہے۔ انھیں باری باری کشمیر، الہ آباد اور ملتان کی گورنری عطا ہوئی لیکن بیچ میں دوبار انھیں اپنے عہدہ سے سبکدوش کیا گیا۔ راگ درپن میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ۱۰۷۱/۶۱-۱۶۶۰ء میں اورنگزیب مجھ سے ناراض ہو گیا۔ لیکن ۱۰۷۷/۶۷-۱۶۶۶ء میں جب بادشاہ کشمیر جانے لگا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور مجھے وہاں کی صوبیداری عنایت کی۔[1] اس کے بعد انھیں ملتان اور الہ آباد کی گورنری ملی۔[2] ۱۰۹۵/۸۴-۱۶۸۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

اس بیکاری کے دور میں فقیر اللہ کو کہیں سے مان کتوہل کا ایک نسخہ ہاتھ آگیا۔ یہ کتاب گوالیار کے راجہ مان سنگھ تنور (۱۴۸۶-۱۵۱۸ء) نے اپنے دربار کے ماہرین موسیقی سے لکھوائی تھی مان سنگھ کے دربار میں اتفاق سے موسیقی کے تمام عبقری جمع ہو گئے تھے۔ ان میں محمود لوہنگ، نایک کرن اور نایک بخشو وغیرہ اپنے فن کے امام تھے۔ خود مان سنگھ موسیقی کا شیدائی اور استاد تھا۔ دھرپد کی ایجاد اسی نے کی ہے۔ غرضکہ ان عبقریوں کی مدد سے ایک کتاب تیار ہوئی اور راجہ کے نام پر اس کا نام مان کتوہل رکھا گیا۔[3] فقیر اللہ نے جب اس کتاب کا ترجمہ شروع کیا تو بہت سی جگہ وہ تشنہ یا مبہم نظر آئی اس لئے انھوں نے مختلف کتابوں کی مدد سے اس میں مزید اضافہ کر دیا تاکہ اس کتاب کے قاری کو کلاسیکی موسیقی کی تینوں قدیم کتابوں بھرت سنگیت، سنگیت درپن[4] اور سنگیت رتناکر کی ضرورت نہ پڑے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جن کتابوں سے مدد لی ان

---

[1] ایضاً ص ۱۴۶۔ [2] مآثر الامرا ۲/ ۸۵-۴۷۹۔

[3] راگ درپن (الف)۔ علی گڈھ، سبحان اللہ، ورق ۳ (اس جلد میں راگ درپن کے دو مخطوطے ہیں اور ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہیں حوالہ میں پہلے نسخہ کو الف اور دوسرے کو ب کہا گیا ہے۔

[4] سنگیت درپن مصنفہ چتر دامودر پنڈت (۱۶۲۵ء) کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا تھا۔ جس کا حوالہ سر ولیم جونس نے اپنے ایک مضمون 'میوزیکل موڈس آف دی ہندوس' میں کیا ہے۔ (اے شارٹ ہسٹری آف میوزک آف دی اپر انڈیا، پنڈت وی۔ این۔ بھتکنڈے، ص ۵۲)

کے نام ہیں رسالہ سید منصور ترتیہ ترتی اور راگ پرکاش شیخ محمد صالح[1] فقیر اللہ نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ عہد اکبری کے موسیقاروں نے بھی ایک کتاب راگ ساگر کے نام سے لکھی تھی مگر میں نے اسے ترجمہ کے لیئے منتخب نہیں کیا کیونکہ تان سین اور عہد اکبری کے دوسرے موسیقار عطائی تھے۔ یعنی عملی موسیقی پر انھیں قدرت تھی لیکن علم موسیقی پر انھیں عبور نہیں تھا۔ اس کے برخلاف مان سنگھ کے دربار میں تمام علمائے موسیقی جمع ہو گئے تھے[2]

فقیر اللہ کو مان کتوہل کا نسخہ ۶۳/۱۰۷۳ - ۱۶۶۲ میں ہاتھ آیا[3]۔ اور انھوں نے اسے فارسی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ کتاب کے متعدد حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۶۶/۱۰۷۶ - ۱۶۶۵ میں راگ درپن مکمل ہو چکی تھی، یا اختتام کے قریب تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

'دبالفعل کہ ۱۰۷۶ باشد'[4]

اسی طرح خوشحال خاں کے حال میں لکھتے ہیں کہ آج یعنی ۱۰۷۶ھ میں کلاونتوں میں اس کا جواب نہیں[5]۔ مگر بعض دوسرے اشاروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راگ درپن میں ترمیم و اصلاح کا کام جاری رہا۔ خود کتاب کے خاتمہ میں فقیر اللہ نے ۶۷/۱۰۷۷ - ۱۶۶۶ میں اورنگزیب کے حضور میں اپنی طلبی کا ذکر کیا ہے[6]۔ ایٹن کالج کے ایک مخطوطہ پر ۶۴/۱۰۷۴ - ۱۶۶۳ کی تاریخ درج ہے[7]۔ فقیر اللہ نے یہ کتاب اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ ممکن ہے ناراض بادشاہ کو خوش کرنے کی یہ بہترین ترکیب ہو۔ ان کا خیال تھا کہ جب بادشاہ کی خدمت میں

---

[1] راگ درپن (الف) ورق ۳ [2] راگ درپن (ب) ورق ۱۵

[3] ایضاً ورق ۲ [4] ایضاً ورق ۳

[5] ایضاً ورق ۱۹ [6] راگ درپن (ہندی ترجمہ) ص ۱۴۶

[7] فہرست مخطوطات ایٹن کالج، مرتبہ ڈی ایس مارگولیتھ، آکسفورڈ، ۱۹۰۴، نمبر ۲۱۲

اسے پیش کروں گا تو اس کی مدح بھی شروع میں رقم کروں گا۔[1] مگر ہمارے مصنف کو یہ سعادت نہیں ملی اور اس طرح گویا یہ کتاب انتساب سے محروم رہ گئی۔

راگ درپن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیر اللہ خود موسیقی کے استاد اور موسیقاروں کے سرپرست تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ مختلف راگوں کو ملا کر میں نے چند نئے راگ نکالے ہیں۔[2] دوسری جگہ کہتے ہیں میں نے انھیں مغنیوں اور سازندوں کا ذکر کیا ہے جن کے ساتھ سنگیت میں میں نے خود حصہ لیا ہے یا جو اورنگزیب کے دربار میں موجود تھے۔[3] اس سلسلہ میں وہ مختلف اساتذہ سے ملتے تھے اور معلومات حاصل کرتے تھے۔ کشمیر میں (جہاں راگ درپن مکمل ہوئی) انھیں موسیقی کے عالم نہیں ملے۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں ہزاروں نہیں لاکھوں روپے خرچ کر دیے۔[4]

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا راگ درپن ترجمہ نہیں بلکہ مان کتوہل کی بنیاد پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت اس اعتبار سے بھی انمول ہے کہ اصل مان کتوہل کے وجود کا کہیں علم نہیں۔ اس لئے اس میں بہت سی ایسی باتوں کا ضمنی طور پر ذکر آ گیا ہے جو آج موسیقی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

راگ درپن دس ابواب پر مشتمل ہے۔ آخری باب تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس میں ان موسیقاروں کا ذکر ہے جو فقیر اللہ کے دور حیات میں گذرے یا ابھی زندہ تھے۔ ذیل میں ان کی مختصر فہرست دی جاتی ہے۔[5]

۱۔ شیخ بہار الدین۔ برناوہ (ضلع میرٹھ) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے دکن میں سنگیت

---

[1] راگ درپن (ہندی ترجمہ) ص ۱۵۰۔ [2] ایضاً ص ۸۱

[3] ایضاً ص ۱۴۵۔ [4] ایضاً ص ۱۵۲،۱۵۰

[5] راگ درپن (ب) ورق ۲۰-۱۶۔

سیکھی اور مارگی میں ید طولی حاصل کیا۔ کبت، دھرپد، خیال اور ترانہ میں ماہر تھے۔ ان کے دو شاگرد نفیز اللہ کے ساتھ رہتے تھے۔

۲۔ میاں ڈالو ڈھاڑی: سرود میں لاجواب تھے

۳۔ لعل خاں کلاونت: ان کا خطاب گن سمندر خاں تھا۔ وہ تان سین کے لڑکے بلاس خاں کے شاگرد اور داماد تھے۔

۴۔ جگن ناتھ: تان سین کے بعد ان جیسا کبت کسی نے نہیں لکھا۔

۵ مصری خاں: بلاس خاں کے شاگرد اور شہزادہ شجاع کے متوسل تھے۔

۶۔ سہیر سین: تان سین کا نواسہ۔

۷۔ میر صالح قوال

۸۔ حسن خاں لوہار۔

۹۔ کشن سین۔ کبت کا ماہر تھا۔ نایک افضل خطاب تھا

۱۰۔ شیخ کمال۔ میاں ڈالو کا شاگرد اور فوج میں ملازم ہے۔

۱۱۔ بخت خاں گجراتی کلاونت۔ میں نے اسے دیکھا ہے مگر سنا نہیں

۱۲۔ رنگ خاں کلاونت۔ شاہجہاں سے متعلق تھا۔

۱۳۔ خوشحال خاں پسر لعل خاں۔ آج کلاونتوں میں اس کا جواب نہیں۔

۱۴۔ سواد خاں ڈھاڑی۔ وطن فتحپور۔

۱۵۔ کشن خاں کلاونت۔ شجاع سے متعلق تھا۔ بنگال میں وفات پائی۔

۱۶۔ ولی ڈھاڑی۔ اکبر آباد میں گذرا

۱۷۔ شیخ سعد اللہ لاہوری۔ میرے ساتھ رہتا ہے۔

۱۸۔ محمد باقی۔ افیم کھانے سے گلا خراب ہو گیا ہے۔

۱۹۔ بایزید خاں کلاونت۔

۲۰۔ زورا قوال ۔

۲۱۔ کبیر قوال

۲۲۔ تلسی رام کلاونت

۲۳۔ دھرم داس کلاونت ۔ بڑھاپے سے آواز خراب ہوگئی ہے۔ آگرہ میں منزوی ہے۔

۲۴۔ رحیم داد ڈھاڑی

۲۵۔ میر عماد ۔ ہرات کے سید ہیں۔ زندہ ہیں ۔

۲۶۔ عید سنگھ ۔ مجھ سے ملتا رہتا ہے ۔

۲۷۔ ہمیر سین اور اس کا لڑکا سہیل سین ۔

۲۸۔ سید خاں نوہار۔ دھرپد کا ماہر۔

ان مغنیوں کے علاوہ بعض سازندے بھی اپنے فن میں مشہور ہیں۔ ان میں پرش نین اور سکھی نین (بایزید کا شاگرد) اورنگزیب کے منظور نظر ہیں۔ جباتی خانی میرے پاس ہے۔ کروائی اور طاہر بہترین مردنگ نواز ہیں۔ فیروز ڈھاڑی اور بھگوان پکھاوج کے ماہر ہیں۔ موخرالذکر نے تان سین کے ساتھ پکھاوج بجائی تھی۔ اللہ داد سارنگی نواز ہے اور محمد رس وین بینا کا استاد ہے شوقی اور ابوالوفا طنبور میں ماہر ہیں[1]

مفتاح السرود مفتاح السرود ہندوستانی موسیقی پر قاضی حسن بن خواجہ طاہر بن خواجہ محمد کی کتاب ہے۔ مصنف پرگنہ انتور (دولت آباد) کا قاضی تھا۔ اور اس نے یہ تصنیف ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ میں لکھی[2]۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں قاضی حسن کی جو تصنیف ہے اس کا نام مصباح السرور اور اس کا سن تصنیف محرم ۱۰۷۴/ اگست ۱۶۶۳ ہے۔

---

[1] راگ درپن (ہندی ترجمہ) ص ۴۴ - ۱۴۲ -

[2] بوڈلین ۳/ نمبر ۲۸۴۶ -

"این رسالہ در محرم سن شش جلوس اورنگزیب بہادر مطابق ۱۰۷۴ موافق حوصلہ خود در سلک تحریر کشید و نام این رسالہ مصباح السرور نہادہ۔ تمام تفصیل در چہار باب آوردہ"[1]

یہ چار باب راگ راگنی موسم اور راگ۔ اور ساز وغیرہ کے اقسام سے متعلق ہیں۔

مصباح السرور ۲۴ اوراق کا مختصر رسالہ ہے۔ ممکن ہے بعد میں اسی کا اضافہ کر کے مصنف نے مفتاح السرود مرتب کیا ہو۔ کیونکہ انڈیا آفس لائبریری میں مفتاح السرور کے نام سے ایک تلخیص مفتاح السرود کی ہے[2] قاضی حسن نے اس سے پہلے ۱۰۷۳/۶۳-۱۶۶۲ میں سرود البحر کے نام سے بھی موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی[3] ان کی ایک تصنیف مفتاح الفرس کا بھی ذکر ملتا ہے[4]

مصنف کا کہنا ہے کہ اگرچہ موسیقی شرعاً جائز نہیں ہے لیکن دل اس کی طرف بہر حال کھنچتا ہے۔ جب خدا نے ارواح کو جسم میں داخل ہونے کا حکم دیا تو روحیں آمادہ نہیں تھیں۔ خدا نے فرشتوں کو الحان کا حکم دیا۔ اس ملکوتی الحان سے متاثر ہو کر ارواح جسم میں داخل ہو گئیں۔ اس سے موسیقی کی تاثیر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے[5]

مصنف کہتا ہے کہ موسیقی کی چار مستند کتابیں ہیں۔ سنگیت رتناکر، روپ رتناکر، سنگیت مکرند اور بھرت سنگیت۔ ان میں اول الذکر تین کتابیں دکن میں مقبول ہیں۔ لیکن بھرت سنگیت ہندوستان (یعنی شمالی ہندوستان) میں زیادہ معتبر مانی جاتی ہے[6]

معرفۃ النغم معرفۃ النغم میں ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کا بیان ہے۔ اس کا مصنف ابوالحسن قیصر اور اس کا سال تصنیف ۱۰۸۷/۷۷-۱۶۷۶ ہے۔ قیصر کا کہنا ہے کہ اس نے

---

[1] مصباح السرور، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۶۲۹، ورق ۴۔ نیز سالار جنگ نمبر ۱۴۲۲/۱۳ یہاں بھی نام مفتاح السرود لکھا ہے۔

[2] ایتھے نمبر ۱۴۷۲

[3] سالار جنگ نمبر ۱۴۱۷/۸

[4] ایضاً نمبر ۱۹۴۰/۳۸

[5] مصباح السرور، ایشیاٹک، ورق ۲

[6] ایضاً ورق ۳۔

متعدد کتابوں کی مدد سے یہ نسخہ تیار کیا ہے۔ کتاب مقدمہ، دو مقالہ اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔[1]

شمس الاصوات شمس الاصوات کسی ہندی کتاب 'سنگیت' کا ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام رس برس ہے جو خوشحال خاں کلاونت کا لڑکا تھا۔[2] مصنف کا بیان صحیح ہے کہ اس کا باپ بھی موسیقی کا استاد تھا اور تان سین سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہ کتاب ۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷ میں مکمل ہوئی۔ "جای نغمہ" تاریخ ہے۔ پوری کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے۔

(۱) سر (۲) راگ (۳) الاپ (۴) اقسام گیت (۵) قوانین دستک زدن (۶) ساز۔[3]

تشریح الموسیقی محمد اکبر ارزانی اس عہد کا مشہور طبیب تھا۔ اس کی طبی تصانیف کا ذکر آگے آئے گا۔ اس نے تان سین کی بدھ پرکاش کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا نام تشریح الموسیقی رکھا۔[4] تان سین کی تصانیف میں بدھ پرکاش کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس طرح مانکتوہل کی طرح بدھ پرکاش بھی صرف ترجمہ کی شکل میں موجود ہے۔

رسالہ موسیقی ملا عیوض بیگ نے شہزادہ محمد اعظم کے لیے موسیقی پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ شہزادہ اعظم کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس عہد کی مشہور کتاب تحفۃ الہند بھی جو ہندوستانی علوم کا خزانہ ہے، شہزادہ کے نام معنون ہے۔ ملا عیوض بیگ کے رسالہ میں دیباچہ اور ۱۳ فصلیں ہیں۔[5]

---

[1] بوڈلین ۲/ نمبر ۱۸۵۰۔ [2] فہرست سالار جنگ نمبر ۱۴۱۸/۹ ؛ راگ درپن (ب) ورق ۱۹

[3] راس وبراؤن، نمبر ۵۰۔

[4] اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۴۷ء (مخطوطہ ذخیرہ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

[5] فہرست مخطوطات درگاہ لائبریری، اچ شریف گیلانی (بھاولپور) مرتبہ غلام سرور، بھاولپور، ۶۰-۱۹۵۹ء ص ۱۳۹، نمبر ۲۶۶ (۹)

باب ۱۰

تاریخ

(۱) عام تاریخ

طراز الاخبار

طراز الاخبار دنیا کی عام تاریخ ہے۔ اس کا مؤلف نجم الدین احمد بن فضل اللہ خوزانی[1] ہے، وہ احمد بیگ خاں اصفہانی کے نام سے معروف اور امیر نجم ثانی کے خاندان سے تھا۔ اسٹوری کا بیان ہے کہ مؤلف نجم ثانی کا داماد تھا۔[2] نجم ثانی لقب کے دو شخص گذرے ہیں اول مرزا یار احمد خاں اصفہانی (م۔ ۹۱۸/۱۵۱۲) جو شاہ اسمٰعیل صفوی کا امیر تھا۔ دوسرا باقر خاں ہے جو جہانگیر کے عہد میں ملتان، اودھ اور الہ آباد کا گورنر تھا اور جس کا انتقال

---

[1] خوزان اصفہان کے پاس ایک گاؤں ہے (اسٹوری ۱/۱۲۶)۔ ایتھے (نمبر ۱۲۲) کا یہ بیان صحیح نہیں کہ فضل اللہ خوزستان کا رہنے والا تھا جو جنوب مغربی ایران کا صوبہ ہے۔

[2] اسٹوری ۱/۱۲۶۔

۴۸/۱۰۴۹-۱۶۳۸ء میں ہوا۔[1] غالباً ہمارے مؤلف کا تعلق مؤخرالذکر نجم ثانی سے تھا۔

طراز الاخبار دکن میں عہد اورنگزیب کے اوائل میں تالیف ہوئی۔ لیکن اس کا آغاز ۱۰۵۲ ۶۳-۱۶۶۲ء میں ہوچکا تھا۔ اس میں علاوہ مقدمہ اور خاتمہ کے دو افتتاح یا ابواب ہیں۔[2]

تحفۃ الاخبار زیب النساء کی سرکار میں جن لوگوں نے علم و فن کی خدمت کی، ان میں ملا صفی بن ولی قزوینی مشہور ہیں۔ انھوں نے شہزادی کے ایما پر تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ زیب التفاسیر کے نام سے شروع کیا۔ اس کی پانچویں جلد جس میں سورۃ انفعال سے سورۃ یوسف تک شامل ہے ۷۱/۱۰۸۱-۱۶۷۰ء میں مکمل ہوئی۔[3] ملا صفی اس کے بعد حج کو چلے گئے۔ انھوں نے اپنے حج کے تاثرات، اور حرمین کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں اپنی دوسری کتاب انیس الحجاج میں کیا ہے۔ یہ کتاب ۷۸/۱۰۸۸-۱۶۷۷ء میں تصنیف ہوئی۔[4]

ملا صفی زیب النساء کی سرکار سے متعلق ہونے سے پہلے اصالت خاں فوجدار مراد آباد (م۔ ۶۶/۱۰۷۶-۱۶۶۵ء) کے ملازم تھے۔ درحقیقت وہ اصالت خاں کی وفات کے بعد شہزادی کی خدمت میں آئے۔ مراد آباد میں رہ کر انھوں نے اپنے آقا کے نام پر ایک عام تاریخ تحفۃ الاخبار کے نام سے مرتب کی۔ اس کا سال تالیف ۶۶/۱۰۷۶-۱۶۶۵ء ہے۔ تحفۃ الاخبار کی صرف پہلی جلد ملتی ہے۔ اس میں قدیم پیغمبروں سے لیکر آنحضور، خلفا اور مسلمان حکمرانوں کا ذکر ہے۔ یہ جلد خوارزم شاہیوں کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔[5]

---

[1] مآثر الامرا ۱/۴۰۹۔

[2] ایتھے نمبر ۱۲۲۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں (بحوالہ اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۲۶ء، ص ۵۸) مصنف کا خود نوشت نسخہ موجود ہے، مگر انڈیا آفس کے نسخہ کی طرح وہ بھی نامکمل ہے۔ [3] بوڈلین نمبر ۱۸۱۰، مآثر عالمگیری ص ۵۳۹۔ [4] انیس الحجاج (دار المصنفین، اعظم گڈھ) ورق ۲-۱۔ ملاحظہ ہو مضمون شاہ معین الدین احمد، معارف، جنوری ۱۹۶۴ء۔ [5] ریو ۱/۱۲۵؛ ۳/۱۰۸۰۔

تحفۃ الاخبار کے ایک نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس کا نام قصہ سلاطین متقدمین رکھا تھا۔ اور اسے چار قسم میں منقسم کیا تھا۔

"مؤلف این مختصر . . . محمد صفی بن ولی ساکن قزوین در سال ہزار و ہفتاد و ششم در قصبۂ مراد آباد . . . در ظل عاطفت . . . اصالت خان . . . بہ تالیف این رسالہ کہ موسوم بہ قصہ سلاطین متقدمین پرداخت و بہ عبارت بی تکلفانہ مودی و بر چہار قسم مرتب ساخت۔" [1]

مرآۃ العالم مرآۃ العالم میں ابتدائے تاریخ سے اورنگزیب کے دسویں سن جلوس ۱۰۷۸/ ۱۶۶۸ تک کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب عموماً اورنگزیب کے خواجہ سرا بختاور خاں کی طرف منسوب کی جاتی تھی مگر جدید مورخین کا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب دراصل شیخ محمد بقا سہارنپوری کی تصنیف ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد بقا نے مرآۃ العالم کی تالیف میں بختاور خاں کے معاون کی حیثیت سے کام کیا جیسا کہ مؤلف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مسودات کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھتے تھے اور یہی نقل بعد میں مرآۃ جہاں نما کے نام سے ان کے پسماندگان نے شائع کی۔ تاریخ کی ترتیب میں عموماً ایک یا زیادہ معاونین ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ کہ مرآۃ العالم سرے سے بختاور خاں کی تالیف نہیں، صحیح نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ خان مذکور نے اور کتابیں بھی مرتب کی ہیں جن کا بیان آگے آئے گا۔ دوسرے یہ کہ مرآۃ العالم میں مؤلف کے ذاتی حالات کا بار بار ذکر آتا ہے اور ان کو خارج کردینے کے بعد کتاب بہت حد تک تشنہ ہو جائیگی نیز تمام قدیم تذکرہ نگار مرآۃ العالم کو بختاور خاں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم

---

[1] تحفۃ الاخبار، ایشیاٹک سوسائٹی، کرزن نمبر ۵، ورق ۱۔ ؂ ریو، ۳/ ۱۰۸۰؛ ایتھے نمبر ۱۲۴۔

[2] مرآۃ العالم، ورق ۶۶۶۔

حوالہ مآثر عالمگیری[1] میں ہے۔ جس کا مؤلف مستعد خاں بختاور خاں کا منشی تھا۔ مآثر الامرا اور مآثر الکرام میں بھی مرآۃ العالم بختاور خاں کی تالیف بتائی گئی ہے[2]

مرآۃ العالم کا مؤلف عبدالرحمن بختاور خاں اورنگزیب کے با اثر امرا میں تھا۔ تخت نشینی کے بعد بادشاہ نے اسے خانی کا منصب عطا کیا اور ۱۳ ویں سن جلوس (۱۶۷۰ء) میں اسے داروغہ خواصان کا عہدہ عنایت کیا۔ بختاور خاں علم و ادب کا دلدادہ اور شعر و سخن کا سرپرست تھا۔ شعرا اس کی تعریف میں قصیدے اور نظمیں کہتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ ان مدحگو شعرا میں ہمیں سرخوش[3]، سید کبیر علوی اور عبداللطیف قیصر کے نام نظر آتے ہیں[4]۔ بختاور خاں کو تعمیر سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس نے ۱۰۸۲/ ۷۲ - ۱٦۷۱ میں دہلی کے قریب ایک آبادی بختاور نگر بسائی جس کی تاریخ سرخوش نے کہی[5]:

شادو خرم رو برآور "راہرو" — گفت "بختاور نگر آباد باد"
۴۱۲ — ۱۴۹۴ - ۴۱۲ = ۱۰۸۲ھ

اس سے چار سال قبل وہ ایک سرائے کی تعمیر کر چکا تھا۔ اور دو سال بعد ۱۰۸۴/ ۷۴-۱٦۷۳ میں اس نے ایک مسجد بنوائی۔ ۱۰۸۷/ ۷۷-۱٦۷٦ میں ایک باغ کی تعمیر کی[6]۔ مرآۃ العالم میں بختاور خاں کی عمارتوں کا تفصیلی ذکر ہے۔

بختاور خاں نے تئیس سال تک اورنگزیب کی خدمت کی۔ اس کا انتقال ۵ ربیع الاول ۱۰۹٦/ ۹ فروری ۱٦۸۵ کو ہوا۔ اورنگزیب نے خود جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اس نے اپنی حیات میں بختاور نگر میں اپنا مقبرہ بنوایا تھا۔ وہیں دفن ہوا[7]۔ سرخوش نے یہ تاریخ وفات کہی:

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۲۵۳۔
[2] مآثر الامرا ۱/ ۴ : مآثر الکرام ص ۸۴۔
[3] کلمات الشعرا ص ۲٦
[4] مرآۃ العالم ورق ٦۷۹، ٦۸۳۔
[5] مرآۃ العالم، ورق ٦۵۵، کلمات الشعرا ص ۲٦
[6] مرآۃ العالم ورق ٦۵٦ - ٦۵۵۔
[7] بختاور خاں کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: عالمگیر نامہ ص ۸۷۰، ۹٦۰؛ مآثر عالمگیری ص ۹۸، ۱۳۷، ۱۴۰، ۲۵۳ وغیرہ۔

خرد خواست تاریخ فوتش زدل　　　بگفتا کہ "کو قدر دان سخن"
۱۰۹۵ھ

بختاور خاں کی دیگر تصانیف میں بعض موجود ہیں اور بعض ضائع ہو گئیں۔ مرآۃ العالم سے اس کی جن تصانیف کا علم ہوتا ہے وہ اس طرح ہیں:۔

۱۔ چہار آئینہ:۔ اورنگزیب کی جنگ تخت نشینی کے حالات پر مشتمل۔

۲۔ انتخابات حدیقہ سنائی، منطق الطیر و مثنوی معنوی دریک جلد (مرتبہ ۱۰۷۶/۶۶-۱۶۶۵)

۳۔ انتخاب تاریخ الفی احمد (مرتبہ ۱۰۸۶/۷۶-۱۶۷۵)

۴۔ انتخاب دیوان صائب۔

۵۔ بیاض عالم آرا۔ ساقی نامے اور دوادین کا انتخاب۔

۶۔ سواد اعظم۔ دوسری بیاض (مولفہ ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱)

۷۔ دلکشا۔ انتخاب نظم۔ (مؤلفہ ۱۰۸۰/۷۰-۱۶۶۹)

۸۔ ریاض الاولیا۔ تذکرۂ اولیا (مرتبہ ۱۰۹۰/۸۰-۱۶۷۹)

۹۔ روضۃ الاحباب۔

۱۰۔ کتاب فتوی۔ قاضی ابو بکر کی عربی تصنیف کا فارسی ترجمہ۔

۱۱۔ خلاصۃ الخانیہ۔ حنفی فقہ پر ملا محمد کی تصنیف کا فارسی ترجمہ[1]۔

مرآۃ العالم کے مؤلف کا بیان ہے کہ وہ شروع سے تاریخ کے مطالعہ کا مشتاق تھا لیکن مستقل سفر کی وجہ سے وہ اپنے ساتھ زیادہ کتابیں نہیں لے جا سکتا تھا۔ اورنگزیب کی تخت نشینی کے بعد اسے ایک جگہ رہنے کا موقعہ ملا چنانچہ وہ اس کتاب کی تالیف میں مشغول ہو گیا۔ کتاب کی تکمیل ۱۰۷۸/۶۸-۱۶۶۷ میں ہوئی۔ مادۂ تاریخ "آئینہ بخت" ہے[2]۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف بعد میں اس میں حک و ترمیم کرتا رہا کیونکہ مرآۃ العالم میں ۱۰۹۴/۱۶۸۳ تک کے واقعات مندرج ہیں۔

---

[1] مرآۃ العالم ورق ۵۵-۶۵۲؛ ریو ا/۱۲۶۔ [2] ایضاً ورق ا۔ مارلے ص ۵۲۔

برٹش میوزیم کے ایک مخطوطہ[۱] کے آخر میں بختاور خاں کے متبنیٰ (جسے ڈاکٹر ریو محمد ساقی مستعد خاں سمجھتے ہیں) کی یہ تحریر ہے کہ اس نے اس کتاب کی تالیف میں بختاور خاں کی مدد کی اور ۱۰۹۶/ ۱۶۸۵ میں اس کی وفات کے بعد اورنگزیب سے اشاعت کی اجازت لی۔

مرآۃ العالم ایک مقدمہ، سات آرائش، دو افزائش اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ کتاب کا آخری حصہ بہت اہم ہے۔ اس میں ہمعصر مشائخ، علما، شعرا اور خطاطوں کے حالات درج ہیں۔ بعد کے مورخین نے مرآۃ العالم کے اسی حصہ سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ خوشحال چند بن جیون رام کی تاریخ محمد شاہی (مولفہ ۱۱۵۴/۴۲-۱۷۴۱) اور عبدالرحمن شاہنواز خاں کی مرآت آفتاب نما میں خطاطوں کا تذکرہ مرآۃ العالم سے ماخوذ ہے۔[۲]

آئینہ بخت ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ایک گمنام مخطوطہ ہے جس کے مندرجات مرآۃ العالم سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ موخر الذکر کی طرح وہ بھی اورنگزیب کے نام معنون ہے اور ایک جگہ یہ عبارت ملتی ہے 'جامع اوراق بہ خطاب بختاور خانی مامور گردید'۔[۳] کتاب کے نام کا کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ ذیل کی عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس کا نام آئینہ بخت ہے۔

'از پرتو بارقہ، خرد فیض آر ۔۔۔۔ م آئنہ بخت رونمود'،[۴]

اصل عبارت میں آئینہ (ی کے ساتھ) کے بجائے آئنہ (بغیر ی کے) ہے۔ اگر اس عنوان کو تاریخی نام مان لیا جائے تو اس سے ۱۰۶۸/۵۸-۱۶۵۷ کا سال نکلتا ہے جبکہ مرآۃ العالم کی تاریخ ۱۰۷۸/۶۸-۱۶۶۷ ہے۔ اسی بنا پر اوٗنوف[۵] وغیرہ کا یہ خیال ہے کہ غالباً یہ کتاب مرآۃ العالم کی اولین شکل ہے کیونکہ مؤلف آخر میں کہتا ہے کہ میں ایک مفصل تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں

---

[۱] ریو ۱/۱۲۵۔ [۲] اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۴ء

[۳] آئینہ بخت، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷، ورق ۱۰۰۔ [۴] ایضاً ورق ۳۔

[۵] ایشیاٹک ۲/ نمبر ۱، ابراوٗن فہرست (ضمیمہ) نمبر ۱۴۵۔

اس کتاب کی تقسیم چالیس معائنہ (ابواب) میں ہے۔

مرآت جہاں نما مرآت جہاں نما سابق الذکر کی مفصل روایت ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اصلاً شیخ محمد بقا نے بختاور خاں کے نام سے مرآۃ العالم کی تالیف کی تھی اور مؤخر الذکر کے نام سے اس کی اشاعت بھی ہوئی مگر شیخ محمد بقا کی وفات کے بعد ان کا مسودہ ان کے ورثا کے ہاتھ آیا اور انھوں نے ان کی کتاب کے دو مختلف ایڈیشن شائع کئے۔ پہلا ایڈیشن شیخ کے بھانجے محمد شفیع بن محمد شریف نے مرتب کیا[1]۔ اور دوسرا ایڈیشن شیخ کے چھوٹے بھائی محمد رضا نے مرتب کیا[2]۔

شیخ محمد بقا سہارنپوری شیخ عبد اللہ انصاری کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے جد اعلیٰ شیخ ضیاء الدین فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دلی آئے۔ شاہی دربار میں ان کا شایان شان استقبال ہوا۔ اور انھیں ملک مردان دولت کے خطاب کے ساتھ ملتان کی نظامت عطا ہوئی۔ ملک مردان کے ورثا سہارنپور میں آن بسے یہیں ۱۰۳۷/۲۸-۱۶۲۷ء میں شیخ محمد بقا کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد شیخ محمد (م۔ ۱۰۶۳/۵۳-۱۶۵۲) بدیع الدین سہارنپوری کے خلیفہ تھے۔ بقا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے سرہند جاکر شیخ عبد اللہ اور شیخ نور الحق دہلوی سے تکمیل کی تحصیل علم کے بعد شیخ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا مگر انھیں دنوں وہ شیخ محمد معصوم سرہندی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ اور ان پر تصوف کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے دنیاوی زندگی ترک کر دی۔ لیکن افتخار خاں میر خانساماں[3] کے اصرار پر بقا ملازمت کے لئے رضامند ہو گئے اور اورنگزیب کے چوتھے سن جلوس میں وہ شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔

---

[1] مرآت جہاں نما مرتبہ محمد شفیع۔ علی گڈھ، عبد السلام، ورق ۳۔

[2] ریو ۳/ ۱۰۱۸، براؤن فہرست (ضمیمہ) نمبر ۱۱۸۰۔

[3] ایلیٹ (۲۵۲/۷) نے افتخار خاں (م۔ ۱۰۹۲/۸۲-۱۶۸۱) کو بختاور خاں سے خلط ملط کر دیا ہے۔

غالباً اس کے بعد ہی وہ بختاور خاں کے معاون بنے ہوں گے۔ آخری عمر میں وہ اپنے وطن سہارنپور واپس چلے گئے۔ وہاں انھوں نے پہلے سے ایک محلہ بقاپورہ بسا رکھا تھا۔ وہیں ۲۲ شعبان ۱۰۹۴/ ۶ اگست ۱۶۸۳ کو ان کا انتقال ہوا۔ "بقا بدار بقا رفت" سے تاریخ نکالی گئی[1]

بقا کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے محمد شفیع نے جب ان کے مسودات کا جائزہ لیا تو اسے اس تاریخ کا علم ہوا۔ لیکن اول تو یہ مسودات انتہائی بے ترتیب صورت میں تھے اور دوسرے بقا کی انشا محمد شفیع کی فہم سے باہر تھی، لیکن موخرالذکر کچھ دنوں تک خاموش رہا۔ آخر جب اس نے ترتیب شروع کی تو معلوم ہوا کہ اصل متن میں جگہ جگہ خلا ہے چنانچہ اس نے تاریخ کی معتبر کتابوں سے وہ مقامات پر کئے۔ اصل متن میں انبیا کے حالات نہیں تھے۔ محمد شفیع نے اس کا بھی اضافہ کیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں تاریخ کی کوئی کتاب انبیا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ محمد شفیع نے یہ ترتیب ۱۰۹۵/۹۴-۱۶۸۳ میں مکمل کی۔ "مرآت جہاں نما شد" اس کی تاریخ ہے۔ اور چونکہ یہ تاریخ جامع جمیع اخبارات ہے اس لئے محمد شفیع نے اس کا عنوان مرآت جہاں نما رکھا[2]

محمد شفیع کے بعد بقا کے چھوٹے بھائی محمد رضا نے بھی مرآت جہاں نما کا ایک ایڈیشن مرتب کیا۔ رضا نے شفیع کے ایڈیشن کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے حالانکہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ اسے شفیع کے ایڈیشن کا بالکل علم نہ ہو۔ اسی طرح محمد شفیع نے اس مخصوص عنوان مرآت جہاں نما کی ایک وجہ پیش کی ہے مگر محمد رضا کا کہنا ہے کہ اس نے کتاب کا یہ مخصوص عنوان اپنے مرحوم بھائی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رکھا۔ رضا کا ایڈیشن ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ کے لگ بھگ تیار ہوا[3]

---

[1] ایلیٹ ۱۵۲/۷، ریو ۸۹۰/۲، مرآت جہاں نما (محمد شفیع) ورق ۲، ۳۰۷، وغیرہ۔

[2] مرآت جہاں نما (محمد شفیع) ورق ۳۔

[3] ایلیٹ ۱۵۲/۷۔

مذکورہ بالابیانات کی روشنی میں مرآۃ العالم پرشیخ محمد بقا کا حق پورا ثابت نہیں ہوتا. اول تو شیخ نے اپنے پاس جو مسودات چھوڑے تھے وہ نامکمل اور بے ترتیب تھے. انھوں نے بختاورخاں کے لیے یہ مواد فراہم کیا تھا. تاریخ کی تدوین میں ہمیشہ ایک سے زیادہ اشخاص مدد کرتے ہیں، لیکن اصل تصنیف کا سہرا مرتب کے سر ہوتا ہے. دوسری بات یہ بھی ہے کہ بختاورخاں تصنیف وتالیف کا شیدائی تھا. اس کی متعدد دیگر تصانیف پر بقا کی طرح کسی اور کا دعوی نہیں ہے.

مرأت جہاں نما پر محمد سلیم نے ۱۱۳۷/۲۴-۱۷۲۴ تک کے واقعات کا اضافہ کیا[1]. اور ۱۸۴۹ء میں نواب ضیاء الدین نیر رخشاں نے اس میں ترمیم واضافہ کیا[2].

مرأت جہاں نما مقدمہ، سات آرائش اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ساتویں آرائش میں اورنگزیب کا ذکر ہے اور اس کا عنوان آرائش کے بجائے پیرائش ہے.

انتخاب منتخب انتخاب منتخب محمد یوسف بن رحمت اللہ کی منتخب التواریخ (مولفہ ۱۰۵۶/۴۷-۱۶۴۶) کی تلخیص ہے۔ یہ تلخیص ٹھٹہ کے عبدالشکور بن شیخ عبدالواسع نے کی ہے. تلخیص کار نے آغاز میں اپنے خاندان کا مفصل حال دیا ہے. وہ کہتا ہے کہ میرے اجداد قریش سے تعلق رکھتے تھے اور محمد بن قاسم کے حملے کے دوران عرب سے آکر بھکر میں آباد ہوئے تھے وہ لوگ تجارت یا درس وتدریس کا کام کرتے تھے. میرے دادا ابوالقاسم بڑے عالم تھے وہ مرزا جانی بیگ ترخان والی ٹھٹہ کے اتالیق تھے اور اس کی تخت نشینی کے بعد ٹھٹہ کے صدر ہوگئے. جانی بیگ نے بارہ ہزار سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا تھا. جب بیرم خاں نے ٹھٹہ کو فتح کیا اور اسے مملکت اکبری میں شامل کیا اور جانی بیگ مغل دربار میں حاضر ہوا تو میرے دادا ابوالقاسم بھی ساتھ تھے. اکبر نے جانی بیگ سے خوش ہو کر ٹھٹہ کی جاگیر اسے واپس کر دی. آگرہ کے قیام کے دوران میں ایک بار شیخ ابوالفضل نے جانی بیگ اور میرے دادا کی دعوت کی مگر خاطر خواہ ضیافت نہیں کی جس سے جانی بیگ بہت بدحظ

---

[1] فہرست مخطوطات ایٹن کالج نمبر ۱۶۴.   [2] ریو ۳/ ۱۰۱۸-

ہوا۔ ابوالقاسم نے کہا آپ فکر نہ کریں. میں اس کی خاطر خواہ تلافی کروں گا۔ چنانچہ جانی بیگ نے ابوالفضل کو اپنے یہاں مدعو کیا. دعوت کے بعد علمی بحث شروع ہوئی جس میں ابوالفضل نے قرآن کی ایک آیت غلط پڑھی. ابوالقاسم نے فوراً ٹوکا اور شیخ سے معافی مانگنے کو کہا۔ شیخ نے ندامت کے ساتھ ہنس کر بات کا موضوع بدل دیا. اس پر جانی بیگ بہت محظوظ ہوا[1]

غرضکہ عبدالشکور کے دادا ابوالقاسم کے علم وفضل کا یہ حال تھا۔ وہ ٹھٹہ میں سکونت پذیر ہوئے ان کے لڑکے شیخ عبدالواسع بہترین خطاط تھے. اور امرا کی سرکار میں منشی گیری کرتے تھے. لیکن جب شاہجہاں نے انھیں ایک گاؤں مدد معاش میں دیدیا تو وہ ملازمت چھوڑ کر ٹھٹہ میں گوشہ گیر ہو گئے۔ عبدالشکور ٹھٹہ میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے. معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی منشی گیری کے ذریعہ زندگی گذارتے تھے. تاریخ سے انھیں شروع سے لگاؤ تھا. اس کتاب کی تلخیص کس طرح عمل میں آئی، ان کی زبانی سنئے :۔

"این کمترین تلامذۂ اہل انشا . . . عبدالشکور از بدایت شعور . . . تا حال کہ سال از اربعین تجاوز نمودہ، ہمیشہ و ہمہ وقت باین شغل شگرف راغب و مائل بودہ، نہایت تلذذ وغایت احتظاظ داشت ومحنت مطالعہ راعین راحت می پنداشت . . . تا آنکہ قلم شکستہ رقم بہ مشاطگی عبارت وناصیہ افروز استعارت چہرہ پردازی آموخت . . . . واین معنی وسیلۂ حصول وجہ معیشت گردید۔ اتفاقاً روزی در مجلس بزرگی کتاب مستطاب منتخب التواریخ کہ تاریخی است جامع . . . در نظر احقر جلوہ گر شد. . . . بہ مجرد مطالعہ دل بہ جانب خود ربودہ . . . بعد از مدتی مدیدہ کہ وصال آن صاحب جمال . . . دست داد، دست در آغوش آن محبوب نہاد و با او تعلق خاطر بہ مرتبہ پیدا شد کہ ہر گاہ . . . . فراغ دست می داد، دست بہ دامن آن صفائح . . . زدہ کامیاب می گردید ولیں . . . .

---

[1] انتخاب منتخب، ورق ۵ ۔ ۳ ۔ (مخطوطہ علی گڈھ)

ازان . . . انتخاب نمودہ، گلدستۂ مختصر مسمیٰ بہ انتخاب منتخب ساخت"۔[۱]

یہ انتخاب عہد اورنگزیب میں ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ء میں مکمل ہوا۔ مادۂ تاریخ اس قطعہ میں ہے:-

الحمد کہ انتخاب والا ازدیدۂ عقل انتخاب است

تاریخ تمام آن خرد گفت باغایت فضل انتخاب است[۲]

۱۰۸۴ = ۱۰۵۴ + ۳۰

منتخب التواریخ کی طرح انتخاب بھی پانچ ابواب (قسم) پر مشتمل ہے۔ پہلی قسم میں انبیا کے حالات ہیں۔ دوسری میں آنحضور سے پہلے کے حکمرانوں کا ذکر ہے۔ تیسری قسم حضرت محمدؐ اور خلفا کے حالات پر مشتمل ہے۔ چوتھی قسم میں مسلمان حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ اور پانچویں میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کا ذکر مملوک سے لے کر شاہجہاں تک ہے۔

عبدالشکور نے سندھ کی ترخانی سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے عیسی خاں، اس کے لڑکے باقی خاں اور اس کے پوتے جانی بیگ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ چونکہ اس کے جد امجد اس خاندان کے ممنون تھے اس لئے اس کے ختم ہونے کا اسے ملال تھا وہ کہتا ہے:-

"دریغ دولت ارغونیہ و ترخانیہ بہ اختتام انجامید"۔[۳]

---

[۱] ایضاً ورق ۳-۲

[۲] ایضاً ورق ۳۔

[۳] ایضاً ورق ۱۶۹۔

(ب) ہندوستان کی عام تاریخ

لب التواریخ ہند رائے بندرابن ولد رائے بھارا مل نے لب التواریخ ہند کے نام سے تاریخ فرشتہ کا انتخاب کیا اور دوسرے ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں مزید معلومات فراہم کیں۔[1] کتاب کا آغاز شہاب الدین غوری کے عہد سے ہوتا ہے اور اورنگزیب کے ۳۳ ویں سن جلوس (۱۲ جمادی الاول ۱۱۰۱/۱۱ فروری ۱۶۹۰) پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا انتساب شہنشاہ وقت اورنگزیب کے نام ہے۔

رائے بندرابن عہد اورنگزیب کے ہندو امرا میں ایک خاص حیثیت کا مالک تھا۔ اس کا باپ بھی شاہی ملازمت میں تھا۔ بندرابن کو اورنگزیب نے رائے کا خطاب عنایت کیا۔ اور اسے شاہ عالم کا دیوان مقرر کیا۔[2] شہزادے کی اکثر فوجی مہمات میں وہ شریک تھا، ۱۰۹۵/۱۶۸۴ میں جب شاہ عالم نے حیدرآباد شہر پہ حملہ کیا تو بندرابن اس کے ہمراہ تھا۔ میدان جنگ میں وہ بری طرح زخمی ہوا اور قریب تھا کہ دشمن اس کا کام تمام کر دیتے مگر سید عبداللہ بارہہ نے عین وقت پہ اس کی جان بچا لی۔[3] پھر جب شاہ عالم گولکنڈہ کی مہم کے سلسلے میں گرفتار ہوا اور اس کے متوسلین معزول کیے گئے تو بندرابن کی ملازمت بھی جاتی رہی۔[4] لیکن بعد میں وہ بحال ہو گیا کیونکہ ہم اسے

---

[1] لب التواریخ ہند، (علی گڈھ، عبدالسلام) ورق ۲-۱۔

[2] ریو ۱/۳۲۸۔ خلیل اللہ (اس نسخہ کے سابق مالک) نے یہ معلومات بہم پہونچائی ہیں؛ خوافی خاں: منتخب اللباب، (۲ جلد) کلکتہ ۷۴-۱۸۶۹ء، ۲/۲۱۱، ۲۱۲۔

[3] مآثر الامرا ۲/۲۸۹۔

[4] مآثر عالمگیری ص ۲۹۳؛ مآثر الامرا ۱/۴۵۸۔

الگنڈل قلعہ (حیدر آباد) کے محافظ کے عہدہ پر دیکھتے ہیں[1]

غالباً یہی دور تھا جب بندرابن نے تاریخ لکھنی شروع کی۔ کتاب کی تکمیل ۱۶۹۴-۹۵/۱۱۰۶ میں ہوئی۔ "حالات ملک ہندوستان" اس کی تاریخ ہے[2]

لب التواریخ ہند دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب ایک علاقہ کے حکمرانوں کی تاریخ پر مبنی ہے۔ اس طرح ہمیں اس میں دہلی، دکن، گجرات، مالوہ، برہانپور، خاندیش، بنگال، جونپور، سندھ ملتان، کشمیر کے حکمرانوں کے حالات ملتے ہیں۔ سلاطین دہلی کا ذکر غوریوں سے شروع ہو کر اورنگزیب پر ختم ہوتا ہے لیکن اورنگزیب کے جلوس کا بیان کر کے مؤلف ایک دم جست لگاتا ہے اور ۲۱ ویں سن جلوس ۱۰۸۹/۷۹-۱۶۷۸ کا ذکر شروع کر دیتا ہے۔ جب اورنگزیب اجمیر کی طرف روانہ ہوا اور اکبر کی بغاوت کے بعد اس نے دکن کا رخ کیا[3]۔ اس طرح لب التواریخ میں فتوحات دکن کی بہت سی تفصیلات مل جاتی ہیں۔ یہ تفصیلات اس لیے اہم ہیں کہ ان کا بیان کرنے والا خود ان واقعات میں شریک تھا۔

لب التواریخ ہند کو بعد کے مورخین نے ایک مستند ماخذ مانا اور اس سے استفادہ کیا۔ تحفۃ الہند مولفہ لعل رام بن رائے دولہ رام کے مآخذ میں اس کا ذکر ملتا ہے[4]۔ جگجیون داس بن منوہر داس کی منتخب التواریخ تقریباً اس کی تلخیص ہے[5]۔ مگر خوافی خاں نے لب التواریخ پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ اس کی اپنی تاریخ کے مقابلہ میں اول الذکر میں آدھی معلومات بھی نہیں ہیں[6]۔

---

[1] اسٹوری ۴۵۳/۱۔

[2] لب التواریخ، ورق ۱۴۵؛ برٹش میوزیم کے ایک نسخہ (ریو ۲۲۹/۱) پر ۱۱۰۵ ہجری کا سن درج ہے (بحوالہ اسٹوری ۱۳۰۹/۲)

[3] لب التواریخ ہند، ورق ۱۴۳ا۔

[4] ریو ۲۳۶/۱۔

[5] ایضاً ۲۳۱/۱

[6] منتخب اللباب، ۲۱۱/۲۔

خلاصۃ التواریخ ہندوستان کی عام تواریخ میں خلاصۃ التواریخ کو اہم مقام حاصل ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہ اور لفظ خلاصہ سے شروع ہونے والی دو اور کتابوں میں مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا ہے۔ البتہ اس نے اپنے بارے میں جو اشارہ کیا ہے وہ کم و بیش یکساں ہے چنانچہ یہاں بھی وہ کہتا ہے:۔

"از عنفوان ظہور شعور بہ ملازمت ناظمان امور مملکت و مال و صاحبان کارگاہ دولت و اقبال پیشہ، خطوط نویسی کہ عبارت از منشی گری باشد، بسر بردہ"۔[1]

جدید مورخین میں ایلیٹ کا خیال ہے کہ کتاب میں ہجری سن کے علاوہ اور کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ اس کا مولف ایک ہندو ہے[2]۔ یہ بات صحیح نہیں۔ داخلی اور خارجی دونوں شواہد ایلیٹ کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔ مآثر الامرا کے مولف کا بیان ہے:۔

"خلاصۃ التواریخ کہ در عہد عالمگیر ہندوی نوشتہ"۔[3]

اب داخلی شواہد کو لیجیے۔ کتاب میں حمد و نعت نہیں ہے جو مسلم مصنفین کا عام شیوہ تھا۔ ہجری کے ساتھ ہندی سنین بھی درج ہیں۔ ہندو اساطیر کا تفصیلی ذکر ہے اور سب سے اہم یہ کہ مسلم حکومت کا ذکر کرتے وقت مولف کا لہجہ اچانک بدل جاتا ہے۔ ہندو سلطنت کی بربادی کا ملال اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی قوم کا اقتدار اسے ذرا نہیں بھاتا۔ وہ صاف کہتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی عظیم ہندو تہذیب کو مٹا دیا ہے[4]۔

ان شواہد سے یہ بات تو طے ہو گئی کہ خلاصۃ التواریخ کا مولف ہندو ہے البتہ اس کے نام کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض قدیم مخطوطات کے ترقیموں میں اس کا نام ملتا ہے لیکن اس میں بھی

---

[1] خلاصۃ التواریخ، مرتبہ ظفر احسن، دہلی ۱۹۱۸ء، ص ۶۔

[2] ایلیٹ ۸/ ص ۷

[3] مآثر الامرا ۱/ ۴

[4] خلاصۃ التواریخ، ص ۶۱ - ۱۶۰۔

اختلاف ہے۔ اس طرح اس نام کا ابتدائی لفظ سجان (سین مفتوح اور جیم کے ساتھ)[1] سبحان (ب اور حای حطی کے ساتھ)[2]، شجان (شین اور جیم کے ساتھ)[3]، سرجان (را اور جیم کے ساتھ)[4] سنجان (نون اور جیم کے ساتھ)[5]، سُجان (سین مضموم اور جیم کے ساتھ)[6] پڑھا جاتا ہے۔ ان مختلف ناموں میں مؤخر الذکر سجان عام طور پر مانا گیا ہے کیونکہ یہ ایک عام ہندو نام ہے اور تذکرۃ الامرا میں ہمیں اس نام کے تین اشخاص نظر آتے ہیں[7]۔ مؤلف کے نام کا دوسرا حصہ بھی مختلف فیہ ہے۔ کیونکہ بعض جگہ رائے ملتا ہے اور بعض جگہ سنگھ[8]۔ اسی طرح اس کی ذات بھنڈاری[9]، بھنڑاری[10] یا دھیر[11] بتائی جاتی ہے۔ بعض مخطوطات میں سجان رائے بھنڈاری ہے[12]۔ اور عام طور پر یہی اس کا نام مان لیا گیا ہے۔

سجان رائے بھنڈاری پنجاب میں بٹالہ کا رہنے والا تھا، اس نے بٹالہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور صاف لکھا ہے:-

"چون زاد و بوم نگارندۂ این نسخہ دلکشای بٹالہ است، ہذا اندکی از احوال آن شہر بہ تسوید در آوردن ضروری دانست"[13]۔

---

[1] اشپرانگر (بحوالہ ریو ۱/۲۳۰)؛ مارلے ص ۶۹؛ کیمبرج ص ۱۵۸۔

[2] ایلیٹ ۵/۸؛ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی (نیو سیریز) ج ۳/ص ۴۲۳۔

[3] ایڈنبرا، نمبر ۲۰۱۔

[4] فہرست مخطوطات کلکتہ مدرسہ مرتبہ کمال الدین و عبدالمقتدر، کلکتہ، ۱۹۰۵ء ص ۴۷۔

[5] فہرست مخطوطات ازبکستان اکادمی، تاشقند، مرتبہ اے۔ اے سیمینوف، تاشقند، ۱۹۵۲ء (روسی) نمبر ۲۴۸

[6] ایتھے نمبر ۳۶۳ وغیرہ

[7] ریو ۱/۲۳۰۔

[8] ایتھے نمبر ۳۶۲، ۳۶۳؛ ریو ۱/۲۳۰؛ مارلے ص ۶۹۔

[9] خلاصۃ التواریخ، (مقدمہ)

[10] ریو ۱/۲۳۰

[11] ایضاً ۳/۹۰۸؛ اسٹوری ۱/۲ ۵۴۴

[12] خلاصۃ التواریخ، (مقدمہ)

[13] ایضاً ص ۱۷۔ ریو کے نسخہ (۱/۲۳۰) میں بھی صاف لفظ بٹالہ ہے۔

بعض دیگر بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سجان رائے پشاور، کابل اور پنجور بھی گیا تھا[1]
بقول مؤلف خلاصۃ التواریخ کی تدوین دو سال کے عرصہ میں اورنگزیب کے ۴۰ویں سن
جلوس مطابق ۱۱۰۷-۹۷/۱۶۹۶ میں مکمل ہوئی[2] مگر اس کے بعد بھی مؤلف اس میں ترمیم و
اضافہ کرتا رہا۔ چنانچہ دو مقامات پر اس نے جو تاریخ دی ہے اس سے ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹ کا سن
برآمد ہوتا ہے۔ ایک جگہ شیخ عبدالقادر کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف کہتا ہے کہ ان کی وفات کو ۵۵۰ سال
گذر چکے ہیں[3] شیخ عبدالقادر کا انتقال ۵۶۱/۱۱۶۶ میں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹
میں لکھ رہا تھا۔ اسی طرح دریائے راوی پر اورنگزیب کے بنوائے ہوئے بند کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

"واز ابتدای سال چہارم لغایت حال کہ زیادہ از چہل سال می گذرد"[4]

یعنی اورنگزیب نے ۴ سن جلوس میں اس پر بند بنوایا اور اس واقعہ کو چالیس سال سے زیادہ
گذر گئے گویا اب اس کے جلوس کا ۴۴ واں سال یعنی ۱۱۱۱ ہجری ہے۔

مگر اس سے زیادہ حیرتناک بات یہ ہے کہ خلاصۃ التواریخ کے خاتمہ میں اورنگزیب کی
وفات کا بھی ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ خود سجان رائے نے لکھا ہو تاکہ اس کی تاریخ اس عہد کے
اہم ترین واقعہ سے خالی نہ رہے۔ لیکن چونکہ اس ذکر کا کوئی سیاق و سباق نہیں ہے اس لئے اکثر مورخین
کا یہ خیال ہے کہ یہ کسی اور کے ہاتھ کا اضافہ ہے۔ سجان رائے کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہے۔ ۱۱۱۵/
۴-۱۷۰۳ تک وہ حیات تھا۔ جب اس نے خلاصۃ السیاق لکھی۔ ممکن ہے اورنگزیب کی وفات
کے وقت وہ حیات رہا ہو اور اس نے اپنے مربی کی وفات کا ذکر نہ کرنا تاریخی دیانت کے خلاف
سمجھا ہو۔

اس مزعومہ کی تصدیق ایوانوف[5] کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ سجان رائے نے عہد

---

[1] اسٹوری ۱/۴۵۴۔
[2] خلاصۃ التواریخ ص ۸
[3] ایضاً ص ۳۴
[4] ایضاً ص ۶۵۔
[5] ایشیاٹک ۱/۵۶۔

اورنگزیب کے خاص خاص واقعات اور سنین بھی لکھے تھے جو اس کے ایک نسخہ میں درج ہیں، اسی طرح ایک اور مخطوطہ[۱] میں مقامی تاریخ اور ہندو راجاؤں کی فہرست بھی درج ہے۔ جس میں ابتدا سے اورنگزیب کے ۴۲ ویں سن جلوس ۱۰۹-۱۱۰۱/۹۹-۱۶۹۸ تک کے نام شامل ہیں۔

سبحان رائے نے اپنے مآخذ میں ۲۷ مستند کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے ایران اور ہندوستان کی اور بہت سی تاریخوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان مآخذ میں اصل سنسکرت کتابوں کے نام کے بجائے ان کا ترجمہ درج ہے[۲] حالانکہ مؤلف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت اچھی جانتا تھا[۳]۔ بہر حال اس کی کتاب میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کا خاصا استعمال ہے اور اسے ہندوستان کے جغرافیہ اور یہاں کے علوم پر اچھی دستگاہ ہے۔

خلاصۃ التواریخ کی تاریخی اہمیت مختلف فیہ ہے۔ مارلے کا دعوی یہ ہے کہ خلاصۃ التواریخ ایک اور کتاب مختصر کا چربہ ہے اور سبحان رائے سنگین سرقہ کا مرتکب ہے۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ خلاصہ میں تاریخ فرشتہ سے زیادہ کوئی خاص معلومات نہیں ہیں اور نہ سبحان رائے نے اپنے تمام مآخذ سے استفادہ کیا ہے[۴]۔ لیکن اس کے برخلاف میجر لیس (Lees) کا یہ کہنا ہے کہ خلاصۃ التواریخ انتہائی محتاط تاریخوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور سیر المتاخرین اس کا لفظ بہ لفظ چربہ ہے[۵]۔

خلاصۃ التواریخ کا ابتدائی حصہ زیادہ اہم ہے جس میں ہندو مذہب، اور اس کے رسوم وعلوم پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ عہد اورنگزیب کے ہندوستان کا جغرافیائی ذکر ہے اور ہر صوبہ کے اہم شہر اور آمدنی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اصل کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے

۱۔ ایتھے نمبر ۳۶۲ ۲۔ خلاصۃ التواریخ ص ۸-۷۔

۳۔ ایضاً (مقدمہ)؛ اسٹوری ۱/۴۵۴۔

۴۔ مارلے ص ۷۰۔ ریو (۱/۲۳۱) کا خیال ہے کہ خلاصہ اور مختصر ایک ہی مؤلف کے قلم سے ہیں۔

۵۔ جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی (نیو سیریز) ج ۳/ ص ۴۲۳۔

حصہ میں ہندو حکومت کا ذکر ہے جس کا آغاز کورو پانڈو سے ہوتا ہے اور پرتھوی راج پر ختم ہوتا ہے بعد کے ہندو حکمرانوں کی محض سرسری فہرست دی گئی ہے۔ مسلم حکومت کا ذکر بھی سرسری ہے اور تاریخ فرشتہ پر مشکل سے کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ مغل دور میں اورنگزیب اور اس کے بھائیوں کی جنگ تخت نشینی کا تفصیلی ذکر ہے مگر شاہجہاں کی تاریخ کے لئے وارث کی تاریخ پڑھنے کا مشورہ دیا گیا ہے[1] مغلوں کے ہمعصر حکمرانوں کا علیٰحدہ ذکر نہیں ہے۔

خلاصۃ التواریخ پر دو ضمیمے لکھے گئے جن میں مزید سو سال کے واقعات کا اضافہ کیا گیا ہے پہلا ضمیمہ جے کشن داس مہرا کا ہے۔ دوسرے کے مؤلف کا علم نہیں ہے۔[2]

(ج) تاریخ تیموریان

جواہر التواریخ جواہر التواریخ تیموریوں کی تاریخ ہے جسے سلمان قزوینی نے عہد اورنگزیب میں مرتب کیا۔ مؤلف اورنگزیب کے آبا و اجداد کے کارنامے بیان کرنا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ آدم سے اورنگزیب تک کی تاریخ لکھے مگر موجودہ تاریخ جہانگیر کی موت پر ختم ہو جاتی ہے۔

جواہر التواریخ میں خاص طور پر تیموریوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ تیموریوں کا آغاز یافث سے ہوتا ہے جو مغل اور ترک قوم کا جد اعلیٰ تھا۔ ان کی مختلف شاخیں ایران اور توران میں پھیلیں یہاں تک کہ تیمور برسر اقتدار آیا۔ اس کے جانشینوں میں شاہرخ، الغ بیگ، بابر، ابوسعید، عمر شیخ اور سلطان حسین

---

[1] خلاصۃ التواریخ ص ۴۸۷۔

[2] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۶۶۔

مرزا کا ذکر ہے۔ تیموری سلطنت کے زوال کے بعد ادھر ادھر جو سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں، ان کا ذکر کرنے کے بعد مؤلف بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کا ذکر کرتا ہے۔ محمد ہادی کا تذکرۂ سلاطین چغتا بہت کچھ جواہر التواریخ سے ملتا جلتا ہے[1]۔

(د) عہد اورنگزیب

تاریخ شاہ شجاعی تاریخ شاہ شجاعی اورنگزیب کی تخت نشینی کے چند سال پہلے اور بعد کی تاریخ ہے۔ اس کا مؤلف محمد معصوم بن حسن بن صالح ۴۲ سال تک شہزادہ شجاع کی ملازمت میں تھا۔ اورنگزیب کے برسر اقتدار آنے کے بعد جب شجاع کے حالات ابتر ہوئے تو محمد معصوم اجازت لے کر مالدہ (بنگال) چلا آیا۔ یہیں اسے خیال آیا کہ ان دو تین سالوں میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں انھیں قلمبند کیا جائے۔ یہ ۱۰۷۰/۶۰-۱۶۵۹ کا سال تھا۔ اسی سال یہ کتاب مرتب ہوئی:

> "در وقت تحریر ایں سطور یعنی سنہ الف وسبعین بہ سبب تزاحم آفات بہ موجب رخصت سلطانی ماہی چند در بلدۂ مالدہ اقامت داشت، بہ خاطر فقیر رسید کہ حالات و واقعات این دو سہ سال آنچہ دیدہ و شنیدہ، عرض گرداند۔"[2]

ان واقعات میں سے بیشتر معصوم کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ اس لئے معصوم کا بیان مستند اور مفصل ہے۔ اورنگزیب کی فتوحات کا ذکر تفصیل سے ہے۔ دارا کے قتل کا سین بڑے دردناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ معصوم نے اپنے اشعار کی پیوندکاری سے ان واقعات

---

[1] بوڈلین نمبر ۱۶۸۔

[2] محمد معصوم: تاریخ شاہ شجاعی، (علی گڑھ) ورق ۲-۱۔

کی دردناکی اور ابھار دی ہے۔

ایلیٹ نے فتوحات عالمگیری یا واقعات عالمگیری کے نام سے معصوم کی جس تاریخ کا ذکر کیا ہے وہ یہی تاریخ شاہ شجاعی ہے۔ ایلیٹ کے بیان کے مطابق اول الذکر میں پچاس باب ہیں[1] بہر حال تاریخ شاہ شجاعی کا شمار عہد اورنگزیب کے اولین آخذ میں ہوتا ہے۔

فتحیہ عبریہ آغاز عہد اورنگزیب کی دوسری اہم تاریخ فتحیہ عبریہ یا تاریخ آسام ہے جس کا مؤلف احمد بن محمد ولی[2] الملقب بہ شہاب الدین طالش ہے۔ مؤلف میر جملہ خانخانان میر محمد سعید اردستانی کی فوج میں ملازم تھا۔ اور میر جملہ کے ساتھ کوچ بہار اور آسام کی مہم میں شریک تھا۔ مؤلف کا بیان ہے کہ میں نے یہ تاریخ دو مقصد سے لکھی ایک تو یہ کہ لوگوں کو کوچ بہار اور آسام کے بارے میں اطلاع بہم پہنچائی جائے اور دوسرے یہ کہ اس کتاب کے ذریعہ کوئی امیر اس کی سفارش بادشاہ سے کرے تاکہ اسے واپس دارالسلطنت بلا لیا جائے۔[3]

مؤلف نے اپنی تاریخ کے اس عجیب عنوان کی یہ وجہ پیش کی ہے:-

"و چون این تالیف مشعر از فتح و عبرت است، بہ فتحیہ عبریہ موسوم شدہ"[4]

میر جملہ نے اورنگزیب کے چوتھے اور پانچویں سن جلوس ۳-۱۰۷۲/۶۳-۱۶۶۱ء میں کوچ بہار اور آسام کو فتح کیا۔ یہ فتح دو حیثیت سے اہم تھی۔ ایک تو اس فتح سے شجاع کا دعوی ختم ہو گیا اور دوسرے یہ کہ ان جنگلی قبائل پر اورنگزیب کا اقتدار قائم ہو گیا اور سارا مشرقی ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ مگر آسام کی آب و ہوا میر جملہ کو راس نہیں آئی وہ خضر پور میں

---

[1] ایلیٹ ۷/۱۹۸

[2] فتحیہ عبریہ (تاریخ آسام) مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۴۷ء، ص ۲؛ ایتھے (نمبر ۳۴۱) میں اس کا نام ابن محمد ولی احمد ہے ایشیاٹک (۴۸/۱) میں احمد بن محمد ہے اور بانکی پور (۸۲/۷) میں ابن ولی محمد ہے۔

[3] فتحیہ عبریہ (مطبوعہ) ص ۵-۳ [4] ایضاً ص ۶

بچہار شنبہ ۲ ر رمضان ۱۰۷۳/ ۳۱ / مارچ ۱۶۶۳ کو انتقال کرگیا۔ اس کے انتقال کے دو روز بعد شہاب الدین نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی اور ڈیڑھ مہینے میں یعنی ۲۰ ر شوال ۱۰۷۳/ ۱۸ ر مئی ۱۶۶۳ کو مکمل کرلی[۱]۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ واقعات جلدی میں لکھے ہیں۔ اور چونکہ مجھے کسی کی تعریف یا تنقیص مقصود نہیں، اس لئے بے کم و کاست لکھے ہیں[۲]۔

فتحیہ عبریہ مقدمہ اور دو مقالات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ باعث نہضت لشکر بادشاہی بہ ولایت کوچ بہار و آسام سے متعلق ہے۔ پہلے مقالہ میں کوچ بہار کی فتح اور وہاں کے حالات کا ذکر ہے اور دوسرے مقالہ میں آسام کی فتح اور وہاں کے لوگوں کا ذکر ہے۔ کتاب کا اختتام میر جملہ کی موت پر ہوتا ہے۔

فتحیہ عبریہ مشرقی ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں لحاظ سے اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مختلف ترجمے ہوئے۔ میر بہادر علی حسینی نے تاریخ آشام کے نام سے اس کا ترجمہ اردو میں کیا[۳]۔ اردو ترجمہ سے پیوی (Pavie) نے اسے فرانسیسی میں منتقل کیا[۴]۔ بلاخمین نے اپنے ایک مضمون میں اس کے بعض اقتباسات کا انگریزی ترجمہ کیا[۵]۔ سر جدو ناتھ سرکار نے بھی اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ کیا[۶]۔

واقعات عالمگیری

واقعات عالمگیری اورنگزیب کے عہد شہزادگی اور ابتدائی حکومت کی تاریخ ہے۔ اصل متن میں مصنف یا کتاب کے نام کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ خوافی خاں نے اس کا نام واقعات عالمگیری لکھا ہے اور اسے عاقل خاں رازی کی تصنیف بتائی ہے۔

"اگرچہ مؤلفان عہد نویس ہر سہ عالمگیر نامہ منزوی ساختن اعلحضرت را موافق مرضی مبارک

---

[۱] بانکی پور، ۷/ نمبر ۵۷۴۔
[۲] فتحیہ عبریہ ص ۴۔
[۳] مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۰۵ء۔
[۴] مطبوعہ پیرس، ۱۸۴۵ء۔
[۵] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، نمبر ۴۱ (۱۸۷۲ء) ص ۴۹
[۶] جرنل آف دی بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی، ج ۱/ ۱۹۱۵ء۔

مجمل بہ زبان قلم آوردہ۔ اما عاقل خاں خوافی در" واقعات عالمگیری" تالیف خود بہ شرح وبسط ذکر کردہ ۔"[1]

لیکن مختلف مخطوطات میں اس تاریخ کے مختلف نام ملتے ہیں۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ میر خاں (م۔ ۱۰۸۰/۷۰۔ ۱۶۶۹) کی تالیف ہے[2]۔

واقعات عالمگیری بغیر کسی تمہید کے اورنگزیب کے بیان سے شروع ہوتی ہے اور صفر ۱۰۷۳/ستمبر ۱۶۶۲ء میں اورنگزیب کی بیماری پر ختم ہوتی ہے۔ خاتمہ میں شاہجہاں کی وفات (۱۰۷۶/۱۶۶۶) کا ذکر ہے جو ممکن ہے بعد کا اضافہ ہو۔

عالمگیرنامہ

عالمگیرنامہ عہد اورنگزیب کے ابتدائی دس سال کی سرکاری تاریخ ہے۔ اس میں اورنگزیب کے اورنگ آباد سے کوچ (جمادی الاول ۱۰۶۸/فروری ۱۹۵۸) سے واقعات کا آغاز ہوتا ہے اور رجب ۱۰۷۸/دسمبر ۱۶۶۷ پر اختتام ہوتا ہے۔ اس کا مؤلف محمد کاظم مشہور مورخ مرزا محمد امین کا لڑکا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت اپنے والد کے زیر نگرانی ہوئی اور والد کی طرح اس نے بھی انشا میں مہارت حاصل کی۔ اورنگزیب جب تخت پر بیٹھا تو کاظم نے ایک منثور مدح شہنشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ اورنگزیب اس کی انشا سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کاظم کو سرکاری تاریخ نویسی کا انچارج بنا دیا[3]۔ ۲۱ویں سن جلوس (۷۹-۱۶۷۸ء) میں کاظم کو ابتیاع خانہ کا داروغہ مقرر کیا گیا[4]۔ اورنگزیب کے سفر اجمیر میں کاظم بھی ساتھ تھا۔ وہیں وہ سخت بیمار پڑا۔ اسے واپس دہلی بھیجا گیا اور یہاں ۱۰۹۲/۸۲-۱۶۸۱ میں اس کا انتقال ہو گیا[5]۔ سرخوش نے قابل خاں ولد میر کاظم منشی کی لکھی ہوئی ایک تاریخ کا ذکر کیا ہے جو ممکن ہے اسی کاظم کا لڑکا ہو[6]۔

---

[1] منتخب اللباب ۳۲/۲۔ [2] ریو ۲۶۵/۱؛ ایتھے نمبر ۳۴۵۔

[3] عالمگیرنامہ مرتبہ مولوی خادم حسین و مولوی عبدالحئی، کلکتہ، ۱۸۶۸ء، ص ۲۱-۲۰۔

[4] مآثر عالمگیری ص ۱۶۳۔ [5] ریو ۱۰۸۳/۳۔

[6] کلمات الشعرا ص ۱۲۸۔

مرزا محمد کاظم نے عالمگیر نامہ کے علاوہ کچھ اور تصانیف کی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کے لیے ایک بیاض مرتب کی تھی۔ جس میں مشہور انشاپردازوں کے علاوہ اس کے والد مرزا محمد امین کی نگارشات بھی شامل تھیں۔ اس کے دیباچہ میں کاظم اپنی نظم و نثر کی تعریف کرتا ہے اور عالمگیر نامہ کو ثبوت میں پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میری نثر وصاف کے تصنع، ابوالفضل کی باژگونہ کاری، شرف الدین علی یزدی کی بیجان ترصیع اور تاریخ آل مظفر کے ابتذال سے پاک ہے[1]۔ افسوس کہ اس بیاض کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک دوسری بیاض میں کاظم کا ایک مکتوب بے نقط درج ہے[2]۔

کاظم نے اورنگزیب کے خطوط کا ایک مجموعہ انشائے خاص الخاص کے نام سے مرتب کیا تھا، جس کا ذکر اوپر ہوا۔ تاریخ محمدی کے بیان کے مطابق کاظم نے تین اور تصنیفات مرتب کیں:۔

۱۔ شاہنامہ (۲) روزنامہ (۳) اخبار حبیبلنہ[3]

تذکروں میں کاظم کا یہ شعر ملتا ہے:۔

نیست از چاہ زنخدان بتان قسمت ما — غیر آبی کہ زحسرت بہ زبان می گردد[4]

عالمگیر نامہ کا آغاز پرشکوہ حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد خاندان تیمور کی فضیلت اور عہد اورنگزیب کی برکت کا بیان ہے۔ مؤلف نے اورنگزیب کے نام سے پہلے لمبی چوڑی صفات کا ذکر کیا ہے۔ عالمگیر نامہ کی تدوین کے لیے حکم تھا کہ وہ تمام سرکاری کاغذات کاظم کو فراہم کیے جائیں۔ جن سے سلطنت کے اہم معاملات پر روشنی پڑتی ہے یا جن میں شہنشاہ بذات خود شامل تھا۔ چنانچہ تمام وقائع نگار کو شاہی فرمان جاری کیا گیا کہ وہ ماہ بماہ اور سال بسال مؤلف کو متعلقہ واقعات کی رپورٹ بھیجتے رہیں۔ لیکن اگر ان کاغذات یا رپورٹ سے بھی کسی واقعہ کا مکمل علم نہ ہو سکے تو مؤلف کو ہدایت تھی کہ ان معتمد افسران سے رجوع کرے جو اس واقعہ میں شریک تھے یا جنھیں اس کا بخوبی علم

---

[1] بیاض بانکی پور نمبر ۱۰۸۸، ورق ۸

[2] مجمع الافکار، بانکی پور نمبر ۸۶۰، ورق ۱۹۶

[3] بحوالہ ایڈنبرا نمبر ۲۱۴۔

[4] سفینۂ بیخبر، ص ۲۷۵۔

ہے۔ اور اگر پھر بھی اشتباہ رہ جائے تو بادشاہ سے بذات خود دریافت کیا جائے۔ کاظم جو کچھ لکھتا بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا اور اس کی منظوری کے بعد تاریخ میں شامل کرتا۔[1]

اورنگزیب عالمگیر کے نام پر اس تاریخ کا نام عالمگیر نامہ طے ہوا۔ خیال تھا کہ حکومت کے ابتدائی اٹھارہ سالوں کی تاریخ ایک جلد میں لکھی جائے گی۔ اس میں اورنگزیب کی شہزادگی کے واقعات نہیں شامل ہوں گے۔ بلکہ کاظم نے اپنے طور پر یہ طے کیا تھا کہ اگر حالات نے اسے مہلت دی تو وہ عہد شہزادگی کی ایک الگ تاریخ لکھے گا۔[1] لیکن جب تاریخ رجب ۱۰۷۸/ دسمبر ۱۶۶۷ تک پہونچی تو اورنگزیب نے اس کی تدوین بند کرنے کا حکم دیا۔ اس نے کہا کہ فتوحات کی نمائش کے مقابلہ میں روح کا تزکیہ زیادہ ضروری ہے۔[2] جدید مؤرخین کا یہ قیاس ہے کہ چونکہ شاہی خزانہ پر غیر معمولی دباؤ تھا، اس لئے شہنشاہ نے تاریخ نویسی کا تعیش بند کر دیا۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ عالمگیر نامہ ۳۲ ویں سن جلوس (۸۹-۱۶۸۸ء) میں مدون ہوا کیونکہ کاظم کی وفات اس سے قبل ۸۲-۱۶۸۱ء میں ہو چکی تھی۔[3]

چونکہ عالمگیر نامہ سرکاری تاریخ ہے اس لئے محتاط مؤرخین اس کے بیانات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیس کا کہنا ہے کہ بعد کے مؤرخین کاظم کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور نہ عالمگیر نامہ ہندوستان میں زیادہ مشہور رہا ہے۔[4] لیکن لیس کا یہ مزعومہ اس لئے غلط معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے سبھی مؤرخین عہد اورنگزیب کے ابتدائی دس سال کی تاریخ کے لئے اسی پر اعتماد کرتے ہیں۔ مرآۃ العالم کے مؤلف نے اس کی تعریف کی ہے[5] اور خوافی خاں نے اسے اپنا ماخذ بتایا ہے۔[6] محمد ساقی مستعد خاں نے اس کی تلخیص کر کے اپنی تاریخ مآثر عالمگیری میں شامل کیا ہے۔ ایک اور

۱۔ عالمگیر نامہ ص ۲۴-۲۳ ۲۔ مآثر عالمگیری ص ۶۸۔

۳۔ ایلیٹ، ۱۷۴/۷؛ مارلے ص ۱۲۵ ۴۔ ایلیٹ ۱۷۷/۷

۵۔ بحوالہ ایلیٹ ۱۷۷/۷۔ ۶۔ منتخب اللباب ۲۱۰/۲۔

تلخیص حاتم خاں نے عالمگیر نامہ کے نام سے کی۔ یہ تخلیص اصل عالمگیر نامہ کی تدوین کے ساتھ ساتھ ہورہی تھی کیونکہ اس میں اصل سے کم معلومات ہیں۔ اس تلخیص میں شہزادہ کام بخش کی ولادت کا ذکر نہیں ہے اور نہ اس میں دسویں سال کا تفصیلی ذکر ہے۔[1] تیسری تلخیص کا نام انتخاب عالمگیر نامہ ہے[2]۔ اور چوتھی کا وہ رسالہ کاظم[3] ہے۔

عالمگیر نامہ کا اسٹائل مغل تواریخ کی طرح مغلق پیچیدہ اور مرصع ہے۔ بیچ بیچ میں کثیر اشعار کی پیوند کاری ہے۔ ہر واقعہ کے بیان سے پہلے لمبی چوڑی تمہید ہے۔

اورنگزیب اور اس کے امرا کے لئے بڑے بڑے القاب کا استعمال کیا گیا ہے مگر مخالفین کا نام ہی سرے سے بدل دیا گیا ہے۔ مثلاً دارا شکوہ کو دارا بےشکوہ۔ شجاع کو ناشجاع اور سلیمان شکوہ کو سلیمان بےشکوہ کا نام دیا گیا ہے۔ شاہجہاں کے لئے البتہ اعلحضرت کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔

چونکہ دسویں سال کے اختتام پر یہ تاریخ بند کردی گئی اس لئے آخر میں مؤلف نے اورنگزیب کی صفات اور روزانہ پروگرام نیز کتاب کے خصائص کا ذکر خاتمہ کے طور پر کیا ہے۔

وقائع وقائع نعمت خاں عالی اورنگزیب کے محاصرہ قلعۂ گولکنڈہ کی داستان ہے جسے اس عہد کے مشہور طنز نگار نعمت خاں عالی نے تحریر کیا ہے۔ یہ محاصرہ ربیع الاول ۱۰۹۸/ جنوری ۱۶۸۷ء میں شروع ہوا اور تقریباً آٹھ مہینے کے بعد ذی الحجہ/ستمبر ۱۶۸۷ء میں ختم ہوا۔ جہاں تک وقائع کا تعلق ہے اس میں رجب اور شعبان کے آٹھ دنوں کا بیان ہے مگر یہ تاریخیں مختلف نسخوں میں الگ الگ ملتی ہیں۔ ذیل میں ان اختلافات کی تفصیل دی جاتی ہے:۔

مخطوطہ برٹش میوزیم[4]:۔ رجب ۱۳، ۱۴، ۱۵

شعبان ۱۷، ۱۸، ۲۵، ۲۹

---

[1] ریو ۱/۲۶۸۔

[2] اسٹوری ۱/۵۸۶۔

[3] ہارڈنگ لائبریری، دہلی نمبر ۱۸۷۔

[4] ریو ۱/۲۶۸۔

مخطوطات انڈیا آفس (۱) رجب ۱۴ - ۱۶
شعبان ۱۹ - ۲۲ [1]

(۲) رجب ۱۳ - ۱۵
شوال ۱۴، ۲۰، ۲۱، ۲۲ [2]

(۳) رجب ۱۳ - ۱۵
شعبان ۱۴، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳ [3]

(۴) رجب ۱۴، ۱۵
شعبان ۱۴، ۱۵، ۱۹ [4]

مخطوطہ بانکی پور پٹنہ :۔
رجب ۱۴، ۱۵، ۱۷
شعبان ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۰
رمضان ۸ [5]

مخطوطات بوڈلین لائبریری (۱) رجب ۱۳ تا شعبان ۲۲ [6]۔
(۲) رجب ۱۳، ۱۴، ۱۵
شعبان ۱۴، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲ [7]

بمبئی یونیورسٹی کے مخطوطہ میں آٹھ دن کے واقعات ہیں مگر پہلے اور آخری واقعہ کی تاریخیں نہیں ہیں۔ باقی تاریخیں یہ ہیں :۔

---

[1] ایتھے نمبر ۱۶۵۹ — [2] ایضاً نمبر ۱۶۶۵
[3] ایضاً نمبر ۱۶۶۶ — [4] ایضاً نمبر ۱۶۶۷
[5] بانکی پور ضمیمہ ۲/ ۱۴۳ نمبر ۲۲۱۹ — [6] بوڈلین نمبر ۱۱۵۷
[7] ایضاً ۳/ نمبر ۲۴۸۶ ۔

رجب ۱۳، ۱۴، ۱۱

شعبان ۱۴، ۱۹، ۲۰، ۲۱ ۔[1]

مطبوعہ نسخوں میں عموماً ۱۳ رجب سے ۲۲ شعبان تک کی تاریخیں ملتی ہیں مگر راٹنفیلڈ ایڈیشن[2] میں مندرجہ ذیل تاریخیں ہیں :۔

رجب ۱۴، ۵، ۱۷

شعبان ۱۴، ۱۹، ۲۱، ۲۵، ۲۹ ۔

تذکرۂ بہارستان سخن کے مؤلف کا بیان ہے کہ نعمت خاں عالی نے روح اللہ خاں کے کہنے پر وقائع لکھنا شروع کیا[3] مصنف کے بعض بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹۸/۸۷-۱۶۸۶ء میں وقائع لکھی گئی[4]

وقائع طنزیہ اور تاریخی ادب کی بہترین مثال ہے۔ عالی خود اس مہم میں شریک تھا۔ تمام مغل سرداروں سے اس کے تعلقات تھے۔ اس نے محاصرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ چشم دید اور قابل اعتبار ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ میرا فرض بحیثیت ایک وقائع نگار کے تمام حالات اور واقعات کو قلمبند کرنا ہے :۔

"چون وظیفہ وقائع نگار ثبت جمیع احوال وضبط تمامی مقال است، بہ قلم دادہ می شود"[5]

لیکن عالی نے جو حقائق پیش کئے ہیں وہ بہت تلخ اور ناخوشگوار ہیں اس تلخی کو اس نے اپنے مزاحیہ اور شیریں انداز بیان میں چھپانے کی کوشش کی ہے مگر اس کا طنز اتنا تیکھا اور تیز ہے کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ جہاں تک وقائع کی تاریخی اہمیت کا سوال ہے، یہ کہنا کافی ہے

---

[1] فہرست بمبئی یونیورسٹی ص ۵۰۔

[2] مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۵ء

[3] بہارستان سخن، ورق ۲۳۰۔

[4] وقائع، نولکشور، جنوری ۱۸۷۸ء، ص ۰۔

[5] ایضاً ص ۱۲۔

کہ خوافی خاں نے اپنی تاریخ منتخب اللباب میں اس کے طویل اقتباسات دیئے ہیں[1] اور مآثر الامرا کے مولف نے اسے اپنا بہترین ماخذ مانا ہے[2]۔

طنز و تعریض کے ساتھ ساتھ وقائع میں ایہام کا خوبصورت استعمال ہے اگرچہ بات کہیں کہیں ابتذال تک پہونچ گئی ہے۔ مگر عالی کا فن یہاں بہر حال اپنے عروج پر ہے اور اس کے اسٹائل کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ شاہی فوج نے رات کو حملہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ دو تین سپاہی فصیل پر چڑھ گئے اتنے میں ایک کتا ان سے ٹکرایا اور اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کی آواز پر قلعہ والے چوکنا ہو کر دوڑے اور ان "شیروں" کو خاک میں ملا دیا۔ اس شکست پر غازی الدین فیروز جنگ نقارہ بجاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ چنانچہ شاہی فوج میں یہ چہ میگوئی شروع ہوئی کہ دشمن کو دراصل فیروز جنگ نے متنبہ کیا۔ لیکن عالی خان مذکور کی حمایت اس طرح کرتا ہے :۔

"ہر چہ کرد آن سگ کرد این چہ کرد ؟"[3]

اسی طرح شاہی فوج اپنی پریشانی کا اظہار اس طرح کرتی ہے :۔

"بالا بر آمدن از ما نمی آید و تقدیم مفعول بر فاعل نمی شاید ؟"[4]

وقائع کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اس دور کے بیشتر علوم رائجہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں یہ اصطلاحیں ظاہر ہے اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئی ہیں، مگر ان کا ایہام عبارت کو عجیب شگفتگی عطا کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالی کا علم وسیع بھی تھا اور عمیق بھی۔ اور اسے ان اصطلاحوں کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے میں کمال تھا۔ ذیل کی مثال میں عروض کی اصطلاحیں دیکھئے :۔

---

[1] منتخب اللباب ۲/۳۳۸ ؛

[2] مآثر الکرام ۲/۲۴ ؛

[3] وقائع (جنوری ۱۸۷۰ء) ص ۱۲

[4] ایضاً ص ۹۱ ۔

"قافیہ تنگ است و زمین سنگلاخ لاعلاج ۔ چون بند ترجیع بہ جای خود آمدند و از زمین سبکی و کوتاہی بحر بحر مثنوی خفیف شدند" ¹

قاضی القضاۃ عبداللہ نے بادشاہ سے دشمن کی سفارش کی ۔ اس پر جواب ملا :۔

"ما میدانستیم کہ فریفتہ شدن بہ زر خاصۂ نوع سافل است ، نہ عرض عام ۔ و تو از جنس عالی خواہی بود ۔ ازین حمایت و رعایت بہ دلالت تضمنی محکوم علیہ شد کہ این معنی در جمیع افراد تمام مشترک است ۔ ۔ ۔ ۔ رسم سلطنت این بود کہ ترا بہ حدی رسانیم ۔ اما بہ ترحم کلی بہ ہمیں جزئی اکتفا فرمودیم کہ ہیچ اوسط قضایا نقل نمودہ از این لشکر بیرون روی و مانند روی در آخر بیوت اردو باشی" ²

مگر بعض بعض مقامات پر عربی الفاظ کی بہتات اور مبہم اصطلاحوں کی کثرت سے عبارت پیچیدہ اور مغلق ہوگئی ہے اور قاری کو بیحد الجھن ہوتی ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ عالی نے قصداً اپنی علمیت کے اظہار کے لئے یہ عبارت لکھی ہے ۔ مثلاً :۔

"بی تکلف از آن حرکت کہ چشم کواکب را در حدقۂ تدویر حیرت نشاند ، جنس عرض را بر نوع جوہر تقدم بالشرف لازم آمد بہ این سند کہ در اتمام نردبان یک زینہ درمیان ماند مذہب نظام کہ بہ طفرہ قائل است ، برہان سلم مسلم شد" ³

عہد اورنگزیب میں اردو ایک ترقی یافتہ زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی ، اس لئے فارسی کے بیچ میں اردو الفاظ کی پیوندکاری وہی مزہ دیتی تھی جو بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی کی پیوندکاری ۔ عالی کے یہاں یہ امتزاج دلچسپ بھی ہے اور خوبصورت بھی ۔ مثلاً

"بانیہ سفینۂ بھی واکردہ ، قصیدہ حسابیہ می خواند ، شرطیہ اش آنکہ تاگذشتہ ادا نشود ، دیگری

---

¹ ایضاً ص ۹۰ ۔ ² ایضاً ص ۲۲-۲۳ ۔

³ ایضاً ص ۲۲ ۔

نمی دہم ، صراف بیاض بیجک کشودہ مثنوی قرضنامہ می شنواند، معنی شاہ بیتش آنکہ بعد ازین داد وستند نمی کنم ۔ نوکران غزلی می سرایند، مستزادش چنین کہ 'بھوکوں مرتے ہیں'، کہاران ترجیع بندی کردہ اند، سربندش اینکہ 'آگنا دیو'۔ [۱]

ہر واقعہ کے بعد نصاب الصبیان کے انداز پر مزاحیہ قطعات ہیں۔ ان قطعات میں عربی الفاظ کے عجیب وغریب معانی دیئے گئے ہیں ۔ اور غالباً انھیں عالی کی مزاجیہ شاعری کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے ۔ یہ قطعات جو مختلف اوزان میں لکھے گئے ہیں، وقائع کا لازمی جزو ہیں۔ اور گویا نفس واقعہ کے بعد منہ کا مزہ بدلنے کے لئے یہ تبیرینی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

الہ است اللہ و رحمان خدای ... مگر او کند رحم بر فوج شاہ
تکلم سخن گو وقل حرف زن ... دلی گاہ با اشک وگاہی بہ آہ [۲]

چیست عنقا؟ روپیہ، کبریت احمر، اشرفی ... کیمیا، نوکر شدن یک ہفتہ پیش بوالحسن [۳]
خیمہ آن چیز یکہ منع بارش وتابش بکرد ... فرش، آن سطح زمین، ملبوس چہ؟ جلد بدن [۴]

محاسب سال را بنوشت ماہ روزہ در دفتر ... برای آنکہ معلومش نشد شوال وشعبانی [۵]

عالی نے مغل فوج اور اس کے حملوں کا بیان بڑی تفصیل اور وضاحت سے کیا ہے یہ عجیب اتفاق تھا کہ مغل فوج کو ہر حملہ میں جان ومال کا نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ عالی نے بعض جگہ مرنے والوں کی تعداد بھی دی ہے ۔ ممکن ہے شاہی کاغذات سے اسے یہ اعداد ملے ہوں۔ مگر انھیں ماننے میں اس لئے تامل ہوتا ہے کہ اس دور میں جنگوں میں اتنی صحیح تعداد مہیا کرنی مشکل تھی ۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے کہ ایک حملہ میں شاہی فوج کے مرنے والوں کی تعداد سال رواں (۱۰۹۸ھ) کے برابر

---

[۱] ایضاً ص ۴۳ [۲] ایضاً ص ۱۳
[۳] ایضاً ص ۱۵ [۴] ایضاً ص ۳۱

تھی۔ دوسرے حملہ میں ۲۰۰۷ اور تیسرے میں ۴۳۴۵ آدمی مارے گئے[1]

وقائع میں مغل فوج کی انتشار، ابتری اور امرا کی آپسی رقابت کی سنسنی خیز تصویر نظر آتی ہے اس مہم میں خوف وہراس اور قدرتی مصائب نے آگ پر تیل کا کام کیا تھا۔ ہر امیر یہ چاہتا تھا کہ جنگ کا سہرا اس کے سر رہے اور اس زعم میں وہ عجیب وغریب حرکتیں کرتا تھا۔ اگر کوئی ناکام ہوتا تو دوسرے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر اس کے خلاف عجیب وغریب افواہیں پھیلاتے۔ غازی الدین کا حال اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ اس سلسلہ میں عالی نے ہر سردار کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بیحد دلچسپ ہے اور ہر ایک کی انفرادیت کو پوری طرح اجاگر کرتی ہے۔ اس ضمن میں اورنگزیب پر بھی خوب خوب طنز وتعریض کی گئی ہے۔ امرا میں غازی الدین فیروز جنگ کے بارے میں "کتے" والا مشہور جملہ اوپر نقل ہوا، اب صلابت خاں کا حال سنئے۔ یہ حضرت دوبارہ میر آتش بنائے گئے تو یہ منادی ہوئی:

"ای بندگان درگاہ آگاہ باشید کہ صلابت خان بہ خدمت داروغگی توپخانہ سرفرازی می یابد، بایں شرط کہ کسں برای زدن بہ جنگ بنیابت وی قبول نماید!"[2]

لطف اللہ خاں کی تعریف اس شعر میں کی گئی ہے:-

ناخوش سبح، چسپان لزج، ماسح تفہ، بارد خنک
غمز وخفیف ابلہ سبک، این جملہ لطف اللہ خان[3]

ایک سردار سالم خاں حبشی تھا، جب مغل فوج فرار ہوئی تو وہ ایک غار میں گھس گیا، کالا رنگ تاریک غار، دشمن کو پتہ نہیں چلا اور سالم خاں صحیح سالم واپس آگیا۔ اس کا حال سنئے:-

"سالم خان حبشی در مغاک تاریکی خزیدہ وغار را برعار رجحان دادہ، ما صدق ظلمات بعضہا فوق بعض ظاہر ساخت!"[4]

---

[1] ایضاً ص ۷۰، ۷۲، ۷۵۔ [2] ایضاً ص ۱۲۵

[3] ایضاً ص ۷۳، اسی قطعہ میں مختار خاں، مہابت خاں اور ممتاز خاں پر بھی چھینٹے اڑائے گئے ہیں۔

[4] ایضاً ص ۱۵۱۔

اس فرار میں عزت خاں میر آتش گرفتار ہوا، وہ کیچڑ میں پھنس گیا تھا۔ دشمن اسے زندہ قلعہ میں لے گئے تاکہ

"محصوران کہ از اطالت حبس دلتنگ شدہ، ہر روز جمعی بیرون روند بہ تماشای او مشغول باشند"۔[1]

آخری واقعہ میں میر عبدالوہاب ماژندرانی کا خاکہ ہے جو خانساماں کا پیشہ بست تھا۔ میر نے کسی کو قرض دیا تھا۔ مقروض اتفاق سے وقت مقررہ سے پہلے قرض لوٹانے آیا۔ میر نے کہا اس میں ضرور کوئی سازش ہے اس لیے قرض واپس لینے سے انکار کر دیا۔ آخر کار نوتو میں میں ہوئی اور میر اور مقروض میں ہاتھاپائی ہونے لگی:

"مدیون می خواست کہ حق را بہ میر داصل سازد و میر خواست اورا بآن حق بہ حق واصل کند"۔[2]

آخر کار رحمت خاں بیونات نے بیچ بچاؤ کیا اور بات اس پر طے ہوئی کہ:

"زر نزد ثالث امانت باشد و میر اجل بعد انقضای اجل موعود بگیرد۔ شخصی گفت الٰہی! جنگ بزرگ نیز بہ اجل موعود انتہا پذیرد"۔[3]

عالی کی تصانیف میں وقائع کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہادر شاہ اول کے ایما پر اسے فارسی نصاب میں شامل کیا گیا[4] اور آج تک وہ درس میں شامل ہے۔ اس کی تین شرحیں لکھی گئیں:

۱۔ تحفۃ الودائع فی حل دقائق الوقائع، از کمال الدین احمد صدیقی (مؤلفہ ۱۲۰۴/۱۷۸۹) اس میں قرآنی آیات کی تشریح ہے۔[5]

---

[1] ایضاً ص ۵۴
[2] ایضاً ص ۱۴۱
[3] ایضاً
[4] مخزن الغرائب ورق ۱۱۰
[5] بوہار نمبر ۴۸۰۔

۲۔ مائدۃ الفوائد، از میر مخدوم مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ [1]

۳۔ شرح احادیہ بر وقائع محمدیہ از عبداللہ [2]

جنگ نامہ نعمت خاں عالی نے دو اور تاریخی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جنگ نامہ اور بہادر شاہ نامہ۔ جنگ نامہ شہزادہ اعظم اور معظم کی جنگ تخت نشینی کی تاریخ ہے عالی کی دوسری تصانیف کے مقابلہ میں یہ ایک سنجیدہ اور عبرت آمیز تاریخچہ ہے۔ شروع ہی میں مصنف نے تقدیر کی ستم ظریفی بیان کی ہے۔ جس کے آگے انسان بے بس اور لاچار ہے:۔

"دو گل از یک شاخ سر بر آرد۔ یکی را بر دستار دولت رساند و دیگری را بہ خار حوادث ریش گرداند۔ دو گوہر از یک بحر بیرون آرد۔ یکی را رونق تاج سلطنت سازد و دیگری را بہ کحل الجواہر عدم انداز د"۔ [3]

اس برادرانہ جنگ میں امرا کا حال بڑا عجیب تھا انھیں خواہی نخواہی اعظم یا معظم کی حمایت کرنی تھی حالانکہ بہت سے ان دونوں کو چاہتے تھے اور ان میں صلح و صفائی کے خواہاں تھے۔ عالی شروع میں شہزادہ اعظم کا حامی تھا لیکن اس کی شہادت کے بعد پانسہ پلٹ گیا اور اسے معظم کی حمایت کرنی پڑی۔ جنگ نامہ کی تالیف کے وقت عالی کو اپنی اس مجبوری کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"لہذا سمند قلم را در فضای احوال آن دو نیر سلطنت . . . جولان می دہد و محاربہ و مجادلہ آن دو شیر معرکہ شہامت و دلیری . . . بہ طریق اجمال بی کم و کاست کہ شایبۂ تکلف و طرفداری ہیچ یکی بدان نرسد، نگاشتۂ خامہ بیان می سازد"۔ [4]

---

[1] مطبوعہ کلکتہ، نیز فہرست مخطوطات کلکتہ مدرسہ ۲/ نمبر ۵۷۵ [2] اسٹوری ۱/ ۵۹۱

[3] جنگ نامہ، نولکشور، مارچ ۱۸۷۲ء ص ۲۔ [4] ایضاً

جنگ نامہ میں تمہید کے طور پر اورنگزیب کا راناا ودے پور پر حملہ شہزادہ اکبر کی بغاوت، دکن کی فتح وغیرہ کا ذکر ہے۔ جنگ کا بیان میدان جنگ تک محدود ہے اور اس کی حیثیت تاریخی سے زیادہ بیانیہ ہے۔ جنگ نامہ کا انداز بیان بھی وقائع کی طرح پر تکلف ہے مگر مؤخر الذکر میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہے جبکہ جنگ نامہ میں اختصار اور طنز و تعریض کا کمال ہے۔ یہ طنز بعد تلخ اور درد انگیز ہے۔ عالی کے لیئے یہ بڑے دکھ کی بات تھی کہ اس کے آقا کے سگے بیٹے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے اور وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ سب قسمت کا کھیل تھا اور یہی تسلی کا سبب تھا:۔

"سپهامان مضمار دانش مقرر کرده اند که ہیچ سپری مانع تیر حوادث سماوی نمی تواند شد و ہیچ تدبیری دافع بلیات آسمانی نمی تواند گردید... چنانچہ منخسف گردیدن بدر اقبال عالیجاه به عقدهٔ ذنب بلای ناگهانی دلیلی است روشن و باوجود رسیدن به ساحل مقصود به گرداب فنا فرو ریختن سفینهٔ حیات آن دریا دل برهانی است روشن"[1]

اس دلدوز واقعہ پر اور اہل قلم نے بھی خیال آرائی کی۔ چنانچہ ہمیں مزید چار کتابوں کا پتہ چلتا ہے جو درج ذیل ہیں:۔

۱. اعظم الحرب از کامراج بن نین سکھ سکسینہ[2]
۲. جنگ نامہ محمد معظم و اعظم شاہ از شاہ عطاء اللہ[3]
۳. نامعلوم الاسم[4]
۴. جنگ نامہ محمد اعظم شاہ (یا ظفر نامہ شاہ عالم بہادر) از سرخوش[5]

جنگ نامہ عالی کے دو انگریزی ترجمے ہوئے۔ پہلا ترجمہ چندر لال گپتا اور انگن لال ورمانے

---

[1] ایضاً (مطبع محمدی ۱۳۶۵ ہجری) ص ۲۰
[2] ریو ۳/۹۳۹
[3] آصفیہ ۱/۲۳۶ نمبر ۷۶۱
[4] ایشیاٹک ۲/نمبر ۷۰۰
[5] کلمات الشعراء ص ۸۰

مل کر کیا۔ دوسرا ترجمہ بیج ناتھ فگار کا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی دو انگریزی تلخیصوں کا بھی ذکر ملتا ہے[1]

بہادر شاہنامہ

نعمت خاں عالی کی اس وفاداری پر بہادر شاہ نے اسے عزت واحترام کے ساتھ اپنے دربار میں جگہ دی اور اسے سرکاری تاریخ بہادر شاہنامہ لکھنے پر مامور کیا[2] لیکن افسوس یہ کہ عالی بہادر شاہ کے صرف ابتدائی دو سالوں کی تاریخ لکھ سکا۔ موت نے اسے اس اہم کام سے باز رکھا ورنہ مآثر عالمگیری کی طرح یہ بھی ایک اہم تاریخ ہوتی کتاب کے دیباچہ میں مؤلف نے اپنے حالات بھی تحریر کیے ہیں جن کا ذکر اس کی سوانح میں کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد بہادر شاہ کی شہزادگی کے حالات پیدائش سے تخت نشینی تک لکھے ہیں۔ پھر اس کی تخت نشینی، برادرانہ جنگ اور دربار کے عام کوائف درج کیے ہیں۔ یہ کوائف ماہ بماہ ہفتہ بہفتہ اور کہیں روز بروز ہیں اور ربیع الثانی ۱۱۱۹/ جولائی ۱۷۰۷ سے لیکر اواخر ذی قعدہ ۱۱۲۰/ فروری ۱۷۰۹ تک کے عرصہ پر حاوی ہیں[3]

بہادر شاہنامہ کا یہ حصہ بہت مفصل اور طویل ہے۔ اس سے بیشتر امرا کے خطابات اور دربار کے روزانہ کے کوائف معلوم ہوتے ہیں جو عموماً ایک جامع تاریخ میں نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔

اسٹوارٹ[4] نے ایک تاریخ شاہ عالم کا ذکر کرتے ہوئے اسے نعمت خاں عالی کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ یہ عالی کی تالیف نہیں ہے کیونکہ مذکورہ تاریخ بہادر شاہ کے پورے عہد پر مشتمل ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے عالی اس سے قبل فوت ہو چکا تھا۔ غالباً یہ ایلیٹ کے مخطوطہ تاریخ بہادر شاہی کا دوسرا نسخہ ہے[5]

---

[1] اسٹوری ۱/ ۵۹۲؛ ایلیٹ ۷/ ۲۰۲۔

[2] بہادر شاہ نامہ (مشمولہ کلیات عالی) مخطوطہ ورق ۶۴ - ۶۳۔

[3] ریو ۱/ ۲۷۲۔

[4] بحوالہ ریو ۱/ ۲۷۲

[5] ایلیٹ ۷/ ۵۶۵۔

بہادر شاہنامہ کا ایک اختصار بھی کلیات عالی کے ایک مخطوطہ میں ملتا ہے[۱]۔

فتوحات عالمگیری

فتوحات عالمگیری میں اورنگزیب کی تخت نشینی سے ۳۴ سن جلوس (۲-۱۱۰۱/۹۱-۱۶۹۰ء) تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کا مؤلف ایسرداس ناگر گجرات میں پٹن کا باشندہ تھا۔ مؤلف نے بقول خود تیس سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام کی ملازمت کی۔ جب قاضی صاحب نے ذوالحجہ ۱۰۹۴/دسمبر ۱۶۸۳ میں اپنے عہدہ سے استعفا دیا تو ایسرداس شجاعت خاں گورنر گجرات سے منتعلق ہو گیا۔ کتاب کے آخر میں مؤلف نے درگا داس راٹھور کے ذریعہ شہزادی صفیۃ النسا اور شہزادہ بلند اختر کی واپسی کا ذکر کیا ہے[۲]۔ اکبر کی بغاوت کے بعد اس کی تین لڑکیاں صفیۃ النسا، زکیۃ النسا اور نجیبۃ النسا اور تین لڑکے محمد اصغر، نیکو سیر اور بلند اختر درگا داس کی حفاظت میں پلے بڑھے[۳]۔ ایسرداس جب جودھپور کا امین بنگر گیا تو درگا داس سے اس کے تعلقات اچھے ہو گئے۔ اس نے راجپوت سردار کو اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ شہزادہ اکبر کی اولاد واپس کر کے اورنگزیب کی خوشنودی حاصل کرے۔ چنانچہ درگا داس اس کے لیے تیار ہو گیا۔ اس اہم کام کی انجام دہی پر ایسرداس کو ڈھائی صدی منصب ملا اور میرٹھ (مارواڑ) میں اسے جاگیر عطا ہوئی[۴]۔ شہزادہ بلند اختر کی واپسی ۴۲ ویں سن جلوس (۹۹-۱۶۹۸ء) میں ہوئی[۵]۔ حالانکہ فتوحات عالمگیری ۳۴ ویں سن جلوس پر ختم ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بعد کا اضافہ ہے۔

سر جادو ناتھ سرکار کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ فتوحات کی تالیف ۲۱ رجب ۱۱۴۳/۲۳ ستمبر ۱۷۳۰ کو مکمل ہوئی جب مؤلف کی عمر ۷۶ سال تھی[۶]۔ یہ دراصل ایک مخطوطہ کی تاریخ ترقیم ہے۔ سال تالیف نہیں۔

---

[۱] ایتھے نمبر ۱۶۵۹۔

[۲] ریو ۱/۲۶۹۔

[۳] مآثر عالمگیری ص ۲۰۳

[۴] ریو ۱/ ۷۰-۲۶۹۔

[۵] مآثر عالمگیری ص ۳۹۵۔

[۶] اسٹڈیز ان اورنگزیبس ریّن ص ۲۶۶۔

فتوحات عالمگیری نام کی ایک اور تاریخ ہے جس کا مولف محمد ثنائی وحشت کشمیری کا بھتیجا شیخ رفعت ہے۔ آصفیہ کی فہرست مشروح میں اس کا نام اورنگ نامہ دیا ہے[1]۔ یہ تاریخ اورنگزیب کے سفر کشمیر (۴ سن جلوس) سے شروع ہو کر اس کی وفات پر ختم ہوتی ہے[2]۔ کتاب کا انداز پر تکلف ہے۔ مؤلف نے اپنی دوسری نامکمل تالیف آئینہ جہاں نما کا بھی ذکر کیا ہے جو اورنگزیب کے لڑکوں کی فتوحات پر مشتمل ہوگی[3]۔

نسخۂ دلکشا نسخۂ دلکشا بھیم سین کایستھ کی تالیف ہے جس میں ۱۰۶۸/۵۸-۱۶۵۷ سے لے کر ۱۱۲۰/۰۹-۱۷۰۸ تک دکن میں ہونے والی فوجی فتوحات کا ذکر ہے۔ مؤلف برہانپور کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ رگھونندن داس دکن میں شاہی توپخانے کا مشرف اور ۱۰۰ صدی منصب دار تھا۔ وہ ۱۰۸۰/۱۶۶۹ میں ملازمت سے سبکدوش ہوا[4]۔ اس کا چچا بھوگند اس دیوان تھا اور دیانت رائے اس کا خطاب تھا[5]۔ دیانت رائے کے لڑکے بھی مغل حکومت میں ملازم تھے[6]۔ بھیم سین ۲۳ جلوس شاہجہانی (۱۶۴۹) میں برہانپور میں پیدا ہوا۔ بچپن کے سات سال وہیں گذارے۔ اس کے بعد وہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد چلا گیا اور وہاں تحصیل علم کی۔ ساتھ ساتھ تیر اندازی اور برق اندازی سیکھی۔ جب مرزا راجہ جے سنگھ دکن کا صوبہ دار ہو کر آیا تو بھیم سین کے والد ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور خود بھیم سین کو ان کی جگہ برہانپور کے کارخانجات

---

[1] فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ (حصہ اول) حیدرآباد، ۱۳۵۷ ہجری، ص ۱۵۳

[2] بوڈلین نمبر ۳۹۵ (۳۰۰۱) فہرست مشروح (حوالہ بالا) کی رو سے یہ تاریخ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ۱۰۷۲/۶۲ - ۱۶۶۱ میں مکمل ہوئی۔

[3] ریو ۳/۱۰۳۶۔

[4] نسخۂ دلکشا، بانکی پور نمبر ۳۶۹۰، ص ۵، ۲۹؛ اسٹڈیز ان اورنگزیبس این ص ۲۵۳

[5] نسخۂ دلکشا ص ۵، ۲۹

[6] ایضاً ص ۳۵۹۔

اور جاگیروں کا مہتمم بنایا گیا. مؤلف روزانہ دو بار مرزا راجہ کے پاس حاضر ہوتا تھا. جب شہزادہ معظم ادھر آیا تو اس کے حضور میں بھی حاضری دی. شہزادہ معظم گولکنڈہ کی مہم کے دوران گرفتار ہوا تو مؤلف نے بھی عزلت اختیار کرلی. لیکن اس کے بعد وہ پھر بحال ہو گیا مگر اورنگزیب کی وفات کے بعد حالات بہت ابتر ہوئے اور جب کام بخش مارا گیا تو بھیم سین نے گوشہ نشینی اور ملازمت سے سبکدوشی کا فیصلہ کرلیا. اس کے دونوں لڑکے نرجھوگن اور شمبھوناتھ جہان شاہ بہادر عرف خجستہ اختر کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے[1]

بھیم سین کے تعلقات خاصے وسیع تھے. بندیل کھنڈ کے راجہ بیر سنگھ دیو کا پوتا راجہ پہاڑ سنگھ اس کا بچپن کا دوست تھا[2]

نسخۂ دلکشا اورنگزیب کی جنگ تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے اور کام بخش کی وفات پر ختم ہوتا ہے اس کا سال تالیف ۱۱۲۰/۰۹-۱۷۰۸ ہے[3].

تاریخ دلکشا نام کی ایک اور کتاب شیخ عنایت اللہ کنبو برادر شیخ محمد صالح کنبو کی تالیف ہے اس میں شاہجہاں اور اس کے پیشروؤں کا ذکر ہے[4]

مآثر عالمگیری عالمگیر نامہ کے بند ہونے کے بعد عہد اورنگزیب کی مسلسل تاریخ لکھنے کا خیال شاید کسی کو نہیں آیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد کی کوئی مکمل معاصر تاریخ نہیں ہے. یہ کام اورنگزیب کی وفات کے فوراً بعد محمد ساقی مستعد خاں نے کیا. اس نے عنایت اللہ مؤلف احکام عالمگیری و کلمات طیبات کے ایما پر عہد اورنگزیب کی تاریخ لکھنی شروع کی اور ۱۱۲۲/۱۷۱۰ء میں اسے

---

[1] ایضاً ص ۵۶، ۵۷، ۱۴۲، ۲۸۲ وغیرہ. [2] ایضاً ص ۵

[3] ایضاً ص ۲۸۳.

[4] براؤن فہرست، ضمیمہ، نمبر ۴۳؛ محمد صالح کنبو لاہوری: عمل صالح مرتبہ غلام یزدانی، ج ۱، کلکتہ ۱۹۲۳ء، ص ۱۳.

مکمل کر کے اس کا تاریخی نام مآثر عالمگیری رکھا۔[1]

محمد ساقی مستعد خاں اورنگزیب کے مشہور خواجہ سرا بختاور خاں کی سرکار میں منشی تھا اور خان مذکور کے خفیہ کاغذات بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا۔[2] مرآۃ العالم کے ایک مخطوطہ پر محمد ساقی کا یہ نوٹ ہے کہ میں نے اپنے آقا کی زندگی کے آخری سترہ سال میں مرآۃ العالم کی تالیف میں ان کی مدد کی۔[3] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مؤلف مذکور ۱۰۷۹/۶۹-۱۶۶۸ء میں بختاور خاں سے وابستہ ہو چکا تھا۔ جس کا انتقال ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ء میں ہوا۔ اس وقت محمد ساقی کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔

بختاور خاں کی وفات کے بعد محمد ساقی شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اسے پنج شنبہ کا وقائع نویس مقرر کیا گیا۔[4] بعد میں اسے مشرف خواصان اور منشی نظارت کے عہدے ملے۔[5] اورنگزیب کی وفات کے بعد وہ اپنے عہدہ پر بحال رہا۔ ذی قعدہ ۱۱۱۹/اپریل ۱۷۰۸ء میں بہادر شاہ اول نے اسے مستعد خاں کا خطاب عنایت کیا۔ چالیس سال شاہی ملازمت کے بعد اس نے ۲۰ شوال ۱۱۳۶/۱۲ جولائی ۱۷۲۴ء کو وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر ۷۵ سال تھی۔[6] اس کا لڑکا حافظ محمد حسن ۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲ء میں وقائع نویس مقرر ہو چکا تھا۔[7] انشای مطلوب میں مستعد خاں کے چند خطوط شامل ہیں۔[8]

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مآثر عالمگیری کی تالیف عنایت اللہ خاں کے ایما پر شروع کی گئی۔ چونکہ

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۶۹ | [2] ایضاً ص ۲۵۳

[3] ریو ۱/۲۷۰ | [4] مآثر عالمگیری ص ۲۵۴۔

[5] ایضاً ص ۲۵۵، ۴۰۷، ۴۶۲۔ | [6] ریو ۳/۹۳۶: ۱۰۸۳۔

[7] مآثر عالمگیری ص ۴۶۲۔

[8] مآثر عالمگیری (انگریزی ترجمہ جدوناتھ سرکار، کلکتہ ۱۹۴۷ء) مقدمہ ص ۶؛ ایتھے نمبر ۲۱۳۴ میں شیخ مبارک فرشی کی ایک انشای مطلوب کا ذکر ہے۔

عالمگیرنامہ میں تفصیل سے اورنگزیب کے ابتدائی دس سالوں کے واقعات لکھے جا چکے تھے اس لئے مؤلف نے اس کو مختصر کر کے اپنی کتاب میں شامل کرلیا. گویا اس کی اصل تالیف گیارہویں سن جلوس سے شروع ہو کر اورنگزیب کی وفات پر ختم ہوتی ہے. مؤلف کا کہنا ہے کہ بیشتر واقعات اس نے اپنی معلومات سے لکھے ہیں کیونکہ وہ ان کا عینی شاہد تھا. لیکن جہاں اسے کسی اور ماخذ کا سہارا لینا پڑا وہاں اس نے صرف معتبر اور مستند ماخذ پر اعتماد کیا ہے[1] واقعات کی ترتیب سال بسال ہے. ہاں کہیں کہیں صرف واقعات کی تالیف کر دی گئی ہے اور سوائے تاریخی ترتیب کے اس میں اور کوئی ترتیب نہیں رکھی گئی ہے. آخر میں اورنگزیب کی صفات اور اس کی اولاد کا ذکر ہے.

بعض مورخین[2] کا کہنا ہے کہ چونکہ محمد ساقی اورنگزیب کا مداح تھا اور دوسرے مداح عنایت اللہ خاں کے کہنے پر اس نے یہ تاریخ لکھی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تاریخ بالکل صحیح اور غیر جانبدارانہ ہے. پھر بھی اس عہد کی یہ سب سے زیادہ مقبول تاریخ ہے کیونکہ ایک تو یہ عہد اورنگزیب کی مکمل تاریخ ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی عبارت سادہ اور صاف اور بڑی حد تک بیجا تکلف اور تصنع سے بری ہے.

(۵) معاصرین اورنگزیب

تاریخ علی عادل شاہ تاریخ علی عادل شاہ بیجاپور کے حکمراں علی عادل شاہ ثانی (۸۳-۱۰۶۷/ ۷۳-۱۶۵۶) کی تاریخ ہے جس کا مؤلف نور اللہ بن قاضی سید علی محمد الحسینی القادری ہے. اس کی تالیف ۱۰۷۷/۶۷-۱۶۶۶ میں ہوئی. جیسا کہ اس مادہ تاریخ سے ظاہر ہے:-

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۶۹.

[2] مارلے ص ۱۲۷.

"روشن شدہ میزان عدل"

نوراللہ اپنے عہد کا ممتاز ادیب تھا. عادل شاہ اس کی صحبت سے محظوظ ہوتا تھا. اس تاریخ میں علی عادل شاہ کی ولادت سے لیکر ۷۶-۱۰۷۶/۶۶-۱۶۶۵ تک کے واقعات درج ہیں. بیجاپور کی تاریخ کے لئے یہ ایک ناگزیر تالیف ہے [۱]

(و) مقامی تاریخ

تاریخ پرسرور تاریخ پرسرور پنجاب (مغربی پاکستان) کے دو مقامات پرسرور اور سیالکوٹ کی نیم انسانوی تاریخ ہے. اس کا مؤلف محمد مقیم بن شیخ رحمت اللہ موضع سراوہ باجوہ [۲] من اعمال پرگنہ پرسرور کا باشندہ تھا. اس کا بیان ہے کہ عرصہ سے وہ ان کھنڈرات کی تاریخ جاننے کا متمنی تھا جو سید علی الحق کے مقبرہ کے چاروں طرف بکھرے تھے. اتفاق سے لاہور میں ایک بوڑھے فقیر سے اس کی ملاقات ہوئی اور اس سے اسے تمام باتیں معلوم ہوئیں. یہ واقعہ اورنگزیب کے چوتھے سن جلوس ۷۲-۱۰۷۱/۶۲-۱۶۶۱ کا ہے. اس تاریخ کا کوئی خاص عنوان نہیں ہے. کتاب دو حصوں میں منقسم ہے. پہلے حصہ میں سید علی الحق کی تاریخ ہے اور دوسرے میں اردگرد کے مقامات کی [۳]

جامع مفیدی محمد مفید مستوفی بن نجم الدین محمود بافقی نے یزد اور اس کے مشاہیر کے حالات پر ایک تاریخ جامع مفیدی کے نام سے لکھی. مؤلف کو ۷۷-۱۰۷۷/۶۷-۱۶۶۶

---

۱ ایتھے نمبر ۴۵۰ ؛ ریو ۱/ ۳۱۸.

۲ باجوہ (موجودہ بھگوول) پہلے سیالکوٹ ضلع کا پرگنہ تھا. پرسرور موجودہ سیالکوٹ کی تحصیل ہے (ڈونلپ اسمتھ گزیٹیر آف سیالکوٹ، ۹۵-۱۸۹۴ء، ص ۲۳)

۳ ریو ۳/ ۹۵۴.

میں یزد کے اوقاف کا مستوفی بنایا گیا اور دو سال بعد اسے ناظر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ لیکن محمد مفید نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور رجب ۱۰۸۱/ نومبر ۱۶۷۰ میں وہ اصفہان کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہاں سے وہ نجف اور کربلا کی زیارت کے لئے گیا اور بصرہ میں بس گیا یہیں ۱۰۸۲/ ۷۲-۱۶۷۱ میں اس نے جامع مفیدی کی تالیف شروع کی۔ اس دوران میں وہ بیمار پڑ گیا اور چار مہینے کے لئے تصنیف و تالیف کا کام بند پڑا رہا۔ صحت یاب ہونے پر مفید نے ہندوستان کا رخ کیا۔ وہ سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے ۱۰۸۴/ ۷۴-۱۶۷۳ میں وہ برہان پور پہونچا۔ دو سال بعد وہ دہلی گیا۔ صفر ۱۰۸۸/ اپریل ۱۶۷۷ میں مؤلف اجین پہونچا۔ یہاں شہزادہ اکبر نے اسے بطور خانساماں ملازم رکھ لیا۔[1] اگلے سال وہ شہزادہ کے ساتھ ملتان گیا اور وہیں جمادی الاول ۱۰۹۰/ جون ۱۶۷۹ میں اس نے یہ کتاب مکمل کی۔ جس پر وہ لگاتار آٹھ سال تک سفر کے دوران کام کرتا رہا تھا۔

مؤلف نے اولاً کتاب کو تین جلدوں میں لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا:۔

۱. سکندر سے تیموریوں تک

۲. صفوی عہد شاہ سلیمان تک۔ یہ جلد شاہجہاں آباد میں ۱۰۸۸/ ۷۸-۱۶۷۷ میں مکمل ہوئی۔

۳. یزد کی تاریخ اور جغرافیہ اور وہاں کے مشاہیر کے حالات[2]

اب جامع مفیدی کی صرف آخری جلد ملتی ہے[3]

کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں حصے ملا کر پانچ مقالے اور خاتمہ پر مشتمل ہیں۔ آخری مقالے میں مؤلف نے اپنے تمام سفر کے حالات لکھے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے بوڈلین لائبریری کی فہرست[4] میں اسے ایک

---

[1] شہزادہ اکبر ۱۷ رشوال ۱۰۸۸/ ۲ ردسمبر ۱۶۷۷ کو اجین پہونچا (مآثر عالمگیری ص ۱۶۰)

[2] ریو ۱/ ۲۰۷؛ اسٹوری ۱/ ۳۵۲۔

[3] ریو ۱/ ۲۰۷۔ برٹش میوزیم کے دونوں نسخے (نمبر ۲۱۰، ۲۱۱) خود نوشت معلوم ہوتے ہیں۔

[4] بوڈلین نمبر ۴۲۳۔

الگ تصنیف کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال کتاب کا یہ حصہ بہت دلچسپ اور پر از معلومات ہے مؤلف نے سورت، دہلی، حیدر آباد، برہانپور، سارنگپور اور اورنگ آباد وغیرہ شہروں کی زیارت کی اور آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا ہے۔

محمد مفید دو اور کتابوں کا مصنف ہے۔ پہلی مجالس الملوک ہے اس میں ایران کے حکمرانوں کی فہرست ابتدا سے اس کے عہد تک دی گئی ہے۔ اس کی تالیف شاہ عباس ثانی (۱۰۵۲-۷۷/۱۶۴۲-۶۷) کے عہد میں ہوئی[1] دوسری کتاب مختصر مفیدی صفوی بادشاہوں کی مدحیہ تاریخ ہے۔ مؤلف اپنے آپ کو صفویوں کا سچا خادم کہتا ہے۔ اس میں ایران کا جغرافیہ اور متعلق تاریخی معلومات ہیں۔ مختصر مفیدی کی تالیف دکن میں ۱۰۸۷/۷۷-۱۶۷۶ میں شروع ہوئی اور لاہور میں ۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰ میں مکمل ہوئی[2]۔

مفید یزدی اور ملا مفید بلخی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ مؤخر الذکر ایک عمدہ شاعر تھا۔ سرخوش کہتا ہے کہ خاک توران سے اس جیسا معنی یاب نہیں اٹھا۔ اس کے بقول مفید بلخی کا انتقال ۱۰۸۱/۷۱-۱۶۷۰ میں ہوا۔

برکشید آہ' و سال تاریخش گفت 'ملا مفید بلخی مرد'[3]

۱۰۸۷ - ۶ = ۱۰۸۱

اشپرانگر[4] نے بھی مفید بلخی کے دیوان کا ذکر کیا ہے۔ اس کے دیوان میں نواب اسلام خاں گورنر کشمیر (م۔ ۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳) کی مدح، علاء الملک فاضل خاں تونی کی تاریخ وفات (ذی قعدہ ۱۰۷۳/ جون ۱۶۶۳)، نواب مبارز خاں گورنر کشمیر کی آمد کا قطعہ (۱۰۷۳/۶۲-۱۶۶۳) وغیرہ ہیں[5]۔ بلخی کی رباعیات اور غزلیں پیاری ہیں۔ دو رباعی یہاں درج کی جاتی ہے :-

---

[1] اسٹوری ۱/ ۲۳۷۔

[2] ریو ۱/ ۴۲۷۔

[3] کلمات الشعرا ص ۱۰۸۔

[4] اشپرانگر ص ۴۹۹۔

[5] دیوان مفید بلخی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹، ورق ۷۰، ۷۱، ۶۵۔ یہ جمادی الاول ۱۰۸۹ ہجری کا نوشتہ ہے۔

صیاد مشو کہ از تو دامی ماند | وز بہر ستمگران نظامی ماند
چشمی تر کن ز گریہ تا چون حالم | بر صفحہ روزگار نامی ماند[1]

ای شام شریف طرۂ مشکینت | وی صبح نشاپور رخ رنگینت
خال تو فرح بخش تر از شام ہرات | بر ہند سواد کاکل مشکینت[2]

---

[1] ایضاً ورق ۶۶ ۔

[2] ایضاً ورق ۶۷ ۔

باب ۱۱

سوانح شعرا

کلمات الشعرا

کلمات الشعرا اس عہد کا مشہور تذکرہ ہے جسے محمد افضل سرخوش نے مرتب کیا، اس میں ہندوستان کے ان شعرا کا ذکر ہے جو جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگزیب کے زمانے میں تھے[۱]۔ کلمات کا مؤلف سرخوش کشمیر میں ۱۰۵۴/۴۵-۱۶۴۴ء میں پیدا ہوا۔ "افضل اہل زمانہ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے جو اس نے موسوی خاں فطرت سے مستعار لے لیا تھا[۲]۔ وہ ترکول کے برلاس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا[۳]۔ بیدل بھی اسی قبیلہ کے فرد تھے۔ سرخوش کے والد محمد زاہد شاہجہاں کے ہفت ہزاری امیر عبداللہ خاں زخمی کی سرکار میں میر سامان تھے[۴]۔ زاہد کے انتقال کے بعد ان کے

۱؎ کلمات الشعرا ص ۲

۲؎ ایضاً ص ۱۰۰؛ سفینۂ خوشگو ص ۷۱۔ شیر خاں (مرآۃ الخیال ص ۳۱۲) اسے بدخشانی کہتا ہے اور (گل رعنا ورق ۱۲۷) اسے دہلوی بتاتا ہے۔

۳؎ مرآۃ الخیال ص ۳۱۲؛ ریاض الشعرا (ورق ۱۸۷) میں ہے "در فرقۂ قولار بسر می بردہ"

۴؎ مرآۃ الخیال ص ۱۰۰۔

پانچوں لڑکے شاہی ملازمت میں آ گئے۔[1] سرخوش کو اول زخمی کے یہاں ملازمت ملی لیکن جب زخمی کا انتقال ہو گیا تو بخشی الممالک روح اللہ خاں کی سفارش پر اسے شاہی دربار میں ملازمت مل گئی۔ غالباً اس وقت اس کا منصب سہ بیستی تھا۔[2] ۱۰۸۷/۷۷-۱۶۷۶ میں اسے حسن ابدال میں مشرف عدالت مقرر کیا گیا جس کی تاریخ اس نے "اشراف عدالت" سے نکالی۔[3] لیکن اس عہدہ سے قبل بھی اس کی مالی حالت بہتر تھی۔ کیونکہ ۱۰۷۱/۶۱-۱۶۶۰ اور ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ میں وہ دہلی میں دو مکان بنوا چکا تھا۔[4] ۱۱۱۰/۹۹-۱۶۹۸ میں اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اور دو سال بعد اس میں ایک حوض اور فوارہ بنوایا۔[5] اپنے مکان کے دروازہ پر اس نے یہ لکھ رکھا تھا۔ 'اگر بیایی درباز است وگر نیایی حق بی نیاز است'۔[6]

اورنگزیب کی وفات کے بعد بھی سرخوش اپنے عہدہ پر بحال رہا۔ غالباً فرخ سیر کے عہد تک اس کی ملازمت باقی رہی۔[7] البتہ بڑھاپے کے سبب وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ بعد میں اس کی بینائی جاتی رہی۔ اسی دوران میں سراج الدین علی خاں آرزو ایک دن اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اس ملاقات کا حال انھیں کی زبانی سنئے:۔

"فقیر آرزو در اوائل سلطنت محمد فرخ سیر بادشاہ شہید مرحوم در خدمت او (سرخوش) رسیدہ۔ چون از حلیہ بصارت در آن وقت مردم چشمش عاری شدہ بود، دیوان خود را بہ فضل اللہ نام پسر خود کہ بعد از و شعر می گفت و ہنر تخلص می نمود و در عین شباب جہان گذران را وداع نمود، داد کہ پیش فقیر بخواند"۔[8]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۷۱۔
[2] کلمات الشعرا ص ۲۷؛ ید بیضا ص ۱۲۶۔
[3] کلمات الشعرا ص ۱۳۲۔
[4] ایضاً ص ۱۳۱
[5] ایضاً ص ۱۲۹
[6] سفینۂ خوشگو ص ۷۲۔
[7] نشتر عشق ص ۸۷۴۔
[8] مجمع النفائس ورق ۲۰۸۔

اس کے بعد سرخوش نے آرزو کے شعر سنے اور بہت تعریف کی۔ آرزو کہتے ہیں کہ سرخوش کے مزاج میں جتنا انصاف تھا، اسکا عشر عشیر بھی بیدل کے یہاں نہیں تھا[۱]

سرخوش کا انتقال دہلی میں محرم ۱۱۲۶/ جنوری ۱۷۱۴ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۶ سال کی تھی۔ قدم شریف میں دفن کیا گیا[۲]۔ دہلی کے شعرا نے اس عظیم سانحہ کا ماتم کیا اور مرثیے اور تاریخی قطعات لکھے۔ لالہ سکھراج سبقت نے "افضل دہور" سے اور حکم چند ندرت نے "زجہان رفت آہ عارف پاک" سے تاریخ نکالی[۳]۔ سرخوش کے لڑکوں میں صرف فضل اللہ ہنر کا نام ملتا ہے۔ باقی اولاد کی تفصیل معلوم نہیں۔

دہلی میں سرخوش کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ اس وقت دہلی میں ایک صوفی شیخ نظام الدین طایع تھے۔ سرخوش انھیں نظام الدین اولیا کہتا تھا اور ان سے بیعت تھا[۴]۔ ایک دوسرے صوفی شاہ جلال تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو سرخوش کو ان کا خلیفہ مقرر کیا گیا[۵]۔ یہ ۱۰۸۵/ ۷۵-۱۶۷۴ کا واقعہ ہے۔ سرخوش کو خود بھی اپنے تصوف پر ناز تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے:

چار اند ز تحقیق کماہی آگاہ ابن عربی اول شان در افواہ
پس مولوی و سحابی و ملا شاہ پنجم سرخوش غریب اللہ[۶]

لیکن تصوف کے اس ادعا کے باوجود امرای عصر سے اس کے اچھے مراسم تھے اور اہم موقعوں پر وہ ان کے لیے مدح یا تاریخ کہتا تھا۔ اگر کبھی کہیں سے خاطر خواہ جواب نہیں ملتا تو سرخوش اس کی ہجو سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ کلمات الشعرا میں جن امرا سے اس نے اپنے تعلق کا ذکر کیا ہے اس

۱؎ ایضاً

۲؎ سفینۂ خوشگو ص ۷۵؛ گل رعنا ورق ۱۲۷؛ ریو ۱/ ۳۶۹) اور ایتھے (نمبر ۶۷۰) نے بالترتیب ۱۱۲۵ھ اور ۱۱۲۷ھ لکھا ہے

۳؎ سفینۂ خوشگو ص ۷۶۔

۴؎ کلمات الشعرا ص ۷۱

۵؎ ایضاً ص ۱۲۹

۶؎ سفینۂ خوشگو ص ۷۲۔

میں ہمت خاں، عاقل خاں رازی، بختاور خاں، ابو علی امجد خاں بخشی، شیخ سعد اللہ اور حافظ نور محمد میر سامان گوہر آرا بیگم کے نام نظر آتے ہیں[۱] شعرا میں ناصر علی سرہندی اور فطرت موسوی سے اس کے خصوصی مراسم تھے۔ بیدل سے البتہ اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ کیونکہ ناصر علی کے اکسانے پر وہ ان کے مصرعوں پر تضمین کر کے اس کا انداز بدل دیتا تھا۔[۲] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ تعلقات استوار ہو گئے تھے کیونکہ بیدل نے سرخوش کے دیوان پر حک و اصلاح کی[۳] خوشگو لکھتا ہے کہ میں نے سرخوش اور بیدل میں مصالحت کی کوشش کی تو سرخوش نے کہا "کیا تمھیں ہاتھیوں کی لڑائی سے دلچسپی ہے؟"[۴]

آج سرخوش ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے زندہ ہے لیکن وہ خود اپنے شاعر ہونے پر فخر کرتا تھا۔ شاعری سے اسے بچپن سے لگاؤ تھا۔ نو سال کی عمر میں اس نے پہلا شعر کہا جسے سن کر اس کے بڑے بھائی خیر الدین عجزی کو بڑی حیرت ہوئی۔ لیکن عجزی نے جب بچے کا کمال دیکھا تو منع کرنے کے بجائے اس کی ہمت افزائی کی[۵] چنانچہ گیارہ سال کی عمر میں سرخوش نے ایک نٹنی کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھ کر یہ رباعی کہی:

آن دلبر بوالعجب کہ ماہ زیبا است — بالای علم چو گل بہ شاخ زیبا است
نی نی غلطم کہ آفتاب محشر — یک نیزہ برآمد و قیامت پیدا است

یہ رباعی سن کر لوگوں کو بیحد تعجب ہوا۔ وہ سرخوش کے والد کے پاس گئے اور ہونہار بچے کے غیر معمولی ملکہ پر انھیں مبارکباد دی[۶] جب سرخوش نے شاعری کی کچھ اور منزلیں طے کیں تو منعم حکاک شیرازی اور ملا بیخود جامی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کا تخلص بیخود کا عطا کردہ ہے۔ بیخود بعد میں اسے محمد علی ماہر کے حضور میں لے گئے لیکن ماہر نوجوان شاعر کو شاگرد سے زیادہ دوست سمجھتے تھے۔[۷] موسوی

۱۔ کلمات الشعرا ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۷۔ — ۲۔ ایضاً ص ۱۵

۳۔ انتخاب دیوان سرخوش، سالار جنگ نمبر ۲۰ (دیباچہ) — ۴۔ سفینۂ خوشگو ص ۷۴۔

۵۔ کلمات الشعرا ص ۱۰۴۔ ۶۔ ایضاً۔ — ۷۔ ایضاً ص ۱۰۴، ۱۲۰- ۱۰۹۔

فطرت اگرچہ باقاعدہ سرخوش کے استاد نہیں تھے لیکن سرخوش انھیں استاد کا درجہ دیتا تھا[1]

خداداد ملکہ شاعری اور اساتذہ کی تربیت نے سرخوش کو بہت جلد ایک مقبول شاعر بنا دیا۔ اس کے دوستوں کی فہرست میں اس دور کے کئی مشہور شاعر تھے۔ اب وہ ایک استاد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور بہت سے نوجوان شعرا کے کلام پر اصلاح دیتا تھا۔ ان شعرا میں حکم چند ندرت[2]۔ محمد یوسف قدیم[3]، بیغم بیراگی[4]، حافظ محمد جمال تلاش[5]، شیخ سعد اللہ گلشن[6]، عبدالرحیم کمگو کشمیری[7] اور بندرابن داس خوشگو مؤلف سفینۂ خوشگو[8] کے نام نظر آتے ہیں۔

سرخوش نے متعدد تصانیف کیں مگر آج وہ صرف کلمات الشعرا کی بدولت زندہ ہے۔

گل رعنا کے مؤلف کا بیان ہے کہ اس کے لڑکوں کی لاپرواہی سے اس کی بیشتر تصانیف ضائع ہو گئیں[9]

اس فہرست میں ہمیں مندرجہ ذیل عنوان نظر آتے ہیں :۔

۱۔ دیوان

۲۔ مثنوی نور علی نور در تتبع مثنوی رومی

۳۔ مثنوی حسن و عشق مشتمل بر قصہ سسی و پنوں

۴۔ مثنوی دربیان ہندوستان

۵۔ مثنوی قضا و قدر[10]

---

[1] ایضاً ص ۹۹ (حاشیہ)

[2] سفینۂ خوشگو ص ۲۵۲۔

[3] ایضاً ص ۶۳۔

[4] کلمات الشعرا ص ۱۹۔

[5] ایضاً ص ۲۱۔ تلاش کا انتقال ۱۱۲۷/ ۱۷۱۵ میں ہوا۔ (سفینۂ خوشگو ص ۸۲)

[6] کلمات الشعرا ص ۹۶

[7] ایضاً ص ۹۷

[8] سفینۂ خوشگو ص ۷۴۔

[9] گل رعنا ورق ۱۲۷۔

[10] سفینۂ خوشگو ص ۷۶۔

۶۔ ساقی نامہ۔ یہ ہمت خاں کے لئے لکھا گیا تھا۔

۷۔ مثنوی درتعریف خسخانہ۔ یہ بھی ہمت خاں کے لئے لکھی گئی[۱]

۸۔ ظفرنامہ شاہ عالم یا جنگ نامۂ محمد اعظم[۲]

۹۔ روائح در تتبع لوائح جامی[۳]

۱۰۔ جوش وخروش دربیان خویش[۴]

۱۱۔ کلمات الشعرا۔

۱۲۔ ترتیب دیوان ناصر علی و معز فطرت موسوی[۵]

سرخوش نے اپنے اشعار کا انتخاب کرکے ایک دیوان مرتب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا دیوان ممتاز معاصرین ناصر علی، غنی اور معز فطرت کے دیوان کی طرح مختصر ہے اور یہ تمام اشعار ممتاز شعرا کے پسندیدہ ہیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ اس نے اپنا دیوان بیدل کی خدمت میں پیش کیا تو استاد نے غیر معیاری یا ہلکے اشعار نکال دئے اور موجودہ دیوان ان کی منظوری کے بعد منظر عام پر آرہا ہے۔ یہ دیوان جس کا نام "منتخب گلدستہ معانی ہے، ۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ء میں مکمل ہوا۔ "ہمہ انتخاب" اس کی تاریخ ہے۔ سرخوش کہتا ہے کہ اس دیوان سے مزید انتخاب ایک احمقانہ فعل ہوگا[۶]

سرخوش کے ایک دیوان میں جس کا نام منتخب کلیات سرخوش ہے، ہمیں ایک نثری دیباچہ ملتا ہے جس کا مندرجہ ذیل اقتباس اہم ہے:۔

"لہٰذا این سعادت نامۂ سرمدی کہ مسمی بہ نور محمدی است و مشتمل بر حمد و نعت و منقبت

---

[۱] کلمات الشعرا ص ۲۳

[۲] ایضاً ص ۸۰

[۳] ایضاً ص ۱۷

[۴] سفینۂ خوشگو ص ۷۶

[۵] کلمات الشعرا ص ۸۴

[۶] انتخاب دیوان سرخوش، سالار جنگ نمبر ۲۰، (دیباچہ)

دیباچہ طراز دیوان وعنوان آرای کلیات خویش ساختم وسر افتخار سخن را باین عز وشرف بہ سپہر برین افراختم۔ سبحان اللہ چہ دیوانی است رنگین وچہ رنگین بوستانی است پراز گلہای مضامین کہ زیب دیباچہ اش نور محمدی است وزینت عنوانش سعادت نامۂ سرمدی"[1]

غالباً یہ کسی دوسرے دیوان کا مقدمہ ہے۔ گل رعنا کے مؤلف کا بیان ہے کہ سرخوش نے دو دیوان مرتب کیے تھے ایک میں شعر قدیم تھے اور دوسرے میں شعر جدید[2]۔ یہ بھی ممکن ہے یہ دیوان غزلیات کے بجائے کلیات کا دیباچہ ہو جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس امر کی تصدیق اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ دیوان غزلیات میں صرف دو ہزار اشعار تھے[3] جبکہ کلیات میں تقریباً پینتالیس ہزار اشعار تھے[4]۔

سرخوش اپنے عہد کے متوسط شعرا میں تھا۔ کلمات میں جگہ جگہ اس نے اپنی شاعری کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناصر علی کا بیان کرتے ہوئے وہ بہت حسرت سے یہ کہتا ہے:-

"من بیطالع ہرگاہ در دیوان خود نظر می کنم، اینقدر معنی ہائے تازہ می یابم کہ شعرای دیگر برای یک مصرع عاجز اند نمی یابند۔ اما ہیچ کس خریدار نیست، بلکہ بہ گوشۂ چشم ہم نمی نگرد۔

یوسفی در پردہ بودم کس خریداری نشد ۔۔۔ خویش را بفروختم باخویش سودا باز گشت

یک بیت در تعریف معنی یابی خود گفتہ ام، فی الواقع چنین است:

سرخوش از طبعم نجستہ معنی نابستہ ای ۔۔۔ بعد ازین ہر کس کہ گوید شعر مضمون از من است"[5]

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس حسرت اور تعلی کے باوجود سرخوش کی شاعری کے بجائے اس کا تذکرہ زیادہ مشہور ہوا۔ تذکرہ کا عنوان کلمات الشعرا تاریخی نام ہے[6] جس سے ۱۰۹۳/۱۶۸۲ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سال تکمیل ہو لیکن اس کے بعد بھی تذکرہ میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ

---

[1] منتخب کلیات سرخوش آصفیہ نمبر ۴۹۷ (ج ۴/ص ۳۰۰) (دیباچہ)

[2] گل رعنا ورق ۱۲۷ ۔۔۔ [3] خلاصۃ الافکار ورق ۸۶

[4] سفینۂ خوشگو ص ۷۶۔ ۔۔۔ [5] کلمات الشعرا ص ۷۵ ۔۔۔ [6] ایضاً ص ۲۔

بعد کے واقعات میں ناصر علی کی وفات (۱۱۰۸/ ۹۷-۱۶۹۶) سرخوش کی مسجد کی تعمیر (۱۱۱۰/ ۹۹-۱۶۹۸) سرخوش کے بھتیجے اسد اللہ کی ولادت (۱۱۱۵/ ۰۴-۱۷۰۳) اور نعمت خاں عالی کی تاریخ نویسی (۱۱۱۸/ ۰۹-۱۷۰۶ - ۲۰) کا ذکر ملتا ہے[1]۔ کلمات کے ایک مخطوطہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے :-

"از وقتیکہ بہ تسوید این نسخۂ غریبہ پرداختہ ام، چہار پنج مسودہ بہ دست خود نگاشتہ مرتب ساختہ ام۔ ہر مسودہ را یاران از غایت شوق بی رُفت وروب نظر ثانی دست بہ دست نقل گرفتہ بردند وجا بہ جا شہرت دادہ۔ اگرچہ مقصود حاصل یکی است۔ اما در کثرت عبارات تغیر وتبدل واقع گشتہ واشعار بعضی اعزہ دیگر داخل شدہ۔ قصہ کوتاہ کہ این نسخۂ ناسخ جمیع مسودہ ہا است۔ ہر کہ سابق دارد بشوید واین را بہ جان برابر دارد"[2]

اس کے بعد مؤلف اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ قاری اس تذکرہ میں اپنے معاصرین کے حالات اور اشعار کا اضافہ کرسکتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر کلمات کے مختلف نسخوں میں شعرا کے تراجم، تعداد اور اشعار مختلف ہیں۔ بعض جگہ ان کے تراجم میں تضاد ملتا ہے۔ مثلاً عاقل خاں رازی کا ترجمہ عام مخطوطات میں اس طرح ہے :-

"در عنفوان جوانی مشق شعر کردہ۔ کتاب مرقع در زمین مثنوی مولوی بہ تقلید عارفان گفتہ۔ بیشتر مطالب نسخۂ امواج خوبی بہ نظم آوردہ۔ چند تصنیف بی مزہ دیگر ہم دارد"

لیکن ایک مخطوطہ میں یہ ترجمہ ملتا ہے :-

"نواب عاقل خان رازی صاحب صوبہ دار الخلافہ شاہجہان آباد۔ امیر با تدبیر، عادل انصاف گستر، رعیت پرور، نیک بخت، حق شناس، صوفی مشرب است خلق خدا

---

[1] ایضاً ص ۷۵، ۱۳۱، ۱۳۲، ۷۹۔ [2] ایضاً (مخطوطہ)

در سایۂ احسان و الطاف او آسودہ و مرفہ الحال ۔ در عالم جوانی مشق شعر بسیار کردہ ۔ کتاب مرقع در زمین مثنوی مولوی روم عارفانہ فرمود ۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ قصۂ پدماوت و مدھمالت را بہ نظم آوردہ، نام نہادہ ۔ درآنجا داد سخنوری دادہ ۔ خدایش دیرگاہ داراد "۔ [1]

اسی بنا پر بیخبر اور احمد علی سندیلوی دونوں نے کلمات پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔[2]

کلمات میں شعرا کا ذکر ابجدوار ہے ۔ پہلا شاعر میر الٰہی (م ۔ ۱۰۶۲/ ۵۲ ۔ ۱۶۵۱) ہے اور آخری شاعر میر یحییٰ کاشی (م ۔ ۱۰۷۴/ ۶۴ ۔ ۱۶۶۳) ہے ۔ کل تذکرہ میں ۱۶۹ شعرا کا ذکر ہے ۔ سرخوش نے ان مآخذ کا ذکر نہیں کیا ہے جہاں سے اس نے اپنے پیشرو شعرا کے حالات لئے ہیں ۔ معاصرین کے اشعار کے لئے اس نے فطرت موسوی، محمد علی ماہر اور راسخ کی بیاضوں سے مدد لی۔[3] پھر بھی جہاں تک تراجم کا تعلق ہے وہ بہت تشنہ ہیں ۔ البتہ جگہ جگہ اس نے اپنے حالات اور اشعار کی خواہ مخواہ بھرمار کی ہے ۔ بعض مشہور معاصر شعرا کے حالات بھی نہیں دیئے ہیں مثلاً غنیمت کے بارے میں صرف یہ لکھا ہے :

" از خاکیان ہند غنیمت بودہ ۔ طبعی درست داشت و دیوانی مختصر دارد ۔ مثنوی نیز فکر کردہ "۔ [4]

یا بیدل کے حالات میں نہ توان کی کسی مثنوی کا نام بتایا ہے اور نہ سوانح پر ایک لفظ لکھا ہے ۔ ان کے اشعار بھی میر محمد زماں راسخ کی زبانی نقل کیے ہیں ۔[5]

---

[1] ایضاً ص ۴۴ ۔ دوسری عبارت مجموعہ شیرانی نمبر ۱۴۹۳ کی ہے (حاشیہ)

[2] سفینۂ بیخبر ص ۱۴۱؛ مخزن الغرائب ورق ۱۸۲ ۔ [3] کلمات الشعرا ص ۲۷ ۔ ۱۲۶ ۔

[4] ایضاً ص ۸۲ ۔

[5] ایضاً ص ۱۴ ۔ دوسرے نسخہ اب ۔ مجموعہ شیرانی نمبر ۱۴۹۳) میں محیط اعظم، طلسم حیرت، چہار عنصر اور طور معرفت کا ذکر ہے ۔

کلمات اگرچہ ہندوستانی شعرا کا تذکرہ ہے مگر اس میں دو ایرانی شاعر طاہر وحید اور مرہادی شرر کا بھی ذکر ہے، کیونکہ ان کی شہرت کے پیش نظر انھیں نظرانداز کرنا مناسب نہیں تھا۔[1]

تذکرہ کے آخر میں کتاب کی تعریف اور چند مشہور تاریخیں ہیں جن میں بہت سی خود سرخوش کی کہی ہیں۔

مرآۃ الخیال اس عہد کا دوسرا تذکرۂ شعرا مرآۃ الخیال ہے جس کا مؤلف شیر خاں لودی ہے شیر خاں کے والد علی امجد خاں[2] لودی شہزادہ شجاع کی سرکار میں ملازم تھے اور ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ شیر خاں بھی کچھ دن وہاں رہا اور فرخ حسین ناظم سے تحصیل علم کی۔ ۱۰۶۸/۵۸-۱۶۵۷ میں جب ناظم کا انتقال ہو گیا تو اس نے والد سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے عربی اور فارسی کا جامع مطالعہ کیا اور علوم رائجہ کی تحصیل کی۔ ۱۰۹۰/۸۰-۱۶۷۹ میں ہمارا مؤلف شکر اللہ خاں خاکسار سے متوسل ہو گیا۔[3] اس نے تذکرہ میں کئی جگہ اپنے مربی کی تعریف کی ہے اور ان سے اپنا آبائی تعلق بتایا ہے۔

مرآۃ الخیال کی تالیف کا سبب ایک حادثہ تھا۔ ایسا ہوا کہ ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ء میں شیر خاں کے والد کا انتقال ہو گیا۔ تین سال بعد اس کے بڑے بھائی عبداللہ خاں بھی گذر گئے۔ چنانچہ اس نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے موجودہ تذکرہ لکھنا شروع کیا اور ۱۱۰۲/۹۱-۱۶۹۰ میں اسے مکمل کیا جیسا کہ اس تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے:-

این چمن زاری کہ مرآۃ الخیالش خواندہ اند ۔۔۔ داد از حسن معانی یک جہان رنگ و کمال

صورت تاریخ اتمامش توان بی پردہ دید ۔۔۔ گر تامل "پردہ" بردارد ز "مرآۃ الخیال"[4]

۱۱۰۲ = تامل ۔ پردہ ۲۱۱ ۔ ۱۳۱۳

---

[1] ایضاً ص ۶۰، ۱۱۹۔

[2] ریو (۳۷۰/۱) اور بوڈلین (نمبر ۳۷۴) میں علی احمد خاں ہے۔

[3] مرآۃ الخیال ص ۱۸، ۱۳۴، ۲۵۶۔

[4] ایضاً ص ۳۸۶

مرآۃ الخیال ابتدا سے معاصر شعرا تک کا تذکرہ ہے۔ پوری کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں قدیم شعرا کا بیان ہے جس میں پہلا شاعر رودکی ہے اور آخری آصفی۔ دوسرے حصہ میں آٹھ شعرا کا ذکر ہے اول شاعر جلال اسیر ہے اور آخری سحابی نجفی۔ تیسرے حصہ میں شاہجہانی عہد کے اٹھائیس شاعروں کا تذکرہ ہے قدسی سے فطرت تک۔ چوتھا حصہ گیارہ زندہ شعرا کے حال پر مشتمل ہے۔ پہلا شاعر عاقل خاں رازی ہے اور آخری عبرت۔ پانچویں حصہ میں ان نو ہندوستانی شعرا کا ذکر ہے جن کی شہرت ایران اور توران تک پہونچ چکی ہے۔ ان میں پہلا شاعر ناصر علی سرہندی ہے اور آخری شیخ عبدالقادر غزنوی۔ چھٹے حصہ میں پندرہ شاعرات کے تراجم ہیں۔ پہلی شاعرہ مہری ہروی ہے اور آخری شریفہ بانو ہمدانی۔

اس طرح پورے تذکرہ میں ۱۳۶ شعرا کا ذکر ہے۔ اس کے بعد خاتمہ ہے جس میں تالیف تذکرہ کے اسباب کا ذکر ہے۔ شیر خاں نے اپنے ماخذ کی فہرست نہیں دی ہے مگر دوران تذکرہ میں یہ حوالے ملتے ہیں:-

مجمل فصیحی، تذکرۂ دولت شاہ، تاریخ گزیدہ، نفحات الانس، تاریخ ہند، جواہر الاسرار شیخ آذری وغیرہ [۱]

معاصرین کے حالات کے لئے اپنی معلومات کا سہارا لیا ہے۔ ان میں اکثر کے حالات مختصر اور معمولی ہیں البتہ اشعار کی بھرمار ہے۔ تعجب ہے کہ شیر خاں اور سرخوش ایک دوسرے کے تذکرہ سے بالکل واقف نہیں نظر آتے۔

مرآۃ الخیال صرف تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں شیر خاں کی انشا پردازی کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ بیچ بیچ میں بحر، قافیہ، تصوف، ہندوستانی موسیقی، تعبیر خواب، قیافہ شناسی، جن، عشق، جغرافیہ اور اخلاقیات پر طویل بحثیں ہیں۔ جن سے تذکرہ نگار کا مقصد اظہار علم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مرآۃ الخیال

---

[۱] ایضاً ص ۷، ۲۳، ۴۵، ۴۹، ۵۸ وغیرہ۔

میں بعض معاصرین کے اہم خطوط بھی نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں ناصر علی اور شکر اللہ خاں خاکسار کی خط و کتابت دلچسپ ہے جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے۔

شیر خاں نے جگہ جگہ شاعری سے اورنگزیب کی نفرت کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر بادشاہ وقت شعرا کا سرپرست ہوتا تو شاید اس عصر کی شاعری اور بہتر ہوتی[1] لیکن مؤلف نے اورنگزیب کی اسلام پرستی کی پرجوش حمایت کی ہے[2] اور ابوالفضل اور فیضی پر سخت تنقید کی ہے کہ انھوں نے اکبر کو دین اسلام سے گمراہ کر دیا تھا[3]

آسمان سخن

یہاں ایک تذکرہ آسمان سخن کا ذکر مناسب ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر اشپرانگر نے اپنی فہرست میں دیا ہے۔ یہ دراصل تذکرۂ دولت شاہ کی منظوم تلخیص ہے۔ یہ تلخیص اس عہد کے مشہور انجینیر لطف اللہ مہندس بن استاد احمد معمار لاہوری نے کی ہے۔ لطف اللہ کا بیان ہے کہ عہد اکبری میں فیضی کرمانی نے تذکرہ دولت شاہ کی تلخیص کی تھی۔ میں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے اس میں عہد شاہجہانی تک کے شعرا کو شامل کر دیا ہے۔ تلخیص بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ آخری حصہ سے اشپرانگر نے چند اشعار نقل کیے ہیں:-

وحید دہر امانی بن مہابت خان	ولی بہ خان زمان است شہرۂ دوران
دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن	ربودہ گوی سخن از سخنوران در فن
دگر سخنور کشمیر محسن فانی است	بقای نام وی از دولت سخندانی است[4]

ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آسمان سخن ایک طرح کی منظوم فہرست ہے اور بس۔

---

1. ایضاً ص ۱۶۳/۱۷۸۔
2. ایضاً ص ۱۵۴۔
3. ایضاً ص ۹۵۔
4. اشپرانگر ص ۱۱۶

(ب) سوانح مشائخ وغیرہ

راحت الارواح

راحت الارواح شیخ عزیز اللہ لاہوری کی سوانح حیات ہے۔ اس کا مصنف شیخ کا شاگرد اور مرید حافظ محمد سعید بن حافظ کرم اللہ بن حافظ عین الدین کھوکھر ہے۔ محمد سعید کا خاندان علم و تقویٰ میں مشہور تھا اور اس خاندان کے نام اورنگزیب کی کئی سندیں آج بھی محفوظ ہیں[1]۔ شیخ عزیز اللہ لاہور کے مشہور صوفی تھے۔ ان کی پیدائش ۳ر جمادی الثانی ۱۰۴۷/۱۹ر نومبر ۱۶۳۷ کو ہوئی اور وہیں لاہور میں ۲۰ر شوال ۱۰۸۴/۱۸ر جنوری ۱۶۷۴ کو ان کا وصال ہوا۔ محمد سعید نے یہ تاریخ کہی:۔

قدوۃ العارفین عزیز اللہ — ہادی خلق و پیشوای امم

گفت ہاتف کہ حیف نصر اللہ — قطب الاقطاب رفت از عالم[2]

۱۰۸۴ھ

محمد سعید نے اس کتاب کا آغاز رجب ۱۰۸۴/ اکتوبر ۱۶۷۳ میں کیا اور ۱۰۸۵/۷۵-۱۶۷۴ میں مکمل کیا۔ جب کہ شہزادہ محمد سلطان کابل کی مہم پر مامور تھا[3]۔ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے اور شیخ عزیز اللہ کی سوانح، کرامات اور اقوال پر مشتمل ہے۔

محمد سعید دو اور کتابوں کا مصنف ہے۔ ایک تحفۂ سعیدیہ ہے جو ذخیرۂ شیرانی پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے[4]۔ دوسری کتاب رسالہ محمد سعید ہے۔ جس میں تصوف کے رموز اور صوفیہ و مشائخ خصوصاً

---

[1] اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۴۷ء

[2] راحت الارواح، بانکی پور نمبر ۳۷۰۲، ورق ۱، ۸۰، ۸۱۔

[3] ایضاً ورق ۸۳؛ ایتھے نمبر ۶۵۱۔

[4] اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۴۷ء۔

حضرت علیؓ کے اقوال درج ہیں. کتاب کا سال تصنیف ۱۱۰۲/۹۱-۱۶۹۰ ہے اور وہ اورنگزیب کے نام معنون ہے. اس میں ایک مقدمہ اور پانچ باب ہیں[۱]

ریاض الاولیا ریاض الاولیا خلفا اور صوفیہ کے حالات پر مشتمل ہے. اس کا مؤلف بھی بختاور خاں ہے. مرآۃ العالم کی تکمیل کے بعد بختاور خاں کو یہ خیال ہوا کہ اگرچہ بعض صوفیہ کے حالات مرآۃ العالم کے آخر میں درج ہیں لیکن ان کے حالات پر ایک علیحدہ کتاب زیادہ بہتر ہوگی چنانچہ ۱۰۹۰/۸۰-۱۶۷۹ میں اس نے یہ کتاب مکمل کی۔ ریاض الاولیا تاریخی نام ہے:۔

"بختاور خان کہ بہ یمن خدمت .... اورنگزیب ... تخم محبت اولیا واصفیا در مزرع دل کاشتہ، بعد اتمام کتاب مرآۃ العالم ... بہ خاطر فاتر آورد کہ اگرچہ نمایشی احوال این طائفہ علیا در مجالی اوراق صورت نمود پذیرفتہ .. جداگانہ نسخہ ای ... سازد. الحمد للہ کہ عمر وفا کرد ... واین ریاض الاولیا کہ تاریخ ونامش ازان مشعر است بہ ترتیب چہار چمن رنگینی وخورمی جاوید پذیرفت"[۲]

ریاض الاولیا چار چمن میں منقسم ہے. پہلے چمن میں خلفا کا بیان ہے، دوسرے میں ائمۂ معصومین کا. تیسرے میں غیر ہندی صوفیہ کا. یہ چمن تذکرۃ الاولیا عطار، نفحات الانس جامی اور رشحات القدس کا ملخص ہے. چوتھے چمن میں ہندوستانی صوفیوں کا حال ہے جو اخبار الاخیار اور دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے. تراجم ابجد وار ہیں.

مطلوب الطالبین مطلوب الطالبین شیخ نظام الدین اولیا کی مفصل سوانح حیات ہے اس کا مؤلف محمد بولاق بن شیخ ابو محمد خالدی دہلوی ہے. بولاق حضرت شیخ کے اخلاف میں تھا اور اس نے یہ کتاب ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹ میں مکمل کی. کتاب میں شیخ نظام الدین اولیا کی سوانح کے علاوہ چشتی مشائخ کا بھی ذکر ہے[۳]

---

[۱] ایتھے نمبر ۲۲۱۱.

[۲] ریاض الاولیا، آصفیہ نمبر ۹/۱۱۵ (فہرست ۱/۳۲۰)

[۳] ایتھے نمبر ۶۵۳.

روضۃ اقطاب بولاق کی دوسری کتاب روضۂ اقطاب ہے[1]۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۲۴/ ۱۳-۱۲-۱۷۱۲ء ہے۔ جو کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے[2]۔ روضۂ اقطاب سے محمد بولاق کے بارے میں مزید معلومات ملتی ہیں۔ مؤلف شیخ نظام الدین کے ہمشیرزادگان میں سے تھا اور شیخ کے روضہ کے پاس ہی اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ شیخ خوب اللہ مانک پوری کا مرید تھا جو کبھی کبھی دہلی میں اس کے والد کے پاس قیام کرتے تھے۔ بولاق کی خدمت سے خوش ہو کر شیخ خوب اللہ نے اسے اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا[3]۔

روضۂ اقطاب شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی سوانح ہے۔ کتاب میں بہت سارے حوالے ہیں اور مندرجہ ذیل سات ابواب پر منقسم ہے:۔

۱۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ولادت، شجرہ اور دہلی میں آمد۔

۲۔ شیخ کی کرامات۔

۳۔ عبادت و ریاضت۔

۴۔ حوض شمسی کا بیان۔

۵۔ مشائخ چشت۔

۶۔ وفات

۷۔ ان صوفیہ کے حالات جو آپ کے روضہ کے جوار میں مدفون ہیں۔

زواہر السرائر زواہر السرائر نقشبندی صوفی شیخ سعدی لاہوری (م۔ ۱۱۰۸/۹۷-۱۶۹۶) کی سوانح ہے جسے ان کے مرید محمد عمر بن ابراہیم پشاوری نے ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰

---

[1] ریو (۲/۹۷۴) نے مصنف کا نام محمد بلاق لکھا ہے۔ مصنف کے نام کے لئے دیکھئے روضۂ اقطاب (اردو ترجمہ) محب ہند پریس، دہلی، ص ۲، ۲۱، ۴۲۔

[2] روضۂ اقطاب ص ۲۔

[3] ایضاً ص ۲، ۴۲، ۴۳۔

میں مرتب کیا۔ بوڈلین لائبریری میں زواہر السرائر کا جو مخطوطہ ہے[1] وہ مؤلف کے ایما پر اس کے خود نوشت نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر ۱۲ رجمادی الثانی ۱۱۱۴ھ/۳۰ مارچ ۱۷۲۲ کی تاریخ پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس وقت تک حیات تھا۔ اس نسخہ کے آخر میں محمد عمر نے اپنے کچھ اشعار بھی خود لکھے ہیں۔ ان اشعار پر ۶ رمحرم ۱۱۳۵ھ/۱۷ اکتوبر ۱۷۲۲ کی تاریخ اور مقام پشاور درج ہے۔

زواہر السرائر کے شروع میں ایک دیباچہ اور مقدمہ ہے جس میں مؤلف نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے پر زور دیا ہے اور نقشبندی مشائخ کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تین منظر (باب) میں شیخ سعدی لاہوری کی زندگی کا حال درج کیا ہے۔ خاتمہ میں ان کی وفات کا ذکر ہے جو ۱۱۰۸ھ/۹۷-۱۶۹۶ میں واقع ہوئی۔[2]

احسن السیر

احسن السیر انبیا، خلفا اور ائمہ معصومین کے حالات پر مشتمل ہے۔ مؤلف اپنا نام محمد المدعو بہ کاظم بتاتا ہے۔ وہ سپہدار خاں کا متوسل تھا جو اورنگزیب کے رضاعی بھائی خان جہاں بہادر کا لڑکا تھا۔[3] برٹش میوزیم میں ایک مخطوطہ فرحنامہ فاطمی[4] ہے۔ اس کا مؤلف بھی اپنے کو محمد المدعو بہ کاظم الطبیب المخاطب بہ حاذق الملک کہتا ہے۔ غالباً یہ دونوں کتابیں ایک ہی مؤلف کی ہیں۔ مؤخر الذکر تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد اصلاً شوستر کا باشندہ تھا۔ اور وہاں سے ہندوستان آکر سپہدار خاں سے متعلق ہو گیا تھا۔ فرحنامہ میں وہ اپنی پہلی تالیف کا ذکر کرتا ہے جو پیغمبروں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ غالباً اس کا مقصد احسن السیر سے ہے۔

احسن السیر سپہدار خاں کے کہنے پر ۱۱۱۴ھ/۰۳-۱۷۰۲ میں لکھی گئی۔ اس وقت محمد کی

---

[1] بوڈلین نمبر ۲۸۴۳ (ج)

[2] ایضاً۔

[3] احسن السیر، بوہار نمبر ۳۰، ورق ۵

[4] ریو ۲/۲۰۸۔

عمر تقریباً چالیس سال تھی ۔ وہ کہتا ہے :۔

" درین ولا کہ سنہ ہزار و یک صد و چہاردہ ہجری است . . . . این ذرہ بیمقدار محمد المدعو بہ کاظم کہ از عنفوان شباب تا غایت الباب کہ از مراحل عمر این نقیر . . . . قریب چہل مرحلہ بہ انجام رسیدہ ، در سلک خادمان . . . انتظام دارد . . . بر زبان فیض ترجمان آوردند کہ خاطر ملکوت ناظر چنان می خواہد کہ مجموعہ ای در آثار و اخبار انبیای عظام و ائمہ کرام کہ از غائلہ روایات مختلفہ متعددہ معرا و مبرا باشد ، از کتب معتبرہ سیر کہ اکثر روایاتش متفق علیہ جمہور ارباب خبر باشد ، بہ عبارت مختصر فراہم آوردہ ، از نظر اشرف بگذراند "[1]

چنانچہ محمد نے احسن السیر مرتب کی اور اس کی ترتیب اس طرح رکھی ۔

مقدمہ :۔ ذکر اول مخلوقات جان تا ظہور آدم

رکن ۱ :۔ از آدم تا عیسی

" ۲ :۔ ذکر حضرت محمد از ولادت تا ہجرت

" ۳ :۔ از ہجرت تا رحلت ۔

" ۴ :۔ خلفای راشدین ۔

" ۵ :۔ ائمہ اثنا عشر

احسن السیر کا ابتدائی حصہ بہت دلچسپ ہے ۔ مؤلف نے جنوں کی پیدائش ، ان کی نافرمانی اور پھر آدم کی تخلیق کے عجیب و غریب قصے لکھے ہیں ۔ معلوم نہیں اسے یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں ۔ آدم کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آدم عجمی لفظ ہے اور عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کی تردید کی ہے[2] ۔ سب سے حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مؤلف نے ہبوط آدم سے ہجرت تک باقاعدہ سنین درج کیے ہیں[3] ۔

---

[1] احسن السیر ورق ۵ ۔
[2] ایضاً ورق ۱۰
[3] ایضاً ورق ۹ ۔

مناقب الحضرات مناقب الحضرات یا مناقب آدمیہ و حضرات احمدیہ نقشبندی صوفیہ کا تذکرہ ہے جس میں خاص طور پر شیخ احمد سرہندی، شیخ محمد سعید اور شیخ آدم نقشبندی کے مفصل حالات درج کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان تینوں صوفیوں کے اہم معاصرین اور مریدین کا ذکر بھی ہے۔ اس کا مؤلف محمد مراد بن حبیب اللہ بن سعید ہے۔ ایتھے[1] کا خیال ہے کہ مؤلف عصر اورنگزیب کے مشہور صوفی محمد مراد نقشبندی کشمیری ہیں جن کا انتقال ۲۲/۱۱۳۴-۱۷۲۱ میں ہوا۔ کتاب مقدمہ، تین مطلب، گیارہ باب اور خاتمہ پر مشتمل ہے[2]۔

باب ۱۲

تصوف و اخلاقیات

ثمرات الحیاۃ ثمرات الحیات عاقل خاں رازی کی تصنیف ہے اور ان کے پیر شیخ برہان الدین راز الٰہی کے اقوال و حکم اور تصوف کے نکات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے دو حصے (نوباوہ) ہیں۔ پہلا حصہ ۱۰۵۳/ ۴۴-۱۶۴۳ میں مکمل ہوا۔ "ثمرات الحیاۃ (۱۵۹۱) – بی شک و ریب (۵۳۸ = ۱۰۵۳ ہجری)" اس کی تاریخ ہے[1]۔ اس لحاظ سے یہ رازی کی اولین تصنیف ہے جب اس کی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی۔ ثمرات کا دوسرا نوباوہ کچھ وقفہ کے بعد لکھا گیا جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :-

"نوباوہ دیگر از ثمرات الحیاۃ و خوشۂ آخر از ثمرات البرکات۔ بہ حکم الامور مرہونۃ باوقاتہا بہ مقتضای موانع بشریت بعد از انقضای مدت از اصل معانی در فصل ثانی در گلستان عبارت شگفتہ د باسند سابقہ صورت وصل پذیرفت"[2]

---

[1] ثمرات الحیاۃ، سالار جنگ، نمبر ۳۹، ورق ۱

[2] ایضاً (علی گڈھ، لٹن، ضمیمہ نمبر ۱۰۶) یہ حصہ الگ جلد ہے

ثمرات الحیاۃ تصوف کی ایک وقیع تصنیف ہے۔ درحقیقت یہ شطاریہ فرقہ کے اصول تصوف پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ نیز اس میں صوفیہ کے جو اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ اہم اور مستند ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں قرآن و حدیث کی تشریحات بھی شامل ہیں جس سے مؤلف کی وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں بہت سی تاریخی شخصیتوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک واقعہ شہزادہ اورنگزیب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ شیخ برہان الدین سے ملنے کا متمنی تھا لیکن شیخ نے صاف انکار کر دیا جس سے شہزادہ کو خاصی ندامت ہوئی ہوگی۔ رازی شروع سے شہزادہ اورنگزیب کا ملازم تھا اور اگر وہ چاہتا تو اس واقعہ کو نظر انداز کر سکتا تھا مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے اس کے کردار میں بیباکی اور حق گوئی ہے واقعہ یہ ہے :-

"شاہزادہ محمد اورنگزیب چون سالک طریقہ انیقہ تشرع و تورع بود، از فرقہ فقرا استمداد ہمت می نمود۔ حافظ ابراہیم پیش نماز خویش را نزد حضرت (شیخ برہان الدین) بہ جہت اظہار اشتیاق و داعیہ ملاقات فرستاد۔ فرستادہ ... گذارش پیغام بدین عبارت نمود کہ .... در ہر دو مختار اند، یا خود بیایند یا مارا در آمدن مجاز نمایند۔ در جواب فرمودند کہ شق ثالث بہتر از شقین مذکور بہ خاطر می رسد و آن این است کہ نہ مارا تکلیف کنند و نہ خود تصدیع کشند"[1]

نغمات العشق

تصوف پر رازی کی دوسری تصنیف نغمات العشق[2] ہے۔ جس میں عشق، مقامات عشق اور لطائف عشق کا انتہائی دلچسپ و دلاویز بیان ہے۔ رازی کے تصوف میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم اور نثر دونوں میں بے پناہ شگفتگی، رنگینی اور جذباتیت ہے۔ اس کتاب میں رازی نے مخلوط نظم و نثر میں عشق پر اپنے بیباکانہ خیالات کا

---

[1] ایضاً (سالار جنگ نمبر ۳۸) ورق ۵۔

[2] یہ کتاب نغمات الرازی کے نام سے ایک مجموعہ مرج البحرین (فتحپور، ۱۲۶۵ھ) میں شائع ہوئی۔ مگر اس کا صحیح عنوان نغمات العشق ص ۷۷ پر موجود ہے۔ نیز ملاحظہ ہو ایتھے نمبر ۱۶۳۴؛ بوڈلین نمبر ۱۱۴۸۔

اظہار کیا ہے اور جگہ جگہ اپنے شیخ کی تعریف وتمجید کی ہے۔ جن کی بدولت رازی بادۂ عشق سے فیضیاب ہوئے۔ نغمات کا انداز بیان ثمرات کے برخلاف جذباتی، شاعرانہ اور رنگین ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے :-

"ای عشق! اگر از خمخانۂ عشق بوی به میکدۂ عالم مجاز رسد، هیچ می پرستی ابدالآباد از مستی به خود نیاید و هر مستی به کیفیتی مستی نماید که دست از جام وسبو بردارد و توجه به خم کند. چون به خم رسد، خود را خشت سر خم بیند و گم کند. آنگاه خم را یابد لبریز نشار شوق و شوق انگیز اہل ذوق"[1]

نغمات کی سال تصنیف کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

کشکول

تصوف پر رازی کی تیسری تصنیف کشکول ہے جس میں تصوف کے رموز ونکات پر صوفیہ اور مشائخ کے مشہور اقوال درج ہیں۔ دراصل کشکول میں خود کہیں مولف کا نام نہیں درج ہے لیکن دو وجہ سے اس کا انتساب رازی کی طرف کیا جاتا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صوفیوں کے اذکار کا بیان کرتے ہوئے مؤلف کہتا ہے کہ میں نے یہ بات تفصیل سے اپنی تصنیف مرقع میں بیان کردی ہے[2] جو غالباً مرقع رازی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے خصوصیت کے ساتھ شطاریوں کے ذکر کا طریقہ بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ میرے مرشد نے مجھے ذکر کا جو طریقہ بتایا تھا وہی میاں میر لاہوری کا بھی تھا[3]

کشکول ایک مقدمہ، دو وصل اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ کا عنوان لقمہ ہے اس کی تالیف کی تاریخ غرہ ذیقعدہ ۱۱۰۱/ اگست ۱۶۹۰ ہے[4]

---

[1] نغمات الرازی، ص ۸۸

[2] کشکول، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۲۷۹، ورق ۲۰۔ [3] ایضاً ورق ۲۶، ۵۶۔

[4] ایضاً ورق ۲۔

گنج سعادت

گنج سعادت تصوف پر معین الدین کی تصنیف ہے۔ مصنف اپنا رشتہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے ملاتا ہے[1]۔ اس کے دادا شیخ خاوند محمود نقشبندی (۱۰۵۲-۹۶۵/ ۱۶۴۳-۱۵۵۷) کشمیر میں رہتے تھے اور اپنے وقت کے مشہور صوفی خواجہ اسحاق کے خلیفہ تھے[2]۔ کتاب میں خواجہ محمود کے بارے میں بہت ساری حکایتیں لکھی ہیں۔ جو عہد اکبر سے عہد شاہجہاں تک کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ اتفاق سے جب ظفر خاں احسن کشمیر کا گورنر ہو کر آیا تو اس کی خواجہ محمود سے نہیں بنی۔ چنانچہ اس نے شاہجہاں کو شکایت لکھی۔ چونکہ معین الدین بھی انھیں کے ساتھ رہتا تھا اس لئے اُسے شاہجہاں نے دربار میں طلب کیا اور اس پر مہربانی کی۔ خواجہ محمود غالباً لاہور میں منتقل ہو گئے کیونکہ یہیں طویل عمر میں ان کا انتقال ہوا[3]۔

معین الدین کہتا ہے کہ جیسے جیسے خیر القرون دور ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کی اخلاقی حالت ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ صوفیہ اور صلحا کے اقوال و احوال لکھوں تاکہ اسے پڑھ کر لوگ اپنی اخلاقی اصلاح کر سکیں۔ چنانچہ میں نے یہ کتاب مکمل کر کے اس کا نام گنج سعادت رکھا جس طرح غزالی نے اپنی کتاب کا نام کیمیای سعادت رکھا تھا۔ کتاب اورنگزیب کے نام معنون ہے۔ مصنف نے کئی تاریخیں دی ہیں اور لکھا ہے کہ مصنف اور کتاب کے نام سے کم تاریخیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ان میں پہلی تاریخ سے ۱۰۷۳/ ۶۳-۱۶۶۲ کے اعداد بر آمد ہوتے ہیں۔

ہاتفی گفت بی ریا بشمار — ہست این تحفہ معین الدین
۲۱۱۰ ۱۲۸۴ = ۱۰۷۳ ہجر

لیکن تکمیل کی تاریخ ۱۰۸۰/ ۷۰-۱۶۶۹ ہے جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

بگفتا عقل تاریخ تمامش — "بدست آوردہ معین آبروئی"
۱۰۸۰ ہجر

---

[1] گنج سعادت، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۲۷۵، ورق ۲۔

[2] ایضاً ورق ۷۰ ب۔ [3] ایضاً ورق ۸۹-۴۸۶۔

[4] ایضاً ۴-۲۔

گنج سعادت چار رکن، خاتمہ اور ختم خاتمہ پر مشتمل ہے پہلے اور دوسرے رکن میں عقائد اور فقہ کا بیان ہے۔ تیسرے میں رسول اللہ اور خلفا کا۔ چوتھا رکن تصوف کے بیان میں ہے اور اس میں خراسان کے تیس اور ترکستان کے بائیس ان نقشبندی صوفیہ کا تذکرہ ہے جنھوں نے کوئی تصنیف چھوڑی ہے۔ خاتمہ میں عدل و احسان اور ختم خاتمہ میں مغفرت اہل عصیان کا ذکر ہے۔ ایک فصل میں مصنف نے اباحت سماع پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ خود شعر کہتے تھے چنانچہ یہ شعر آپؐ کا ہے۔

الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل　　　وکل نعیم لا محالۃ زائل[1]

کنز الہدایات

"کنز الہدایات فی کشف البدایات والنہایات" نقشبندی سلسلہ، تصوف پر ایک مفید رسالہ ہے۔ درحقیقت یہ رسالہ شیخ احمد سرہندی کی کتاب مبدأ و معاد اور ان کے اور شیخ معصوم کے مکاتیب کی مضمون وار تلخیص ہے۔ یہ تلخیص و ترتیب محمد باقر بن شرف الدین لاہوری عباسی حسینی نے کی ہے۔ باقر کا بیان ہے کہ چونکہ شیخ احمد سرہندی اور شیخ معصوم کے مکاتیب و تصانیف میں مراتب سلوک کسی خاص ترتیب سے نہیں بیان کیے گئے ہیں اس لیے

"بہ خاطر این فادوی ریخت کہ رسالہ مبدأ و معاد و دفاتر ستہ مکاتیب حضرت مجدد الف ثانی و حضرت ایشان (شیخ معصوم) را . . . . در نظر داشتہ این لآلی منثورہ را منتظم سازد"[2]

باقر کے احباب نے مشورہ دیا کہ تمام مکاتیب کی تلخیص وہ اپنے الفاظ میں کرے مگر خود اس نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر مسئلہ پر ان بزرگوں کی رائے انھیں کے الفاظ میں درج کی ہے، البتہ جہاں کہیں عبارت پیچیدہ یا غیر مسلسل تھی، وہاں تغیر و تبدل کر دیا ہے مگر اس کے لئے وہ کہتا ہے میں نے روح پرفتوح حضرت مجددؒ سے اجازت لے لی ہے۔[3]

---

[1] ایضاً ورق ۳۶۳

[2] کنز الہدایات، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۴۴۵، ورق ۳

[3] ایضاً ورق ۴۔

کنز الہدایات ۲۱/شوال ۱۰۸۰/۴/مارچ ۱۶۷۰ کو شروع کی گئی اور ۹/ذی قعدہ/۲۲/مارچ کو مکمل ہو گئی۔ تاریخ تکمیل یہ ہے :-

"الحق کہ رسالہ با کنز الہدایات آمدہ"[1]
۱۰۸۰ ہجر

باقر شیخ معصوم کا مرید تھا۔[2] جب اس نے یہ تالیف مکمل کر لی تو اس نے خواب میں حضرت مجدد کی زیارت کی جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کی کتاب مقبول ہو گئی۔[3] کتاب مختلف ہدایہ (باب) اور فائدہ (فصل) میں منقسم ہے۔

دمشق خیال دمشق خیال تصوف پر حصار (ہریانہ) کے بال کرشن برہمن کی تصنیف ہے مصنف کہتا ہے کہ میں نے کتاب کا یہ عجیب عنوان دو وجہ سے منتخب کیا ایک تو یہ کہ یہ تصنیف روحانی اعتبار سے ویسی ہی خوشگوار اور فرحت بخش ہے جیسی دمشق کی فضا اور دوسرے یہ کہ اس میں وہی تنوع اور رنگا رنگی ہے جو ایک بڑے شہر میں نظر آتی ہے۔ دمشق خیال کا سال تصنیف ۱۰۸۵/۷۵-۱۶۷۴ ہے۔ بال کرشن نے زیادہ تر باتیں شمس الدین کے حوالے سے لکھی ہیں۔ یہ شمس الدین غالباً وہی مخزن قادریہ کا مصنف ہے جس کا انتقال ۱۰۸۳/۷۳-۱۶۷۲ میں ہوا۔[4] کتاب کا انداز بیان خاصا پر تکلف ہے۔ بیچ میں جگہ جگہ اشعار کی پیوند کاری ہے۔ بعض اشعار خود مصنف کے ہیں اور باقی مشہور صوفیوں کے۔[5]

آداب الذکر تصوف میں اذکار و اشغال کی بہت اہمیت ہے۔ اور صوفیوں کے مختلف فرقوں میں اس کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ آداب الذکر صوفیوں کے آٹھ فرقوں کے طریقہ ذکر پر مشتمل ہے۔ اس کا مصنف ابو سعید عرف جعفر محمد خنکواری قلندری حسینی ہے۔ اس نے

---

[1] ایضاً ورق ۳، ۱۱۳
[2] ایضاً ورق ۱۰۴
[3] ایضاً ورق ۵۔
[4] ریو ۲/۸۷۴۔
[5] ایتھے نمبر ۱۸۹۷۔

یہ کتاب اپنے برادر دینی شیخ عزیز اللہ شرف الدین ملقب بہ بصیرۃ اللہ ابراہیم پوری کے کہنے پر لکھی[1]۔ آداب الذکر میں دس باب ہیں۔ پہلا باب جمیع سلسلۂ تصوف کے اشغال پر ہے۔ اس کے بعد آٹھ باب قادریہ، قلندریہ، شطاریہ، چشتیہ، فردوسیہ، سہروردیہ، مداریہ، اور نقشبندیہ سلسلوں کے طریقۂ ذکر پر ہیں۔ آخری باب میں اذکار متفرقہ کا بیان ہے۔

قلندریوں کے طریقۂ ذکر کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے آنحضور سے روایت ملائی ہے[2]۔

آداب الذکر کی تکمیل سہ شنبہ، ۲۷ رجادی الثانی ۱۰۹۷/۱۱ مئی ۱۶۸۶ کو ہوئی[3]۔

محرم الاسرار محرم الاسرار رموز تصوف اور قادریہ سلسلہ کے طریقۂ ذکر پر ایک مختصر رسالہ ہے اس کا مصنف شیخ عبدالکریم بن شیخ فرید انصاری ہے۔ عبدالکریم نے یہ رسالہ ۱۱۱۰/۹۹-۱۶۹۸ میں لکھا۔ وہ شیخ احمد قادری لکھنوی کا مرید تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقت کو پانے کے لئے مرشد کا اتباع لازمی ہے۔ من لا شیخ لہ فشیخہ الشیطان۔ یعنی جس کا کوئی شیخ نہیں ہوتا اس کا شیخ شیطان ہوتا ہے[4]۔ اس کے بعد وجود آدم کے مقصد، عشق حقیقی، افضلیت محمد صلعم وغیرہ پر بحث ہے

کلمات عالیات کلمات عالیات ارادت خاں واضح کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں تصوف پر بہترین اقوال وخیالات جمع کئے گئے ہیں اس کا سال تصنیف ۱۱۱۶/ ۰۵-۱۷۰۴ ہے۔ مادۂ تاریخ "کلمات عالیات حقہ" ہے[5]۔ کلمات میں تصوف سے متعلق واضح کی بہت ساری رباعیاں ہیں جنھیں بعد میں اس نے

---

[1] آداب الذکر، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۲۸۰، ورق ۱، ۱۷ -

[2] ایضاً ورق ۱۳ [3] ایضاً ورق ۲

[4] محرم الاسرار، ایشیاٹک سوسائٹی، نمبر ۱۲۸۲، ورق ۷۶۔

[5] کلمات عالیات، سالار جنگ نمبر ۱۳۲، ورق ۲ -

ایک علیحدہ مجموعہ کی صورت میں مرتب کر دیا جیسا کہ اس رباعی سے معلوم ہوتا ہے :-

واضح کلمات را چو تحریر نمود — در ہر کلمہ رباعیی شد موجود
وآنہا چون ہمہ جدا بہ ترتیب نوشت — در کشف طریق نسخہ ای شد موجود[1]

عروس عرفان محمود بحری دکنی کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹ میں تصوف سے متعلق ایک مثنوی من لگن لکھی تھی۔ پھر ۱۱۱۷/۰۶-۱۷۰۵ میں اسے فارسی نثر میں منتقل کیا اور اس کا نام عروس عرفان رکھا۔ شیخ محمود بحری کو اپنے والد محمد پیشنگی قادری سے تصوف کی تعلیم ملی لیکن انھوں نے اپنی ریاضت اور مطالعہ سے اپنی روحانیت کو جلا بخشی۔ ان کا شمار اس عہد کے مشہور مشائخ میں ہونے لگا۔ جب ۱۰۹۵/۸۴-۱۶۸۳ میں وہ اپنے مسکن گوگی سے بیجاپور آئے تو وہاں کے حکمراں سکندر عادل شاہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ دو سال بعد جب بیجاپور کو اورنگزیب نے فتح کر لیا تو بحری حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن حیدرآباد میں سکون کہاں تھا۔ حیدرآباد کی فتح کے بعد بحری مسافرانہ زندگی گذارنے لگے۔

بحری نے اپنے حالات عروس عرفان کے دیباچہ میں خود لکھے ہیں۔ انھوں نے عروس عرفان اور من لگن کے علاوہ حکایات کے عنوان سے دکنی میں ایک مثنوی لکھی، صوفیوں کے لئے ایک دستور العمل مرتب کیا۔ اور ناصر خسرو کی غزلوں پر شرح لکھی[2]

ارشاد رحیمیہ شاہ عبدالرحیم دہلوی نے اپنے پر ارزش مکاتیب کے علاوہ ایک اور مفید تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ وہ ہے "ارشاد رحیمیہ در طریق حضرات نقشبندیہ"[3]

---

[1] کشف الطریق، سالار جنگ، نمبر ۷۱۳، ورق ۴۔

[2] کلیات بحری مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید، نولکشور، فروری ۱۹۳۵ء (دیباچہ)؛ من لگن بحری مرتبہ سخاوت مرزا، کراچی، ۱۹۵۵ء (مقدمہ)؛ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (۴ جلدیں) حیدرآباد، ۷۸-۱۳۶۲ھ/۲/۹۷۔

[3] ارشاد رحیمیہ، دہلی ۱۳۲۱ھ۔

جیساکہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اس میں نقشبندیہ سلسلہ کے بنیادی عقائد، اذکار اور شجرہ کا بیان ہے۔ ایک فصل میں شیخ عبدالخالق غجدوانی کے اقوال اور تصوف کی مختلف تشریحات ہیں۔ تصوف کے ایک عام طالب علم کے لئے یہ فصل زیادہ اہم ہے۔

دستور جہانکشائی عہد اورنگزیب میں فن حرب پر دو انتہائی مفید کتابیں لکھی گئیں۔ پہلی کتاب دستور جہانکشائی حاجی خیراللہ بن حاجی کرم اللہ نے لکھی۔ مصنف کے والد نے تقریباً پندرہ سال شاہجہاں کی فوج میں ملازمت کی تھی اور انھیں کی بتائی ہوئی اطلاعات پر خیراللہ نے یہ کتاب مرتب کی[1] معلوم ہوتا ہے کہ دستور جہانکشائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ہندوستان کے حالات بدل گئے۔ شاہجہاں کو گرفتار کرکے اورنگزیب نے تخت طاؤس پر جلوس کیا۔ خیراللہ کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"چنانچہ درین روزہا کہ دور قمر بہ آخر رسید و دور زحل آغاز گشت، تماشای بس غریب چشم عبرت دیدہ و فقرۂ چند در تہنیت جلوس جہاندار ہفت کشور بادشاہ عالمگیر نگارش نمودہ ختم کتاب بر دمی نماید"[2]

اس کے بعد خیراللہ نے ایک منثور قصیدہ تہنیت جلوس اورنگزیب پر لکھا ہے جو اس دعائیہ قطعہ پر ختم ہوتا ہے :-

فلک تا دگہ) گردندہ و اختر است — وزین ہر دو آمیزش گوہر است
چراغ جہان گوہر شاہ باد — رخ شاہ روشن تر از ماہ باد[3]

دستور جہانکشائی ۱۰۷۰/۶۰-۱۶۵۹ میں مکمل ہوئی۔ مصنف کے لڑکے محمد نذر نے عنوان

---

[1] دستور جہانکشائی، (علی گڈھ، عبدالسلام) ورق ۶۔ [2] ایضاً ورق ۷۹ -

[3] ایضاً ورق ۸۴ -

سے تاریخ نکالی [1]

دستور جہان کشائی بارہ کلید (باب) پر مشتمل ہے۔ مصنف نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ فوج کے سردار کا کردار کیسا ہونا چاہیئے۔ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ اس میں غرور نہ ہو اور وہ ہمیشہ خدا کی درگاہ میں نیاز مند رہے۔ قوم کے بزرگوں کا فرض ہے کہ جب فوج کسی مہم پر روانہ ہو تو اسے خلوص اور محبت سے خدا حافظ کہیں اور اس کی دلدہی اور ہمت افزائی کریں۔ فوجی سرداروں کے انتخاب میں شجاعت اور مردانگی کے علاوہ حسب نسب کا خیال بھی بیحد ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مشاورتی کونسل کا ہونا لازمی ہے جس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے۔

عملی جنگ پر خیر اللہ نے کئی باب لکھے ہیں۔ توپخانہ اور محاذ جنگ کی ترتیب اول اہم کام ہے۔ اس کے بعد ہر فوجی کے لئے مناسب ہتھیار بہترین طریقہ پر پہننا ضروری ہے۔ میدان جنگ میں ہر دستہ کو مناسب مقام پر متعین کرنا چاہیئے، دستور جہانکشائی کا یہ حصہ اہم بھی ہے اور مفید بھی۔ اور آج بھی اس کی افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ کے دوران میں فوج کا ایک طریقہ کار ہونا ضروری ہے اور فتح یا شکست کے بعد آپے سے باہر ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

دستور جہان کشائی کی اہمیت اور افادیت کا احساس خود مصنف کو بھی تھا، وہ کہتا ہے:

"وآنکس کہ برین دستور جہانکشائی عمل کند، آتش نمرود جنگ براو گلزار خلیل شود" [2]

تحفۃ الشجاعۃ فن حرب پر دوسری اہم کتاب تحفۃ الشجاعۃ ہے جو ارادت خاں واضح کے لڑکے روح اللہ مخاطب بہ روح الامین کی تصنیف ہے اور اورنگزیب کے نام معنون ہے [3]۔ کتاب چار چمن (باب) اور مقدمہ میں منقسم ہے اور اس وجہ سے اہم ہے کہ اس سے عہد اورنگزیب کی فوجی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] ایضاً ورق ۶   [2] ایضاً ورق ۷۸؛ نیز ایڈنبرا نمبر ۱۴۵

[3] تحفۃ الشجاعۃ، سالار جنگ، نمبر ۳۱، ورق ۶۔

باب ۱۳

دیگر علوم

(۱) لغت

اشہر اللغات اشہر اللغات فارسی کا لغت ہے جس میں بیشتر نادر الفاظ کی تشریح ہے۔ اس کا مؤلف غلام اللہ صدیقی ہانسوی غزنوی ہے۔ کتاب بادشاہ وقت اورنگزیب کے نام معنون ہے۔ غلام اللہ کہتا ہے کہ میرے مطالعہ میں عربی اور فارسی لغت کی مشہور کتابیں رہتی تھیں۔ اس نے جن کتب کے نام گنائے ہیں ان میں صحاح اللغۃ، صراح، دیوان الادب، تاج المصادر، مہذب الاسما، ادات الفضلا، شرفنامہ، قصائد شرح خاقانی داؤد شادی آبادی، مؤید الفضلا، فرہنگ نصاب الصبیان عبداللہ، فرہنگ مثنوی معنوی عبداللطیف، قاموس، کنز اللغۃ، فرہنگ جہانگیری کشف اللغات اور مدار الافاضل وغیرہ ہیں۔ مؤلف نے اس لغت کی تدوین میں کافی وقت گذارا اور اسے ۱۰۸۲/۷۲-۱۶۷۱ میں مکمل کیا۔ یہ تاریخ الفاظ میں بھی درج ہے "سنہ ہزار وہشتاد

ودو"۔ اور یہ دو شعر بھی دیئے ہیں :۔

"تاریخ نام پیر خرد فی البدیہہ گفت — از "اشہر لغات" برآری "مراد خود"

۱۰۸۲ : ۸۵۵ - ۱۹۳۷

بہ تاریخ تمامیش خرد گفت — عجایب نسخہ درو لآلی[1]

۱۰۸۲ ہجر

مگر اتنی عرق ریزی کے باوجود غلام اللہ کو اپنی مجبوری کا احساس ہے ۔ وہ کہتا ہے :۔

"در تسوید این الفاظ غریبہ و ترکیب این لغات عجیبہ از کاتبی بیش نیست "۔[2]

اور اس سے واقعی کہیں کہیں فروگذاشت ہو گئی ہے ۔ مثلاً آل بویہ کی تشریح کرتے ہوئے

وہ کہتا ہے :۔

"نام بادشاہی است" یا منوچہر کا اعراب "بہ فتح اول وسیوم وچہارم فارسی" لکھا ہے۔[3]

لغات عالمگیریہ لغات عالمگیریہ یا تحفۂ عالمگیریہ اورنگزیب کو پیش کرنے کے لئے مدون کی گئی تھی ۔ اس کا مرتب فاضل خاں ہے ۔ اس لغت میں قرآن، حدیث اور اقوال صوفیہ کے مختلف حصوں کی تشریح ہے ۔ نیز اہم تاریخی واقعات اور مذہبی تلمیحات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

کتاب میں نہ سال تالیف درج ہے اور نہ مؤلف کے بارے میں کوئی اور اشارہ ملتا ہے ۔ عہد اورنگزیب میں کئی امیروں کا خطاب فاضل خاں تھا ۔ ان میں پہلا ملا علاء الملک تونی تھا جو ۱۱/ ذی الحجہ ۱۰۷۳/۷ / جون ۱۶۶۳ کو عہدۂ وزارت پر فائز ہوا اور چند روز بعد انتقال کر گیا ۔ ۳۲ سن جلوس میں اس کے بھتیجے برہان الدین کو یہ خطاب عطا ہوا ۔ اسے قابل خاں اور اعتماد خاں کا خطاب

---

[1] اشہر اللغات، بانکی پور، نمبر ۷۶۸، ورق ۲، یہاں غلطی سے مادہ تاریخ میں "اشہر لغات" کے بجائے "اشہر اللغات" لکھا ہے جس سے مرتب فہرست (۲۸/۹) کو اشتباہ ہوا ہے ۔

[2] اشہر اللغات ورق ۲ [3] ایضاً ورق ۳ ۔

بھی حاصل تھا۔ برہان الدین کشمیر اور پنجاب کا گورنر رہا اور ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰ء میں فوت ہوا۔
تیسرا شخص جسے فاضل خاں کا خطاب عطا ہوا، ملا مخدوم ٹھٹھوی ہے۔ وہ نظم و نثر کا ماہر تھا قانع نے اس کی نثر کے بارے میں لکھا ہے:۔

"منشا آتش اظہر من الشمس وابین من الامس"[1]

وہ صدر الصدور کے عہدہ پر مامور ہوا اور ۱۰۹۶/۸۵-۱۶۸۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔
عین ممکن ہے کہ یہی ملا مخدوم اس لغت کا مؤلف ہو[2]۔

چوتھا شخص جسے فاضل خاں کا خطاب حاصل تھا، خواجہ بابا منصف سمرقندی (م ۱۱۲۸/۱۷۱۶) ہے جس کی شاعری کا ذکر اوپر ہوا۔

فرہنگ قطبی فارسی لغت کی دوسری کتاب فرہنگ قطبی ہے جو سید قطب الدین بن سید شاہ بن سید محمود قادری حسینی مدنی کی تالیف ہے اور اورنگزیب کے نام معنون ہے۔ مولف کا کہنا ہے کہ اس نے بہترین لغات کے نمونہ پر اپنی کتاب مدون کی ہے[3]۔

لوامع لوامع اصطلاحات تصوف کا لغت ہے۔ اس کی تالیف امیر (شاہ) علی اکبر بن محمد نے کشمیر میں کی اور اسے رمضان ۱۱۰۷/ اپریل ۱۶۹۶ء میں مکمل کیا۔ کتاب متعدد لامعہ (باب) میں منقسم ہے[4]۔

آمدن نامہ ترکی آمدن نامہ ترکی، ترکی اور فارسی کا لغت ہے۔ اس کا مؤلف سید حسین اورنگزیب کا معاصر تھا۔ لغت دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں الفاظ مرکبہ کی

---

[1] مقالات الشعرا، ص ۴۸۰۔

[2] لغات عالمگیریہ پر ایک مفصل مضمون معارف اکتوبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا مخطوطہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں موجود ہے۔ دوسرا مخطوطہ سالار جنگ (نمبر ۱۲۶۵/۱۱۷۰ء) میں ہے۔

[3] بوڈلین نمبر ۱۷۵۴۔

[4] ایتھے نمبر ۱۹۰۰

تشریح ہے اور دوسرے میں الفاظ مفردہ کی. آخر میں ایک سے ہزار تک ترکی اعداد درج ہیں[۱].

لغت ترکی ترکی فارسی کا دوسرا لغت، "لغت ترکی" ہے. اس کا مؤلف فضل اللہ خاں ہے جو اپنے آپ کو سیف خاں چاکو کا چچازاد بھائی کہتا ہے. سیف خاں چاکو وہی مرزا فقیر اللہ سیف خاں ہے. امیر چاکو اس کے جد اعلیٰ تھے اور چودہ پشت سے یہ خاندان مغلوں کی خدمت کر رہا تھا[۲].

یہ لغت بادشاہ کے ایما پر شہزادہ کے لئے مرتب کیا گیا تھا. مگر مؤلف نے نہ تو بادشاہ کا نام بتایا ہے اور نہ شہزادہ کا. وہ بادشاہ کے عدل و تقویٰ کی تعریف کرتا ہے. جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً وہ اورنگزیب ہے. اور شہزادہ کو وہ "بادشاہزادہ عالم و عالمیان" کہتا ہے[۳].

لغت ترکی تین حصوں میں منقسم ہے. پہلے حصہ میں مصادر کا بیان ہے. دوسرے میں افعال کا اور تیسرے میں اسمائے جامد کا. اس لغت کا ایک خلاصہ انڈیا آفس میں موجود ہے[۴].

---

[۱] ایضاً نمبر ۲۴۴۰

[۲] لغت ترکی، بانکی پور، نمبر ۷۹۳، ورق ۲. [۳] ایضاً

[۴] ایتھے نمبر ۲۴۳۸

(ب) فرہنگ اور شرح

ملا سعد

کلاسیکی متون پر شرح اور فرہنگ لکھنے کا اس عہد میں عام رواج تھا اور غالباً اس فن میں اس عہد کے پیشرو ملا محمد سعد تھے، جو پٹنہ کے باشندے تھے۔ اور سعد و غالب تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے دونوں تخلص کی مناسبت سے دو دیوان شعر مرتب کیے۔[1] ایک دیوان کا ذکر ڈاکٹر اشپرانگر نے کیا ہے۔ اس کی تدوین ١١٠١/٩٠-١٦٨٩ میں ہوئی۔[2]

ملا سعد معلم تھے انھوں نے بیشتر فرہنگیں اور شرحیں اپنے طلبہ کے استفادہ کے لئے لکھی تھیں اس سلسلہ میں پہلی فرہنگ شرح مکاتبات علامی ہے۔ اس میں مکاتیب ابوالفضل کے مشکل الفاظ کی تشریح ہے۔ اس کی ترتیب ١٠٨١/٧١-١٦٧٠ میں ہوئی۔[3] اس کے بعد انھوں نے ١٠٩٦/٨٥-١٦٨٤ میں نظامی کے سکندر نامہ اور شرف نامہ کی شرح لکھی۔[4] ایک سال بعد گلستان اور بوستان کی شرح لکھی گئی۔[5] انھوں نے حافظ کی غزلیات[6]، بدر چاچ کے قصائد[7] اور جامی کی یوسف زلیخا[8] کی بھی فرہنگیں

---

[1] گل رعنا ورق ١٢٢- یہاں نام سعید ہے۔ ملاحظہ ہو مضمون ڈاکٹر مختار الدین احمد، مجلہ علوم اسلامی، علی گڈھ، دسمبر ٦٢ء١٩

[2] اشپرانگر ص ٤٠٩۔

[3] شرح مکاتبات علامی۔ ایشیاٹک، کرزن نمبر ٤٤٧ (ب) ورق ٤٠

[4] مجلہ علوم اسلامی، علی گڈھ، دسمبر ١٩٦٢ء

[5] ایشیاٹک ١/نمبر ٥٤١، اشپرانگر ص ٥٢٣۔

[6] ایشیاٹک، کرزن نمبر ٤٤٧ (ج)

[7] ایضاً کرزن نمبر ٤٤٧ (د)

[8] ایضاً کرزن نمبر ٤٤٧ (الف)

مرتب کیں. عربی کی مقامات حریری کی شرح کی[1] اور حدیقۃ اللغۃ کے نام سے اخلاق ناصری کی فرہنگ تیار کی[2]. مؤخر الذکر کی دوسری فرہنگ مفتاح الاخلاق کے نام سے عبدالرحیم بن عبدالکریم عباسی برہانپوری نے ۱۰۸۵/ ۷۵-۱۶۷۴ میں مرتب کی[3].

سعد کو مثنوی معنوی سے خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے. انھوں نے ۱۱۰۵/ ۹۴-۱۶۹۳ء میں مثنوی کا ایک انتخاب کیا، اس کی فرہنگ لکھی اور خطبات رومی کا فارسی میں ترجمہ کیا[4].

فارسی کے علاوہ عربی تصانیف پر بھی سعد نے توجہ کی اور عربی قواعد کی تین معیاری کتابوں کی شرح لکھی. جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱. عافیہ شرح شافیہ ابن الحاجب. (مؤلفہ صفر ۱۰۹۷/ دسمبر ۱۶۸۵)

۲. انتخاب بی بدل. شرح ملا جامی. (مؤلفہ ذی الحجہ ۱۱۰۲/ ستمبر ۱۶۹۱)

۳. تنذیل شرح مصباح مطرزی (م. ۶۱۰/ ۱۴-۱۲۱۳). یہ ربیع الثانی ۱۱۰۶/ نومبر ۱۶۹۴ میں مرتب ہوئی[5].

اسی طرح انھوں نے منطق کی دو بنیادی کتابوں تہذیب اور میزان کی شرح لکھی[6]. لغت میں نصاب الصبیان، نصاب مثلث اور نصاب بدیع پر شرح لکھی[7]. اور ایک علحدہ تصنیف نصاب طفلاں کے نام سے پیش کی. عروض پر انھوں نے کسی کتاب کی شرح نہیں لکھی بلکہ خود ایک تصنیف میزان الاشعار مرتب کی. میزان کی تاریخ کتابت ۴۷ جلوس اورنگزیب (۱۷۰۴ء) ہے. سعد نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب سے مقصد اپنی تعریف و توصیف نہیں ہے کیونکہ زندگی میں

---

[1] گل رعنا ورق ۱۲۲.

[2] حدیقۃ اللغۃ، بانکی پور، نمبر ۹۰۸، ورق ۲

[3] ریو ۲/ ۸۳۶.

[4] مجلہ علوم اسلامی. دسمبر ۱۹۶۲ء

[5] بانکی پور ۹/ ۷-۳

[6] گل رعنا ورق ۱۲۲

[7] بانکی پور ۹/ ۴-۳.

مجھے کیا ملا جو موت کے بعد ملے گا [۱]

مثنوی رومی کی شرحیں

اس عہد میں مثنوی رومی کی چھ شرحیں لکھی گئیں۔ پہلی شرح شاہ میر نور اللہ احراری کی ہے جو گیارہویں صدی ہجری کے آواخر میں مکمل ہوئی [۲] احراری سے پہلے عبداللطیف گجراتی (م ۱۰۴۸/۳۹-۱۶۳۸) کی شرح عام تھی۔ احراری کی شرح کو بھی استادانہ درجہ حاصل ہوا اور بعد کے بیشتر شارحین نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

دوسری شرح مکاشفات رضوی کے نام محمد رضا لاہوری نے لکھی۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ ہے [۳]۔ محمد رضا شاہی ملازم تھا اور رسالہبر کی مہم (۱۰۹۰/۸۰-۱۶۷۹) میں خان زماں کے ساتھ موجود تھا [۴] رضا نے اپنے پیشرو شارحین کے علاوہ اپنے معاصر عبدالفتاح کا بھی حوالہ دیا ہے [۵] مگر اس کی شرح کا پتہ نہیں چلتا۔

تیسری شرح محمد عابد عرف مغنی نے لکھی۔ مغنی نے پہلے دفتر کی شرح ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ میں مکمل کی [۶]۔ چوتھی شرح شکر اللہ خاں خاکسار کی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔

پانچویں شرح حل مثنوی کے نام سے افضل الہ آبادی نے لکھی۔ اس نے فارسی اور عربی میں اور کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں یہ شرح زیادہ مشہور ہوئی [۷]۔ افضل کہتا ہے کہ مثنوی کی دو شرحیں عام ہیں ایک شیخ عبداللطیف کی اور دوسری میر نور اللہ احراری کی مگر ان دونوں سے پورا اطمینان نہیں ہوتا اس لیے موجودہ شرح لکھی گئی تاکہ کوئی خفا باقی نہ رہے [۸]۔ موجودہ شرح ۱۱۰۴/۹۳-۱۶۹۲ میں مکمل ہوئی [۹]۔ افضل نے مثنوی

---

[۱] میزان الاشعار، بانکی پور، نمبر ۸۳۴، ورق ۲، ۲۴۔ [۲] نور اللہ احراری: شرح مثنوی، علی گڈھ، ورق ۲-۱

[۳] محمد رضا: مکاشفات رضوی، نولکشور، جنوری ۱۸۷۷ء، ص ۲۔

[۴] مآثر الامرا ۸۰۴/۱۔ [۵] مکاشفات رضوی، ص ۳۔

[۶] ریو ۵۹۱/۲ [۷] سرو آزاد۔ ص ۲۱۱

[۸] افضل الٰہ آبادی: حل مثنوی، بانکی پور نمبر ۶۰۴، ورق ۹۔

[۹] ایضاً ورق ۵۴۵۔

کے چھ دفتر ہونے کی عجیب توجیہہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے کائنات میں چھ کا ہندسہ بہت اہم ہے آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا ہوئے۔ احادیث کے مجموعے چھ ہیں۔ صحت کے لوازم چھ ہیں۔ تصوف کے درجے چھ ہیں اور تخلیق انسان کے مراتب بھی چھ ہیں۔[۱] پہلے دفتر کی شرح طویل اور مفصل ہے۔ بعد کے دفاتر کی شرح فرہنگ سی ہے۔

مثنوی کی چھٹی شرح محمد نعیم نے لکھی۔ اس میں صرف مشکل اشعار کی تشریح ہے۔ محمد نعیم کے خود نوشتہ مخطوطہ پر ۳۶ سن جلوس ۱۱۰۴/ ۹۳-۱۶۹۲ کی تاریخ ہے۔[۲]

شرح بوستان میر نوراللہ احراری کے شاگرد عبدالرسول بن شہاب قرشی تھے۔ انھوں نے ۱۰۷۳/ ۶۳-۱۶۶۲ میں بوستان سعدی کی شرح لکھی۔ اس شرح پر میر نوراللہ کی اصلاح ہے۔[۳] عبدالرسول نے یہ شرح محنت سے لکھی۔ انھوں نے مشکل الفاظ کی تشریح کے بعد اشعار کی وضاحت کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور لغات کا حوالہ دیا ہے۔

فرہنگ گلستان جب شرح بوستان بہت پسند کی گئی تو لوگوں کے اصرار پر عبدالرسول نے گلستان کی فرہنگ بھی مرتب کی۔[۴]

گلستان کی فرہنگ ملا سعد نے بھی لکھی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اس کے علاوہ بہار عمر کے نام سے غالباً عبدالحی عادل نے بھی اس کی شرح لکھی۔ یہ شرح پلول میں ۱۱۱۹/ ۰۸-۱۷۰۷ء میں مکمل ہوئی۔[۵]

شرح مخزن اسرار اس عہد میں نظامی گنجوی کی مخزن کی دو شرحیں لکھی گئیں۔ پہلی شرح قاضی ابراہیم ٹھٹھوی کی ہے جو ٹھٹھ کے امین الملک تھے اور ۱۰۷۳/ ۶۳-۱۶۶۲ میں فوت ہوئے۔[۶] دوسری شرح محمد بن توام بن رستم کی جو ۱۰۹۱/ ۸۱-۱۶۸۰ میں مرتب ہوئی۔[۷]

---

[۱] ایضاً ورق ۱۰ [۲] ریو ۲/ ۵۹۱

[۳] عبدالرسول: شرح بوستان، علی گڈھ، ورق ۲۔ [۴] عبدالرسول: شرح گلستان۔ علی گڈھ، ورق ۲-۱

[۵] ریو ۲/ ۷۰۶۔ [۶] مقالات الشعرا ص ۶۸ : شرح مخزن الاسرار، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۲۰۳، ورق ۸۵

[۷] فہرست مخطوطات مدراس ۲۰/ نمبر ۵۹۳۔

شرح قصائد عرفی قصائد عرفی پر اس عہد میں جو شرحیں لکھی گئیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی معنوی کی طرح قصائد عرفی بھی عام تھے۔ کل تین شرحوں کا پتہ چلتا ہے، پہلی مرزا جان کی ہے۔ جس کا سال تصنیف ۱۰۷۳/۶۳-۱۶۶۲ ہے[1]۔ دوسری طراز معنی کے نام سے قطب الدین فارغ کی شرح ہے جو ۱۰۹۳/۱۶۸۲ میں مکمل ہوئی[2]۔ تیسری شرح راجو علوی کی ہے جس کا سال تدوین ۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹ ہے۔ اس کا عنوان نگار نامہ فیضی ہے[3]۔

(ج) انسائیکلوپیڈیا

عقول عشرہ عقول عشرہ واقعات اور اساطیر کی دلچسپ انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کا مصنف مشہور مورخ محمد براری امی بن محمد جمشید ہے۔ امی کے دادا براری خاں اور اس کے پردادا مجنون خاں قاقشال عہد اکبر کے ممتاز امرا میں سے تھے اور حکومت میں ان کا بڑا مرتبہ تھا[4]۔ کتاب دس عقل (باب) پر منقسم ہے اور اس کا سال تدوین ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ ہے[5]۔ لیکن مادہ تاریخ سے ۱۰۸۳ برآمد ہوتا ہے:

پی تاریخ این تالیف امی ‌ ‌ ‌ چو پرسیدیم از علمای ہر شہر
یکی زیشان ز روی لطف فرمود ‌ ‌ ‌ "عقول عشرہ و اعجوبہ دہر"[6]
۱۰۸۳ ہجری

امی خاصا جہاں گرد تھا۔ وہ ۱۰۴۷/۳۸-۱۶۳۷ میں اپنے دوست ہبۃ اللہ کے ساتھ

---

[1] ریو ۲/۶۶۸

[2] طراز معنی، (شرح مترجم قصائد عرفی نول کشور، جولائی ۱۸۸۷ء، ص ۲

[3] ایتھے نمبر ۱۴۵۱۔

[4] مآثر الامرا ۳/۲۰۷۔

[5] عقول عشرہ، علی گڈھ، عبدالسلام، ورق ۲۔

[6] ایضاً ورق ۲۶۰۔

کوڑہ (الہ آباد) میں تھا۔ اس نے جونپور میں سلطان حسین کے مزار کی زیارت کی[1]۔ بردوان (بنگال) میں وہ ایک فقیر سے ملتا تھا[2]۔

امی نے عقول عشرہ کی تالیف اپنے لڑکے اصحاب محمد اور اپنے دوستوں کے استفادہ کے لئے کی[3]۔

کتاب کی تقسیم اس طرح ہے :۔

عقل اول ۔ افلاک

" دوم ۔ اصطرلاب

" سوم ۔ رمل

" چہارم ۔ کرہ زمین

" پنجم ۔ طب

" ششم ۔ جبال

" ہفتم ۔ معدنیات ، نباتات ، حیوانات

" ہشتم ۔ بحار (سمندر)

" نہم ۔ عجائبات

" دہم ۔ زمان و مکان ۔

پہلے باب میں دمدار تارہ کے سلسلہ میں امی نے دلچسپ تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً شاہ طہماسپ صفوی کے دور میں پچاس دن تک دمدار تارہ نکلتا رہا۔ اسی سال صفوی بادشاہ فوت ہوا۔ ۸۰۳/۱۴۰۱-۱۴۰۰ میں جب وہ نکلا تھا تو تیمور نے روم فتح کیا تھا اور ۸۶۰/۵۶-۱۴۵۵

---

[1] ایضاً ورق ۲۵۸ [2] ایضاً ورق ۱۵۷

[3] ایضاً ورق ۱۳۴۔

میں طلوع ہوا تو اس کا اثر تبت، ترکستان، چین، کاشغر، فرغانہ اور ماوراء النہر پر پڑا تھا۔[1] 1162/557 میں خطرناک چاند گہن ہوا۔ یہ طغرل شاہ کا دور تھا۔ اس کا باپ محمود بیمار پڑا اور گذر گیا۔[2]

۵۷۱/۷۶-۱۱۷۵ میں میزان میں سبعہ سیارہ کا اجتماع ہوا۔ منجموں نے خطرناک آندھی اور طوفان کی پیشین گوئی کی مگر ایک پتہ بھی نہیں ہلا۔[3]

تاریخ کے ذیل میں امی نے ہندی کلنڈر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ہندی مہینوں کا ذکر بیساکھ سے شروع کر کے چیت پر ختم کیا ہے۔[4] اس نے اصطرلاب کو بھی ہندی مہینے کے مطابق درست کیا۔[5]

ایک مستقل فصل تاریخ گوئی پر ہے میر محمد باقر حسینی نے اورنگزیب کی خدمت میں ایک قصیدہ بھیجا تھا جس کے ہر مصرعہ سے بحساب جمل ۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳ کا عدد برآمد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے حروف منقوط اور غیر منقوط کو الگ الگ جوڑنے سے کل ۱۶۱۶ تاریخیں نکلتی ہیں۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:-

نجیب و تاج رسل، ملک عدل، زیب جہان　　　　وحید ملک و ملل، عین رحمت یزدان[6]

امی نے اپنی تاریخ نویسی کی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً مجمل مفصل اور طبقات تیموری کے تاریخی قطعے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

رمل کے باب میں امی نے اپنے استاد شیخ محمد یونس لاہوری کا واقعہ نقل کیا ہے جس سے اس نے رمل سیکھی تھی۔[7]

عقول عشرہ کی چوتھی عقل یعنی کرۂ زمین سب سے زیادہ طویل اور دلچسپ ہے۔ مؤلف نے

---

[1] ایضاً ورق ۱۸　　　[2] ایضاً ورق ۳۲۔
[3] ایضاً ورق ۲۵۔　　　[4] ایضاً ورق ۳۴
[5] ایضاً ورق ۴۲　　　[6] ایضاً ورق ۲۶
[7] ایضاً ورق ۵۷

ابجد وار دنیا کے تمام بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد دنیا کی خاص خاص عمارتیں، مینار قلعے اور مساجد کا بیان ہے۔ ایک فصل طلسمات پر ہے۔ پھر صوفیہ، محدثین حفاظ، شعرا اور خطاط پر الگ الگ فصلیں ہیں۔ شعر کی ابتدا اور ارتقا پر ایک جداگانہ بحث ہے۔ قصیدہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے امی نے دارا شکوہ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے[1]۔ ایک فصل لطائف پر ہے۔ اس میں دلچسپ لطیفے ہیں۔ مثلاً

"شخصی از منجمی پرسید کہ "برای کتخدایی کدام ساعت خوب است؟" منجم گفت "برای کتخدایی ہرگز ساعت خوب نباشد"[2]

"مجنون را گفتند "خلافت حق ابوبکر بود یا علی؟" گفت "حق لیلی بود"[3]

ایک فصل 'عیب زنان ونکوہش ایشاں' پر ہے۔ اس کے ذیل میں حیرت انگیز اقوال درج ہیں۔ مثلاً

زن اگر ترا دوست دارد، رنج دہد، اگر دشمن دارد، بنگر کہ چہ کند؟

مالک دینار را گفتند، چرا کدخدا نشوی؟ گفت "اگر توانم خود را ہم طلاق دہم"۔ کدخدا شدہ ای وہنوز نمردہ ای!

ملا دوپیازہ گوید "الندامۃ حاصل کدخدایی"[4]

طب کے باب میں امی نے درازعمری کے عجیب واقعات لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

"در زمان سابق آدمی بہ ہزار سال رسیدی وہر دتا ہشتاد سالہ نشد، بالغ نگشتی۔ اکنون عمر طبعی صد وبست سال است و تواند بود کہ ازین بیشتر بود"[5]

---

[1] ایضاً ورق ۱۲۹ [2] ایضاً ورق ۱۳۴

[3] ایضاً ورق ۱۴۳ [4] ایضاً ورق ۱۴۶،۱۴۵۔

[5] ایضاً ورق ۱۵۷

وہ لکھتا ہے کہ جونپور میں ایک شخص ہے جس کی عمر تین سو سال ہے۔ اسے جمال سیدی کہتے ہیں۔ بردوان میں مجنوں نامی ایک فقیر ہے۔ اس کی عمر ۲۴۰ سال ہے مگر کوئی پچاس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا میں اس سے کئی بار مل چکا ہوں [۱]

صحت کے باب میں ایک فصل شراب نوشی پر ہے اور دوسری آداب شراب خوردن پر۔ امی کا مشورہ ہے کہ شراب کی محفل میں کوئی گندی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ مہینہ میں دو تین بار سے زیادہ شراب نہیں پینی چاہیئے " واقل مقدار آن رطلی باشد"

"نشرب بہ کاسہای کوچک مناسب بود دپیاپی نباید خورد ویک دفع بناید خورد" [۲]

شراب کے لوازم شباب اور رباب پر امی نے بھی زور دیا ہے وہ کہتا ہے:۔

"سزاوار آن است کہ مجلس از خوبرویان ونغمہ دازان وسخن گویان خالی نباشد۔۔۔

شراب بی نغمہ چون درختی است بی بر ونغمہ بی شراب چون رعدی است بی مطر" [۳]

خمار کا ذکر کرتے ہوئے امی کہتا ہے کہ بہترین علاج یہ ہے کہ دو تین جام اور پی لیا جائے نقل سے اگرچہ حکما نے منع کیا ہے مگر گرم مزاج والوں کو پھل اور سرد مزاج حضرات کو گلقند وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے [۴]

ان ساری تفاصیل کے بعد مصنف نے شراب کی حرمت کی تاکید کی ہے۔

براری دو اور کتابوں کا مصنف ہے۔ مجمل مفصل اور طبقات تیموری۔ اول الذکر مسلمانوں کی عام تاریخ ہے جس میں ابتدائے عالم سے شاہجہاں کی تخت نشینی (۱۶۲۸ء) تک کے واقعات درج ہیں۔ براری کہتا ہے کہ میں شروع سے تاریخ کے مطالعہ کی طرف راغب تھا:۔

" وہمیشہ تتبع و تفحص این فن می کردم مرکوز خاطر داشت کہ مجملی از مفصلی کہ خالی از تکلف عبارت

---

[۱] ایضاً

[۲] ایضاً ورق ۱۷۶

[۳] ایضاً ورق ۱۷۷

[۴] ایضاً ورق ۱۷۷

باشد، ترتیب دہد کہ ہرکس بہ آسانی ہر مطلب کہ خواہد، بہ دست آرد و محتاج بہ تجسس و تفحص دیگر نشود ":[1]

اور اس طرح ۱۰۶۵/۵۵-۱۶۵۴ میں اس کی کتاب مکمل ہوگئی. جیساکہ اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے :۔

این نامہ کہ تالیف نمودہ است امی بسیار بہ محنت و بہ رنج آوردہ است
از روی حساب و ظاہر الفاظش گفتم کہ ہزار و شصت و پنج آوردہ است[2]

بوڈلین لائبریری کے ایک مخطوطہ کی درج ذیل عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجمل مفصل کی دو جلدیں ہیں. دوسری جلد جس میں ایران اور ہندوستان کے تیموریوں کا حال ہے، طبقات تیموری کے نام سے موسوم ہے۔

" امابعد - این مجلد ثانی است از مجمل مفصل کہ نیازمند درگاہ باری محمد براری . . .
مؤلف ساختہ از تطویل تقلیل پرداختہ و چون این مجلد مبنی و مخبر است از احوال طبقہ گورگان مسمّیٰ بہ طبقات تیموری گشتہ ":[3]

طبقات تیموری کا ذکر صراحتہً عقول عشرہ میں بھی ہے. یہ کتاب ۸ محرم ۱۰۷۹/۱۸ جون ۱۶۶۸ کو مکمل ہوئی. قطعہ تاریخ یہ ہے :۔

طبع امی از پی تاریخ آن "ہشتم ماہ محرم" گفتہ است[4]

بوڈلین نسخہ کے آخر میں یہ عبارت درج ذیل ہے :۔

" . . . محرم گفتہ است ۱۰۷۹- الحمد للہ علی اتمام مؤلفہ العبد المذنب راجی الی رحمۃ اللہ فاقتال عفی عنہ[5]

---

[1] مجمل مفصل بانکی پور نمبر ۴۰۲ - ورق ۱
[2] ایضاً (آخری صفحہ)، ایشیاٹک ۱/ نمبر ۴۳ - نیز عقول عشرہ از محمد براری امی (علی گڈھ، عبدالسلام)، ورق ۲۸ -
[3] بوڈلین نمبر ۲۴۲ -
[4] عقول عشرہ ورق ۲۸
[5] بوڈلین نمبر ۲۴۲ -

بعض حضرات[1] کا خیال ہے کہ مؤلف کے جملہ 'از تطویل تقلیل پرداختہ' اور کتاب کے عنوان مجمل مفصل کا یہ مطلب ہے کہ براری نے خود ہی دو نسخے تیار کئے تھے۔ پہلا مفصل نسخہ تھا اور دوسرا مجمل، لیکن راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ براری نے صرف یہی نسخہ ترتیب دیا۔ اس نے دیباچہ میں ہیں یہ بات واضح کردی ہے کہ مفصل تواریخ سے میں نے ۱۰۶۵/۵۵-۱۶۵۴ میں ایک مجمل تاریخ مرتب کی ہے۔

"ومرکوز خاطر داشت کہ مجملی از مفصلی کہ خالی از تکلف عبارت باشد، ترتیب دہد،

. . . پس بروجہ ایجاز واختصار احوال پیشینیان وگذشتگان درسنہ خمس وستین والف

ہجری از سواد بہ بیاض برد"[2]

مجمل مفصل کے تقریباً انیس سال بعد ۱۰۸۴/۷۴-۱۶۷۳ میں براری نے ایک انسائیکلوپیڈیا عقول عشرہ کے نام سے مرتب کی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ایک مخطوطہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۰۰/۸۹-۱۶۸۸ میں براری جہات تھا جب اس کے لئے غلام محمد نے مجمل مفصل کی ایک نقل تیار کی تھی۔[3]

براری کی تاریخ میں غیر معمولی اطلاعات نہیں ہیں لیکن قدیم تاریخ کے لکھنے میں اس نے اہم واقعات پر زور دیا ہے اور روایات واساطیر کے بجائے حقیقت اور عقل پسندی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً آغاز کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"صاحب اکبرنامہ می نویسد کہ بیشتری از اسلامیان برآنند کہ آغاز آدمیان راہفت ہزار سال است۔ لیکن بردیدہ وران دوربین پیدا است کہ عقول در رد وقبول آن می ایستد واز کتب قدیمۂ ہندی وخطائی کہ بنای قواعد نجوم واحکام ارصاد برآن است واز ضبط تواریخ حکمای

---

[1] ایشیاٹک ۱/نمبر ۴۳

[2] مجمل مفصل ورق ۱۰۲

[3] ایشیاٹک ۱/نمبر ۴۳۔

این اقالیم دانستہ می شود کہ عالم و عالمیان را ابتدا نیست "[1]

تحفۃ الہند تحفۃ الہند فارسی کی واحد کتاب ہے جس میں پہلی بار ہندی علم شعر اور دیگر علوم رائجہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس کا مصنف مرزا خان بن فخر الدین محمد ہے[2] اس نے یہ کتاب کوکلتاش خاں کے کہنے پر شہزادہ معز الدین جہاندار شاہ کے لیے لکھی، مگر کتاب شہزادہ اعظم کے نام معنون ہے[3]۔ چونکہ اس میں کوکلتاش خاں کے مشہور خطاب خان جہاں کا ذکر نہیں ہے جو اسے ۱۰۸۶/۷۶ - ۱۶۷۵ میں عطا ہوا، اس لئے ڈاکٹر ریو کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ تحفۃ الہند کی تصنیف اس سے قبل ہوئی ہے[4] لیکن ڈینیسن راس کا یہ کہنا ہے کہ مرزا خان کی ولادت ۱۰۷۱/۶۱- ۱۶۶۰ میں ہوئی۔[5] اگر یہ بات مان لی جائے تو ۱۰۸۶/۷۶ - ۱۶۷۵ یعنی پندرہ میں اس کے لئے کتاب لکھنا ممکن نہیں۔

تحفۃ الہند مقدمہ۔ سات باب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے ہندی حروف کی فارسی املا کے طریقے وضع کئے ہیں۔ ایسی کوشش ملا روشن ضمیر نے بھی پارجاتک میں کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے دانشور ہندی املا پر غور و خوض کرتے تھے۔ سات باب کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ پنگل یعنی علم عروض

۲۔ تک یعنی علم قافیہ

۳۔ النکار یعنی علم بدیع و بیان

۴۔ سنگار رس یعنی عاشقی و معشوقی

---

[1] مجمل مفصل ورق ۵

[2] تحفۃ الہند، علی گڈھ، حبیب گنج، ورق ۱

[3] ایضاً ورق ۱۰۲

[4] ریو ۱/ ۶۲

[5] راس و براون، نمبر ۵۸۔

۵. سنگیت یعنی علم موسیقی

۶. کوک یعنی علم معرفت اقسام زن و مرد.

۷. سامدرک یعنی علم قیافہ.

خاتمہ میں ہندی کی خاص اصطلاحات اور تلمیحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مصنف نے ایک مختصر ہندی فارسی لغت بھی مرتب کیا ہے۔ تحفۃ الہند کو اس لحاظ سے بھی اولیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی بار ہندی فارسی لغت پیش کیا گیا ہے۔

فرہنگ اورنگ شاہی

عقول عشرہ کی طرح دوسرا انسائیکلوپیڈیا فرہنگ اورنگ شاہی ہے۔ البتہ اول الذکر کے مقابلہ میں اس میں طبیعیات کا بیان خاص ہے۔ فرہنگ اورنگ شاہی کا مؤلف ہدایت اللہ بن محمد محسن قریشی ہاشمی جعفری ہے[1]۔ کتاب میں تاریخ تصنیف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ لفظ اورنگ شاہی سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ عہد اورنگ زیب کی تصنیف ہے۔ ایک اور بات سے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے کہ مؤلف نے صائب، خالص اور گرامی کے اشعار نقل کئے ہیں۔ صائب[2] اور خالص کے اشعار تنبا کو سے متعلق ہیں۔ خالص کہتے ہیں:

تنبا کوی ما محرم رازی است تمام　　　پیوستہ مصاحب است چہ صبح وچہ شام

قانع چو شدم بہ دود این برگ طرب　　　کردیم مدام توبہ از شرب مدام[3]

فرہنگ اورنگ شاہی مقدمہ، آٹھ ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں عرش اور آسمان کا بیان ہے۔ نفس کتاب میں بالترتیب عناصر اربعہ، درندے، وحوش دانہ خوار، طیور، حیوانات آبی ہوام و ملخ و مور، نباتات اور جمادات کا ذکر ہے۔ خاتمہ میں ہوا اور موسم کا ذکر ہے۔

کتاب میں اشعار کی بھرمار ہے۔ بہت سی اصطلاحوں کی تشریح بجائے نثر کے شعر میں درج ہے۔

---

۱ فرہنگ اورنگ شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، نمبر ۱۳۶۷، ورق ۲

۲ ایضاً ورق ۵۳۰.　　۳ ایضاً ورق ۵۳۶.

(د) متفرقات

ان تصنیفات کے علاوہ اس عہد میں مذہبیات، قواعد، ریاضی، شکاریات وغیرہ پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کی ادبی حیثیت نہیں ہے مگر وہ بھی تاریخ عصر کا ایک جزو ہیں اور اس لئے مختصراً ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مذہبیات میں سید خواجگی نے سورۂ واقعہ کی تفسیر (مصنفہ ۱۰۸۳/۷۳-۱۶۷۲) لکھی[1]۔ قرأت پر دو کتابیں لکھی گئیں۔ پہلی احمد بن رکن الدین کی حلیۃ القاری (۹۵-۱۰۸۳/۸۴-۱۶۷۲) ہے جو ابوالحسن قطب شاہ کے نام معنون ہے[2]۔ دوسری تصنیف مفید القرا نعمت اللہ بن رحمت لاہوری کی ہے[3]۔ مصطفٰے بن محمد سعید نے علامات نجوم الفرقان (۱۱۰۳/۹۲-۱۶۹۱) لکھی جس میں ابجد وار قرآن کے تمام الفاظ کی فہرست دی ہے[4]۔ شیخ نور الحق دہلوی نے ۱۰۷۳/۶۳-۱۶۶۲ میں تیسیر القاری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی[5]۔ ان کے لڑکے محب اللہ نے صحیح مسلم کی شرح لکھی اور منبع العلم نام رکھا[6]۔ اور محب اللہ کے لڑکے فخر الدین نے عین العلم عثمان بن عمر بلخی کی شرح لکھی[7]۔

فقہ میں عبدالخالق سجاول نے ۱۰۷۶/۶۶-۱۶۶۵ میں شرح وقایہ کا فارسی ترجمہ کیا اور اورنگزیب کے نام انتساب کیا[8]۔ اس نے شرح ہدایہ کا فارسی ترجمہ بھی کیا[9]۔ شہزادی زیب النساء کے ایما پر فتاوای عالمگیری کا فارسی ترجمہ ہوا[10]۔ محمد بن لعل بیگ نے چاروں ائمہ کے نقطہ نظر سے جامع الروایات میں فقہی مسائل پر بحث کی[11]۔ تاج محمد

---

[1] تفسیر سورہ واقعہ، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۳۳۶، ورق ۱۔
[2] ایشیاٹک ۲/نمبر ۳۴۔
[3] ایضے نمبر ۲۷۰۵۔
[4] بانکی پور ۱۴/۳۷۔
[5] مطبوعہ مطبع علوی، لکھنؤ ۱۲۹۸ھ
[6] منبع العلم، بانکی پور، نمبر ۱۱۹۲، ورق ۲۔
[7] شرح عین العلم، بانکی پور، نمبر ۱۳۶۲، ورق ۲
[8] ترجمہ شرح وقایہ، علی گڈھ، احسن ورق ۲-۱۔
[9] ایضے نمبر ۲۵۹۳
[10] ایڈنبرا نمبر ۱۸۰۔
[11] فہرست مخطوطات کلکتہ مدرسہ، ص ۱۱۰۔

قادری نے خلاصۃ المسائل میں فقہ کے مسائل جمع کئے۔[1] عبداللہ بن علی الطبیب نے اسلام کے بنیادی عقائد پر فضائل النقبا (۱۱۰۵/۹۴-۱۶۹۳) لکھی۔[2] اور علی اصغر خاں نے شیعہ روایات واحادیث پر مجالس الاحزان (قبل ۱۱۰۹/۹۸-۱۶۹۷) مرتب کی اور شہزادہ بلند اختر بن شہزادہ اکبر کے نام معنون کیا۔[3] آیات قرآنی کے روحانی اثر میں ابوالمفاخر نظام الدین عرف شاہ میرزا الملقب بہ مرزا مہدی خاں صفوی نے ضیاء العیون (۱۱۱۴/۰۳-۱۷۰۲) مرتب کی۔[4] ایک نو مسلم ہر کشن عرف عبدالقوی نے اسلام کی حقانیت پر ایک رسالہ رد الکفر لحجۃ القوی لکھا۔ اس کی تاریخ تصنیف شوال ۱۰۷۱/جون ۱۶۶۰ ہے۔[5]

قواعد میں عربی علم صرف کی مشہور کتاب فصول اکبری اسی دور کی تالیف ہے۔ اس کا مصنف علی اکبر الہ آبادی (م۔ ۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰) ہے۔[6] شیخ غلام محمد بن اللہ یار امروہوی نے شہزادی زیب النساء کے لئے شافیہ کی فارسی شرح لکھی۔[7] نورالدین محمد فرزدن نے صرف میر کی شرح لکھی۔[8] عبدالواسع ہانسوی نے ۱۱۰۱/۹۰-۱۶۸۹ میں دستور العمل فارسی لکھا۔ محمد بن محمد سعید انصاری نے عروض سیفی کی منظوم تلخیص کرکے اس کا نام خافیۃ المثل (۱۱۰۷/۹۶-۱۶۹۵) رکھا۔[9] ریاضی پر دھرم نرائن بن کلیان مل نے بدائع الفنون (۱۰۷۴/۶۴-۱۶۶۳) لکھی۔[10]

اس عہد میں طب پر بھی خاصی کتابیں لکھی گئیں۔ اس عہد کے مشہور طبیب محمد اکبر ارزانی کی تصنیفات آج بھی طب کے نصاب میں شامل ہیں۔ جن میں طب اکبر (۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰) سب سے مشہور ہے۔[11]

---

[1] فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، ۳۶/۲

[2] فضائل النقبا، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۰۸۶، ورق ۲۔

[3] مجالس الاحزان، ایشیاٹک، کرزن، نمبر ۳/۷، ورق ۲۔

[4] بوڈلین نمبر ۱۵۶۳۔

[5] سید سلیمان ندوی: مقالات سلیمان مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن، حصہ اول، اعظم گڈھ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۶

[6] بانکی پور ۹/۷۷۳۔ ایتھے (نمبر ۲۴۲۳) نے مصنف کا نام علی الکبیر دیا ہے۔

[7] ایشیاٹک ۲/نمبر ۵۶۰

[8] ایضاً ۱/نمبر ۱۴۵۶

[9] خافیۃ المثل، ایشیاٹک، کرزن، نمبر ۱۸۰، ورق ۱۰۰۹۔

[10] ایتھے نمبر ۲۲۵۹

[11] بانکی پور ۱۱/۳۱۔

اس کی دیگر تصانیف میں قرابادین نادری (۳۰-۱۱۲۶/۱۸-۱۷۱۴)[1]، میزان طب[2]، مجربات اکبری[3] اور مفرح القلوب ہیں[4]۔

محمد قاسم بن شریف خاں نے ۱۰۷۶/۶۶-۱۶۶۵ میں سالہوتر کی بنیاد پر تحفۂ کان علاج اسپ لکھا[5]۔ محمد رضا بن ابوالفضل شیرازی نے ریاض عالمگیری کے عنوان سے ایک قرابادین مرتب کی[6]۔ تریاق پر محمد رضی الدین نے شہزادہ اعظم کے لیے عجائب الاتفاق فی شناختن تریاق لکھی[7]۔ شیخ محمد بن زکریا رازی (م۔ ۹۲۲/۳۱۱) کی تصنیف دستور الطب کا شیخ حسین جابری انصاری نے تحفۂ شاہی کے نام سے فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی شہزادہ اعظم کے لیے کیا گیا[8]۔ درویش محمد امن آبادی نے ویدک کے مطابق ایک کتاب طب اورنگزیبی مرتب کی اور اسے اورنگزیب کے نام معنون کیا[9]۔

شکاریات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں محمد رضا بن محمد یوسف کی دستور الصید (۱۰۸۳/۷۳-۱۶۷۲)[10]، بہادر کی بازنامہ (۱۰۹۱/۸۱-۱۶۸۰)[11] اور اللہ یار جامی کی مرآۃ الصید (۱۱۱۱/۱۷۰۰-۱۶۹۹) ہیں[12]۔

تیراندازی کے فن پر خواجہ محمد بن فاضل بن خواجہ محمد قاسم نے ۱۱۱۲/۱۷۰۱-۱۷۰۰ میں کشف اسرار رمی لکھی[13]۔ تلوار کی پرکھ پر لطف اللہ خاں نثار معروف بہ نصرت اللہ نے تائید بصارت (۱۱۱۸/۰۷-۱۷۰۶) مرتب کی[14]۔ جانوروں کی دیکھ بھال پر ایک گمنام کتابچہ فن جانور داری ملتا ہے جو ۱۱۰۳-۱۰۹۰/۹۲-۱۶۷۹ کے دوران مرتب ہوا[15]۔

---

[1] ایتھے نمبر ۲۳۴۴۔ [2] بانکی پور ۳۳/۱۱

[3] ایتھے نمبر ۲۴۳۲۔ [4] فہرست مخطوطات مدراس، ۲/ نمبر ۶۴۶

[5] تحفۂ کان علاج اسپ، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۶۰۴، ورق ۲، ۴۵۔

[6] ایتھے نمبر ۲۳۳۷۔ [7] ایضاً نمبر ۲۳۵۱۔

[8] بوڈلین نمبر ۱۶۱۰۔ [9] ایشیاٹک، ۲/ نمبر ۶۰۰

[10] محمد رضا: دستور الصید، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۶۱۹، ورق ۱ [11] بازنامہ، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۶۱۹ (ز)، ورق ۸۵

[12] ایتھے نمبر ۲۹۷۹ [13] بوڈلین نمبر ۱۸۸۶۔

[14] تائید بصارت، علی گڑھ، سبحان اللہ، ورق ۴۴، نیز سفینۂ بیخبر ص ۳۵۱۔ [15] بوڈلین نمبر ۲۸۱۷۔

کتابیات

آتشکدہ از لطف علی خاں آذر، بمبئی، ۱۲۹۹ ہجری

آثار الصنادید از سر سید احمد خاں، نولکشور، ۱۹۰۰ء

احسن السیر از محمد المدعو بہ کاظم، بوہار مخطوطہ نمبر ۳۰۔

احکام عالمگیری از حمید الدین خاں مرتبہ سر جدوناتھ سرکار، کلکتہ، ۱۹۱۲ء

اخبار الاخیار از شیخ عبد الحق دہلوی (اردو ترجمہ از لطیف ملک) لاہور، ۱۹۶۲ء

آداب الذکر ابو سعید عرف جعفر محمد خنکواری، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ذخیرہ سوسائٹی نمبر ۱۲۸۰

(مجلہ) ادب اکامل، جون۔ جولائی ۱۹۶۶ء

آداب عالمگیری۔ ابو الفتح قابل خاں (مخطوطہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ)

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبد اللہ، دہلی، ۱۹۴۲ء۔

ارشاد رحیمیہ از شاہ عبد الرحیم دہلوی، دہلی، ۱۳۲۱ہجری

اشہر اللغات از غلام اللہ صدیقی ہانسوی غزنوی، بانکی پور لائبریری، مخطوطہ نمبر ۷۶۸۔

افسانہ تولد شدن راجہ بکرماجیت، ایشیاٹک سوسائٹی، ذخیرہ کرزن نمبر ۱۲۱۔

(مثنوی) امواج الخیال از میر عبد الجلیل بلگرامی (مخطوطہ علی گڑھ)

انتخاب دیوان اعجاز (مشمولہ انتخابات مخطوطہ سلیمان، علی گڑھ نمبر $\frac{۶۹۱ - ۹۲}{۱۶ - ۱۷}$)

انتخاب دیوان سرخوش، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، مخطوطہ نمبر ۲۰۔

انتخاب مرزا محمد اشرف، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد، مخطوطہ نمبر (دیوان) ۱۰۵۰

انتخاب منتخب از عبد الشکور بن عبد الواسع ٹھٹھوی (مخطوطہ علی گڑھ)

انشای جلیل مع شرح کلمات النبیل از میر عبد الجلیل بلگرامی، لکھنؤ، ۱۲۸۹ ہجری

انشای خلیفہ از خلیفہ شاہ محمد، نولکشور، اکتوبر ۱۸۷۷ء

انشای دستور الہی از ضیاء اللہ بلگرامی (مخطوطہ علی گڈھ)

انشای روشن ضمیر (مشمولہ بیاض، بانکی پور، نمبر ۱۰۹۸)

انفاس رحیمیہ از شاہ عبدالرحیم دہلوی، مطبع احمدی، دہلی

انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ، دہلی، ۱۳۱۵ ھ

انیس الحجاج از ملا صفی بن ولی قزوینی (مخطوطہ دارالمصنفین، اعظم گڈھ)

اورنگ نامہ از حقیری، آصفیہ، تاریخ نمبر ۶۰۳

اورنٹیل کالج میگزین، لاہور۔

آئینۂ بخت، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷۔

(مثنوی) آئینۂ راز از ارادت خاں واضح، سالارجنگ نمبر ۹۴

بازنامہ از بہادر، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۶۱۹ (۷)

بدائع العقول (بیتال پچیسی) ایشیاٹک، کرزن نمبر ۱۲۱۔

بدائع الفنون از میدن مل ولد دھرم داس سکسینہ، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۴۹۷
(سابلہ) برہان، دہلی

بساتین السلاطین از ابراہیم زبیری، حیدرآباد۔

بستان بیخزان از فضل علی خاں (مخطوطہ)

بہارستان سخن از شاہنواز خاں خوانی (مخطوطہ)

بیدل از خواجہ عباداللہ اختر، لاہور، ۱۹۵۲ء

بیاض، بانکی پور نمبر ۱۰۸۸

بادشاہنامہ از عبدالحمید لاہوری مرتبہ کبیرالدین و عبدالرحیم، کلکتہ ۶۸ - ۱۸۶۷ء

پارجاتک از مرزا روشن ضمیر (مخطوطہ علی گڑھ)

پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۰ء

پنجابی قصے فارسی زبان میں، مرتبہ ڈاکٹر سید محمد باقر، لاہور (۲ جلد) ۵۷-۱۹۵۶ء

پیام مشرق از علامہ محمد اقبال، لاہور، ۱۹۴۶ء (پانچواں ایڈیشن)

تاج محل از ڈاکٹر سید عبداللہ چغتائی، لاہور، ۱۹۳۳ء

تاریخ ارادت خاں واضح، مخطوطہ سبحان اللہ، علی گڑھ۔

تاریخ آشام مترجمہ میر بہادر علی حسینی، کلکتہ ۱۸۰۵ء

تاریخ حسن مؤلفہ پیر غلام کھویہامی، سرینگر

تاریخ شاہ شجاعی از محمد معصوم (مخطوطہ علی گڑھ)

تائید بصارت، از لطف اللہ خان نثار (مخطوطہ سبحان اللہ، علی گڑھ)

تبصرہ کارروائی ترتیب کلیات امیر خسرو از محمد اسحق،

تحفۃ الاخیار از ملا صفی بن ولی قزوینی، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۵

تحفۃ الشجاعۃ از روح اللہ، سالار جنگ نمبر ۳۱

تحفۃ العراقین از خاقانی

تحفۂ کان علاج اسپ از محمد قاسم، ایشیاٹک، سوسائٹی نمبر ۱۶۰۴

تحفۃ الہند از مرزا خان (مخطوطہ حبیب گنج، علی گڑھ)

تذکرۂ بینظیر از عبدالوہاب افتخار مرتبہ سید منظور علی، الہ آباد، ۱۹۴۰ء

تذکرۂ حسینی از حسین دوست سنبھلی، نولکشور، ۱۸۷۵ء

تذکرۃ الشعرا از عبدالغنی خاں، علی گڑھ، ۱۹۱۶ء

تذکرۂ علمای ہند از رحمان علی، نولکشور، ۱۹۱۴ء

تذکرۂ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (۴ جلد) حیدرآباد ۱۳۶۲-۷۸ ہجری۔

تذکرۃ المعاصرین از شیخ علی حزین (مخطوطہ علی گڈھ)

تذکرہ نصرآبادی از محمد طاہر نصرآبادی، تہران، ۱۳۱۷ شمسی۔

ترجمہ شرح وقایہ از عبدالحق سجادلی سرہندی۔ (مخطوطہ علی گڈھ)

تفسیر سورۂ واقعہ از سید سلطان خواجگی حسینی، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۳۳۶

تیسیر القاری از شیخ نورالحق دہلوی (مخطوطہ حبیب گنج، علی گڈھ)

ثمرات الحیاۃ از عاقل خاں رازی، سالارجنگ نمبر ۳۸، ۳۹ (نیز علی گڈھ لٹن ضمیمہ نمبر ۱۰۶)

جاوید نامہ از علامہ محمد اقبال، لاہور، ۱۹۴۷ء (دوسرا ایڈیشن)

جغرافیای ایران مفصل از مسعود کیہان، ج ۲، تہران ۱۳۱۱ شمسی

جنگ نامہ از نعمت خاں عالی، نولکشور، ۱۸۷۲ء

جہاں آرا از ضیاء الدین برنی بی۔ اے، کراچی، ۱۹۵۵ء (دوسرا ایڈیشن)

حدیقۃ اللغۃ از ملا محمد سعد، بانکی پور نمبر ۹۰۸

حربۂ حیدری از ابوطالب بن ابوالقاسم فندرسکی، سالارجنگ نمبر ۱۸۸

حسن و دل از یحیی سیبک فتاحی (مخطوطہ علی گڈھ)

حسن و عشق از سید منصب علی ہنر، لکھنؤ۔

حسن و عشق از نعمت خاں عالی، ہارڈنگ لائبریری، دہلی، نمبر ۱۶۳

حملۂ حیدری از رفیع خاں باذل، آصفیہ، تاریخ نمبر ۴۶۷۔

(مجموعہ) حکایات ناسکیت از روپ نراین کھتری (مخطوطہ انجمن ترقی اردو، علی گڈھ)

حل مثنوی از افضل الہ آبادی، بانکی پور نمبر ۴۰۶

حیات جلیل از مقبول صمدنی، الہ آباد، ۱۹۲۹ء

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی از خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۵۳ء

خاص الانشا از معین الدین جامعی (مخطوطہ علی گڈھ)

خافیۃ المثل از شیخ محمد بن محمد سعید انصاری دہلوی، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۱۸۰.

خزانہ عامرہ از غلام علی آزاد بلگرامی، کانپور، ۱۸۷۱ء

خزینۃ الاصفیا از غلام سرور، کانپور، ۱۳۲۰ ھجری

خطبات گارساں دتاسی (اردو) اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء

خلاصۃ الافکار از ابوطالب اصفہانی، بانکی پور نمبر ۷۱۲.

خلاصۃ التواریخ از سجان رائے مرتبہ ظفر احسن، دہلی، ۱۹۱۸ء

خلاصۃ السیاق (مخطوطہ علی گڈھ)

خلاصۃ الکلام از نواب علی ابراہیم خلیل (مخطوطہ حبیب گنج، علی گڈھ)

خلاصۃ المکاتیب، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، مخطوطہ نمبر ۳۲۶۱، ۳۲۵۸.

خوان نعمت، مطبع محمدی، دہلی.

دانشمندان آذربائجان از محمد علی تربیت، تہران، ۱۳۱۴ ھجری

دستور جہاں کشائی از حاجی خیر اللہ بن حاجی کرم اللہ (مخطوطہ علی گڈھ)

دستور الصبید از محمد رضا، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۶۱۹.

دستور العمل آگہی (رقعات اورنگزیب) مخطوطہ دہلی یونیورسٹی لائبریری

(مثنوی) دستور ہمت، ہارڈنگ لائبریری، دہلی، نمبر ۵۰.

دو تذکرے مرتبہ ڈاکٹر کلیم الدین احمد، پٹنہ۔

دوحۃ الصنائع از امام الدین النعمانی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۳۷۷۔

دہ سالۂ کاظم (تلخیص عالمگیر نامہ) ہارڈنگ لائبریری، نمبر ۱۸۷۔

دیوان ابوالفرج رونی مرتبہ پروفسور چایکین، ۱۳۰۴ ہج

دیوان اشرف مازندرانی (مخطوطہ منیر عالم، علی گڈھ) نیز ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۷۔

دیوان ایجاد، نیشنل میوزیم، نمبر ۲۹۵۶۔

دیوان بیخود، بوہار، نیشنل لائبریری، کلکتہ، نمبر ۴۰۰۔

دیوان بینش کشمیری، بانکی پور، نمبر ۵۴۷۔

دیوان تسلیم، بانکی پور، نمبر ۵۵۰

دیوان حیرت، بانکی پور، نمبر ۵۵۹

دیوان خاکسار، بانکی پور، نمبر ۲۹۶۸

دیوان خالص اصفہانی، سالار جنگ، نمبر ۳۳۳

دیوان خلیل، بوہار، نمبر ۴۰۷

دیوان سابق، سالار جنگ، نمبر ۳۴۹

دیوان سالم کشمیری، بانکی پور، نمبر ۵۶۴

دیوان شاکر از نواب آصف جاہ شاکر، حیدرآباد، ۱۳۵۷ ہج

دیوان شمسی، بانکی پور، نمبر ۱۹۰۵

دیوان عالی (نعمت خاں) نیشنل میوزیم، نمبر ۲۹۴۲ نیز نولکشور، ۱۸۹۴ء

دیوان عطا تتوی مرتبہ مطیع اللہ راشد، کراچی۔

دیوان علوی، بانکی پور، نمبر ۵۹۲

دیوان غنی کشمیری، لکھنو، ۱۹۳۱ء۔

دیوان غنی کشمیری مرتبہ محمد داراب، سری نگر، ۱۹۶۴ء

دیوان غنیمت مرتبہ غلام ربانی عزیز، لاہور، ۱۹۵۸ء

دیوان فطرت موسوی نیشنل میوزیم، نمبر ۳۰۵۱

دیوان کاشفی، بانکی پور، نمبر ۳۴۵۴

دیوان گرامی (عبدالرحمن وزارت خاں)، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۸۰۴

دیوان محترم بانکی پور نمبر ۱۹۰۰ اور ۱۹۰۱

دیوان مخفی مرتبہ عبدالباری آسی، نولکشور، ۱۹۲۹ء

دیوان مفید بلخی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۰

دیوان منصف (مخطوطہ حبیب گنج، علی گڑھ)

دیوان ناصر علی سرہندی، کانپور، ۱۹۱۲ء

دیوان نصیبی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۴

دیوان وحادت، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۸۳۱

دیوان ہمت (محمد عاشق) مخطوطہ حبیب گنج، علی گڑھ۔

ذخیرۂ جواہر از شاہنواز حسینی، بوہار، نمبر ۲۷۳

راحت الارواح از محمد سعید بن حافظ کرم اللہ، بانکی پور، نمبر ۲۷۳

راگ درپن (فارسی) از مرزا فقیر اللہ سیف خاں (مخطوطہ علی گڑھ)

" (ہندی ترجمہ) ہری نواس دویدی، گوالیار۔

رامائن از گوپال بن سری گوبند، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۶۸۲

رامائن (نرگستان) از چندر من بیدل، نولکشور، ۱۸۷۵ء

رباعیات بیدل، ہارڈنگ لائبریری، نمبر ۱۱۷۔
رسالہ سرپری (سنگھاسن بتیسی)، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۰۲
رقائم کرائم مرتبہ سید اشرف حسینی، ہارڈنگ لائبریری، نمبر ۲۰۷
رقعات و مضحکات از نعمت خاں عالی، نولکشور، ۱۲۶۱ھ
رقعات بیدل، نولکشور، مارچ ۱۸۸۵ء
رقعات خلیل از مرزا محمد خلیل، (مخطوطہ علی گڈھ)
رقعات عالمگیر مرتبہ محمد صلاح جعفری، ہارڈنگ لائبریری نمبر ۲۰۹
" " ، نولکشور، ۱۹۱۰ء
" " مرتبہ نجیب اشرف ندوی، اعظم گڈھ۔
رود کوثر از شیخ محمد اکرام، لاہور، ۱۹۵۸ء (تیسرا ایڈیشن)
روز روشن از محمد مظفر حسین صبا، بھوپال، ۱۲۹۷ھ
روضۂ اقطاب از محمد بولاق (اردو ترجمہ) محب ہند پریس، دہلی۔
ریاض الافکار از وزیر علی عبرتی، (مخطوطہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڈھ)
ریاض الاولیا از بختاور خاں، آصفیہ، نمبر ۹/۱۱۵
ریاض الشعرا از والہ داغستانی (مخطوطہ علی گڈھ)
ریاض الوداد از ایزد بخش رسا، (مخطوطہ علی گڈھ)

زیب المعانی (زیب المنشآت) از زیب النساء، (مخطوطہ انجمن ترقی اردو علی گڈھ)
زیب النساء از شبلی نعمانی، لاہور۔

سب رس از ملا وجہی مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، کراچی، ۱۹۵۲ء

سراکبر از داراشکوہ مرتبہ رضا جلالی نائنی، تہران، ۱۹۵۷ء

سروآزاد از غلام علی آزاد بلگرامی، حیدرآباد،

سرود البحر از قاضی حسن، سالار جنگ نمبر ۱۴۱۷ب

سفینۂ بیخبر از عظمت اللہ بیخبر (مخطوطہ علی گڑھ)

سفینۂ خوشگو از بندرابن داس خوشگو مرتبہ شاہ عطاء الرحمن کاکوی، پٹنہ

سفینۂ ہندی از بھگوان داس ہندی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء

سنگیت پارجات (ہندی ترجمہ پارجاتک)، ہاتھرس، ۱۹۴۱ء

سنگیت درپن از چتر دامودر، مرتبہ کے، واسودیو شاستری، مدراس، ۱۹۵۲ء

شاہنامۂ دکن (فتوحات آصفی)، آصفیہ، نمبر ۱۴۹۳،

شرح بوستان از عبدالرسول (مخطوطہ علی گڈھ)

شرح دیوان حافظ از ملا محمد سعد، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷۴۴ (ج)

شرح عین العلم از فخر الدین، بانکی پور، نمبر ۱۳۶۲

شرح قصائد بدر چاچ از ملا محمد سعد، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷۴۴ (د)

شرح قطعہ نعمت خاں عالی از آزاد بلگرامی، لکھنؤ، ۱۲۰۹ ہجری

شرح گلستان از عبدالرسول (مخطوطہ علی گڈھ)

شرح مثنوی از نور اللہ احراری (مخطوطہ علی گڈھ)

شرح مثنوی از شکر اللہ خاں خاکسار (مخطوطہ سلیمان، علی گڈھ)

شرح مخزن اسرار از قاضی ابراہیم ٹھٹھوی، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۲۰۳۔

شرح مکاتبات علامی از ملا محمد سعد، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷۴۴ (ب)

شرح یوسف زلیخای جامی از ملا محمد سعد، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷۴۴ (الف)

شش جہت از روپ نراین کھتری، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۱۵۱۔

شمس الاصوات از رس برس، سالار جنگ، نمبر $\frac{1418}{9}$

شمع انجمن از نواب صدیق حسن خان، بھوپال

شمع و پروانہ (پدماوت) از عاقل خاں رازی، سالار جنگ، نمبر ۶۱۷ - اور حبیب گنج، علی گڈھ۔

صبح گلشن از سید حسن علی خاں، بھوپال، ۱۲۹۵ھ

صحائف شرائف از محمد عسکری حسینی بلگرامی، بانکی پور، نمبر ۲۶۸۷

صحف ابراہیم از ابراہیم خاں خلیل، بانکی پور، نمبر ۲۲۸

طراز معنی از قطب الدین فارغ، نولکشور، جولائی ۱۸۸۷ء

(مثنوی) طلسم حیرت از مرزا عبدالقادر بیدل، سالار جنگ، نمبر ۹۲۹

(مثنوی) طور معرفت از " " " نمبر ۶۳۰

ظفرنامہ منسوب بہ گورو گوبند سنگھ ترجمہ سردار گوردیال سنگھ، دہلی، جنوری ۱۹۶۷ء

عالمگیر نامہ از محمد کاظم مرتبہ مولوی خادم حسین و مولوی عبدالحی، کلکتہ، ۱۸۶۸ء

(مثنوی) عرفان از بیدل (مخطوطہ لٹن، علی گڈھ)

عشق نامہ از بیانی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۵۲۸۔

عقول عشرہ از محمد براری امی (مخطوطہ علی گڈھ)

عمل صالح از محمد صالح کنبو لاہوری مرتبہ غلام یزدانی، ج ۱، کلکتہ، ۱۹۲۳ء

فارسی بلگرام از سید اصغر علی بلگرامی، حیدر آباد، ۱۳۴۷ھ

فتحیہ عبریہ (تاریخ آسام) از احمد بن محمد ولی الملقب بہ شہاب الدین طالش، کلکتہ، ۱۸۴۷ء

فرہنگ اورنگ شاہی از ہدایت اللہ قریشی ہاشمی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۳۶۷

فضائل النقبا از عبداللہ بن علی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۰۸۶

فنون لطیفہ بعہد اورنگزیب از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، لاہور، ۱۹۵۷ء

فہرست ذخیرۂ حبیب گنج (علی گڈھ یونیورسٹی) مرتبہ معین الدین

فہرست کتب خانۂ آصفیہ (۴ جلد) حیدرآباد، ۳۵-۱۳۳۳ ہج

فہرست کتب نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی مرتبہ سید محمد عبدالرؤف، دہلی

فہرست مخطوطات جواہر میوزیم، اٹاوہ مرتبہ ابرار حسین فاروقی، اٹاوہ، ۱۹۵۹ء

فہرست مخطوطات درگاہ لائبریری، اچ شریف گیلانی (بہاولپور) مرتبہ غلام سرور، بہاولپور، ۶۰-۱۹۵۹ء

فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ (کتب خانہ آصفیہ) حصہ اول، حیدرآباد، ۱۳۵۷ ہج

قصائد فطرت موسوی، بانکی پور، نمبر ۱۹۵۸

قصۂ کامروپ (عکس بوڈلین مخطوطہ نمبر ۱۳۲۶) نیز مخطوطہ علی گڈھ۔

قصہ لدھا فقیر از عاقل خاں رازی (مخطوطہ سلیمان، علی گڈھ)

قصہ لعل پوش از سید ناصر علی (مخطوطہ علی گڈھ)

کارنامہ از منشی لعل چند ملتانی معروف بہ ملک زادہ، سالار جنگ، نمبر ۳۳۱۸۔

کاویہ اور سنگیت کا پارسپرک سمبندھ (ہندی) از ڈاکٹر اما مشرا، دہلی، ۱۹۶۲ء

کشایش نامہ از خواجہ راجکرن (مخطوطہ علی گڈھ)

کشف الطریق از ارادت خاں واضح، سالار جنگ، نمبر ۷۱۳۔

کشکول منسوب بہ عاقل خاں رازی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۲۷۹۔

کلمات الشعرا از محمد افضل سرخوش، مرتبہ صادق علی دلاوری، لاہور، ۱۹۴۲ء

کلمات طیبات مرتبہ عنایت اللہ خاں، سالار جنگ، نمبر ۲۳۲۔

کلمات عالیات از ارادت خاں واضح، سالار جنگ، نمبر ۱۳۲

کلیات اشرف مازندرانی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۷

کلیات بحری مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید، نولکشور، فروری ۱۹۳۵ء

کلیات بیدل، نولکشور، ۱۸۷۵ء

" " کابل، ۱۳۴۲ شمسی (۴ جلد)

کلیات جعفر زٹلی، مطبع محمدی، دہلی، ۱۲۸۹ھ

کلیات جویا تبریزی مرتبہ ڈاکٹر سید محمد باقر، ۱۹۵۹ء

کلیات خاشع، بوہار، ۴۰۸

کلیات دانا بن اشرف، آصفیہ، نمبر ۵۹۰

کلیات ساعی نیشنل میوزیم، نمبر $\frac{۴۹}{۷}$، ۵۵

کلیات صائب مرتبہ امیری فیروز کوہی تہران، ۱۳۳۶ (شمسی)

کلیات صہبائی از امام بخش صہبائی، مطبع نظامی، کانپور

کلیات عالی (نعمت خاں) مخطوطہ

کلیات کریم (محمد کاظم) بانکی پور، نمبر ۲۸۹۵۔

کلیات واضح (عکس مخطوطہ انڈیا آفس، لندن، نمبر ۱۶۷۴)

کنز الهدایات از محمد باقر بن شرف الدین لاہوری، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۴۴۵

گل اورنگ از ماہر اکبر آبادی (مشمولہ مجمع الافکار، بانکی پور، نمبر ۸۶۰۔

گل رعنا از لچھمی نراین شفیق، بانکی پور، نمبر ۲۲۴

گلدستہ، سالار جنگ، نمبر ۲۷۳۱

گلدستہ سخن از مل رائے شوقی مرتبہ جوت پرکاش، بانکی پور، نمبر ۸۵۹۔

گلزار آصفیہ از خواجہ غلام حسین، مطبع محمدی، ۱۳۰۸ ہجری
گنج سعادت از معین الدین، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۲۷۵

لب تاریخ سندھ از خداداد خاں مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خاں، کراچی، ۱۹۵۹ء
لب التواریخ ہند از رائے بنارا بن (مخطوطہ علی گڈھ)
(مثنوی) لطیفہ شوق از جنونی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۹۸
لغات عالمگیریہ از فاضل خاں، سالار جنگ نمبر $\frac{1265}{2117}$
لغت ترکی از فضل اللہ خاں، بانکی پور نمبر ۷۹۳
(مثنوی) لمعات الطاہرین از غلام علی دکنی، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۸۱۰

مآثر الامرا از شاہنواز خاں، کلکتہ، ۱۹۰۳ - ۱۸۸۸ء
مآثر رحیمی از عبدالباقی نہاوندی، ج ۳، کلکتہ، ۱۹۳۱ء
مآثر عالمگیری از محمد ساقی مستعد خاں مرتبہ آغا احمد علی، کلکتہ، ۱۸۷۱ء
مآثر الکرام از غلام علی آزاد بلگرامی، آگرہ، ۱۹۱۰ء
ماہ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۵ء
مائدۃ الفوائد (شرح وقائع) از میر مخدوم مدرس مدرسہ عالیہ، کلکتہ
مناکشر (ہت اچھرا) مترجمہ لعل بہاری سکسینہ (مخطوطہ علی گڈھ)
مناکشر مع وشواروپا (سنسکرت) مرتبہ ایس۔ ایس بینتلر، مدراس ۱۹۱۲ء
مثنوی راسخ سرہندی (راز و نیاز)، بانکی پور، نمبر ۶۴۱
مثنوی فطرت موسوی (در ماجرای بنارس) سالار جنگ، بیاض نمبر ۷۳
مثنوی گل و بلبل (یا نسخہ شوق) از جھنجل منشی، سالار جنگ نمبر $\frac{2761}{820}$
مثنوی مادھونل کام کندلا (مخفی اعجاز) از حقیر یا، مرتبہ یوگ دھیان آہوجہ، دہلی، ۱۹۶۵ء

مثنوی مناظرت، سالار جنگ، نمبر ۸۸۱

مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی (در سفر دکن) مخطوطہ لٹن، علی گڑھ

مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی (در عروسی فرخ سیر) نولکشور، ۱۸۸۲ء

مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی (در عروسی ارشاد خاں) مخطوطہ لٹن، علی گڑھ

مثنوی ناصر علی سرہندی، نیشنل میوزیم، نمبر ۳۰۶۹

" " (دفتر دوم) نیشنل میوزیم، نمبر ۳۰۳۹

(مجموعہ) مثنویات بینش کشمیری، سالار جنگ، نمبر ۱۰۹۴۔

مثنویات فانی مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، سری نگر

مثنویات ہیبر انجام مرتبہ حفیظ ہوشیار پوری (۲ جلد) کراچی، ۱۹۵۷ء

مثنویات (دیوان واضح، سالار جنگ نمبر ۹۳۷

مجالس الاحزان از حکیم اصغر علی خاں، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۳۷۷

مجلہ علوم اسلامی، علی گڑھ۔

مجمع الافکار، بانکی پور، نمبر ۸۶۰

مجمع النفائس از سراج الدین علی خاں آرزو، بانکی پور نمبر ۲۳۷

مجمل مفصل از محمد براری امی، بانکی پور نمبر ۴۰۲۸

مجموعۂ نغز از قدرت اللہ قاسم، لاہور، ۱۹۳۳ء

محرم الاسرار از شیخ عبدالکریم بن شیخ فرید انصاری، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۲۸۲

(مثنوی) محیط اعظم از بیدل، سالار جنگ نمبر ۸۹۰

مخزن الغرائب از احمد علی (مخطوطہ علی گڑھ)

مدھومالتی (ہندی) از منجھن مرتبہ ڈاکٹر شیو گوپال مشرا، بنارس، ۱۹۴۷ء

مرآت احمدی از مرزا محمد حسن علی خاں بہادر، مرتبہ سید نواب علی، جزو اول، کلکتہ، ۱۹۲۸ء

مرآت جہاں نما از شیخ محمد بقا (مخطوطہ علی گڑھ)

" " مرتبہ محمد شفیع (مخطوطہ عبدالسلام، علی گڑھ)

مرآۃ الخیال از شیر خاں لودی، عمدۃ الاخبار پریس، ۱۸۴۸ء

مرآۃ العالم از بختاور خاں (مخطوط لٹن، فرنگی محل، علی گڈھ)

مردم دیدہ از حاکم لاہوری مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور، ۱۹۶۱ء

مرقع از عاقل خاں رازی، بانکی پور، نمبر ۶۹۵

مصباح السرور (یا مفتاح السرود) از قاضی حسن، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۶۲۹، سالار جنگ نمبر ۱۴۳۲/۱۳

مطارح الانظار مرتبہ مرزا محمود مازندرانی، بمبئی، ۱۳۸۷ ہجری

مظہر الاعجاز از مہدی واصف، ایشیاٹک، کرزن نمبر ۷۰۸

معارج النبوۃ از ملا معین مسکین، بمبئی، ۱۳۲۴ ہجری

معارف، اعظم گڈھ

معاصر، پٹنہ، جنوری ۱۹۵۲ء

مفتاح الفرس از قاضی حسن، سالار جنگ نمبر ۱۹۴۰/۲۸

مفید الانشا مرتبہ چلنپت رائے، بانکی پور، نمبر ۲۵۱۲ -

مقالات سلیمان از سید سلیمان ندوی مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم۔ اے، حصہ اول، اعظم گڈھ، ۱۹۶۶ء

مقالات شبلی از علامہ شبلی نعمانی، اعظم گڈھ، ج ۵

مقالات الشعرا از قانع ٹھٹھوی مرتبہ حسام الدین راشدی، کراچی، ۱۹۵۷ء

مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی، اعظم گڈھ -

مکاتیب میر عبدالجلیل بلگرامی مشمولہ اورینٹل میسلینی، کلکتہ، ج ۱، ۱۷۹۸ء

مکاشفات رضوی، (شرح مثنوی) از محمد رضا، نولکشور، جنوری ۱۸۷۷ء

من لگن از بحری مرتبہ سخاوت مرزا، کراچی ۱۹۵۵ء

منبع العلم فی شرح صحیح مسلم از فخر الدین، بانکی پور نمبر ۱۱۹۲

منتخب التواریخ از عبدالقادر بدایونی، ج ۳، کلکتہ ۱۸۶۹ء

منتخب کلیات سرخوش، آصفیہ نمبر ۴ ۹۷

منتخب اللباب از خوافی خاں، کلکتہ، ۷۴-۱۸۶۹ء

منثورات فطرت موسوی، بانکی پور، نمبر ۱۹۵۷

(مثنوی) مہر و ماہ از عاقل خاں رازی (مخطوطہ علی گڈھ)

میزان الاشعار از ملا محمد سعد ، بانکی پور نمبر ۸۳۴
نتائج الافکار از محمد قدرت اللہ گوپاموی ، بمبئی ، ۱۳۳۶ (شمسی)
نسخۂ دلکشا از بھیم سین کایستھ ، بانکی پور نمبر ۳۶۹۰
نشتر عشق از حسین قلی خاں ، بانکی پور نمبر ۳۴۱
نصرۃ المرتضیٰ (مثنوی حقیری در بیان جنگ محمد بن حنفیہ) سالار جنگ نمبر ۱۸۶
نغمات العشق یا نغمات الرازی از عاقل خاں رازی ، مشمولہ مرج البحرین ، فتحپور ، ۱۲۶۵ ھ
نکات الشعرا از میر تقی میر مرتبہ مولوی عبد الحق ، اورنگ آباد ، ۱۹۳۵ء نیز مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی ، بدایوں ۔
نگار نامہ از لعل چند ملتانی معروف بہ ملک زادہ ، نولکشور ، ۱۸۸۲ء
نگارستان سخن از سید نور الحسن ، بھوپال ، ۱۲۹۳ ھ
نگارستان فارس از محمد حسین آزاد ، لاہور ، ۱۹۲۲ء
نیا دور ، لکھنؤ
نیرنگ عشق (مثنوی غنیمت) فخر المطابع ، ۱۲۶۸ ھ
واقعات عالمگیری مرتبہ ظفر حسن ، علی گڈھ ، ۱۹۴۶ء
وامق عذرا ، بارڈنگ لائبریری ، نمبر ۳۶ ، ۳۷
وقائع عالمگیر از نبی احمد سندیلوی ، علی گڈھ ، ۱۹۳۰ء
وقائع نعمت خاں عالی ، نولکشور ، جنوری ۱۸۷۸ء
ویہار بالم بھٹی یا شرح مثا کشر مرتبہ نتیا نند پنت ، بنارس ، ۱۹۱۲ء
(مثنوی) ہفت اختر از عیشی ، ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۷۶۸
ہلال کراچی ، جنوری ۱۹۶۳ء
ہمیشہ بہار از کشن چند اخلاص (مخطوطہ دہلی یونیورسٹی لائبریری)
ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، دہلی ، ۱۹۶۲ء
ہندی ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس از ڈاکٹر رام کمار ورما ، الہ آباد ، ۱۹۵۸ء
ید بیضا از غلام علی آزاد بلگرامی (مخطوطہ علی گڈھ)

اشاریہ

اشخاص

کتب

مقامات

ممہ :